سلسلۂ تالیفات وکیل ٹریڈنگ کمپنی لمیٹڈ امرتسر

نمبر ۵۵

دمشق

از

خواجہ محمد عباد اللہ اختر ۔ بی ۔ اے

امرتسری

مولف "بغداد" وغیرہ وغیرہ

روز بازار سٹیم پریس امرتسر میں

شیخ عبد العزیز پرنٹر کے اہتمام سے طبع ہوا

سنہ ۱۳۲۹ ھ

۱۹۱۱ ء

تعداد جلد ۱۰۰۰

قیمت فی جلد ۔ عہ

فہرست مضامین

سنین دمشق

سنین دمشق قبل از مسیح کتب مقدس توریت و زبور اور دیگر صحف انبیا سے اخذ کیے گیے ہیں لیکن مفسرین بائیبل اعتراف کرتے ہیں کہ سنین کتب مقدس صحیح تواریخ واقعات نہیں ہیں، چنانچہ سلطنت یہودیہ اور اسرائیلیہ کے سنین جو کتاب "شاہان" اور "تواریخ" میں ہر ایک حکمران کی مدت سلطنت بیان کرتے ہیں مختلف ہیں۔ اس اختلاف کے وجوہات بیان کرنا اور ان مشکلات کو حل کرنا ہمارا کام نہیں ہے۔ ہم صرف اتنا کہہ سکتے ہیں کہ موجودہ زمانہ میں اس اختلاف کو رفع کرنا ناممکن ہے۔ دمشق نہایت ہی پرانا شہر ہے۔ یہ بھی معلوم نہیں کہ کب آباد ہوا اور کس نے آباد کیا۔ ذیل کے نقشے سے دمشق کے حالات کا تذکرہ مقصود ہے۔ کتب مقدس کے علاوہ پرانے کتبے جو بابل اور نینوا کے کھنڈرات اور شام اور ارض فلسطین میں دستیاب ہوئے سنین دمشق کے قدیم ماخذ ہیں۔

سنہ	شاہان	مشہور واقعات
قبل از پیدائش مسیح ۲۲۲۴		اگر یہ تسلیم کیا جائے کہ دنیا کی پیدائش چار ہزار برس قبل از مسیح صحیح ہے تو دو ہزار دو سو چوبیس برس قبل مسیح دمشق آباد ہوا۔ ارامیوں نے جو حضرت نوح کی نسل سے تھے اس کا بنیادی پتھر رکھا۔ چونکہ اس خاندان کے قبضہ میں شام اور عراق کی زمینیں تھیں۔ اور مؤخر الذکر کو "ارم نہریم" کہتے تھے۔ اس لیے دمشق کا امتیازی نام ارم دمشق تھا۔ (۲ سموئیل باب ۸۔ آیت ۶)۔
۱۸۹۶ء-۱۹۲۱		حضرت ابراہیم خلیل اللہ شام میں آکر آباد ہوئے۔ آپ کا غلام "الیعاذر" دمشق کا باشندہ تھا۔
۱۰۴۰-۱۰۵۵ء	حضرت داؤد	حضرت داؤد بنی اسرائیل کے بادشاہ منتخب کیے گئے۔
		۱۰۴۰ قبل از مسیح دمشق کو فتح کیا اور اس جگہ اسرائیلی چھاؤنی ڈالی۔
۱۰۱۱ء-۱۰۱۵	حضرت سلیمان	حضرت داؤد کے انتقال پر حضرت سلیمان جانشین ہوئے۔

سنہ	شاہان	مشہور واقعات
		بیت المقدس کو سات سال میں تعمیر کیا۔
۹۷۵	بن ہدد شاہ دمشق	حضرت سلیمانؑ کا انتقال ہوگیا۔ اور سلطنت میں ابتری پھیل گئی۔ بنی اسرائیل کے دس قبیلوں نے بغاوت کی۔ اور سلطنت اسرائیلیہ جس کا دار الحکومت سامریہ قرار پایا قائم کی۔ اور دوسری سلطنت یہودیہ کا پایۂ تخت یروشلم برقرار رہا۔ ابتدا میں دونوں حریف سلطنتیں ایک دوسرے کے مقابل معرکہ آرا رہیں۔ اسکے بعد شاہان دمشق کے ساتھ ایک دوسرے کے برخلاف رابطۂ اتحاد قائم کرتے رہے۔ شاہان دمشق کبھی اسرائیلیہ اور کبھی یہودیہ کی امداد دیتے۔ مگر بعض اوقات دونوں حریف سلطنتیں متفقہ طاقت سے شاہانِ دمشق سے جنگ کرتی تھیں۔ یربعام (ستره[۱۷] سال) ابی جاہ (تین[۳] سال) آسا (چالیس[۴۰] سال) یہویافث (پچیس[۲۵] سال) جیرام (چھبیس[۲۶] سال) اخریاہ (ایک[۱] سال) اتلیاہ (چھ[۶] سال) یواس (چالیس[۴۰] سال) امصیاہ (انتیس[۲۹] سال) اوزیاہ (باون[۵۲] سال) جوتم (سولہ[۱۶] سال) احاز (سولہ[۱۶] سال) حزقیاہ (انتیس[۲۹] سال) منساہ (پچپن[۵۵] سال) آمون (دو[۲] سال) جوسیاہ (اکتیس[۳۱] سال) جوآحاز (تین[۳] ماہ) جوقیم (گیارہ[۱۱] سال) زدقیاہ (گیارہ سال) سلسلہ وار شاہان یہودیہ ہیں۔ اور ان کے ہمعصر جربوبام۔ نداب۔ باشا۔ زمری۔ عمری۔ احاب۔ اخریاہ۔ یہورام۔ یاہو۔ یہواخز۔ یوآس۔ یربعام ثانی۔ ذکریا۔ شالم۔ مناحم۔ یقح۔ ہوشیاہ۔ شاہان اسرائیلیہ میں اول الذکر کا خاتمہ ۵۸۸ برس قبل مسیحؑ۔ آخر الذکر ۷۲۲ برس قبل از مسیحؑ ہوا۔
۹۵۲	″	آسا شاہ یہودیہ نے شاہ دمشق بن ہدد سے اسرائیلیہ کے برخلاف

سنہ	شاہان	مشہور واقعات
		سازش کی۔ شاہ دمشق نے اسرائیلیہ کو متواتر شکستیں دیکر ایک حصہ ملک پر قبضہ کر لیا۔
۹۰۱	بن ہدو ثانی	بن ہدو شاہ دمشق اور شاہ اسرائیلیہ کی لڑائی سامریہ پر ہوئی۔ شاہ دمشق نے شکست فاش کھائی؛ (۱ شاہان ۲۰) بن ہدو نے سامریہ کا محاصرہ کیا ہوا تھا۔ مگر انجام کار خود شکست کھائی؛ موسم بہار میں دوبارہ حملہ کیا۔ اس دفعہ بھی شکست کھائی۔ اور مفتوحہ ممالک واپس دیئے۔ اس وقت شاہ اسرائیل احاب تھا ۸۹۰ قبل مسیح دونوں حریف سلطنتوں نے شاہ دمشق کے برخلاف متفقہ طاقت سے فوج کشی کی۔ احاب شاہ اسرائیل اس جنگ میں کام آیا۔ اور شاہ دمشق کو نمایاں فتح حاصل ہوئی۔ ب ۸۹۲ حضرت الیشع نے نعمان سپہ سالار کو مرض جذام سے شفا بخشی؛
۸۸۵	حزاایل	۸۸۵ حضرت الیشع دمشق میں وارد ہوئے؛ شاہ دمشق بیمار تھا؛ حضرت الیشع کے پاس اپنے سردار حزاایل کو روانہ کیا کہ دریافت کرے کہ اس بیماری سے شفا ہوگی یا نہیں۔ جواب ملا کہ نہیں۔ حزاایل نے ایک موٹا کپڑا پانی میں بھگو کر بادشاہ کے مونھہ پر رکھا جس سے اس کا دم بند ہوگیا اور مرگیا۔ اس کے ساتھ خاندان ہدو کا خاتمہ ہوا۔ اور حزاایل نئے خاندان کا پہلا بادشاہ ہوا؛
۸۴۰ قبل مسیح	بن ہدو ثالث	حزاایل کی وفات پر اس کا بیٹا بن ہدو تخت نشین ہوا؛ شاہ اسرائیل یوآس اور بن ہدو کے درمیان تین دفعہ جنگ ہوا۔ اور جس قدر ممالک حزاایل نے اسرائیل کے فتح کیے تھے یوآس نے ان پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ (۲ سلاطین ۱۳-۲۴)
۸۲۵ "		شاہ اسرائیل یربعام نے شاہ دمشق کو شکست دیکر دمشق کو مسخر کیا

مشہور واقعات	شاہان	سنہ
اور حماۃ سے بحیرہ مردار تک تمام ملک پر قبضہ کر لیا۔ اس وقت دمشق اسرائیلوں کی ایک ریاست ہو گئی۔ بادر شاہ دمشق خراج ادا کرنے پر بحال کیا گیا۔		
شاہ اسرائیل یقیع اور شاہ دمشق رضین نے متفقہ طاقت سے یروسلم کا محاصرہ کیا۔ شاہ یہوداہ آخز نے "تلفات پلاسر" شاہ عصاریہ سے امداد طلب کی جس نے دمشق پر لشکر کشی کی۔ اور اسے بجبر و قہر مسخر کیا۔ رضین مارا گیا۔ اس جگہ شاہ عصاریہ نے ایک دربار منعقد کیا۔ تمام بادشاہوں نے جو اس وقت شام اور دیگر ممالک گرد و نواح میں حکمران تھے اس کی اطاعت کی۔ اس واقعہ کے ساتھ آرامی سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔	رضین	۷۳۰ قبل مسیح۔
دور دوم اس دور میں سلطنت عصاریہ کے ماتحت دمشق بلکہ تمام سرزمین شام تھی۔ اس عظیم الشان سلطنت کا پایہ تخت دجلہ کے کنارے پر شہر نینوا تھا۔ اس کی مفصل تاریخ کے لیے دفتر چاہیے۔ جہاں تک دمشق کا تعلق ہے وہ بہت مختصر ہے۔ دمشق کی آزادی اور عروج کا زمانہ دور اول ہی تھا۔ سنہ ۸۶۰–۸۸۶ قبل مسیح۔ "اشور ناصر پال" شاہ عصاریہ کی زیر حکومت شام اور آرمینیہ سے خلیج فارس تک ملک تھا۔ سنہ ۸۳۵ قبل مسیح شلمنصر ثانی شاہ دمشق کے ساتھ معرکہ آرائیاں جاری رکھیں۔ سنہ ۸۱۱–۷۸۲ "رمان نراری" نے شام کی ریاستوں سے خراج وصول کیا۔ پل جس کا دوسرا نام تلفاث پلاسر ہے سنہ ۷۴۵–۷۲۷ تک حکمران رہا۔ رضین شاہ دمشق اس کا		

سنہ	شاہان	مشہور واقعات
		ہمعصر تھا۔ اس کے عہد میں آرامی حکومت کا خاتمہ ہوا۔ اس کے بعد دمشق سلطنت عصاریہ کا صوبہ تھا؛
سنہ ۷۲۲–۷۰۵	سرجون	حضرت الیشعاہ نبی کا ہمعصر تھا؛ (الیشعاہ باب ۲۰) اور غاصب تھا۔
سنہ ۷۰۵–۶۸۱	سنحریب	سرجون کی وفات پر اسکا بیٹا سنحریب تخت نشین ہوا۔ شاہ یہودا حزقیاہ کا ہمعصر تھا۔
سنہ ۶۸۱–۶۶۸	آسر حدون	منسّی شاہ یہودا کا ہمعصر تھا۔
سنہ ۶۶۸–۶۲۵	آسور بنی پال	اس بادشاہ کی وفات پر سلطنت عصاریہ کا خاتمہ ہوگیا۔ اور بابل اس وقت عروج پر تھا۔

دور سوم و چہارم

سنہ	شاہان	مشہور واقعات
		اس دور میں شاہان بابل اور فارس کا دور دورہ رہا۔ شاہ
۵۸۶	بخت نصر	بابل بخت نصر کے برخلاف اہل شام اور فلسطین نے بغاوت کی۔ بخت نصر نے دمشق کا محاصرہ کیا۔ کئی دن تک میدان کارزار گرم رہا۔ آخر شہر فتح ہوا۔ بخت نصر نے تمام فصلوں کو برباد اور لوگوں کو تہ تیغ بیدریغ کیا؛ اس سلطنت کا خاتمہ شاہان فارس کے ہاتھ سے ہوا؛

دور پنجم

سنہ	شاہان	مشہور واقعات
۳۳۱	سکندر اعظم شاہ سلوکس	سکندر اعظم نے دارا شاہ فارس کو شکست فاش دیکر دمشق کا محاصرہ کیا۔ اور بجبر و قہر سخر کر لیا۔ سنہ ۳۲۳ قبل از مسیح سکندر اعظم کی وفات پر اس فتحمند کی وسیع سلطنت اس کے سپہ سالاروں کے

سنہ	شاہان	مشہور واقعات
		درمیان تقسیم ہوگئی۔ چنانچہ شام شاہ سلوکس کے حصہ میں آیا۔
٦٥		اٹھارہ بادشاہوں نے ٦٥ سنہ تک حکومت کی۔ اس سال پمپی اعظم نے دمشق فتح کیا۔ جو بعد ازاں رومی سلطنت کا ایک صوبہ بن گیا۔
		دورِ ششم و ہفتم
٦٣٤ سنہ ء	صدیق اکبر۔	رومی دورہ دورہ میں دمشق پر رومیوں اور ایرانیوں کے درمیان مختلف اوقات میں لڑائیاں ہوئیں۔ اور کبھی ایرانی اور کبھی رومی غالب آتے۔ آخری تاجدار ہرقل تھا۔ ٦٣٤ سنہ میں عربوں نے دمشق کا محاصرہ کیا جو دو ماہ بعد فتح ہوا۔
٦٦١ سنہ ء	فاروق اعظم، ذی النورین،	٦٦١ سنہ ء تک خلفاء راشدین کی حکومت رہی۔ مگر خلیفہ چہارم کی اطاعت اہل شام نے قبول نہیں کی۔ اس وقت سے یہ ملک بالکل آزاد تھا۔ ٦٦١ سنہ ء میں دمشق مستقل پایۂ خلافت ہوگیا۔
		دورِ ہشتم
٧٤٥ سنہ ء	خلفاء بنو امیہ	٧٤٥ سنہ ء تک چودہ ١٤ تاجدار بنو امیہ حکمران رہے۔ اس خاندان کے حالات مفصّل لکھے گیے ہیں۔ +

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دمشق کے ماخذ

بغداد کے بعد ہم دمشق کی تاریخ لکھنے لگے تو کئی ایک مشکلات کا سامنا ہوا۔ جس کا وہم و گمان ہمیں اس وقت نہ تھا جب ہم نے "بغداد" میں بے تامل وعدہ کیا تھا کہ دمشق کی تاریخ لکھیں گے۔ لیکن اس وقت جب ایفاء وعدہ کا وقت آیا تو ہم نے سمجھ لیا۔ یہ کام ہمارے حوصلہ اور قابلیت سے بڑھکر ہے۔ اس وقت ہمیں اس قول کے حقیقی معنی معلوم ہوئے کہ وعدہ آسان ہے وعدہ کی وفا مشکل ہے۔ اس امر کا اظہار ہم نے چند احباب کے سامنے کیا۔ اور افسوس کے ساتھ کہا کہ "دمشق" کی تاریخ لکھنے کا وعدہ جو ہم نے بغداد میں کیا تھا۔ ایفا ہوتا ہوا نظر نہیں آتا۔ دوستوں نے پست ہمتی پر ملامت کرتے ہوئے افسردہ طبیعت میں ایک ولولہ پیدا کر دیا۔ اور ہم نے پھر مصمم ارادہ کر لیا۔ کہ خواہ کچھ ہی ہو۔ ہم ناظرین کو ایک دفعہ "دمشق" کی سیر ضرور کرائیں گے۔ اگرچہ اس سیر میں وہ لطف نہ ہو جو بغداد کے عالی شان قصروں اور دریائے دجلہ کی روانی اور دلکش مناظر میں تھا۔ اور شاید بعض اشخاص یہ بھی کہیں کہ سیر بدمزہ تھی۔ مگر ہماری دلی تشفی کے لئے اتنا کافی ہے کہ ہم نے ایفاء وعدہ کے ساتھ ایک فرض ادا کیا ہے۔

ان مشکلات سے ہماری مراد دمشق کے ماخذ ہیں۔ جن کی جستجو میں دو سال کا عرصہ گذر گیا۔ مگر بہت کم دستیاب ہوئے۔ بغداد کی عمارتوں کا مصالح ہمیں بغیر کسی ذاتی کوشش کے مل گیا تھا۔ "لی۔سٹرینج" نے وہ سب کچھ مہیا کر دیا جس کے ہم خواہاں تھے۔ چند سیاحوں اور مؤرخین نے بغداد کی تاریخ کو مکمل کر دیا۔ اس کے بعد جس دل و دماغ کی نظر سے ہم نے بغداد کو دیکھا ناظرین کے سامنے پیش کر دیا۔ دمشق کی صورت ہی کچھ اور ہے۔ اگرچہ قریب قریب دونوں کے ماخذ ایک ہی ہیں۔ مگر جو کچھ فرق دونوں صورتوں میں ہے۔ وہ دمشق کے مطالعہ سے ظاہر ہو جائے گا۔ دمشق کے ماخذوں کا ذکر

کرتے ہوئے ہم اپنے احباب کو اُن بزرگوں سے تعارف کا موقع دیتے ہیں، جن سے ہم نے براہِ راست ملاقات کی یا بذریعہ ترجمان گفتگو کا فخر حاصل کیا۔ یا جنکا تذکرہ ضمناً ہمارے رو برو کیا گیا۔

کتب مقدس توریت - انجیل قرآن اور دیگر صحف انبیاء

دمشق کی قدیم تاریخ کے ماخذ صرف کتب مقدس ہی ہیں۔ توریت اور دیگر صحف انبیاء میں دمشق کا تذکرہ مختلف مقامات پر کیا گیا ہے، بالخصوص کتاب پیدائش۔ شاہان۔ تواریخ۔ اور صحف سموئیل۔ اشعیا نبی، میں کسی قدر مفصل تذکرہ ہے۔ انجیل کے ضمیموں یعنی رسولوں کے اعمال اور دیگر خطوط میں بھی حوالہ دیا گیا ہے۔ قرآن شریف میں اگرچہ دمشق کا جغرافیہ نہیں، مگر اُن سوالات کا جو دمشق کے متعلق بحیثیت دار الخلافت پیدا ہوتے ہیں مفصل جواب ہے۔ اور فلسفۂ تاریخ کے لئے قرآن شریف کی آیات بینات کا اصولاً حوالہ دیا گیا ہے۔ ہمارا ارادہ تھا کہ اس بحث میں نہ پڑیں جس میں دنیاء اسلام ایک عرصہ سے مبتلا ہے، اور فی الحقیقت یہ ایک ایسی مشکل تھی جسے سلجھانا اگر ناممکن نہیں تو سخت مشکل ضرور تھا۔ یہ امر نہایت آسان تھا کہ مؤرخانہ حیثیت کو پیش نظر رکھ کر ایسے پیچیدہ سوالات کو خاموشی کے ساتھ نظر انداز کر دیا جاتا۔ مگر تاریخ دمشق اس کے بغیر نامکمل ہے اس لئے جو کچھ قرآن شریف نے (ہماری رائے میں) خلافت کی نسبت فیصلہ کیا ہے، اُسے ظاہر کرتے ہوئے ہم نے ایک ناگوار مگر ایک مشکل عقدہ کو حل کر دیا ہے، اور ضمناً ہم نے اُن اُمور کا تذکرہ بھی کر دیا ہے جو خلافت کے متعلق سمجھے جاتے ہیں۔

ہماری رائے کی تائید میں ہر ایک زمانہ ہے جو اسلام اور اس سے پیشتر دنیا پر گذرا ہے۔ اسکے ثبوت میں ہم قرآن شریف کو پیش کرتے ہیں جسکی آیات کا حوالہ ہم نے مختلف مقامات پر دیا ہے، اور تاریخی واقعات سے ظاہر کیا گیا ہے کہ "خلافت حفاظت اور تقویت مذہب کے لئے لازمی ہے۔ اور ایسی حکومت جس سے تقویت مذہب ہو خلافت ہے" اس لئے ہماری رائے کا علمی و عملی ثبوت کتب مقدس اور تواریخ سے ہی ملیگا۔

کتب مقدس کا سمجھنا کچھ آسان کام نہیں، اور ایسی حالت میں جبکہ مفسرین نے انکی آیات کو معما بنا دیا ہے، سخت مشکل ہے۔ اس لئے ہم نے بیشمار ضخیم تفسیروں اور تاریخوں کے مطالعہ کے بعد اور کسی قدر دل برداشتہ ہو کر ان کتب مقدس ہی سے دمشق کے متعلق معلومات کا ذخیرہ بہم پہنچایا۔ اور اس طرح یہ مشکل آسان ہو گئی، مگر ضمناً جو کچھ ان تفسیروں سے فائدہ حاصل ہوا اُس کا تذکرہ بھی کر دیا ہے۔ مفسرین میں سے جو دیدہ

مشہور پادری صاحبان ہیں جنہوں نے مختصر کتب مقدس یعنی بائیبل کو بے شمار جلدوں میں لکھا ہے، اور ان میں سے بعض اشخاص نے شام اور ارض فلسطین کا سفر صرف اس لئے کیا کہ بائیبل کو اچھی طرح سمجھ سکیں۔ کیونکہ بائیبل کی زمین ملک شام اور مصر ہی ہے، قرآن شریف کے مفسروں میں سے محی الدین ابن العربی اور امام رازی قابل ذکر ہیں۔

محی الدین محمد بن علی ابن العربی کی پیدائش مرسیہ، واقعہ ہسپانیہ میں بتاریخ ۱۷- ماہ رمضان ۵۶۰ھ ۲۹- جولائی ۱۱۶۵ء میں ہوئی۔ ۱۱۹۳ء سے ۱۲۰۲ء تک ہسپانیہ میں ہی قیام رہا، اس کے بعد مشرق کا سفر کیا۔ اور مصر سے ہوتے ہوئے حجاز میں ایک عرصہ تک مقیم رہے اور اس جگہ فتوحات مکیہ لکھی۔ اس ضخیم کتاب کی پانچسو ساٹھ فصلیں ہیں۔ عالم مثال کے کرشمے اور کشف کی کیفیت اسی کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہو سکتی ہے، اور اندازہ ہو سکتا ہے کہ طائر خیال دل یا قلب انسانی کہاں تک پہنچ سکتا ہے، اور اللہ تعالیٰ نے انسانی وجود میں کیا عجائبات رکھے ہیں۔ ابن العربی کی دوسری مشہور کتاب فصوص الحکم ہے، یہ کتاب مصنف نے محروسہ دمشق میں ماہ محرم ۶۲۷ھ میں لکھی، شیخ اکبر خود لکھتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، کو خواب میں دیکھا کہ ان کے ہاتھ میں ایک کتاب ہے۔ یہ کتاب مجھے عنایت کی، اور فرمایا کہ اسے لوگوں کے پاس لے جاؤ اور شائع کرو، دنیا اس سے فائدہ اٹھائے گی، چنانچہ اس حکم کی تعمیل کی گئی۔ یہی کتاب فصوص الحکم ہے، اس کی ستائیس فصلیں ہیں، اور ہر ایک فصل ایک ایک پیغمبر کے نام پر ہے، مثلاً حکمۃ الٰہیۃ فی کلمۃ آدمیہ، فص حکمۃ حقیہ فی کلمۃ اسحاقیہ، فص حکمۃ علویہ فی کلمۃ موسویہ، فص حکمۃ فردیہ فی کلمۃ محمدیہ، شیخ اکبر نے حکمۃ سے مراد عین ہر نبی کی لی ہے، یعنی عالم ایک کتاب ہے اور اس میں اسماء وصفات الٰہی کلمات ہیں، اور چونکہ پیغمبر انسان کامل ہیں اور انسان انہی اسماء وصفات کا مظہر ہے، اس لئے ہر ایک نبی میں جس اسم یا صفت کا ظہور بدرجہ اتم ہوا ہے وہ ایک کلمہ ہے، مثلاً حضرت یوسف علیہ السلام کو اسم نور کا مظہر سمجھ کر ان تمام واقعات سے جو حضرت یوسف کو پیش آئے، اس اسم کی تحقیق کی گئی ہے۔

اس کتاب میں شیخ اکبر نے خداداد قابلیت کا اظہار کیا ہے، اگرچہ اس کتاب کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرتے ہیں مگر عین القضات ہمدانی فرماتے ہیں "کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بارہا عالم مثال میں دیکھا اور ملاقات اور گفتگو سے استفادہ حاصل کیا۔ بالآخر مجھے معلوم ہوا کہ یہ میرا اپنا ہی خیال تھا اس لئے اس کتاب کو بھی شیخ اکبر کے خیال سے منسوب کرنا چاہئے، مگر اس میں کچھ شک نہیں یہ خیال

ایسا اعلیٰ درجہ کا تھا کہ بہت کم آدمیوں کے دماغ نے یہاں تک پرواز کی ہے۔ فصِ آدمیہ میں جو کچھ شیخ اکبر نے عالم کبیر و صغیر سے بحث کی ہے وہ نہایت لطیف ہے۔ ہم نے "خلافت" میں اسی بنا پر اصول وضع کئے ہیں۔

شیخ اکبر کی بے شمار تصنیفات میں سے قرآن شریف کی تفسیر بھی ہے جو ہماری نظر سے نہیں گزری۔ ایک تفسیر ساٹھ اور دوسری تفسیر پچانوے ۹۵ جلدوں میں ہے۔ "عرائس البیان" مشہور تفسیر ہے۔ اور بہت مختصر ہے۔ شیخ اکبر کی تصنیفات میں ابتدائی خیالات پائے جاتے ہیں۔ فصوص الحکم میں جہاں مختلف امور پر بحث کی ہے۔ فص موسوی میں فرعون کو مومن ثابت کیا ہے۔ اور اسکی مغفرت اور نجات کے مقرہیں۔ دلایل نہایت مضبوط ہیں۔ جو قرآن شریف کے آیات ہیں۔ صوفیہ کرام میں شیخ اکبر کا رتبہ مسلّمہ ہے۔ وحدت وجود کو رواج کھلے کھلے الفاظ میں سب سے پیشتر شیخ اکبر نے دیا۔ علماء اسلام نے ان کے مذہب پر حملہ کیا ہے۔ جسپر ہم بحث کرنا نہیں چاہتے۔ شیخ اکبر کی تصنیفات صوفیوں کے درس میں رہی ہیں۔ اور بالخصوص فصوص کی شرح مختلف زبانوں میں کی گئی ہے۔ ان میں سے مولانا جامی اور محب اللہ شاہ بہاری۔ اور حکیم سید محمد حسن امروہی کی شرح میں ہماری نظر سے بھی گذری ہیں۔ شیخ اکبر کا مذہب یہ ہے:-

فلولاہ ولولانا	لما کان الذی کانا
فانا اعبد حقا	وان اللہ مولینا
وانا عینہ فاعلم	اذا ما قلت انسانا

اللہ تعالیٰ کی رحمت وسیع ہے۔ اہل دوزخ بھی عذاب سے ایک خوشگوار ذائقہ میں ہوں گے۔

خوارج کتب مقدس کے ضمن میں اسلام میں مختلف فرقوں کا تذکرہ جو خلافت اور باہمی جھگڑوں کی وجہ سے پیدا ہو گئے۔ بیفائدہ نہ ہوگا۔ اور سچ پوچھئے تو یہ مضمون نہایت اہم تھا۔ اور ہمیں ڈر ہے کہ جو کچھ ہم نے ان فرقوں کے اصول و ابتدائی حالات کے متعلق لکھا ہے وہ ایک ناگوار بحث خیال کیجائیگی۔ اور ممکن ہے کہ اہل سنت ہمیں شیعہ اور شیعہ ہمیں خارجی اور خارجی ہمیں کافر سمجھیں۔ مگر جو کچھ ہم نے لکھا ہے وہ نہایت غور و فکر کے بعد لکھا ہے اور ہمیں یقین ہے کہ ہماری رائے قابل وقعت ہے۔ کیونکہ یہ ہمارے دل سے نکلی ہے۔ جس آزادی اور دلیری سے ہم نے اس امر کا اظہار کیا ہے۔ اگرچہ قابل تعریف نہیں مگر جو کچھ ہم نے لکھا ہے وہ اہل بصیرت کے لئے نظر انداز کرنے کے لائق نہیں۔

خوارج[1] کی وجہ تسمیہ عموماً مورخین نے یہی بیان کی ہے کہ اس جماعت نے اپنے آپ کو حضرت علیؓ کے لشکر سے علیحدہ کرلیا، اس لئے خوارج کے نام سے موسوم ہوئے، دیگر وجہ قرآن شریف کی متعدد آیات ہیں جو خروج فی سبیل اللہ کو قابل تعریف و اجر ثابت کرتی ہیں۔

بہرحال خواہ اس جماعت نے فی سبیل اللہ خروج کیا، یا سپاہ علیؓ سے خارج ہو گئے، مسلمانوں میں ایک مستقل فرقہ ہے اور ابتدائی زمانہ میں حضرت علیؓ کی خلافت اور بنو امیہ کی حکومت میں انکا آغاز ہوا۔ جنگ صفین میں اس فرقہ کی بنیاد پڑی، جس وقت امیر معاویہ اور حضرت علیؓ کے درمیان خلافت کا فیصلہ بذریعہ حکمین ہوا، خوارج جو اس سے پیشتر حضرت علیؓ کے سرگرم معاون تھے ناراض ہو گئے اور کہا کہ علیؓ نے گناہ کیا ہے کہ خلافت کا فیصلہ دو شخصوں کے سپرد کر دیا ہے۔ لاحکم الا اللہ۔ حضرت علیؓ نے نرمی اور ملاطفت سے سمجھایا مگر کچھ اثر نہ ہوا، اور ان لوگوں نے اپنا ایک سردار انتخاب کیا۔ اور نہروان پایہ خلافت مقرر کیا، اس وقت ایک طرف تو حضرت علیؓ کوفہ میں اور دوسری طرف امیر معاویہ دمشق میں اور خوارج نہروان میں خلافت کی مشکلات کو سلجھانے کی کوشش کر رہے تھے، اول الذکر دونوں مدعی خلافت تھے۔ اور خوارج دونوں کا انکار کرتے تھے، ان کا منشاء یہ تھا کہ دونوں کو برطرف کر کے کسی اور شخص کو خلیفہ مقرر کیا جائے۔ اس لئے اس وقت دنیائے اسلام میں چار فریق تھے۔ ایک تو حضرت علیؓ کے معاون تھے، دوسرے امیر معاویہ کے مددگار تھے۔ تیسرے دونوں کے مخالف تھے، چوتھے سب سے الگ تھے، اور نتیجہ کے منتظر تھے کہ دیکھئے اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے، خوارج کے لئے نہایت مشکل کا سامنا تھا، کیونکہ حضرت علیؓ اور امیر معاویہ دونوں انکی بیخ کنی کے درپے تھے، یہ کچھ تعجب کی بات نہیں کہ ایک گروہ جسکی تعداد ہزاروں تک تھی اور جس میں اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی تھے، ایک ایسی بات پر اڑا ہوا تھا

حاشیہ نمبر ۱۔ خوارج اپنے آپ کو "شراۃ" بھی کہتے تھے، انکا قول تھا، اناشرینا انفسنا فی طاعۃ اللہ ای بعناھا بالجنۃ حین نارمنا الائمۃ الجائرۃ۔" (ہم نے اپنے آپ کو اللہ تعالی کی اطاعت میں فروخت کر دیا ہے، یعنی بعوض جنت بیچ ڈالا اس وقت جبکہ ہم ظالم اماموں سے مفارقت کرینگے)۔ آیۃ "ومن الناس من یشری نفسہ الخ" میں بھی بیچنے کے معنی ہی ہیں،

"خارجی" کے معنی یہ بھی ہیں کہ جو کسی حکومت کو تسلیم نہیں کرتا اور بذات خود مہتر اور سردار ہو، غالباً اس اصطلاح کا اطلاق انہی معنوں میں اس جماعت پر صحیح ہوگا، ہمیں اسکا علم نہیں کہ "خوارج" اپنے آپ کو دیگر فرقوں سے اسی نام سے متمیز کرتے تھے،

جو بادی النظر میں سیدھی سادھی معلوم ہوتی ہے، مگر رفتہ رفتہ اس میں پیچیدگیاں پیدا ہوگئیں۔ اور اس درجہ مخالفت بڑھ گئی، کہ انکی نظر میں کل انصار بنوامیہ اور شیعان علی کافر تھے، خوارج کی ابتدا اور ان کے ابتدائی اصولوں پر جتنا غور کیا جائے خلافت اور امامت کا راز افشا ہوتا جائے گا اور اسکی حقیقت کھل جائے گی،

اس امر سے انکار نہیں ہوسکتا کہ خوارج صوم وصلوٰۃ کے سخت پابند تھے، اور قرآن شریف کی تلاوت ان کا کام تھا، اور اس جماعت میں وہ لوگ بکثرت تھے جو بصرہ اور کوفہ میں ابتداً آباد ہوئے، اور غالبًا قراء تھے، ایک مومن مسلمان میں جو اوصاف ضروری ہیں وہ خوارج میں بدرجہ اولیٰ موجود تھے، ان کے شعار یعنی "لاحکم الا اللہ" سے انکار نہیں ہوسکتا اور حضرت علیؓ نے بھی تسلیم کیا تھا، کہ یہ لوگ "اہل الصیام والصلوٰۃ" ہیں۔ قرآن شریف اس جماعت کے دل ودماغ پر نقش تھا۔ اور سنت رسول اللہ پر چلتے تھے، اور سچ تو یہ ہے کہ زاہد خشک تھے، حضرت علیؓ کا قاتل عبدالرحمٰن بن ملجم دنیائے اسلام میں ایک مشہور خارجی گذرا ہے، اس شخص کی نسبت ابن اثیر لکھتا ہے کہ ابن ملجم اسی وقت گرفتار ہوگیا تھا حضرت علیؓ کی وفات کے بعد حسنؓ نے اسے باہر نکلوایا اور لوگ روغن، چٹائیاں اور آگ لے کر جمع ہوگئے کہ زندہ جلا دیا جائے، عبداللہ بن جعفرؓ اور حسینؓ اور محمد بن حنیفہ نے کہا کہ اس کو ہمارے حوالے کردو تاکہ اسے نہایت عذاب دردناک سے ماریں اور اپنا دل ٹھنڈا کریں، چنانچہ عبداللہ بن جعفر نے اسکے پہلے دونوں ہاتھ کاٹے، پھر پاؤں کاٹے، ابن ملجم نے اف تک نہ کی، اور سورہ اقرا باسم ربک آخر تک پڑھتا رہا، اس کے بعد عبداللہ نے اسکی زبان پکڑلی تاکہ اسے کاٹا جائے، ابن ملجم چلایا، اس سے سبب دریافت کیا گیا تو کہا "میں اس بات کو برا سمجھتا ہوں۔ کہ دنیا میں زندہ رہوں اور اللہ کو یاد نہ کروں، جبتک میرے دم میں دم ہے میری زبان پر اللہ کا ذکر ہونا چاہئے"

لوگوں نے زبان بھی کاٹ دی اور پھر آگ میں زندہ جلادیا،

ابن ملجم کا رنگ گندمی تھا اور اسکی پیشانی پر سجدہ کا نشان تھا جس وقت حضرت علیؓ کو مارا تو چلا کر کہا کہ "رب کعبہ میں اپنی مراد کو پہونچا"

مردوں کا تو کیا ذکر ہے۔ خوارج کی عورتیں بھی زہد وتقویٰ میں کم نہ تھیں، اور غیر خوارج کو جس نفرت کی نگاہ سے دیکھتی تھیں ذیل کی مثالوں سے واضح ہوجائیگا:۔

ایک دفعہ ایک خارجی عورت حجاج بن یوسف کے حضور گرفتار ہو کر آئی۔ حجاج نے اپنے اصحاب سے اس کے متعلق مشورہ کیا، سب نے کہا کہ اسے فوراً قتل کردو۔ عورت نے حجاج کو مخاطب کرکے کہا کہ "اے حجاج تیرے دوست کے وزرا تیرے اصحاب سے بہتر تھے۔" حجاج نے پوچھا "میرا دوست کون ہے؟" جواب دیا۔ "فرعون"۔ کہ اس نے اپنے وزرا سے حضرت موسیٰ کی نسبت پوچھا تو سب نے جواب دیا کہ "موسیٰ اور اس کے بھائی کو مہلت دینی چاہئے۔"

اسی طرح ایک خارجی عورت کو حجاج کے پاس لائے، حجاج اس کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہتا تھا اور وہ آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتی تھی۔ ایک شخص نے اُسے کہا کہ "امیر تو تجھ سے کلام کرتا ہے اور تو اسکی طرف دیکھنا بھی پسند نہیں کرتی۔" جواب دیا کہ "میں اس شخص کیطرف کس طرح دیکھوں جس کی طرف اللہ تعالیٰ نگاہ نہیں کرتا۔" حجاج نے اس کے قتل کا حکم دیا۔ نہایت استقلال اور صبر سے جان دی۔

عبید اللہ بن زیاد عراق کا عامل تھا۔ بصرہ میں ابو بلال مرداس بن ادیہ خوارج کا امام تھا۔ عبید اللہ کے جور و ستم سے بصرہ میں پناہ ملنی مشکل تھی، اس لئے چالیس رفقاء کے ساتھ شہر کو چھوڑ کر بمقام "آسک" رہائش اختیار کی۔ عبید اللہ نے معبد بن اسلم الکلابی کو ان کے تعاقب میں روانہ کیا۔ اس لڑائی کا نقشہ عیسی بن فاتک الخطی اس طرح کھینچتا ہے:۔

فلما اصبحوا صلوا وقاموا — الی الجرد العتاق مسومینا

فلما استجمعوا حملوا علیھم — فظل ذوو الجعائل یقتلونا

بقیتہ یومھم حتی اتاھم — سواد اللیل فیہ یراد غونا

یقول بصیرھم لما اتاھم — بأن القوم ولوا ھاربینا

أألفا مسلم فیما زعمتم — ویقتلھم بآسک اربعونا

کذبتم لیس ذاک کما زعمتم — ولکن الخوارج مؤمنونا

ھم الفئۃ القلیلۃ غیر شک — علی الفئۃ الکثیرۃ ینصرونا

بیشمار تاریخی واقعات شاہد ہیں کہ "خوارج" کی بغاوت کا محرک پاکیزہ خیالات تھے، اور وہ خود پرہیزگار لوگ تھے، اور جنگ و جدل میں بھی صرف اللہ تعالیٰ کی خوشنودی مدنظر تھی۔ دنیوی اغراض جس پر دیگر فریق کم و بیش لڑ رہے تھے ان کے عقائد میں شامل نہ تھے۔ یہ کون کہہ سکتا ہے کہ خوارج ایسے لوگ تھے جو

اسلام اور مسلمانوں کے دشمن تھے۔ اور یہ اس لئے کہ وہ بنو ہاشم اور بنو امیہ کے سر برآوردہ ارکان کے خون کے پیاسے تھے۔ تعجب ہے کہ فی زمانہ یہ صورت نہیں لیکن اس وقت جبکہ ہجرت نے نصف صدی کا عرصہ بھی طے نہ کیا تھا، اس وقت جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب موجود تھے۔ اس وقت جبکہ لوگوں کے دلوں پر نبوت اور رسالت کا ادب تازہ تھا، اس وقت جبکہ لوگ جانتے تھے، کہ اسلام کیا ہے۔ ہاں اس وقت جبکہ لوگ عملاً اسلام کے پابند تھے، تعجب ہے کہ اس وقت لوگوں کے خیالات ہمارے عقائد کے مخالف تھے، اگر ہم ٹھنڈے دل سے اپنے اور ان لوگوں کے اسلام۔ ایمان، افعال کا مقابلہ کریں، تو بیّن فرق نظر آئے گا، ان کا ایمان، ان کا قول، انکا فعل حقیقی اسلام تھا، وہ پکے موحد تھے۔ سچے خدا پرست تھے۔ اور ہم انسان پرست ہیں۔ ہم گذشتہ زمانہ کے بزرگان دین کو ایک ایسے عالی مرتبہ پر دیکھتے ہیں جہاں ہم نہیں پہونچ سکتے۔ لیکن اس زمانہ میں یہ بزرگ ایک دوسرے کو ایسے درجہ پر دیکھتے تھے، جس میں مساوات تھی۔ اور اپنی ذات سے بالاتر صرف ایک ذات اللہ واحد القہار کو دیکھتے تھے۔ یہی اسلام تھا جسے وہ بخوبی سمجھتے تھے اور یہی بُت پرستی ہے جس میں ہم مبتلا ہیں،

خوارج نے حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، اور امیر معاویہؓ کو ظالم قرار دیا، اور ان کے برخلاف جنگ کرنا جہاد اور ثواب عظیم تھا، کیونکہ دنیا کو ظلم سے پاک کرنا ہر ایک شخص کا اعلیٰ فرض ہے، اس لئے ان کے عقائد میں خلافت ایک جزو مذہب ہے جس کا ہر ایک مسلمان مومن صالح مستحق ہے، اور خلیفہ اگر وہ کسی وقت خلاف احکام الٰہی اور سُنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کام کرے برطرفی کے قابل ہے بلکہ واجب القتل ہے۔ طبری نے خوارج کی ابتدائی تاریخ مفصل لکھی ہے، وہ لکھتا ہے، کہ خوارج کا یہ خیال تھا کہ حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ نے قرآن شریف کے برخلاف کام کیا، اور ظلم اور خود پرستی کو روا رکھا، اس لئے وہ مستحق خلافت نہ تھے، ابو بکرؓ اور عمرؓ ہی ایسے شخص تھے جو خلیفہ برحق تھے کیونکہ وہ اللہ اور رسول کے احکام کے پابند تھے اور تقویٰ پر ان کی بنیاد خلافت تھی، یہی مضمون اُس خط کا ہے، جو سماک بن عبید عامل مداین کو خارجی سردار نے لکھا تھا،

شبیب نے عبد الملک کے عہد میں خروج کیا، حجاج اس وقت عراق میں خوارج کی بیخکنی میں مصروف تھا، مطرف بن مغیرہ بن شعبہ مدائن کا عامل تھا، ایک دفعہ شبیب اپنے رفقاء کو ساتھ لیے ہوئے مدائن کے قریب اُترا، مطرف نے شبیب کو کہلا بھیجا کہ کسی شخص کو ہمارے پاس بھیجو کہ ہم تمہارے خیالات پر غور کریں،

شبیب نے اپنے رفقاء میں سے بغیث بن بوید کو بھیجدیا۔ مطرف کے استفسار پر کہا کہ "ہم مسلمانوں کو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ پر عمل کرنے کی دعوت دیتے ہیں اور جس چیز نے ہمکو ہماری قوم سے بدلہ لینے پر آمادہ کیا ہے وہ یہ ہے کہ ان لوگوں نے حدود شرعی کو بیکار سمجھ کر چھوڑ دیا ہے۔ مال غنیمت کو زور بازو کی کمائی سمجھ کر تصرف کرتے ہیں۔ اور خلافت بجبر و قہر حاصل کرتے ہیں۔ مطرف نے کہا "چوں کہ تم حق کی دعوت کرتے ہو۔ اور علی الاعلان ظلم کی بیخ کنی پر آمادہ ہو۔ اس لئے ہم تمہاری تقلید پسند کرتے ہیں۔ ان ظالموں، بیدینوں، اور بدعتیوں سے لڑنے پر ہم سے بیعت لے لو۔ کہ لوگوں کو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ پر عمل کرنے اور شوریٰ سے کام کرنے کی دعوت کریں گے۔ جیسا کہ عمرؓ بن الخطاب نے کیا تھا۔ یہاں تک کہ کافہ اسلام جس سے راضی ہوں اسکو اپنا امیر بنائیں۔ کیونکہ عرب کو جب یہ معلوم ہو جائیگا کہ شوریٰ سے مراد قریش کی رضامندی حاصل کرنا ہے تو خواہ مخواہ وہ کسی کی بیعت پر اتفاق کرینگے۔"

اگرچہ اس وقت شبیب مطرف کی بیعت پر راضی نہ ہوا۔ مگر شبیب کی وفات کے بعد مطرف نے بھی خروج کیا۔ اور جو کچھ ان لوگوں کی قسمت میں لکھا ہوا تھا اسکے بھی پیش آیا۔

ایک دفعہ عبد الملک کے حضور دس خارجی پکڑے آئے۔ حکم دیا کہ قتل کر دو۔ اس وقت آسمان پر ابر چھایا ہوا تھا۔ اور ترشح ہو رہا تھا۔ رعد گرجتا تھا اور بجلی چمکتی تھی۔ نو آدمی قتل ہو چکے تو دسویں کی باری آئی۔ اسکی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے اور کہا:۔

فالوا البرق نجدیا فقلت له ۔ یا ایھا البرق انی عنک مشغول
بذکر للعقل حیران بمعتکف ۔ فی کفہ کحباب الماء مسلول

عبد الملک نے کہا کہ میں خیال کرتا ہوں کہ اپنے وطن اور اہل کی محبت بیقرار کرتی ہے اور تو کسی پر عاشق ہے۔" کہا ہاں۔

عبد الملک نے کہا اگر یہی اشعار پہلے پڑھتا تو تیرے رفقاء کو بھی آزاد کر دیتا۔ اسکے بعد حکم دیا کہ اسے چھوڑ دو۔

خوارج نرے زاہد خشک ہی نہ تھے بلکہ شاعری اور شعراء سے بھی واقف تھے۔ عبد الملک نے دو شعروں کے صلہ میں ایک خارجی کو رہا کر دیا۔ مگر بات یہ ہے کہ اس شخص کی قابلیت اور دلی درد کو محسوس کیا۔ اور ایسے شخص کا قتل نہایت سنگدلی کی دلیل تھی۔ مہلب عامل خراسان خوارج ازارقہ کی سرکوبی کے لئے ایک

لشکر جرار کے ہمراہ کوچ کر رہا تھا۔ ایک دن کمپ میں شور وغل کی آواز سنائی دی، گھبرا کر خیمہ سے باہر نکل آیا۔ دیکھا کہ ایک خیمہ میں کچھ سپاہی آپس میں جھگڑ رہے ہیں۔ معلوم ہوا کہ فرزدق اور جریر دو شعراء وقت کے اشعار کا مقابلہ کرتے ہوئے ایک فریق فرزدق اور دوسرا جریر کو ترجیح دیتا ہے۔ آخر مہلب کی آمد پر اسی کو حکم مقرر کیا گیا۔ مہلب نے کہا: استغفر اللہ۔ تمہارا یہ منشاء ہے کہ یہ دو کتے مجھے پھاڑیں! میں ان میں فیصلہ نہیں کر سکتا۔ ہاں خوارج ازارقیہ میں اکثر عربی بدوی ہیں اور زباندانی میں کمال رکھتے ہیں ان سے پوچھو وہ صحیح فیصلہ دیں گے۔ اور ان کو ان کے بھونکنے کی پرواہ بھی نہیں۔ دوسرے دن ایک خارجی عبیدہ بن ہلال اپنی صفوں سے باہر نکل کر مبارز طلب کرنے لگا۔ اس طرف سے ایک سپاہی مقابلہ کے لئے نکلا۔ لیکن لڑائی کے آغاز سے پیشتر مہلبی سپاہی نے پوچھا کہ "آتنا بتا دو۔ ان دونوں میں سے کون بہتر شاعر ہے۔ فرزدق یا جریر۔" عبیدہ نے کہا کہ "خدا تجھے غارت کرے۔ بجائے اسکے کہ تو مجھ سے قرآن شریف کی کسی آیت کی تفسیر یا فقہ کا کوئی مسئلہ دریافت کرتا۔ شاعروں کی یاوہ گوئی کی نسبت سوال کرتا ہے۔" آخر سپاہی کے اصرار پر جریر کا ایک شعر پڑھ کر جریر کے حق میں فیصلہ دیا۔

خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کے زمانہ میں شوذب خارجی نے خروج کیا۔ اس وقت عبدالحمید بن عبدالرحمن بن زید بن خطاب والی کوفہ تھا۔ آپ نے اس کے نام فرمان لکھا کہ جبتک خوارج فتنہ و فساد اور خونریزی کی ابتدا نہ کریں اس وقت تک ان سے متعرض نہونا۔ بصورت دیگر کسی بہادر مستقل مزاج جوانمرد کو لشکر کولی کے واسطے روانہ کرنا۔ محمد بن جریر بن عبداللہ بجلی اس مہم کے افسر مقرر ہوئے۔ عمر بن عبدالعزیز نے ایک نامہ خارجی سردار کو لکھا کہ "اللہ اور اس کا رسول تمہارے خروج سے خوش نہیں ہو سکتا کہ اس کے احکام کے مخالف ہے۔ آؤ ہم باہم مناظرہ کریں۔ اگر ہم حق پر ہوں۔ تو تم اوس جماعت میں داخل ہو جاؤ جس میں کل مسلمان شامل ہیں۔ اگر تم حق پر ہو تو ہم تمہارے عقائد پر غور کرینگے۔" خارجی سردار نے عاصم کو معہ دیگر اشخاص کے مناظرہ کے واسطے بھیجدیا۔ یہ دلچسپ مناظرہ نہ صرف خوارج کے عقاید پر روشنی ڈالتا ہے بلکہ بنوامیہ پر لعنت ملامت کرنے والوں کے لئے بھی ایک معقول جواب ہے۔ عمر بن عبدالعزیزؒ نے عاصم کو پہلے سوال کا حق دیا۔

عاصم نے کہا کہ "آپکے اوصاف حسنہ اور خصائل حمیدہ نے ہماری مشتعل طبائع کو سرد کر دیا ہے اور ابھی تک ہمارے دل و دماغ میں آپ کی امارت کے برخلاف کسی قسم کی کوشش ظہور میں نہیں آئی۔ لیکن یہ بتاؤ کہ تمہیں خلافت کا استحقاق کس طرح پیدا ہوا۔ لوگوں کی رضامندی سے یا بزور غلبہ۔" عمر بن عبدالعزیز نے جواب دیا کہ

نہ تو مجھے اس کی خواہش ہوئی اور نہ میں نے اسے غلبہ سے حاصل کیا، ایک شخص نے میرے حق میں وصیت کی اور کسی شخص نے میری بیعت سے اختلاف نہیں کیا، چونکہ تمہارا یہی عقیدہ ہے کہ ہر ایک مومن مسلمان خلافت کا مستحق ہے۔ اور جس شخص کی خلافت پر لوگوں کا اتفاق ہو جائے وہی خلیفہ برحق ہے؛ مگر عدالت کے لئے عمل شرط ہے؛ اس لئے اگر میں حق کا مخالف ہوں تو میری اطاعت تم پر فرض نہیں۔" عاصم نے کہا کہ بیشک تم امیر عادل ہو، اور عوام الناس نے تمہاری بیعت پر اتفاق کیا، لیکن تمہارے رشتہ دار جن کے افعال وحرکات سے تم نے مخالفت کی ہے اور انہیں ظلم سے تعبیر کرتے ہو، اس قابل ہیں کہ تم ان سے بیزاری ظاہر کرو اور ان پر لعنت بھیجو۔ کیونکہ تم ہدایت پر ہو اور وہ ضلالت پر قائم رہے۔" عمر بن عبدالعزیز نے جواب دیا کہ "افسوس کہ تمہارے خروج کا مدعا تو صرف اللہ اور اللہ کے رسول کی خوشنودی حاصل کرنا ہے مگر تم شارع حقیقت سے دور جا پڑے ہو، اللہ تعالیٰ نے کسی پر لعن کرنا شروع نہیں کیا۔ اور نہ رسول اللہ کو لاعن مبعوث کیا، ابراہیم خلیل اللہ نے کہا ومن عصانی فانک غفور الرحیم؛ اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اولئک الذین ھدی اللہ فبھداھم اقتدہ۔ میں نے ان کے اعمال کو مظالم سے تعبیر کیا ہے پس اس قدر ان کی مذمت کافی ہے۔ اگر گنہگاروں پر لعنت کرنا واجب ہے تو تم حق بجانب ہو کہ فرعون پر لعنت کرو، لیکن تم ایسا نہیں کرتے؛ اور وہ بدترین خلائق تھا۔ میں اپنے خاندان والوں پر کس طرح لعنت کر سکتا ہوں، کہ وہ صوم وصلوٰۃ کے پابند تھے، بیشک ظلم کرنے سے وہ کافر نہیں ہو سکتے تھے۔ کیونکہ رسول اللہ نے لوگوں کو ایمان وشریعت کی طرف دعوت دی۔ جو اس پر عمل کرے گا اس سے وہ فعل قبول کیا جائے گا۔ اور جو شخص کسی امر کا احداث کرے گا اس پر حد جاری کی جائے گی۔" عاصم نے کہا کہ یہ سب کچھ سہی۔ مگر رسول اللہ نے لوگوں کو توحید اقرار بما نزل علیہ کی بھی دعوت دی ہے۔" عمر بن عبدالعزیز نے جواب دیا کہ ان لوگوں نے توحید کا کبھی انکار نہیں کیا اور کبھی نہیں کہا کہ سنت رسول اللہ پر عمل نہیں کرینگے۔" اس لئے وہ کس طرح مورد لعن وطعن ہو سکتے ہیں۔" عاصم نے کہا کہ "بہرحال تم انکے افعال کو مظالم سمجھتے ہو، اس لئے ان لوگوں سے بیزاری ظاہر کرو اور ان کے احکام کو رد کر دو۔" عمر بن عبدالعزیز نے جواب دیا کہ "تم ابوبکرؓ اور عمرؓ کو خلیفہ برحق سمجھتے ہو، صدیق اکبرؓ نے اہل ردت سے جنگ کی اور ان کی عورتوں اور بچوں کو لونڈی اور غلام بنالیا، عمرؓ نے ان کو فدیہ کے ساتھ واپس کر دیا، اور ابوبکرؓ سے بیزاری ظاہر نہیں کی؛ اس کے بعد عمر بن عبدالعزیز نے اور مثالیں پیش کیں اور خود خوارج کے باہمی اختلاف پر بحث کرتے ہوئے

کہا کہ "تم ایک دوسرے سے بیزاری ظاہر نہیں کرتے اور تم مجھے کہتے ہو۔ کہ اپنے خاندان والوں سے تبرّا کروں، حالانکہ مذہب و دین ایک ہی ہے، اللہ تعالیٰ سے ڈرو۔ مردود کو مقبول اور مقبول کو مردود نہ بناؤ، بیشک رسول اللہ نے اس شخص کو امن دی ہے، جس نے کلمہ شہادت پڑھا کہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ اور اس کا مال و خون حرام فرمایا ہے، تم انہی کلمہ گویوں کو قتل کرتے ہو، اور غیر مذاہب والوں کو امن دیتے ہو اور ان کے مال و خون کو نا روا سمجھتے ہو"

اِس مباحثہ کا اثر جو ہم نے ترجمہ ابن خلدون سے نقل کیا ہے یہ ہوا کہ عاصم نے خوارج کے عقاید سے توبہ کر لی۔ اور پھر لوٹ کر اپنے رفقا کے پاس نہیں گیا، کیونکہ اس واقعہ کے چند دن بعد عمر بن عبد العزیز کا انتقال ہو گیا، اور عبد الحمید نے محمد بن جریر کو شوذب سے جنگ چھیڑنے کا حکم دیدیا، اگرچہ خوارج عاصم کی واپسی کے منتظر تھے، اور ابھی تک طرفین ایک دوسرے کے مقابلہ میں خاموش تھے، لیکن جب عبد اللہ بن جریر کو آمادہ پیکار دیکھا تو سمجھ لیا کہ اُس مرد صالح یعنی عمر بن عبد العزیز کا انتقال ہو گیا۔ اس لئے یہ لوگ وعدہ کے خلاف جنگ کرنا چاہتے ہیں،

یہ خیال کہ اسلام نے ذاتوں کا امتیاز اُٹھا دیا ہے۔ اور "ان المومنون اخوۃ" اور مومنین میں مساوات ہے، بصورت علم تو ہر ایک شخص کے دماغ میں ہے۔ مگر خوارج نے اس کا عملی ثبوت دیا۔ افسوس ہے کہ یہ لوگ زمانہ کی رفتار کو نہ سمجھے۔ اس لئے بقول حضرت علیؓ ان کے عقائد کا مدعا یہ تھا کہ لا امارۃ انتظام مملکت کے لئے حکومت ضروری ہے خواہ وہ حکومت اچھی ہو یا بُری، لیکن امارت کی عدم موجودگی میں بدنظمی بری حکومت سے بھی بدتر ہے، ان لوگوں نے نیک نیتی سے بدنظمی کو رواج دیا۔ بہرحال اختلاف امت رحمت ثابت ہوا، کیونکہ خوارج نے اگر خلافت اور امارت کے معنی سمجھنے میں غلطی کی تو کم از کم اسلام کو ہمیشہ کے لئے کفر اور شرک کی آمیزش سے بچا لیا، آجتک جس قدر بلند عمارتیں معماران قوم نے دنیا اسلام میں تعمیر کیں وہ اسی اصلاح کے بنیادی پتھر پر قائم ہیں جس کو خوارج نے پہلی نصف صدی ہجری میں خلافت کے پہلو میں رکھا،

شعرا خلافت جریرؔ، فرزدقؔ، اخطلؔ

کتب مقدس اور مختلف تفسیروں، اور فرقوں، کے بعد شعرا دربار اموی کا تذکرہ نہایت دلچسپ ہے، ان میں سے جریر[2]، فرزدق، اور اخطل تین سربرآوردہ ہیں، ان کے اشعار میں ایک خاص بات ہے جو دیگر شعرا کے کلام سے متمیز ہے، تینوں عراقی تھے،

حاشیہ نمبر ۲ بقول ابن خلکان اکثر اہل علم کا اجتماع اس بات پر ہے کہ جریر کا پایہ فرزدق سے بلند ہے،

لیکن فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے زبان عربی ہے، جریر اور فرزدق اور اخطل ہمعصر تھے، اول الذکر دونوں حریف تھے، ان کے نقائض نے ملک شعر میں ایک عرصہ تک خوشگوار شورش برپا کی تھی۔ لوگ اُٹھتے بیٹھتے مجلسوں میں، سپاہی کیمپ میں، جریر اور فرزدق کے شعر پڑھتے۔ اور ایک کو دوسرے پر ترجیح دیتے،

مگر جریر کا رتبہ ہر ایک امر میں فرزدق سے بالا ہے، فخر۔ مدح۔ ہجا۔ نسیب میں فرزدق اسے نہیں پہونچتا،

فخریہ کہتا ہے:-

اذا غضبت علیک بنو تمیم حسبت الناس کلهم غضابا

عبد الملک کی مدح میں لکھتا ہے:-

ألستم خیر من رکب المطایا وأندی العالمین بطون راح

راعی کی ہجو میں کہتا ہے:-

فغض الطرف انک من نمیر فلا کعبا بلغت ولا کلابا

نسیب میں کہتا ہے:-

ان العیون التی فی طرفها حور قتلننا ثم لم یحیین قتلانا

یصرعن ذا اللب حتی لا حراک به وهن اضعف خلق الله ارکانا

اس زمانہ میں جریر کے پایہ کا کوئی شاعر نہ تھا، مسعود ابن بشر نے اس کے اشعار مفصلہ ذیل پڑھ کر جریر کو کل شعرا وقت پر ترجیح دی تھی،

ان الذین غدوا بلبک غادروا وشلا بعینک لا یزال معینا

غیضن من عبراتهن وقلن لی ماذا لقیت من الهوی ولقینا

ان الذی حرم المکارم تغلبا جعل النبوة والخلافة فینا

مضر أبی وأبو الملوک فهل لکم یا خزر تغلب من أب کأبینا

هذا ابن عمی فی دمشق خلیفة لو شئت ساقکم الی قطینا

ایک دفعہ جریر عبد الملک بن مروان کے پاس آیا اور اسکی مدح میں قصیدہ پڑھنا شروع کیا جس کے ابتدائی شعر یہ ہیں:-

أتصحو ام فؤادک غیر صاح عشیة هم صحبک بالرواح

اخطل، فرزدق، کا طرفدار تھا۔ ایک اور مشہور شاعر "راعی الابل" نامی تھا۔ اگرچہ فرزدق نے ان کے خاندان بنو نمیر کی ہجو اور جریر نے مدح کی تھی، مگر "راعی" نے فرزدق کو ترجیح دی، جریر کو بڑا معلوم ہوا اور راعی کے پاس شکوہ کیا۔ راعی کا لڑکا خیدل بھی اس وقت موجود تھا، باپ کو کہا کہ "ابن سگ بنو کلاب (جریر) کو کیا منہ لگاتے ہو" جریر غضب میں آگیا، اور ایک ہجو کہی۔ راعی کے ساتھ بنو نمیر کی بھی مذمت کی،

تقول العاذلات علاك شيب — اهذا الشيب يمنعني مزاحي

تعزت ام خيرة ثم قالت — رايت الموردين ذوي لقاح

ثقي بالله ليس له شريك — ومن عند الخليفة بالنجاح

ساشكر ان رددت الى ريشي — وانبت القوادم في جناحي

الستم خير من ركب المطايا — واندى العالمين بطون راح

عبد الملک اس وقت تکیہ لگائے بیٹھا تھا۔ جریر نے جس وقت اس شعر الستم خیر من الخ کو ختم کیا، عبد الملک سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور کہا کہ اگر کوئی ہماری مدح کرنا چاہے تو اس طرح کرے،

ابو فراس ہمام الفرزدق اور جریر میں ہمیشہ ملک شعر میں لڑائیاں ہوتی رہیں۔ ایک دوسرے کو برا بھلا کہتے رہے،۔ ایک دفعہ فرزدق نے چند شعر لکھے۔ جریر نے اسپر فرزدق کی ہجو لکھی،۔

لقد ولدت ام الفرزدق فاجرا — فجاءت بوزار قصير القوادم

يوصل حبليه اذا جن ليله — ليرقى الى جاراته بالسلالم

تدليت تزني من ثمانين قامة — وقصرت عن باع العلا والمكارم

هو الرجس يا اهل المدينة فاحذروا — مداخل رجس بالخبيثات عالم

لقد كان اخراج الفرزدق عنكم — طهورا لما بين المصلى دواقم

فرزدق نے جب یہ شعر سنے تو ایک طویل قصیدہ لکھا۔ چند شعر یہ ہیں:۔

وان حراما ان اسب مقاعسا — بابائي الشم الكرام الخضارم

ولكن نصفا لو سببت وسبني — بنو عبد شمس من مناف وهاشم

اولئك آبائي فجئني بمثلهم — واعتد ان اهجوا كليبا بدارم۔

اس وقت فرزدق کی رہایش مدینہ میں تھی، مروان ابن الحکم والی مدینہ تھا۔ اہل مدینہ نے جب فرزدق کے اشعار

اور راعی کو منہ پر سناتا رہا، راعی نے شرمندہ ہوکر سر جھکالیا، جریر نے کہا:

فغض الطرف انک من نمیر فلا کعبا بلغت ولا کلابا

(شرم سے اپنی آنکھیں نیچے کرلے۔ کیونکہ تو بنو نمیر سے ایک ہے یعنی کعب کا ہمسر نہیں۔ اور نہ کلاب میں نسب ہے) یہ ہجو ایسی زبانزد خلایق ہوئی کہ بے چارہ راعی کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہا،

سنتے تو مروان کے پاس جمع ہوکر کہا کہ اس شخص پر جو اس قسم کے اشعار ایسی جگہ جہاں ازواج رسول اللہ ہوں کہے حد شرع واجب ہے، مروان نے فرزوق کو حکم دیا کہ مدینہ منورہ سے تین دن کے اندر نکل جائے، فرزوق اس شعر میں اسی قضیہ کی نسبت کہتا ہے:۔

توعدنی واجلنی ثلاثا کما وعدت لمهلکها ثمود

مروان نے ایک عامل کو لکھا کہ فرزوق کو گرفتار کرکے قید کیا جائے، اس کے بعد اپنے کئے پر پشیمان ہوا، تو ایک آدمی فرزوق کی طرف روانہ کیا۔ اس نے فرزوق کو یہ شعر مروان کی طرف سے سنائے؛

قل الفرزوق والسفاهة کاسمها ان کنت تارک ما امرتک فاجلس

ودع المدینة انها مرهوبة واقصد لمکة اولبیت المقدس

واذا احتنیت من الامور عظیمة فخذن لنفسک بالدفاع الاکیس

فرزوق نے یہ شعر سنکر جواب میں لکھا کہ:۔

امروان ان مطیتی محبوسة ترجوا الحباء وربها لم ییاس

وحبوتنی بصحیفة مختومة یخشی علے بها اصاء النقرس

الق الصحیفة یا فرزق لا تکن نکدا کمثل صحیفة المتلمس

ایک دفعہ سلیمان بن عبد الملک کے حضور میں ایک قصیدہ پڑھا جسکے آخری شعر یہ ہیں:۔

ثلاث واثنتان فهن خمس وسادسة تمیل الی شمام

فبتن بجانبی مصرعات وبت افض اغلاق الختام

کان مغالق الرمان فیه وجمر غضی تعدن علیه حام

سلیمان نے یہ شعر سنکر کہا کہ تو نے خود زنا کا اقرار میرے سامنے کیا ہے۔ اور میں امام وقت ہوں۔ تجھ پر حد شرع واجب ہو چکی ہے، فرزوق نے سبب پوچھا تو سلیمان نے جواب دیا کہ اللہ تعالی فرماتا ہے:۔

بصرہ کو چھوڑا"، مگر داغ بدنامی بنونمیر کے دامن پر سالہا سال تک رہا بلکہ بنونمیر کی ہجو تو ضرب المثل ہو گئی، حبیب کہتا ہے :-

فسوف یزید کو صنعتہ ھجائی   کما وضع الھجاء بنی نمیر

ایسے مُنہ پھٹ شاعروں کی قابلیتوں کا موازنہ اور ان کا محاکمہ اور فیصلہ کون کرتا۔ ہر ایک شخص ڈرتا تھا کہ اگر ایک کو ترجیح دیتا ہوں، تو دوسرا پیچھا نہ چھوڑے گا، جریر اور فرزدق نے ایک دوسرے کے برخلاف ہجو میں ایسے نامہذب اشعار کہے ہیں کہ صرف فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے قابل تحسین ہیں، ورنہ بے نقط گالیاں فحش کلمات کا مجموعہ ہے، ہجو اور مدح میں دونوں اس پایہ کے شاعر ہیں، کہ ان کا نظیر اس زمانہ میں نہیں ملتا۔

"الزانیۃ والزانی فاجلدوا کل واحد منھما مائۃ جلدۃ" فرزدق نے کہا کہ "کتاب اللہ میں یہ ارشاد خداوندی آپ کی نظر سے نہیں گذرا۔ کہ "والشعراء یتبعھم الغاوٗن الم ترا انھم فی کل وادٍ یھیمون۔ وانھم یقولون مالا یفعلون" میرا بھی یہی حال ہے۔ میرا قول و فعل یکساں نہیں، جو کچھ کہتا ہوں وہ نہیں کرتا" سلیمان مسکرایا اور انعام و اکرام سے کلام کی داد دی"

ایک دفعہ ایک بوڑھیا عورت فرزدق کے پاس آ کر فریاد کرنے لگی کہ حجاج بن یوسف الثقفی نے تمیم بن زید کو بلاد سندھ کا والی مقرر کیا ہے اور اس نے اہل بصرہ میں سے لوگ منتخب کر کے ایک فوج مرتب کی ہے انہیں میرا بیٹا بھی ہے، اسکے سوائے میرا اور کوئی بیٹا نہیں اور وہی میرا نگراں حال تھا۔ اور زندگی کا سہارا تھا

فرزدق نے اس کے بیٹے کا نام دریافت کیا، کہا "خنیس"

فرزدق نے تمیم کو ایک منظوم خط لکھا،

تمیم بن زید لا تکونن حاجتی   بظھر فلا یعیا علی جوابھا
فھب لی خنیسا واحتسب فیہ منۃ   لعبرۃ ام ما یسوغ شرابھا
اتتنی فعاذت یا تمیم بغالب   وبالحفرۃ السافی علیھا ترابھا
وقد علم الاقوام انک ماجد   ولیث اذا ما الحرب شبت شھابھا

تمیم نے خط دیکھا تو بوڑھیا کے بیٹے کا نام صحیح نہ پڑھا گیا، چونکہ "خنیس" اور "حبیش" میں تجنیس خطی ہے۔ اس لیے یہ معلوم نہ ہو سکا کہ یہ اسم خُنیس ہے یا حبیش ہے، حکم دیا کہ لشکر میں جو شخص ان ناموں کے ہوں۔ تلاش کئے جائیں، چھ آدمی ان دونوں اسموں کے ملے، سب کو فرزدق کے پاس روانہ کر دیا"

اس کے ساتھ اس درجہ دلیر تھے کہ خلفاء اور امراء سے بھی نہ چوکتے تھے۔ فرزدق اور جریر میں صرف شاعرانہ عداوت تھی۔ فی الحقیقت دونوں دلی دوست تھے۔ ایک دفعہ فرزدق نے ہشام بن عبدالملک کو اس طرح مخاطب کیا۔

یقلب عینا لکم تکن بخلیفۃ   مشوھۃ حولاء جما عیوبھا

ہشام نے عامل عراق خالد بن عبداللہ القسری کو فرزدق کی گرفتاری کی نسبت لکھا۔ عامل مذکور نے گرفتار کرکے قیدخانہ میں رکھا۔ آخر جریر کی سفارش سے رہائی ہوئی۔

جب جریر نے فرزدق کے مرنے کی خبر سنی تو زار زار رویا اور کہا۔ واللہ اب لطف زندگی باقی نہیں رہا۔ ایک دوست دنیا میں تھا وہ بھی چل بسا۔ وہ مجھ سے اور میں اس سے مشغول تھا۔ یہ نہیں تو جینے کا مزہ کیا۔"

اخطل عیسائی تھا بظاہر قیود وتکالیف مذہب سے آزاد تھا۔ مگر اسپر بھی پاس مذہب تھا۔ ایک دفعہ گرجا میں گیا۔ پادری صاحب کے سامنے اپنے گناہوں کا اقرار کیا۔ اور معافی کا خواستگار ہوا۔ پادری صاحب نے نہایت سخت وسست کلمات کہے۔ اور آخر میں کہا۔ "اے دشمن خدا کیا آیندہ تو لوگوں کی مذمت اور ہجا اور عورتوں کو بے عزت کرے گا۔" اخطل نے توبہ کی۔ ایک شخص یہ باتیں سن رہا تھا۔ اخطل سے پوچھا "کہ تم تو خلیفہ کے دربار میں آتے جاتے ہو۔ اور لوگ تم سے خائف ہیں۔ اس پادری کے سامنے ہاتھ باندھے کیوں کھڑے تھے۔" جواب دیا۔ یہ مذہب ہے جسکا پاس ہمارا ایمان ہے۔ مگر اخطل کی توبہ بھی توبہ ناصواب تھی۔

دی روز بہ توبہ شکستم ساغر
امروز بہ ساغرے شکستم توبہ

ایک دفعہ پادری صاحب کو گدھے پر سوار دیکھا۔ اپنی عورت کو مقدس بزرگ کا دامن چھونے کے لئے کہا۔ بیچاری حاملہ تھی۔ تیز قدمی سے بڑھی مگر گدھے کی دم تک ہاتھ پہونچا تھا۔ کہ سواری آگے نکل گئی۔ اخطل نے تسلی دی کہ "کچھ فکر نہیں سعادت دارین حاصل ہوگئی۔ پادری صاحب اور گدھے کی دم میں کچھ فرق نہیں۔"

ایک دن جریر عبدالملک کے پاس بیٹھا ہوا تھا اخطل بھی آنکلا۔ عبدالملک نے جریر کی طرف اشارہ کرکے اخطل سے کہا کہ "اسے جانتے ہو؟" کہا۔ "نہیں" عبدالملک نے کہا کہ "یہی جریر ہے"۔ اخطل نے کہا۔ "والذی رفعنی اعیا راھلک یا جریر ما عرفتک"۔ جریر نے کہا۔ "والذی اعمی بصیرتک وادام خزیتک اقد

عرفنك سيماك سيما اهل المنار ؎

ایک دفعہ [۳۳] عبدالرحمٰن بن حسانؓ بن ثابت نے یزید کی بہن رملہ کی تعریف میں اشعار لکھے، شاعر وہ تھا کلام نقارہ خدا تھا۔ شہرت ہوئی تو یزید غصہ میں امیر معاویہ کے پاس گیا۔ اور کہا کہ عبدالرحمٰن نے آپ کی لڑکی کو رسوا کیا ہے، آپ کس طرح یہ گوارا کریں گے؟ امیر معاویہ نے کہا آخر اس نے کیا کہا ہے۔ وہ شعر میں بھی تو سنوں؟ یزید نے کہا ایک شعر یہ ہے :-

هي بيضاء مثل لؤلؤة الغواص　　صيغت من لؤلؤ مكنون ؎

امیر معاویہ نے سن کر کہا کہ اس میں کونسی بری بات ہے، جو کچھ کہا ہے صحیح ہے۔ یزید نے کہا ایک اور شعر اس طرح ہے :-

حاشیہ نمبر ۳۳ عبدالرحمٰن بن حسانؓ نے رملہ کے عشق میں چند شعر یہ بھی کہے تھے :-

رمل هل تذكرين يوم عزال　　اذ قطعنا مسيرنا بالتمني

اے رملہ تمہیں چشمہ والا دن یاد ہے، کہ جب میں نے بڑے شوق سے قطع مسافت کی تھی؟

اذ تقولين عمرك الله هل شئ　　وان جل سوف يسليك عني

جب تم مجھ سے یہ کہہ رہی تھیں کہ اللہ تمہیں زندہ رکھے کیا کوئی ایسی تدبیر ہے جو تم کو مجھ سے خوش کر دے۔ گو وہ تدبیر دشوار ہو، مگر مجھے بتا دو؟

ام هل اطمعت منكم يا ابن حسان　　كما قد اراك اطمعت مني

اے ابن حسان کبھی میں نے بھی تم سے کسی بات کی خواہش کی ہو، جس طرح سے میں تمہیں اپنے لئے خواہش کرتا ہوا دیکھ رہی ہوں؟

ایک دفعہ انصار کا وفد امیر معاویہ کے پاس آیا، عبدالرحمٰن بن حسان بھی ہمراہ تھے، امیر معاویہ نے عبدالرحمٰن کو کہا کیا یہ درست ہے کہ تم نے رملہ کو مخاطب کر کے کچھ عاشقانہ شعر کہے ہیں، عبدالرحمٰن نے کہا کہے تو ہیں، لیکن میں نے اپنا مخاطب اسی کو بنایا ہے۔ جو حسن و جمال میں سب سے زیادہ فائق ہے۔ اس میں سے کونسی بری بات ہے۔ اور علاوہ ازیں ایک شاعرانہ خیال ہے؟

عبدالرحمٰن کا باپ حسانؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مداح تھا، شاعری ورثہ میں ملی تھی۔ ایک دفعہ عبدالرحمٰن بن ام حکم نے فخریہ کہا، کہ ہم قریش ہیں اور خلفاء ہم سے ہیں، عبدالرحمٰن بن حسانؓ نے کہا :-

واذا ما مستہا لم تجدھا   فی نساء من المکارم دون

امیر معاویہ نے کہا بالکل صحیح ہے۔ یزید نے کہا ایک شعر اور بھی سنیں:-

ثم خاصرتھا الی القبۃ الحمراء   تمشی فی مرمر مسنون

امیر معاویہ نے کہا۔ یہ تو سراسر کذب ہے، مگر شاعرانہ کلام ہے۔ تمہارا مدعا کیا ہے؟ یزید نے کہا۔ بس اس جھوٹ کی سزا دیں۔ وہ واجب القتل ہے، کہ خلیفہ کی لڑکی سے تعشق کا اظہار کرتا ہے۔ امیر معاویہ نے کہا "بیٹا، ایک شعر پر اگر یہ سزا تجویز کرتے ہو تو یاد رکھو کہ تمام دنیا میں بدنامی ہوگی، اور جو رسوائی اس وقت خیال کرتے ہو، اس سے بڑھ کر ہوگی، گھر گھر چرچا ہوگا۔ اور لوگ سمجھیں گے کہ جو کچھ عبدالرحمٰن نے لکھا ہے، صحیح واقعہ ہے" یزید چپکا ہو رہا، مگر جوش غضب کم نہ ہوا۔ کعب بن جعیل کو کہا کہ دوست ہمارا بدلہ لو اور انصار کی ہجو لکھو۔ کعب نے

واما قولک الخلفاء منا   فھم منعوا وریدک من وداج

ولولاھم لکنت کحوت بحر   ھوی فی مظلم الغمرات داج

وھم دعج وود ابیک ازرق   کان عیونھم قطع الزجاج

حاشیہ نمبر ۴۔ کعب بن جعیل اچھا شاعر تھا۔ عبدالرحمٰن بن خالد بن ولید فاتح شام کی وفات پر مرثیہ لکھا:-

الا تبکی وما ظلمت قریش   باعوال البکاء علی فتاھا

اے مخاطب تو نہیں روتا۔ قریش تو اپنے نوجوانوں کی موت پر بلند آواز میں رونے سے کوتاہی نہیں کرتے۔

ولو سئلت دمشق لاخبرتکم   وبصری من رباح لکم حماھا

اگر دمشق سے پوچھا جائے تو وہ تم سے بیان کرے گا۔ اور شہر بصرہ بھی بتا دیگا کہ کس نے وہاں کی چراگاہ تمہارے واسطے عام کر دی۔

وسیف اللہ اوردھا المنایا   وھدم حصنھا وحمی حماھا

اور کس نے سیف اللہ کو موت کی گھاٹ اتارا۔ اور کس نے قلعے منہدم کئے۔ اور چراگاہیں محفوظ رکھیں۔

کہا کہ "مجھے تو معذور رکھو، میں ایمان لانے کے بعد شرک سے دور رہا ہوں، اور جن لوگوں نے رسول اللہ کی امداد کی۔ بھلا اُن کی ہجو میں کس طرح کرسکتا ہوں، البتہ ایک شخص کا پتہ دیتا ہوں، چونکہ وہ مشرک ہے۔ اس لئے اُسے نہ انصار کی پرواہ ہے نہ مہاجرین کی، اس کے بعد اخطل کا نام لیا۔ اخطل نے بھی انکار کیا اور کہا کہ "ہجو تو میں ضرور لکھتا، مگر امیر معاویہ مجھے زندہ نہ چھوڑیں گے"۔ یزید نے کہا "اسکا میں ذمہ لیتا ہوں"۔ آخر اخطل نے انصار کی ہجو لکھی :-

ذھبت قریش بالمکارم کلھا	سب بزرگیاں تو قریش لے گئے،
واللؤم تحت عمائم الانصار	اور انصار کے عماموں کے نیچے ملامت ہے،
قوم اذا احضر العصیر رایتھم	جب ان لوگوں کے پاس دخت رز آئے۔
حمرا عیونھم من المسطار	تو تو انہیں شراب ترش کے نشہ میں متوالا دیکھے گا،
لعن الالہ من الیھود عصابۃ	اللہ تعالیٰ یہودیوں کے گروہ کو لعنت کرے۔
بالجزع بین صلیصل وحرار	جو اونٹ اور گھوڑوں کے درمیان شور مچاتے ہیں،
واذا نسبت ابن الفریعۃ خلتہ	جب فریعہ (قبیلہ انصار کی ایک کا نام ہے) کا بیٹا اپنا نسب بیان کرتا
کالجحش بین حمارۃ وحمار	ہے جس طرح گدھے کا بچہ گدھی اور گدھے سے پیدا ہوتا ہے،
فدعوا المکارم لستم من اھلھا	تم بزرگیوں کو چھوڑ دو تم اسکے اہل نہیں ہو،
وخذوا مساحیکم بنی النجار	اے بنی نجار تم اپنے پھاوڑے لیکر کام کرو۔

اِن اشعار کی شہرت ہوئی، نعمان بن بشیر الانصاری غصہ میں امیر معاویہ کے پاس گئے۔ اور سر سے عمامہ اُتار کر کہا "دکیا آپ کو کوئی ملامت نظر آتی ہے؟" امیر معاویہ نے حیران ہوکر کہا "نہیں ملامت تو نظر نہیں آتی بلکہ خیر ہے" نعمان نے کہا کہ عبد الارقم نے پھر کیوں کہا ہے :-

ذھبت قریش بالمکارم کلھا ۔۔۔ واللؤم تحت عمائم الانصار

امیر معاویہ سخت برافروختہ ہوئے اور کہا "تجھے اختیار ہے جو چاہو اس سے سلوک کرو، نعمان نے کہا واللہ اسکی زبان قطع کروں گا، پھر کہا :-

معادی الا تعطنا الحق تعترف	لحی کالاسد مشدودا علیھا العمائم
ایشتمنا عبد الاراقم ظلمہ	وماذا الذی تجری علیک الاراقم

خمالی ثار و ون قطع لسانہ　　　فدواک من ترضیہ هنک اللہ اھم

اخطل نے سمجھا کہ اب خیر نہیں، یزید کے پاس گیا، یزید نے نعمان کو راضی کر لیا۔ اور ادھر امیر سے کہا کہ پہلے یہ تو تحقیق کر لیں یہ ہجو اخطل نے کہی ہے، چنانچہ گواہ طلب ہوئے، کسی نے گواہی نہ دی، اس طرح اخطل کی جان بچی۔

ایک دفعہ فرزدق، اخطل، اور جریر، سلیمان بن عبدالملک کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ رات کا وقت تھا، سلیمان اونگھنے لگا۔ اُٹھنے لگے تو سلیمان نے کہا جب تک اس پر ایک ایک شعر نہ کہو، بیٹھے رہو۔" اخطل نے کہا:۔

رماہ السکری فی رأسہ فکانہ　　　صریع سقی ما بین اصحابہ خمرا۔

سلیمان نے کہا، افسوس ہے تو نے مجھے شرابی بنا دیا۔

جریر نے کہا۔

رماہ السکری فی رأسہ فکانما　　　یری فے سواد اللیل قنبرۃ حمراء

سلیمان نے کہا افسوس ہے تو نے مجھے اندھا بنا دیا۔

فرزدق نے کہا:۔

رماہ السکری فی رأسہ مکانما　　　أمیم جلامید ترکن بہ وقرا۔

ہشام، عبدالملک، سلیمان، کے دربار میں تو شعرا رونق بزم تھے، عمر بن عبدالعزیز سے زاہد بھی اسکے مذاق سے خالی نہ تھے، مگر شعرا کی یہاں دال نہ گلتی تھی، نصیب بن رباح ایک دفعہ آیا۔ اجازت شعر گوئی نہ ہوئی، کہا "امیر المومنین میں نے شعر کہے ہیں۔ مگر الحمد للہ" سے شروع کیا ہے، کہا "اچھا کہو۔"

نصیب نے کہا:۔

الحمد للہ اما بعد یا عمر　　　فقد اتتنا بک الحاجات والقدر

فأنت رأس قریش وابن سیدھا　　　والراس فیہ یکون السمع والبصر۔

خلعت فاخرہ انعام میں دیا۔

ان شعرا کے علاوہ عہد بنو امیہ میں عتبہ بن شماس، جمیل، عمر بن ابی ربیعہ، قیس المعروف مجنون، مشہور شاعر ہیں۔

الف لیلہ

دمشق کے ماخذوں میں سے الف لیلہ بھی ایک ہے"۔ دنیا کی کل زبانوں میں اس کا ترجمہ عربی سے ہوا۔ اور شاید اس قسم کی کوئی کتاب نہیں جسے ایسی عالمگیر شہرت حاصل ہوئی ہو۔ جسے ہر ایک شخص ہر ایک زمانہ اور ملک میں شوق سے پڑھتا ہو۔ اس کتاب کی خوبیوں میں ایک یہ بھی ہے۔ کہ اسکے قصے اگرچہ عموماً افسانے ہیں۔ مگر عربی زبان، عربی عادات، عربی اوضاع و اطوار، اور المختصر عربی زندگی کا فوٹو ہے۔ اور بعض قصے تو تاریخی واقعات ہیں۔ جن میں سے شعرا کا کلام اور خلفاء بنو امیہ اور عباسیہ کے دلچسپ حالات، مختلف شہروں بالخصوص بغداد، دمشق، مصر وغیرہ کے نظارے الف لیلہ کی وقعت کو بہ نسبت دوسرے قصص اور بعض حالات میں تاریخ سے بھی زیادہ بڑھا دیتے ہیں"۔

کہتے ہیں کہ ابتدا الف لیلہ ہزار افسانہ ہے جو فارسی زبان میں تھا۔ اور کسی ساسانی بادشاہ کے عہد میں لکھا گیا تھا۔ کتاب الفہرست اور مسعودی اس روایت کی تصدیق کرتے ہیں۔ النّدیم تو لکھتا ہے کہ میں نے اس کتاب کو دیکھا ہے۔ غالباً ۹۸۷ء میں دیکھا ہوگا۔ مگر اسکی یہ رائے ہے کہ یہ کتاب بیہودہ کہانیوں اور بدمزہ قصوں سے بھری ہوئی ہے۔ اس کتاب کا موجودہ زمانہ میں تو کچھ پتہ نہیں ملتا۔ اگر کوئی ایسی کتاب النّدیم کے وقت ہو تو بظاہر الف لیلہ کا نام ہزار افسانہ سے اخذ کیا گیا ہوگا۔ حکایات جو اکثر عربی شہروں اور عربی سلطنتوں اور خلفا کے متعلق ہیں ہزار افسانہ سے کس طرح ترجمہ ہو سکتی تھیں۔ اور اگر ہزار افسانہ بقول النّدیم ایسی ہی بدمزہ اور پھیکی کتاب ہی ہے تو الف لیلہ سے اسے کیا نسبت ہو سکتی ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں دنیا زاد اور شہرزاد فارسی نام ہیں۔ مگر یہ کوئی دلیل اس امر کی نہیں کہ الف لیلہ ابتدا میں فارسی زبان میں تھی۔ النّدیم تو یہ بھی لکھتا ہے کہ سکندر اعظم کو کہانیاں سننے کا شوق تھا۔ اور اسکے ہمراہ قصہ خواں رہتے تھے۔ مگر اس وقت یہ کہانیاں جو سکندر اعظم کے روبرو بیان کی جاتی تھیں جمع نہ کی گئیں۔ بعد ازاں ہزار افسانہ کی صورت میں دختر بہمن کے واسطے لکھی گئیں۔ اگر الف لیلہ یونانی الاصل ہوتی تو کچھ قابل اعتبار تھا۔ مگر یونانی لٹریچر میں اس قسم کی کہانیوں اور حکایتوں کا پتہ نہیں ملتا۔ اور ہماری رائے میں "الف لیلہ" کسی غیر زبان کی ممنون نہیں"۔

دمشق میں ہم نے الف لیلہ سے بعض دلچسپ نظاروں کا عکس لیا ہے۔ بالخصوص بدر الدین حسن اور عمر النعمان اور دیگر ایسی حکایات سے فائدہ اٹھایا ہے جن کے سین دمشق میں ہیں۔ ان حکایات سے کم از کم دمشق کی مختلف راہوں کا پتہ ملتا ہے۔

ابن جبیر اور ابن بطوطہ اور دیگر سیاح

سیاحوں میں سے ابن جبیر کا مرتبہ سب سے بڑھا ہوا ہے، دمشق اور دیگر مقامات کے چشم دید حالات اس نے اس طرح بیان کئے ہیں کہ خود بخود تصور میں نقشہ کھنچتا چلا جاتا ہے۔ ابن جبیر اور ابن بطوطہ کا تذکرہ ہم بغداد میں کر چکے ہیں۔ اس لئے اعادہ کی ضرورت نہیں، اس جگہ سیاحان مغرب قابل ذکر ہیں۔ ان میں سے اطالی سیاح "لوڈو۔ وی کو۔ ڈی۔ ورتھمہ" (Ludovico Di Varthema) دمشق میں ۱۵۰۳ء میں آیا۔ تعجب ہے کہ اس سیاح کی ذاتی حالات سے کسی شخص کو آگاہی نہیں، اگرچہ اسکے سفرنامہ کا ترجمہ یورپ کی کل زبانوں میں ہوا ہے۔ ہمارے مطالعہ میں انگریزی ترجمہ رہا ہے جون۔ ونٹر۔ جونس" نے اسکا انگریزی میں ترجمہ کیا۔ اور "جارج۔ پرسی۔ بیجر" نے اسپر حاشیہ چڑھایا ہے۔ اور چونکہ اکثر مقامات پر غلطیاں کی ہیں اس لئے اوڈیٹر نے اسکی اصلاح بھی کی ہے، سیاح مذکور نے مصر، شام، عرب، فارس اور ہندوستان کا سفر کیا شوق سیاحت ہی اسے یورپ سے ان مقامات پر کھینچ لایا۔ دمشق میں کچھ عرصہ مقیم رہا اسکے بعد قافلہ حاج کے ساتھ مکہ اور مدینہ منورہ میں گیا۔ اوڈیٹر کا خیال ہے کہ اگرچہ سیاح مذکور نے اس امر کا اظہار مناسب نہیں سمجھا۔ مگر دمشق میں اس نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ کیونکہ کسی غیر مسلمان کا ان ممالک میں جانا ممکن نہ تھا۔ ہماری رائے میں سیاح مذکور نے جہاں دیدہ بسیار گوید دروغ پر عمل کیا۔ چونکہ اہل یورپ کو مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے دیکھنے کا بہت اشتیاق رہا ہے۔ اس لئے اسنے اپنی قدر افزائی کے لئے اپنے سفرنامہ میں مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے حالات جو لوگوں سے دمشق میں سنے لکھ دیئے۔ ان حالات کی تصدیق اہل یورپ کس طرح کر سکتے تھے۔ اس سے زیادہ انہیں بھی کچھ معلوم نہیں ہو سکتا تھا۔ مدینہ منورہ کا ذکر کرتے ہوئے یہودیوں کی ایک بستی کی نسبت عجب بے تکی ہانکتا ہے، اور اسی قسم کے اور حالات بھی لکھے ہیں جو بالکل غلط ہیں۔

دمشق کے متعلق سیاح مذکور لکھتا ہے کہ اس شہر کی خوبصورتی اور آبادی کا تذکرہ لفظوں میں بیان نہیں ہو سکتا ہے، میں چند ماہ اس جگہ رہا۔ اسی جگہ عربی سیکھی، اس کے بعد باشندگان شہر کی نسبت لکھتا ہے کہ "اسجگہ مور۔ مملوک، یونانی عیسائی، بود و باش رکھتے ہیں"۔ اسکے بعد قلعہ دمشق کا ذکر کرتا ہے کہ "اسے ایک فلورنٹائن مملوک نے بنایا تھا۔ یہ مملوک شاہ مصر کے ماتحت ہے، اور اس وقت یہی حاکم دمشق ہے"۔ یہ بیان صریحاً غلط ہے، اوڈیٹر بھی اس غلطی کو تسلیم کرتا ہے۔ اور لکھتا ہے کہ قلعہ کی عمارت عربی وضع کی ہے"۔

لیکن سیاح مذکور یہ بھی لکھتا ہے کہ قلعہ کے ہر ایک گوشہ میں "فلورنس" کے آلات کا نقشہ بنایا ہوا ہے" یہ اس امر کا ثبوت ہے کہ "فلورنسا ئن مملوک نے ہی اسکی تعمیر کی ہے"۔ اسکے بعد شہر دمشق کی نسبت لکھتا ہے کہ اسکی دولت و ثروت کا اندازہ نہیں ہو سکتا، ہر ایک قسم کے میوے اس جگہ دستیاب ہوتے ہیں۔ مگر پانی کی اس قدر کثرت ہے کہ سیب اور ناسپاتی اچھی نہیں ہوتی گلاب کے پھول سرخ اور سفید بے نظیر ہیں۔ ایک نہر شہر میں بہتی ہے مکانات کی بیرونی حالت خراب ہے۔ مگر اندرونی نقشہ حیرت افزا ہے، مختلف پتھر۔ سنگ مرمر، سنگ موسٰی و سنگ خارا وغیرہ سے مکانوں کو خوبصورت اور مضبوط بنا رکھا ہے۔ اور صحن میں فوارے تو عجیب دلکش نظارہ ہے، مساجد بے شمار ہیں" اس کے بعد جامع اموی کا بالخصوص ذکر کرتا ہے کہ روم کے گنبد پطرس کے برابر ہے اور اس جگہ حضرت ذکریا علیہ السلام کی قبر ہے" غالباً اسکی مراد حضرت یحیٰی علیہ السلام سے ہے" اس کے بعد شہر کے چار آہنی دروازوں کا ذکر کرتا ہے، حضرت عیسیٰ اور پولوس رسول کی روایتوں کا تذکرہ کرتے ہوئے خوش اعتقادی کی جھلک دکھاتا ہے، اڈیٹر نے اس موقع پر ایک پر معنی نوٹ دیا ہے کہ یہ سب غلط روایتیں ہیں جسے دمشق کے عیسائی اب بھی خوش اعتقادی سے بیان کرتے ہیں؛

"دار الاسلام" کے مصنف نے دمشق کے بہت مختصر حالات لکھے ہیں جو قابل ذکر نہیں؛

"مارکوپولو" کا ضخیم سفرنامہ دمشق کی تاریخ سے معرا ہے، مگر دیگر شہروں کے حالات سے جو کچھ اس نے لکھے ہیں کچھ تاریخ دمشق کے ماخذوں کا پتہ ملتا ہے؛

ان یورپی سیاحوں کو ابن جبیر اور ابن بطوطہ سے کچھ نسبت نہیں، مؤخر الذکر سیاحوں کی علمیت اور قابلیت کا اندازہ ان یورپی سیاحوں کے مقابلہ میں بخوبی ہو سکتا ہے، مگر اس امر کو نظر انداز نہ کرنا چاہئے کہ اس زمانہ میں جو کچھ سہولتیں مسلمان سیاحوں کو میسر ہو سکتی تھیں وہ عیسائی سیاحوں کو حاصل نہیں ہو سکتی ہیں، دنیا، اسلام میں ایک مسلمان سیاح اپنی ذاتی واقفیت کی وجہ سے ان امور پر بآسانی مطلع ہو سکتا ہے جو غیر مذاہب کے معتقدین کے لئے مشکل اور بسا اوقات غلط فہمی کا موجب ہیں۔ اسلئے موجودہ زمانہ میں بھی یورپی سیاحوں نے جو کچھ دمشق یا دیگر اسلامی ملک کی نسبت لکھا ہے۔ ہمارے کسی مصرف کا نہیں، انکی واقفیت محدود۔ اور ان کے معلومات کا دائرہ نہایت تنگ۔ اور کسی قدر تعصب مذہب کا رنگ بہت نمایاں ہے، مگر ان لوگوں کی ہمت قابل رشک ہے، کہ مردوں کا تو کیا ذکر ہے انکی عورتیں بھی سیاح ہیں، اور انکی تصنیف میں ایک خاص بات ہے جو ان کے مردوں کی تحریروں میں نہیں۔ ان میں سے "اذ لے" بلاد برٹن؛

قابلِ ذکر ہے"

۱۸۳۲ء میں محمد علی پاشا والیٔ مصر کے بیٹے ابراہیم پاشا نے دمشق کو ترکوں کے مقابلہ میں فتح کیا۔ اگرچہ اس فتح کی خوشی چند روزہ تھی کیونکہ پھر ترکوں کا تسلط ہو گیا، لیکن اس باہمی جنگ و جدل کا ایک اہم نتیجہ یہ ہوا کہ دول یورپ کو شام میں مداخلت کا موقع مل گیا۔ اور عیسائی طاقتوں کے کونسل دمشق میں رہنے لگے۔ چنانچہ ۱۸۶۹ء میں انگریزی کونسل کپتان برٹن دمشق میں آیا۔ اس کے ہمراہ اس کی عورت "ازبے بلا برٹن" بھی تھی۔ اس نے شام کے متعلق کچھ حالات لکھے ہیں، مگر دلچسپ ہیں۔ "قافلہ حاج"۔ اور "دمشق کا عام نظارہ" اور "دمشق کے بازار اور دکانیں اور عمارتیں" "دمشق کی آبادی" اور "مسلمانوں" "عیسائیوں" اور "یہودیوں" کی معاشرت اور دیگر حالات عمدہ پیرایہ میں بیان کئے ہیں۔ ایک بات جو "ازبے بلا برٹن" نے لکھی ہے وہ اسی کا حصہ ہے یعنی دمشق کی عورتوں کے حالات۔ ان کی روزانہ زندگی، اور شغل کا نقشہ اگرچہ سچا ہے۔ مگر مصنفہ کے طبعی رنگ کی نمائش بھی ہے۔

دمشق کے بازاروں اور دکانوں کا تذکرہ کرتے ہوئے "ازبے بلا برٹن" ایک دکاندار کے حالات اور خوش طبعی کی باتیں، دلچسپ پیرایہ میں کرتی ہے۔ اس کا نام "شیخ ابو عتیقہ" ہے۔ یہ اصلی نام نہیں۔ مگر چونکہ اس کے پاس قدیم زمانہ کی اشیاء اکثر موجود ہیں۔ اس لئے اسی نام سے مشہور ہے۔ اس کی دوکان میں ایک سوراخ ہے جو دروازہ کا کام دیتا ہے۔ اور بیرونی صورت نہایت بری ہے۔ اس دروازہ کے آگے ایک صحن ہے جو ایسی خراب حالت میں پڑا ہے کہ "شیخ ابو عتیقہ" کی مفلسی اور ناداری قابلِ رحم معلوم ہوتی ہے شیخ ترک ہے، لمبی سفید داڑھی، اور سر پر عمامہ، آنکھوں میں عیاری، اور اوضاع و اطوار شریفانہ ہیں، روپیہ پیسہ کے معاملہ میں اس قدر حریص اور کوڑی کے فائدہ پر اس قدر جدوجہد کرتا ہے کہ میں نے مدت العمر میں صرف اسی ایک مسلمان کو ایسا تنگ دل دیکھا ہے، کیا تعجب ہے کہ اس کی ماں یہودی الاصل ہو۔ اگر قیمت کسی شے کی کم لگاؤ تو اس قدر ترش رو اور چیں بجبیں ہوتا ہے کہ خواہ نخواہ خیال پیدا ہوتا ہے، کہ ناراض ہو گیا۔ غصہ میں ایک دفعہ دو تین مٹی کے برتن پھوڑ دیئے، داڑھی نوچ لی۔ عمامہ سر سے پھینک دیا، اور ایک کوٹھری میں چلا گیا۔ مجھے خیال پیدا ہوا کہ میں نے بوڑھے شریف آدمی کو بیٹھے بیٹھے ناراض کر دیا، اس لئے تلافی مافات کے لئے اس کے پیچھے گئی۔ بیرونی صحن سے گذر کر ایک دروازہ میں داخل ہوئی تو تصویرِ حیرت بن گئی، ایک وسیع منقش صحن جس میں سنگ مرمر کا فوارہ۔ صاف شفاف پانی کا اچھلنا۔ سرخ مچھلیوں کا کھیلنا۔

سنگترہ اور لیموں کے درختوں کی قطار اور نہایت نادر اور بیش قیمت اشیاء کا انبار، ایک کیفیت تھی جو بیان نہیں ہو سکتی۔ شیخ "ابو عتیقہ" کے ظاہر اور باطن میں کس قدر فرق ہے، جب میں اُسے طمع دنیاوی پر ملامت کر کے کہتی ہوں، کہ مرنے کے بعد تیرا کیا حال ہوگا۔ اور تیرے اعتقاد کے مطابق سود خواری تجھے جہنم کے کس درجہ میں پہنچائے گی، اور تیرے بعد اس دولت کے کون وارث ہوں گے، تو اسکے چہرہ پر پژمردگی چھا جاتی ہے،

کافی سے تو ہر ایک شخص تواضع کرتا ہے، لیکن شیخ "ابو عتیقہ" مٹھائی بھی کھلاتا ہے، جو خوش ذائقہ ہے، شیخ غلط فہمی سے یہ سمجھتا ہے کہ اس میں کچھ نشہ ہے، اور جب خریدار اسے کھاتے ہیں تو زیادہ قیمت دیتے ہیں، اور بہت چیزیں خریدتے ہیں، میں نے کچھ اشیاء طلب کیں اور پوچھا۔ کیوں شیخ! اسکے دام کتنے ہیں؟"

شیخ — "اللہ شاہد ہے، کہ اگر میں ایک ہزار فرانک کے عوض بھی دوں، تو تحفتہً دیتا ہوں، نفع تو کچھ نہیں، مدعا یہ ہے کہ آپ خوش ہوں، اور اپنی تشریف آوری سے کلبۂ احزان کو منور فرمایا کریں"۔

میں — شیخ! تم تو بہکی باتیں کرتے ہو، ایک سو فرانک اگر منظور ہو تو معقول قیمت ہے، (اتنا مجھے معلوم ہے کہ اسکی قیمت تین اور چار سو فرانک کے درمیان ہے)۔ شیخ کا چہرہ سُرخ ہو جاتا ہے، مگر وہ اس غصہ کو ضبط کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور بے اعتنائی سے ایک طرف چلا جاتا ہے، گویا مجھ سے بات کرنا نہیں چاہتا اور پھر اور مٹھائی لاتا، اور پیش کرتا ہے، ہر ایک لقمہ پر پچاس فرانک بڑھا کر پانچسو فرانک پر فیصلہ ہو جاتا ہے اگرچہ شیخ کو اس میں بہت فائدہ ہے۔ مگر یورپ میں ان اشیا کی اس سے بہت زیادہ قیمت ہے، شیخ دروازہ تک آتا ہے اور بار بار کہتا ہے، "واللہ تم نے تو مجھے لوٹ لیا"۔

"اِزے بلا برٹن" کو ابتدا ہی سے سیاحت مشرق کا شوق تھا۔ اور اس لئے اسنے جو کچھ دیکھا شوق سے دیکھا۔ اور ان کے متعلق جو کچھ لکھا، اچھا لکھا، افسوس ہے کہ اسکے خاوند کپتان برٹن نے پولیٹکل معاملات میں کچھ ایسی پیچیدگیاں پیدا کر دیں، اور لوگوں کی نظروں میں اس طرح کھٹکنے لگا کہ دمشق میں رہنا دشوار ہو گیا۔ اس لئے انگریزی حکومت نے اسے واپس بلا لیا۔ "ازے بلا" کو بھی ہمراہ جانا پڑا۔

کپتان برٹن پہلا عیسائی شخص ہے جس نے مسلمانوں کے مقدس شہروں کو دیکھا۔ اسکے متعلق اسکی ایک مشہور تصنیف ہے، پورٹر کی ہینڈ بک شام اور ارض فلسطین کے سیاحوں کی رہنما ہے۔ یہ کتاب بھی

انگریزی میں ہے، دمشق کے مختلف راستوں اور منزلوں، اور دمشق کی مشہور عمارتوں اور بازاروں اور مختصر تواریخ شہر اور دیگر حالات بیان کئے گئے ہیں، مگر اس میں وہ بات نہیں، جو "از بلا" کی تحریر میں ہے، دمشق کے متعلق چند نقشے بھی ہیں جو "فرگوسن" کی کتاب فن عمارات سے نقل کئے گئے ہیں۔"

• ابو عبداللہ یاقوت بن عبداللہ الرومی الحموی شہاب الدین خاص شکریہ اور تذکرہ کا مستحق ہے۔ بچپن میں ایک تاجر عسکر بن ابی نصر ابراہیم الحموی کے ہاتھ پڑا۔ تاجر مذکور بغداد میں کاروبار کرتا تھا، اور دیگر ممالک میں اسکی تجارتی کوٹھیاں تھیں، یاقوت بحالت غلامی اس کے ہاتھ بکا، عسکر لکھنا پڑھنا نہ جانتا تھا، البتہ تجارت کے اصولوں سے خوب واقف تھا، یاقوت کو کتابت کی تعلیم دلوائی، اور تجارت سکھائی، اس کے علاوہ یاقوت نے نحو اور لغت میں بھی مہارت حاصل کی، عسکر نے یاقوت کو اپنے کام میں لگایا، اور بہت فائدہ اٹھایا، اس کے بعد یاقوت کو اپنا بیٹا بنا لیا، اور قید غلامی سے آزاد کر دیا، عسکر نے مال تجارت کے ساتھ یاقوت کو دیگر ممالک کیطرف روانہ کیا، تجارت کی بدولت مختلف ملکوں اور شہروں میں سفر کیا، اور اس طرح کتاب "معجم البلدان" کا مصالح بہم پہونچاتا رہا۔ یاقوت نے ابتدائی عمر میں خوارج کی چند کتابوں کا مطالعہ کیا، اس کا اثر اس کے دل و دماغ پر ایسا ہوا کہ متعصب خارجی ہو گیا، ۵۹۶ھ میں دمشق میں آیا، دمشق کے بازاروں کی سیر کر رہا تھا کہ اس کی نظر ایک آدمی پر پڑی کہ ایک دکان پر بیٹھا حضرت علیؓ کے مناقب بیان کر رہا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص یاقوت کا شناسا تھا اور بغداد کا رہنے والا تھا یاقوت سے اس وقت رہا نہ گیا۔ اور شخص مذکور سے بحث شروع کر دی۔ باتوں باتوں میں چند سخت متعصبانہ کلمات حضرت علیؓ کی شان کے برخلاف یاقوت کے منہ سے نکلے، اس وقت لوگوں کا ہجوم ہو رہا تھا، سخت برافروختہ ہوئے، اور یاقوت نے دیکھا۔ کہ اب خیر نہیں اور چپکے سے کھسک گیا۔ اہل دمشق نے والی کو اطلاع دی، یاقوت کی گرفتاری کا حکم صادر ہو گیا، یاقوت حیران و پریشان دمشق سے بھاگا اور حلب کا راستہ لیا۔ یہی دھڑکا لگا ہوا تھا کہ اب دھرے گئے، مگر خیر گذری، حلب سے موصل اور موصل سے اربل اور اربل سے خراسان کی طرف گیا۔ بغداد میں داخل نہ ہوا، یہی ڈر تھا کہ مبادا دمشق کے مناظرہ کی کیفیت روایتاً اس جگہ بھی پہونچ گئی ہو اور اس کے پاداش میں قتل نہ کیا جاؤں، خراسان میں رہ کر مختلف بلاد کی سیر کرتا رہا، اور آخر خوارزم میں آیا۔ ۶۱۶ھ ہجری کا واقعہ ہے کہ تاتاریوں اور سلطان محمد بن تکش خوارزم شاہ کے مابین جنگ ہوا اور تاتاریوں کی ترکتازی کے باعث یاقوت کو اس جگہ بھی امن نہ ملا، بحالت خستہ موصل میں آیا اور پھر سنجبار،

اور بعد ازاں حلب میں آیا، اور اسی جگہ وفات پائی، اس کی بیشمار تصانیف اور تالیف میں معجم البلدان، دمشق کے ماخذوں میں سے ایک ہے، اس کتاب میں یاقوت نے مختلف ممالک اور بلاد وغیرہ کا تذکرہ نظم و نثر میں کیا ہے، فی الحقیقت یہ کتاب لغات جغرافیہ ہے، یاقوت نے اسے آٹھ جلدوں میں ختم کیا ہے اور مضمون کو اپنی قابلیت کی وجہ سے نہایت دلچسپ بنا دیا ہے،

یاقوت کا انتقال ۶۲۶ھ میں ہوا، محمد امین خانجی نے اس کے ساتھ دو اور جلدیں منجم العمران بھی ملحق کر دی ہیں، جو بطور ضمیمہ معجم البلدان کی شرح ہے، اور علاوہ ان ممالک کا بھی تذکرہ ہے جو یاقوت نے نہیں لکھا،

تواریخ ابن خلدون، ابن خلکان وغیرہما، مؤرخین میں سے ابن خلدون، ابن خلکان، طبری، اور ابن اثیر، ابن عبد ربہ گبن، وغیرہ کی تصانیف دمشق کے ماخذوں میں سے ہیں،

ابو عمر احمد بن محمد بن عبد ربہ بن حبیب بن حدیر بن سالم القرطبی کے معلومات کا خزانہ اس کی کتاب "عقد الفرید" ہے، تین جلدوں میں لکھی ہے، درحقیقت بیش قیمت موتیوں کا ذخیرہ ہے،

ابن عبد ربہ نے اس کتاب میں تاریخ کے معنوں کو بہت وسعت دی اور اسکے ہر ایک پہلو پر نظر کی ہے اگرچہ عقد الفرید ایک ادب کی کتاب ہے۔ مگر ہم اس کو تاریخی حیثیت سے دیکھتے ہیں،

ابن عبد ربہ شاعر بھی تھا، اور صاحب دیوان ہے، لکھتا ہے:-

یا ذالذی خط العذار بوجہ   خطین ھاجرا لوعۃ وبلا بلا

ما صح عندی ان لحظک صارم   حتی لبست بعارضیک حمائلا

قرطبہ میں اموی خلفاء کے زیر سایہ پرورش پائی۔ اس لئے ان کی مدح میں رطب اللسان ہے، منذر بن محمد بن عبد الرحمٰن بن الحکم بن ہشام ابن عبد الرحمٰن بن معاویہ بن ہشام بن عبد الملک بن مروان الحکم کی تعریف میں ایک قصیدہ لکھا جس میں دو شعر یہ ہیں:-

بالمنذر بن محمد   شرفت بلاد اندلس

فالطیر فیھا ساکن   والوحش فیھا قد انس

ان اشعار نے شہرت حاصل کی، تو ابو الحسن علی بن محمد الایادی التونسی نے ابی تمیم معد المعز لدین اللہ کے اشارے سے اس کا جواب لکھا، مطلع یہ ہے:-

ربع لزینب قد درس   واعتاض من نطق خرس

ابن عبد ربہ نے لکھا:۔

نعق الغراب فقلت اکذب طائر ۔۔۔ ان لم یصدقہ رغاء بعیر

لهن الوجی مباکن عونا علی النوی ۔۔۔ ولا زال منها طالع وحسیر

وما الشوم فی نعق الغراب ونعبه ۔۔۔ وما الشوم الا ناقتہ وبعیر

پیدائش ۲۴۶ھ اور وفات ۳۲۸ھ میں ہوئی۔ قرطبہ میں بنی عباس کے مقبرہ میں دفن ہوا۔ ابن خلدون ابن خلکان، طبری، ابن اثیر، ابوالفداء، الواقدی کی شہرت کسی تذکرہ کی محتاج نہیں۔ مسعودی کا پایہ بلحاظ سیاح کسی سے کم نہیں۔ مروج الذہب جو اسکی کتاب اخبار الزمان کا خلاصہ ہے جو ساٹھ جلدوں میں ختم ہوئی۔ اسکی علمی قابلیت، فضیلت اور تحقیق کا بین ثبوت ہے۔ علم ہیئت۔ تواریخ۔ جغرافیہ۔ ہندسہ وغیرہ وغیرہ پر اسے کامل عبور تھا۔ سواحل جنوبی ہند۔ افریقہ۔ اور تمام بلاد اسلامیہ کی سیاحت کے بعد مسعودی نے اپنے تجربہ اور مشاہدہ کو مروج الذہب میں بالاختصار لکھا۔ اخبار الزمان غالباً زمانہ کے ہاتھوں غارت ہوگیا۔ مروج الذہب میں مسعودی اس کا حوالہ دیتا ہے۔ افسوس یہ مفصل تذکرہ اب کہیں دستیاب نہیں ہوتا۔

گبن کی کتاب جو اس نے رومن امپائر کے تنزل و بربادی کے اسباب پر لکھی ہے، تاریخ میں مسلمہ شہرت اور عزت حاصل کر چکی ہے۔ ہماری رائے ہے کہ جو کچھ اس نے لکھا ہے اس میں تعصب کو دخل نہیں۔ جو کچھ مسلمان مؤرخین کی تحریروں سے رطب و یابس دستیاب ہوا۔ اس پر کسی قدر بلا تحقیق حاشیہ چڑھا کر بعض متعصب عیسائی مؤرخین کی تائید کی جو صرف اسکی عدم واقفیت کی وجہ سے ہمارے کسی مصرف کی نہیں۔

سید علی الحریری کی کتاب الاخبار السنیہ فی الحروب الصلیبیہ، ابن عربشاہ کی کتاب عجائب المقدور فی اخبار تیمور، سٹینلی لین پول کی "سیرسنک ارٹ"۔ آر۔ بتھنوٹ کی ارابک اوتھرز، نکلسن کی لٹریری ہسٹری آف دی عرب، اوکلی کی "ہسٹری آف دی سیرسین"۔ گلمین کی "دی سیرسین"، جرجی زیدان کی تاریخ التمدن الاسلامی، اور علاوہ ازیں انسکلوپیڈیا برٹنیکا، ناسخ التواریخ، روضتہ الصفا، تمدن عرب، ایسی کتابیں ہیں جو دمشق کے حالات پر مزید روشنی ڈالتی ہیں۔

دمشق کے ماخذوں کا تذکرہ بالتفصیل کرکے ہم طول دینا نہیں چاہتے۔ ان کتابوں کے علاوہ جن کا تذکرہ ہم نے کیا ہے ایسی کتابیں اور مضامین بھی ہیں جو گذشتہ سالوں میں ہمارے مطالع میں رہے ہیں۔ ان کا تذکرہ بخوف طوالت ترک کیا گیا ہے۔ کیونکہ ان کی تعداد بیشمار ہے۔" +

دمشق کے تذکرہ میں ضمناً ہم نے مختلف شہروں کے حالات بالاختصار لکھ دیئے ہیں۔ اگرچہ یہہ شہر اسلامی دار الخلافت کا فخر حاصل نہیں کر سکے۔ مگر بہ لحاظ آبادی اور دیگر تواریخی واقعات اسلامی شہر ہیں، ہم امید نہیں کرتے کہ دنیاوی مشاغل اور زندگی کے گنتی کے ایام سے ہمیں اتنی فرصت ملے کہ ان شہروں کے مفصل حالات لکھیں، اس لیئے دمشق کے حاشیہ میں انہیں بھی جگہ دی گئی،

بعض کتابیں جن کا حوالہ دیا گیا ہے ہماری نظر سے نہیں گزریں، دیگر مؤرخین کے ذریعہ ان کی تحریروں کا اقتباس ملا ہے، مثلاً ابن عساکر کی تاریخ دمشق، یاقوت اور علامہ جلال الدین سیوطی اور دیگر مؤرخین نے اپنی کتابوں میں اس کا جابجا حوالہ دیا ہے، افسوس ہے کہ یہ کتاب جو علامہ موصوف نے اسّی جلدوں میں لکھی ہے ابھی تک ابتدائی حالت میں پڑی ہے۔ مسلمانوں کے علمی مذاق کا قیاس اسی سے ہو سکتا ہے کہ یہ قلمی نسخہ جو حافظ ابو القاسم ابن عساکر نے نصف صدی میں لکھا اور چھٹی صدی ہجری کی بہترین یادگاروں سے ہے ابھی تک دمشق کے کتب خانہ میں بیکسی کی حالت میں پڑی ہے، شکر کا مقام ہے کہ یہ بیش قیمت اور نادر تحفہ جو زمانہ سلف میں ایک بزرگ کی اسلامی علمی خدمت کا نمونہ ہے زمانہ کی دستبرد سے بچ رہا ورنہ اسکے ساتھ مشاہیر اسلام کی ایک طویل فہرست بھی ضائع ہو جاتی"۔

اکثر اصحاب کے مطالعہ میں عیسائی یورپی مؤرخین کی تحریریں رہی ہونگی، اور وہ غالباً اس نتیجہ پر پہونچے ہوں گے، کہ ان میں سے اکثر جو کچھ لکھتے ہیں نیک نیتی سے لکھتے ہیں، مگر چونکہ ان لوگوں کو اسلام کے مطالعہ کرنے کا موقع ہمارے اسلامیوں کی طرح نہیں ملا، اس عدم واقفیت کے باعث وہ ایسے اُمور کا تذکرہ بھی کرتے ہیں جو عموماً حاسد بدبیں کا کام ہے، اور بعض اوقات ایسے حملے بھی کرتے ہیں جو تعصب مذہبی کا نتیجہ سمجھا جاتا ہے، ہم انہیں معذور سمجھتے ہیں، اور اس قابل نہیں سمجھتے کہ تردید کی تکلیف گوارا کریں، الحمد للہ کہ ہم عیسائیت سے بخوبی واقف ہیں، جو کچھ ہم نے اس پر لکھا ہے اسکی سند ہمارے پاس موجود ہے۔ اور کسی عیسائی کو اس سے انکار نہیں ہو سکتا،

ہم نے بعض تواریخی واقعات کا تذکرہ کرتے ہوئے ابن اثیر، طبری اور دیگر مؤرخین سے اختلاف رائے کیا ہے۔ اور فلسفہ تاریخ کو مدنظر رکھکر بحث بھی کی ہے، منقولی اور معقولی دلائل کو اگر شرح و بسط کے ساتھ لکھا جاتا تو اصل مدعا فوت ہو جاتا، اس لیئے ہم نے روایتوں کے ضعف ظاہر کرنے پر اکتفا کیا ہے۔ اور اس سے ہمارا مدعا صرف یہی ہے کہ ان روایتوں کو غیر معتبر ثابت کیا جائے، اور واقعات کی اصلیت

کو ظاہر کیا جائے؛ ممکن ہے کہ ہماری رائے غلط ہو اور کسی آیندہ زمانہ میں زیادہ تحقیق یا کسی اور ذریعہ سے ہمیں اپنی غلطی کا اعتراف کرنا پڑے؛ اس امر کے لئے ہم ہر وقت تیار ہیں؛ جیسا کہ ہم نے "دمشق" میں بغداد کی غلطیوں کی صحت کردی ہے؛

الشام

براعظم ایشیا کا وہ غربی گوشہ جہاں دودھ اور شہد موج مارتے ہیں جسکے ساحلوں کی بحیرہ روم پابوسی کرتا ہے اور فی الحقیقت یورپ اور افریقہ کے منہ میں بہ تمنا وصل پانی بھرا ہوا ہے؛ جس کے مشرق میں دریائے فرات بہتا ہے جو صبح آفرینش سے باغ عدن کو سیراب کرتا ہے؛ "شام" کے نام سے مشہور ہے؛ یہ قطعہ زمین جسے قدرت نے پہاڑوں۔ دریاؤں اور سمندروں اور ریگستانوں کی آغوش میں پرورش کیا ہے خلاصہ دنیا ہے؛ اور بہ لحاظ موقع اور پیداوار اور آب و ہوا "ارض موعود" کا فخر تمام کرہ ارض میں اسکے سوا ہے کسے ہو سکتا تھا؟

حاشیہ نمبر ۵ و ۷ - اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ سے وعدہ فرمایا کہ شام کا ملک آنحضرتؐ کی اولاد کو دونگا؛ اور یہی وعدہ حضرت موسیٰ سے بھی کیا گیا؛ اور اسی لئے ملک شام "ارض موعود" کے نام سے موسوم ہے "ارض موعود" کے حدود پیدایش باب ۱۵ - آیت ۱۸ میں دریائے مصر اور دریائے اعظم فرات لکھے ہیں؛ دریائے مصر سے مراد نیل کی شرقی شاخ ہے۔ آیت ۱۹ میں ان اقوام کا نام بتایا ہے جو اس وقت شام میں آباد تھیں؛ اسی باب کی دیگر آیات سے واضح ہوتا ہے کہ اس وقت حضرت ابراہیمؑ کی رہایش "حوران" کے دامن میں تھی جو ارض موعود میں شامل ہے۔ حضرت داؤدؑ کے زمانہ تک بنی اسرائیل اس تمام زمین پر قابض نہیں ہوئے جس کا وعدہ ان کے باپ دادا سے ہو چکا تھا - اگر کبھی ان کا قبضہ ہوا تو چند روزہ تھا؛ ملاحظہ ہو ۲ - سموئیل ۸ - ۳ - ۳ تواریخ ۹ - ۲۶ - توریت کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل اس نعمت عظمیٰ کے قابل اور مستحق نہ تھے؛ احکام الٰہی کو باوجود تہدید او غضب و قہر خداوندی بار بار توڑا - اور جادۂ اعتدال سے ہمیشہ قدم آگے رکھا؛ اور شارع ہدایت سے گمراہ ہو کر علی الاعلان بت پرستی کو رواج دیا؛ "قرآن شریف" میں بنی اسرائیل کی کفران نعمت کا مفصل تذکرہ ہے؛ اس لئے خدا کا غضب اُن پر بھڑکا اور جیسا کہ قانون قدرت ہے اللہ تعالیٰ نے اور قومیں ان پر غالب کردیں حتیٰ کہ حضرت عیسیٰؑ کے زمانہ میں بنی اسرائیل رومیوں کے محکوم تھے؛ اگرچہ "روح اللہ" نے بہت

بالتحقیق معلوم نہیں کہ لفظ "شام" کی وجہ تسمیہ کیا ہے۔ مختلف وجوہ جو مورخین نے لکھے ہیں اگر صحیح نہیں تو دلچسپ اور معنی خیز ضرور ہیں۔

کوشش کی کسی طرح بنی اسرائیل کو "مرغی کی طرح اپنے پروں کے نیچے لے لیں"۔ لیکن "یروشلم جو نبیوں کو قتل کرتا تھا"۔ اور جس پر خدا کا غضب نازل ہو رہا تھا اس قابل ہی نہ رہا تھا کہ آپ کی تعلیم سے متاثر ہوتا۔ بلکہ کفر اور شرک اور بدعت کی طغیانی اس قدر زور پر تھی کہ حضرت مسیح کے قتل کے منصوبے باندھنے لگے۔ آخر اللہ تعالیٰ کا وعدہ پورا ہوا اور اللہ تعالیٰ کا وعدہ سچا تھا۔ حضرت ابراہیم کی اولاد نے "ارض موعود" کو فتح کیا۔ اور آج تک اہل اسلام اسپر قابض ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے خلافت کی خوشخبری پیش از وقت اور ایک عرصہ پہلے بذریعہ مخبر صادق مسلمانوں کو دی تھی جو اس وعدہ کے ہم معنی ہے۔ "وعد اللہ الذین آمنوا منکم وعملوا الصٰلحٰت لیستخلفنہم الخ"۔ یہ امر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اسلام ایک ایسا مذہب ہے جو اللہ تعالیٰ نے پسند فرمایا۔ اور جسکی نسبت ارشاد فرمایا کہ یہ ملت ابراہیم ہے۔ اور اسی مذہب کی تعلیم آپ کی اولاد حضرت اسمٰعیل و اسحاق و یعقوب و دیگر انبیا کرتے رہے۔ اسلئے "ارض موعود" کے مستحق اہل اسلام ہی تھے۔ جو آجتک سنت ابراہیمی یعنی اُس نشان کو قائم رکھتے ہیں جو "ختنہ" کے نام سے موسوم ہے۔ اور جو اللہ تعالیٰ نے اپنے وعدہ کی حقانیت ظاہر کرنیکے لئے حضرت ابراہیم کے ساتھ باندھا اور حکم فرمایا کہ جو شخص اسے توڑے گا قوم سے کٹ جائے گا۔ اگرچہ بظاہر لور الصاقاً ارض موعود کا استحقاق اہل اسلام کی ذات کے ساتھ وابستہ ہے اور "اولاد" کے معنوں کو اولاد صلبی تک محدود رکھنا اللہ تعالیٰ کی رحمت کو تنگدلی سے منسوب کرنا ہے۔ توریت کے لفظوں سے بھی یہی مفہوم ہوتا ہے کہ اولاد کے معنی اللہ تعالیٰ کی رحمت کی طرح وسیع ہیں کسی خاص قوم یا شخص تک محدود نہیں۔ بلکہ جس طرح "نشان الٰہی" کو توڑنے والا افراد قوم میں شمار نہیں ہو سکتا تھا۔ اسی طرح جو شخص اس نشان کو قائم رکھے اور ملت ابراہیم کا پیرو ہو مستحق ہے کہ اُس قوم میں داخل سمجھا جائے جسپر اللہ تعالیٰ کی رحمت اور برکت کا نزول ہوتا ہے۔ حضرت ابراہیم نے نہ صرف اپنی اولاد کا ختنہ کیا بلکہ اپنے غلاموں اور نوکروں کا بھی ختنہ کیا۔ اور اس طرح انہیں بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت کے سایہ میں لے لیا۔ توریت کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل نے دیگر اقوام سے اپنے آپ کو صرف ختنہ کی وجہ سے غیر سمجھا ہوا تھا۔ "شہزادہ شہیم" اور "دینا" دختر یعقوب کے قصہ میں اس خیال کی بخوبی توضیح ہوتی ہے۔ ہماری رائے میں اگر "اولاد" کا لفظ صرف بنی اسرائیل یا اسمٰعیل پر عاید ہوتا ہے تو یہ اسلام کے مضمون کے برخلاف ہے۔ اسلام نے ذاتوں کا امتیاز ان معنوں میں جائز نہیں رکھا۔ اس لئے "ارض موعود" کے وارث اہل اسلام ہی ہیں۔ اور

بقول بعض محققین اس کا پرانا نام "سوریہ" ہے۔ اگر یہ صحیح ہو تو یہ لفظ "اسوریہ" کا مخفف ہوگا؛
ان معنوں میں "سوریہ" سے وہ قطعہ زمین مراد ہے جو سلطنت "اسوریہ" کے حدود میں تھی یا پادشاہان
"اسور" کے ماتحت تھی۔ اور ممکن ہے کہ "صور" سوریہ کا مشتق ہو، صور شام کا ایک شہر ہے؛
اور شاید سب سے پرانا نام "شام" ہی ہو جو حضرت نوحؑ کے ایک بیٹے کا تھا۔ +

چونکہ یہ وعدہ ابدی ہے۔ اس لئے ملک شام قیامت تک ان کے قبضہ میں رہے گا۔ اس سے بڑھ کر اسکی صداقت
کی شہادت اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ مقامات جو یہود و نصارٰی کے مسلمہ مقدس ہیں اہل اسلام کے قبضہ میں ہیں اور
اہل اسلام کا کوئی ایسا مقام غیر مذاہب کے قبضہ میں نہیں اور نہ ہو سکتا ہے۔" +

حاشیہ نمبر ۶ - پیدائش باب ۲ میں باغ عدن اور حضرت آدمؑ کی رہائش کا تذکرہ لکھا ہے۔ اس باغ کی وسعت
ایک ملک کے برابر معلوم ہوتی ہے۔ اسے چار دریا سیراب کرتے تھے۔ اور چوتھا دریا فرات تھا۔" +

حاشیہ نمبر ۸ - "اسیریا" یا "اسوریہ" وہ عظیم الشان سلطنت ہے جس کا پایہ تخت شہر "نینوا" تھا۔ اور جس کی
وسعت اور دولت و ثروت کی نسبت ایسی روائتیں مشہور ہیں جو بظاہر ناقابل قیاس ہیں۔ لیکن جو کچھ موجودہ زمانہ
میں قدیم تواریخی آثار شہر "موصل" کے قریب پائے گئے ہیں اون سے ان روایتوں کی تصدیق ہوتی ہے کہ شہر
نینوا شان میں اس درجہ بڑھا ہوا تھا کہ تواریخی زمانہ میں اس کا نظیر روئے زمین پر نہیں ملتا۔ مؤرخین نے بہت کچھ
تحقیق اس سلطنت اور دارالسلطنت کی نسبت کی ہے اور ضخیم کتابیں ان کے حالات پر لکھی ہیں نتیجہ یہ ہے
کہ یہ لوگ نہایت سرکش اور گمراہ تھے۔ اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک اور کفر کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انکی بستیوں
کو صفحۂ ہستی سے اس طرح محو کر دیا کہ آج کوئی شخص تیقن کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ "نینوا" کہاں آباد تھا۔ اور وہ بدکار
اور گمراہ لوگ کیا ہوئے۔ شاہان اسوریہ جن کا تذکرہ کتاب مقدس یعنی بائیبل میں بھی ہے اور جن کے لشکر شام
کو ہر ایک عرصہ تک پامال کرتے رہتے۔ جو بنی اسرائیل کو بحالت غلامی اسیر کر کے لے گئے۔ اور ان کے
شہروں کو خاک میں ملا دیا۔ اگرچہ ایک وقت تکبر اور نخوت سے اُن کے سر اونچے تھے مگر بالآخر ربّ الافواج
نے ان کو نیست و نابود کر دیا۔ اور ان کی جگہ اور قوموں کو کھڑا کر دیا۔ چوں کہ اس سلطنت کا تعلق "دمشق"
سے بھی ہے اس لئے اس کا تذکرہ بالاختصار کیا گیا۔" +

اس میں کچھ شک نہیں کہ یہ زمین انتہا درجہ کی "سرسبز و شاداب" ہے اور ممکن ہے کہ ان معنوں میں "شام" سُریانی زبان کا لفظ ہو۔ اگر یونانی لفظ ہے تو اس کا مشتق "صور" ہے جس سے یونانی سب سے پہلے آشنا ہوئے۔ اور بعد ازاں تمام ملک کو سوریہ کہنے لگے"

اور یہ بھی قرین قیاس ہے کہ یہ لفظ عربی ہو اور اہل عرب "الشام" اور "الیمن" سے صرف سمتوں میں تمیز کرتے تھے۔ یعنی یمن سے وہ زمین مراد ہے جو "حجاز" کے جانب "راست" اور "الشام" وہ ملک جو طرف "چپ" واقع ہے؛

شام قدیم الایام سے مختلف اقوام عالم کا جولانگاہ اور شارع تجارت رہا ہے۔ اور مشرق اور مغرب میں رابطہ اتحاد اور اشاعت تہذیب و تمدن کا وسیلہ تھا۔ اور یہی وجہ ہے کہ اہل شام میں ایک خالص قوم کے اجزا کبھی نہیں پائے گئے لیکن اس میں کچھ شک نہیں کہ اس ملک کی تواریخ میں ایسے عظیم الشان واقعات کا تذکرہ ہے جس کا کسی دوسرے ملک کی تواریخ میں نظیر نہیں ملتا۔ یہ ملک ایسے موزون موقع پر واقع ہے اور قدرت نے اسکی آب و ہوا کو وہ خوبیاں عطا کی ہیں کہ ہر ایک زمانہ میں آبادی کا محرک رہا ہے۔ اس کے سرسبز پہاڑ جن پر انگور کی بیلیں پیچ و خم کھاتی ہوئی چڑھتی ہیں۔ شمال سے جنوب کی طرف ایک دوسرے کے متوازی چلے گئے ہیں۔ ان کی بلندی سمندر اور دریا کی طرف بتدریج کم ہوتی جاتی ہے۔ سرسبز وادیاں اور دلکشا میدان جو دریاؤں اور ندی نالوں سے ہمیشہ سیراب ہوتے ہیں۔ کثرت سے ہیں۔ کوہ لبنان جہاں سے مختلف اقسام کی لکڑی "بیت المقدس" کی تعمیر کے لئے حضرت سلیمان نے بہم پہنچائی وہ پہاڑی سلسلے ہیں جو شام کے انتہائے شمال میں واقع ہیں۔ اس کی چوٹیاں برف سے ہمیشہ مستور رہتی ہیں۔ لیکن اکثر جگہ ہموار ہیں۔ ان پہاڑیوں سے قدرتی چشمے اور ندی نالے بہتے ہیں جن کا خوشگوار پانی اُن میدانوں کو سیراب کرتا ہے جو "لبنان" کے دامن پر پھیلے ہوئے ہیں۔ کوہ "زیتون" جو اس امر کی شہادت ہے کہ انسان "احسن تقویم" میں پیدا ہوا یروسلم کے مشرق میں واقع ہے۔ دریا "العاصی" لبنان سے نکل کر شمال کی طرف بہتا ہوا انطاکیہ کے قریب بعد ایک معاون مغرب کی جانب رخ کرتا ہے اور سمندر میں گرتا ہے۔ توریت اور انجیل کا مقدس دریا "یردن" جس میں غوطے لگانے سے افواج شام کے سپہ سالار نعمان کی جسمانی مرض جذام کا ازالہ حضرت الیشع کے وقت ہوا اور روحانی امراض کا علاج حضرت یحییٰ نے اس کے پانیوں سے کیا شمال سے آتا ہوا جھیل "جلیل" سے گذر کر بحیرہ "مردار" میں گرتا ہے؛

جھیل جلیل یا بحر "تبریہ" کے کنارے "روح اللہ" کے قدموں نے مقدس بنا دیئے۔ اس جگہ حضرت عیسٰی نے شمعون پطرس اور اس کے بھائی کو جھیل میں جال ڈال کر مچھلیاں پکڑتے ہوئے دیکھا۔ آپ کی تعلیم کا یہ اثر ہوا کہ یہ "جلیل" کے مچھوے جلیل القدر حواری بن گئے۔ یہ جھیل جس کا تذکرہ اناجیل اربعہ میں مختلف مقامات پر کیا گیا ہے اس وجہ سے متبرک مقام ہے کہ مسیح کی روحانی تعلیم کا آغاز اسی جگہ سے ہوا۔

بحیرہ "لوط" یا بحیرہ "مردار" جسکے پانیوں میں کوئی مچھلی زندہ نہیں رہ سکتی اور کوئی پیراک ڈوب نہیں سکتا۔ "سدوم" اور "غموره" کی تباہی کا آثار ہے جو موجودہ زمانہ میں اس درد انگیز اور عبرت خیز داستان کو زبانِ حال سے بیان کر رہا ہے کہ بدکرداروں کا انجام جو قانون قدرت کو توڑتے ہیں۔ جو حد اعتدال سے قدم آگے رکھتے ہیں ایسا ہوتا ہے۔

شام عجائبات کا گھر ہے۔ عبرت کی جگہ ہے۔ ادب کا مقام ہے۔ اولی الابصار اسکے قدرتی منظروں اور برباد شدہ شہروں کے آثاروں سے وہ سبق حاصل کر سکتے ہیں جو تواریخ عالم کے مطالعے سے نہ ہو گا۔ شام قدیم الایام سے قوموں کی ترقی اور تنزل کا مقام رہا ہے۔ اور اگر حضرت آدم علیہ السلام کی جائے پیدائش نہیں تو اسمیں کچھ شک نہیں کہ ابتدائی عظیم الشان سلطنتوں کی حدود اور پایہ تخت اسی ملک میں تھا۔ مصر اور عراق کچھ شک نہیں کہ ایسے ملک ہیں جو ہر ایک حیثیت سے ممالک دنیا سے ممتاز ہیں۔ لیکن یہ ملک جو مصر اور عراق کے درمیان واقع ہے دونوں ملکوں کے درمیان قدرتی رابطہ ہے اور اس لئے ہر دو ممالک کی تہذیب و تمدن کی تکمیل اسی ملک کے حدود میں ہو سکتی تھی اور ہوئی۔

حسان العجم حکیم خاقانی شروانی "تحفۃ العراقین" میں آفتاب کو مخاطب کرتے ہوئے "شام" کا عراق اور "مصر" سے مقابلہ کرتا ہے کہ:۔

اے در حرکات وصل و ہجران	گہ بابل جوئی و گہ خراسان
اے زآب و ہوا خاک بابل	تپ لرزہ و صرع کردہ حاصل
صحت گہ تو قصور شام است	جاندار دئے تو قبور شام است
آخر چہ فنبزو وجزو بالت	زین گردش صد ہزار سالت
برکن زرد و میغ و ہفت پردہ	این قطب و سپہر سال خوردہ

اینک خطِ موصل و حدِ شام
قطب ہُدیٰ و سپہر اسلام

قطبے کہ ترا زوال ندہد
چرخے کہ ترا وبال ندہد

آن چرخ محیط بر دو گیتی ست
وان قطب توام ہر دو گیتی است

چند از فلک و نہاد خامش
وین بو قلموں صبح و شامش

بے آنکہ سپاس ہیچ خام است
در کشور شام صبح و شام است

دو جہان بسہ حرف شام برخاست
بل ہر دو ازان سہ حرف برخاست

خاصہ "الفے" ست درمیان جائے
"سین" بر سر شہاست و میم بہ پائے

ہمچون سہ رنگ بستہ زیور
خلخال بپائے و تاج بر سر

شام از الفے کہ درمیان داشت
بر چرخ عمود صبح بفراشت

خود صبح دوم کہ نور عام است
دندانہ تاج سین شام است

فرزند سعادتی زمین اوست
بل مادر احتشام دین اوست

زین قرہ عین بحر دین را
فخر است مشیمۂ زمین را

بہ زو خلفے نزاد ما ناک
از پشت فلک مشیمۂ خاک

جسمے ست زمین بہفت اندام
ناف‌ش عربست و پشت او شام

شام از پے رہرواں چنانست
چون چرخ ز راہ کہکشانست

در خدمت شاہ شام پیوست
چرخ از رہ کہکشان کمر بست

چہ چرخ و چہ راہ کہکشانش
چہ خوشہ و دانہ درمیانش

آن خوشہ و دانہ ہست بادام
دانے و گہے ز خرمن شام

ملک الشعرا خاقانی عراق اور دیگر ممالک دنیا سے مقابلہ اور لفظ "شام" کے حروف کی بندش اور اس کے معانی اور زمین شام کی تعریف کے بعد "مصر" سے مقابلہ کرتا ہے:-

"مصر" ارچہ لطیف جایگاہ است
از دانہ کشت شام گاہ است

گاہے کہ چو دانہ جنانست
نہ قوت جسم دام جانست

گاہے کہ چو خوشہ داس دارد
داسے کہ خلندہ تر ز خار است

آن واس بچشم دین درفت د — خونانه زچشم دین بردن داد
خورشید بجنگ مصریان است — چون خوشه سنان کشیده رانست
مصریکه شکسته اند نامش — حرفے شمر از شمار شامش
کان حرف که انتہائی شام است — خود اول مصر ازو تمام است
از دفتر شام در اقالیم — مصر ست سقط چو حرف ترخیم
شام از دو جہان مثال دارد — با مصر چہ اتصال دارد
خالِ رخ مصر گشت پنہان — در نقطۂ خال خائے خذلان
زین خالِ سیہ کہ چہرہ بگرفت — گر شرع زبان کشید نشگفت
بر مصر نقطہ نہی مضر است — زیر نقطہ ہزار سر است
شام است سفرگہِ ملائک — بیعت گہِ صادقانِ سالک
ہم مکتبِ علمِ انبیا اوست — ہم مشربِ جانِ اصفیا اوست

مسیح کی پیدائش سے غالباً پندرہ سو برس پیشتر ملک شام میں مصری اور عراقی آبادی اور تہذیب و تمدن کا اختلاط شروع ہوا۔ توریت کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ شام قدیم الایام سے ہر دو ممالک میں شارع تجارت تھا۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اسکا اثر ابتدا میں مصر اور بابل اور نینوا پر پڑا ہو۔ لیکن اس میں کچھ شک نہیں کہ شام کی ہمسایہ زبردست طاقتوں کا اثر شام کی صنعت و حرفت اور تجارت وغیرہ پر ضرور ہوا غیر ممالک میں قدیمی شامی اشیا اب بھی پائی جاتی ہیں۔ غالباً یہ یا تو بذریعہ تجارت یا مال غنیمت میں سوداگروں یا فاتحان دنیا نے اون ملکوں میں پہونچائی ہیں۔ شام میں کپڑے کے عام کارخانے تھے اور شیشہ کی صنعت میں تو اہل شام کو ید طولیٰ حاصل تھا۔ تواریخ شاہد ہے کہ تجارتی قافلے شام سے مصر اور عراق میں اور ان ممالک سے دور دور شہروں میں جاتے۔ لیکن شام کا اثر اور احسان دنیا پر مذہبی حیثیت سے بہ نسبت دیگر امور بہت بڑھا ہوا ہے۔ شام نے دنیا کو مذہب کی تعلیم دی۔ اگرچہ اس کے کھنڈرات میں بت پرستی کے آثار اب بھی پائے جاتے ہیں، مگر محققین کی صائب رائے یہی ہے یہ اثر مصر کی توہم پرستی کا ہے۔ توحید کا آغاز شام سے ہوا اور اسکی اشاعت کا باعث ابوالانبیا حضرت ابراہیم خلیل اللہ ہوا۔ اگرچہ اس کی پیدائش کا فخر عراق اور شام کی حدود کو یکساں ہے۔ لیکن وہ زمین

جہاں آنحضرت نے مستقل رہائش اختیار کی اور جہاں اُن کی اولاد آسمان کے ستاروں کی طرح بڑھی اور برومند ہوئی۔ وہ شام ہے؛ یہی زمین ہے جو بالاستقلال و تا ابد آنحضرت کی نسل اور پیروان مذہب کے قبضہ میں رہی اور رہے گی۔ یہ اللہ تعالٰی کا وعدہ سچا ہے کہ جبتک اس عہد کا نشان ختنہ قوم میں قائم ہے ارض موعود کے وہی وارث ہیں اور جس شخص نے اس نشان کو توڑا قوم سے علیحدہ کیا جاویگا۔ اور خسر الدنیا والآخرہ کچھ شک نہیں کہ وہ زمانہ بہت نزدیک ہے جب اسلام یعنی ملت ابراہیم تمام دنیا کا مذہب ہوگا۔ اسکے ابتدائی آثار اب بھی پائے جاتے ہیں۔ مہذب ممالک دنیا کا رجوع توحید کی طرف ہو رہا ہے اور علی العموم کفر و شرک کی مضرتوں سے واقف ہو گئے ہیں۔ موجودہ زمانہ میں بھی دنیا کے اکثر حصہ کا مذہب اون پیغمبروں کی ملت ہے جن کی پیدائش یا وفات شام میں واقع ہوئی۔ اس میں ذرا بھی مبالغہ نہیں کہ شام نے تمام ممالک دنیا کے مذہب پر بہت بڑا اثر کیا ہے۔ ملک الشعراء خاقانی نے بالکل سچ لکھا ہے کہ:۔

شام است سفرگہ ملایک — بیعت گہ صادقان سالک

ہم مکتب علم انبیا اوست — ہم مشرب جان اصفیا اوست

المختصر شام وہ ملک ہے جو اکثر انبیا و رسل اور بزرگان یہود و نصاریٰ اور اسلام کی جائے ولادت اور وفات ہے۔ اس کا تذکرہ تواریخ کے صفحات اور مقدس کتب اور سیاحوں کے سفر ناموں اور شعراء کے اشعار میں کیا گیا ہے۔ اسکی آب و ہوا اور اسکی زمین کی زرخیزی۔ اور اسکی تہذیب و تمدن و معاشرت۔ مصری۔ عراقی اور یونانی اور رومی حکومت کا اثر اور شان و شوکت اور اسکے مشہور شہروں کے حالات اگر بالاختصار بھی بیان کئے جائیں تو ایک دفتر بن جائے۔ "دمشق" جسکے تاریخی حالات اور وہ بھی خلافت اموی کا تذکرہ ہم بیان کرنا چاہتے ہیں شام کا ایک شہر ہے۔

"دمشق الشام"

دمشق کی قدیم تواریخ کے ماخذ کتب مقدس توریت و زبور و انجیل ہیں۔ فی الحقیقت دمشق کے ابتدائی حالات تاریکی میں ہیں۔ کتب مقدس اور دیگر روایتیں جو مؤرخین نے نقل کی ہیں دمشق کی وجہ تسمیہ اور باقی شہر کے حالات پر کچھ روشنی نہیں ڈالتی۔ ہماری رائے میں جس قدر روایتیں وجہ تسمیہ کے ضمن

میں بیان کی جاتی ہیں، غلط ہیں، اور اس لئے اس شہر کے بانی کے حالات بھی کسی کو معلوم نہیں۔

ایک روایت یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ خلیل اللہ کے غلام "الیعاذر" نے اس شہر کو آباد کیا تھا۔ یہ روایت صریحاً غلط ہے۔ پیدائش باب ۱۵ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے، کہ حضرت ابراہیمؑ کی کوئی اولاد نہ تھی اور آپ مغموم تھے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا مانگتے تھے۔ اور آپ کو تسلی دی گئی تھی۔ حضرت ابراہیمؑ نے درگاہ رب العالمین میں عرض کی "اے خدا! میں دنیا سے لاولد جاتا ہوں، میرے بعد میرا کوئی وارث جو میری نسل سے ہو نہیں ہے، میرا خانہ زاد "الیعاذر" دمشقی جو میرے گھر کا مختار ہے میرا وارث ہوگا"۔ قرین عقل نہیں کہ ایک نوکر یا غلام نے جو دمشقی کہلاتا تھا دمشق کو آباد کیا ہو۔ دیگر آیات سے واضح ہوتا ہے کہ "الیعاذر" کی زاد بوم دمشق تھی، اور حضرت ابراہیمؑ کے وقت میں دمشق ایک مشہور شہر تھا۔

ایک اور روایت اس طرح ہے کہ سکندر اعظم کے غلام یا جرنیل نے جس کا نام دمشق تھا۔ اس شہر کو آباد کیا۔ یہ بھی غلط ہے، سکندر کے زمانہ میں دمشق آباد اور مشہور شہر تھا۔ اس اولوالعزم فاتح دنیا کی مفتوحہ ممالک کی فہرست میں دمشق کا نام بھی ہے، خود سکندر یا اسکا غلام اسکا بانی کس طرح ہو سکتا ہے، جو مسیحؑ سے قریباً ساڑھے چار سو برس پیشتر دنیا میں گذرا ہے۔ حالانکہ دمشق حضرت ابراہیمؑ کے وقت بھی موجود تھا۔

بعض اقوال کے مطابق اسکا بانی دمشق بن نمرود حضرت ابراہیمؑ کا ہمعصر تھا، اور بعض مؤرخین کہتے ہیں کہ "دمشاق" بن کنعان نے آباد کیا، اور بعض کا اتفاق اس امر پر ہے کہ جیرون بن عاد بن ارم نے بسایا۔ مؤخر الذکر دو اقوال میں سے اگر ایک صحیح ہو تو تعجب نہیں، بہر حال ان روایتوں اور مختلف حکایتوں سے اتنا پتہ ملتا ہے کہ دمشق قدیم الایام سے آباد اور سرسبز شہر مشہور رہا ہے۔ اور چونکہ قدیم زمانہ کے صحیح صحیح حالات تاریکی میں ہیں، اس لئے معلوم نہیں کہ کس شخص نے اسے بسایا۔

دمشق شام کے شہروں میں سب سے مشہور ہے۔ اور قدرت نے اس کے لئے جس جگہ کو انتخاب کیا ہے وہ انسانی آبادی اور تمدن کو ہر ایک زمانہ میں ترقی دیتی رہی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابتدائی تمدن کی بنیاد غالباً شام میں دمشق سے شروع ہوئی ہے، اور دمشق شام کے ابتدائی شہروں میں سے ہے اس لئے کچھ تعجب نہیں کہ حضرت نوحؑ کی اولاد میں سے کوئی اس کا بانی ہو۔ ارم بن سام بن نوحؑ کی اولاد "آرامی" کہلاتی ہے۔ اس لئے وہ ممالک جو ارم کی اولاد نے آباد کئے "ارم" کی یادگار ہیں، مثلاً "ارم نہریم" وہ قطعہ زمین یا وہ ملک جو دو نہروں کے درمیان ہے جسے ہم دوآبہ کہتے ہیں، "ارم نہریم" عراق کا قدیم نام ہے۔

(پیدائش باب ۱۰ آیت ۱۱) اور اسی طرح "ارم دمشق" توریت کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ "ارامیوں" نے اس سرزمین کو آباد کیا تھا جو کوہ طورس کی جنوب سے شروع ہو کر دمشق اور بحیرہ روم تک مشرقی جانب دریاء دجلہ کے پار عصاریہ تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس میں مختلف قطعات مختلف ناموں سے مشہور ہیں، جو نہایت سرسبز اور شاداب ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دمشق اگر کسی شخص کا نام تھا تو وہ "ارم بن سام" کی اولاد میں سے تھا اس لئے اقرین قیاس یہی ہے کہ دمشق کی بنیاد ارم کی اولاد نے رکھی، اور غالباً اس کے بانی کا نام "دمشق" ہے جو ارم کی نسل سے تھا۔

دنیا میں کوئی شہر دمشق کی قدامت کا ہمسر نہیں ہو سکتا۔ اور کسی شہر کی تواریخ ایسے عظیم الشان واقعات کو نظیراً پیش نہیں کر سکتی جیسا کہ دمشق کر سکتا ہے، معلوم نہیں کتنی دفعہ یہ شہر دار السلطنت رہا اور کس قدر وسیع علاقوں پر حکومت کرتا رہا۔ کیونکہ اسکی بنیاد اور عروج تواریخی زمانہ سے بھی کئی سو برس پیشتر ہوا، چودہ سو پچاس برس ۱۴۵۰ تک تو اسپر آرامیوں کا دور دورہ تھا۔ معلوم نہیں کہ اس سے پیشتر اسکی کیا کیفیت تھی، بابل اور فارس کا قبضہ چار سو سترہ برس ۴۱۷ تک رہا، دو سو اڑتالیس برس تک یونانی قابض رہے۔ سات سو برس تک رومی شہنشاہت کا ایک صوبہ تھا، سو سال تک بنو امیہ اور پانچسو برس تک عباسیہ کا دور دورہ رہا۔ اس تغیر و تبدل کے ساتھ کئی ایک دفعہ اسپر ارضی و سماوی بلائیں نازل ہوتی رہیں، بہت دفعہ دمشق تباہ ہوا مگر اب بھی موجود ہے جیسا کہ شروع میں تھا، ابتدائی حالات تو تاریکی میں تھے۔ لیکن اگر پُرانے عہدنامہ کے گیارہ باب جو پیدائش کے متعلق ہیں، چھوڑ دیئے جائیں تو دنیا میں کوئی ایسا واقعہ نہیں ہوا جسکی خبر دمشق کو نہ ہو، دمشق ہر ایک زمانہ میں سرسبز و آباد شہر موجود تھا۔ اور اب بھی ویسا ہی ہے، ہر ایک مؤرخ جو عالیشان سلطنتوں کی تاریخ لکھتا ہے دمشق کا ضرور تذکرہ کرتا ہے۔ دنوں، مہینوں اور سالوں کا کیا ذکر ہے، دمشق کی قدامت کا شمار سلطنتوں کی عمر اور مختلف زمانوں کی ابتدا اور انتہائ کے ساتھ کرنا چاہئے۔ سلطنتیں جو اس کے سامنے عروج و نزول کے تمام مراتب طے کر چکیں، اور زمانے جو قدیم الایام سے اس پر گذر رہے ہیں، بعلبک تھیبز، آتھنس، بابل، نینوا، تدمر، یروسلم، روم کی بنیادیں اس کے سامنے رکھی گئیں، ان کی شان و شوکت اور تباہی اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھی، یہ تمام عظیم الشان سلطنتیں اس کے مقابلہ میں کل کے بچے ہیں۔ اس نے ان مواضعات کو شہر اور شہر سے دار السلطنت بنتے دیکھا اور آخر چغد و بوم کا آشیانہ انہیں مقامات میں پایا، اسرائیلیوں کو شام میں داخل ہوتے اور فتحمند قوم کی طرح ملکوں کو مسخر کرتے ہوئے

دیکھا، اور دیکھتے دیکھتے اسرائیلی تباہ ہو گئے۔ اہل بابل نینوا اور فارس نے لشکر کشی کی، اور یکے بعد دیگرے برباد ہوتے گئے، یونانی اور رومیوں نے عظیم الشان شہنشاہتیں قائم کیں جو رفتہ رفتہ معدوم ہو گئیں مگر دمشق اسی طرح موجود ہے، اور خدا جانے اسکی عمر تک کتنی سلطنتیں باقی ہیں، المختصر دنیا میں ایک یہی شہر ہے جو ابتدا سے آج تک تمام واقعات کا شاہد ہے۔

قدیم زمانہ میں دمشق آرامی سلطنت کی ایک شاخ کا پایہ تخت تھا، اور ابتدا سے شام میں سب سے بڑا شہر تھا، کوہ لبنان کے دامن میں واقع ہے اور پہاڑوں نے اُسے ہر طرف سے گھیرا ہوا ہے۔ دمشق ایک محفوظ مقام پر سر سبز اور زرخیز میدان میں آباد ہے۔ ایک دریا جسے قدیم زمانہ میں "نہر الذہب" کہتے تھے دو شاخوں میں دمشق کو سیراب کرتا ہے، ان کا نام "آبانہ" اور "فرفر" ہے، جو توریت میں دو دمشقی نہروں کے نام سے مشہور ہیں، اس دریا سے کئی ایک چھوٹی بڑی نہریں کاٹ کر شہر کے مختلف حصوں میں پانی جاتا تھا۔ اس کا سرچشمہ کوہ لبنان تھا، حضرت ابراہیمؑ کے زمانہ سے داؤدؑ کے عہد تک توریت میں دمشق کا کچھ ذکر نہیں، حضرت داؤدؑ نے اسے سخر کیا اور اس جگہ بنی اسرائیل کی ایک چھاونی قائم کی (۲ تواریخ باب ۱۸) حضرت سلیمانؑ کے عہد میں دمشق اسرائیلی مفتوحہ ممالک میں شمار ہوتا تھا، لیکن آپ کے آخری ایام سلطنت میں بغاوتوں اور شورشوں نے اسرائیلی بادشاہت کے اجزا کو پریشان کر دیا۔ دمشق کو پھر گذشتہ اقتدار حاصل کرنے کا موقع مل گیا، اور ایک شخص "رزون" نامی نے دمشق میں بغاوت کی اور بآسانی اسرائیلی حکومت سے آزادی حاصل کر لی، "رزون" دمشق کا پہلا خود مختار بادشاہ ہوا، دراصل "رزون" ابتداً ادومی بادشاہ کے ہاں ملازم تھا، جب داؤدؑ نے ادوم پر حملہ کیا تو "رزون" اسرائیلیوں کے ساتھ آملا، اس وقت ادومی بادشاہ کا لڑکا "ہددعزر" کچھ جانثاروں کو ساتھ لے کر مصر کی طرف بھاگ گیا، مصر والوں نے اسکی تعلیم اور تربیت میں دریغ نہ کیا جب داؤدؑ وفات پا گئے تو "ہددعزر" نے اسرائیلی سلطنت کی بدنظمی سے فائدہ اٹھایا اور مصری فوج کے ساتھ اپنے آبائی ممالک پر قابض ہو گیا، "رزون" کو داؤدؑ نے دمشق میں ایک دستہ فوج کا سردار مقرر کر دیا تھا، اس پرآشوب زمانہ میں وہ بھی خاموش نہ رہا اور اِدھر اُدھر سے فوج فراہم کر کے دمشق کا خود مختار بادشاہ بن بیٹھا، (۱ سلاطین باب ۱۱- آیت ۲۳) حضرت سلیمانؑ کی وفات پر کئی ایک دعویدار سلطنت کھڑے ہو گئے، اور سلطنت میں بدامنی اور بدنظمی کو رواج دیتے رہے، آخر یہ عالیشان سلطنت دو حصوں میں تقسیم ہو گئی، جو یہوداہ اور اسرائیل کے نام سے مشہور ہے۔ سلطنت یہوداہ کا پایہ تخت یروسلم

اور اسرائیل کا دارالسلطنت سامریہ قرار پایا"۔ دونوں حریف سلطنتیں ایک دوسرے کے مقابل کئی ایک دفعہ معرکہ آرا ہوئیں۔ اور ان لڑائیوں میں دمشق نے بہت کچھ حصہ لیا۔ اور اس طرح اپنی طاقت کو روز افزوں ترقی دیتا رہا۔ آخر شاہ اسرائیل یربعام نے اسے سخر کر لیا۔ (۲ سلاطین باب ۱۴ آیت ۲۵)۔ لیکن یربعام کی وفات پر دمشق پھر آزاد ہو گیا"۔

اس وقت شام میں یہوداہ اسرائیل کی خانہ جنگیوں سے بنی اسرائیل روبہ زوال تھے۔ اور ہمسایہ قوموں اور طاقتوں کو عروج ہو رہا تھا۔ دمشق میں اس وقت "رضین" حکمران تھا۔ اور شاہ ارام کہلاتا تھا۔ اور شاہ یہوداہ آخز بن یوتام تھا۔ اور شاہ اسرائیل فقح بن رملیاہ تھا۔ فقح اور رضین نے آخز کے برخلاف سازش کی۔ اور متفقہ طاقت کے ساتھ یروشلم پایہ تخت یہوداہ پر فوج کشی کی۔ شاہ یہوداہ پے در پے شکستوں کے بعد سخت گھبرا گیا۔ دشمن نے ہر طرف سے قتل و غارت کا بازار گرم کیا ہوا تھا۔ رضین نے ایلت کو مجبور و قہر سخر کر کے ارامی حدود میں شامل کر دیا۔ اس وقت اگرچہ یسعیاہ نبی نے شاہ یہوداہ کو بہت کچھ تسلی دی مگر بادشاہ کو مخلصی کی کوئی راہ نظر نہ آئی۔ آخر اسور کے بادشاہ "تلغات پلاسر" سے امداد طلب کی۔ اور کہلا بھیجا کہ میں تیرا خادم اور تیرا بیٹا ہوں۔ شاہ ارم اور شاہ اسرائیل کے ہاتھ سے جو مجھ پر چڑھ آئے ہیں رہائی دے" (۲ سلاطین باب ۱۶) اور شاہ اسور کی خدمت میں سونا چاندی جو عبادت گاہوں اور شاہی خزانہ میں جمع تھا بطور نذر بھیجا۔ تلغات پلاسر شاہ یہوداہ کی امداد کو اٹھا اور دمشق کا محاصرہ ڈالا۔ رضین مقابلہ میں مارا گیا اور دمشق فتح ہو گیا۔ تلغات پلاسر نے لوگوں کو اسیر کر کے قیر کی طرف بھیج دیا اور اس جگہ یعنی دمشق میں ایک دربار منعقد کیا۔ شاہ یہوداہ بھی دمشق میں حاضر ہوا۔ اور اطاعت کا اظہار کیا۔ اس وقت جو کچھ شہر دمشق کا نقشہ تھا۔ قابل ذکر ہے۔ شاہ یہوداہ ایک دن شہر کی سیر کر رہا تھا کہ اس کا گذر ایک معبد پر ہوا۔ وضع عمارت اور نقش و نگار کی خوبیوں نے ایسا گرویدہ کر لیا۔ اندر داخل ہوا تو مذبح پر نظر پڑی۔ ایک نقشہ تیار کر دایا۔ اور اوریا کاہن کے پاس بھیجا کہ اسی قسم کا مذبح یروشلم میں تعمیر کیا جاوے۔

یسعیاہ نبی کی کتاب میں دمشق اور اسکی تباہی کا تذکرہ ہے۔ جیسا کہ بیان ہو چکا ہے یسعیاہ نبی شاہ یہوداہ آخز کے عہد میں تبلیغ کا کام کر رہے تھے۔ دمشق کے متعلق جو کچھ ان کی کتاب میں لکھا ہے۔ اسے دمشق کی بربادی کے متعلق پیش گوئی کہو یا اسکی تباہی پر نوحہ سمجھو۔ بہر حال دمشق کے عام حالات کا نقشہ ہے۔ اس وقت جو کچھ اس شہر کی صورت تھی وہ یسعیاہ نبی نے اس طرح بیان کی ہے:-

"دیکھو دمشق یوں خراب ہو جائے گا کہ شہر نہ رہے گا؛ وہ ایسا لوٹ جائے گا کہ ڈھیر بنے گا؛
عرائر کی بستیاں خالی ہو جائیں گی؛ اور گلّوں کی چراگاہیں ہونگی؛ گلّے وہاں بیٹھینگے اور کوئی ان کے
ڈرانے کو بھی وہاں نہ ہوگا؛ اور افرائیم کا مضبوط شہر نابود ہوگا؛ دمشق اور باقی ارام سے سلطنت جاتی
رہے گی؛ رب الافواج فرماتا ہے کہ جو حال بنی اسرائیل کی شوکت کا ہوا ہے؛ وہی ان کا حال ہوگا؛ اور
اس روز ایسا ہوگا کہ یعقوب کی حشمت گھٹ جائے گی؛ اور اس کا موٹا تازہ بدن دُبلا ہوگا؛ یہ ایسا ہوگا
جیسا کوئی کھیت کاٹنے والا کھڑے کھیت کاٹ کر غلہ جمع کرے؛ اور اپنے ہاتھ سے خوشوں کو لوٹے۔
اور ایسا ہوگا جیسا کوئی رفائیوں کی وادی میں خوشہ چینی کرے؛ کیونکہ اس میں چننے کے لئے تھوڑے
پھل باقی رہیں گے؛ جیسا کہ زیتون کے درخت میں ہوتے ہیں؛ جب وہ ہلایا جاوے تو تین دانے پھنگی
پر؛ چار پانچ اسکی پھلدار پھیلی ہوئی شاخ پر گرتے ہیں؛ خداوند اسرائیل کا خدا فرماتا ہے؛ اس روز انسان اپنے
خالق کی طرف نظر کرے گا؛ اور اسکی آنکھیں اسرائیل کے قدوس کی طرف توجہ کرینگی؛ اور وہ مذبحوں پر اپنے
ہاتھ کے کام پر نظر نہ کریگا؛ اسے ہرگز اس پر جسے اسکی انگلیوں نے بنایا؛ کیا یسیرت اور کیا بت کسی پر توجہ
نہ ہوگی اور اس دن اس کے مضبوط شہر اجاڑے ہوئے بن کی مانند ہوں گے؛ اور اس شاخ کی مانند جو سب سے
اوپر ہے جسے اسرائیل کے سامنے سے انھوں نے چھوڑا ہے؛ اور وہاں ویرانی ہوگی؛ اس لئے کہ تو نے
اپنے نجات دینے والے خدا کو فراموش کیا؛ اور اپنی توانائی کی چٹان کو یاد نہ کیا؛ تو خوب صورت پودے لگائیگا؛
اور اجنبی اس میں بیزی جمائے گا؛ جس دن تو اسے لگائے تو اسکے گرد احاطہ بھی باندھے؛ سو صبح کو پھولے پر
اس کا حاصل دکھ اور مصیبت کے دن جاتا رہے گا؛"

"آہ! بیشمار قوموں کا ہنگامہ برپا ہو رہا ہے؛ اور وہ سمندر کے طلاطم کی مانند شور مچاتی ہیں؛ اور امتوں
کا غوغا ہو رہا ہے؛ وہ بڑے پانیوں کی مانند غوغا کرتی ہیں؛ امتیں زور کے پانیوں کے ریلے کی مانند شور
کرینگی۔ پر وہ انہیں ڈانٹیگا؛ اور وہ دور بھاگ جائے گی؛ اور خس و خاشاک کی طرح جو ٹیلوں کے اوپر
آندھی سے اُڑتا پھرتا ہے؛ یا اس پتہ کی طرح جو بگولہ میں گھومتا ہے۔ ماری ماری پھرینگی؛ اور دیکھو شام کے
وقت تک تو ہیبت ہے اور صبح ہونے سے پیشتر وہ نابود ہیں؛ وہ جو ہمکو غارت کرتے ہیں یہ اس کا
حصہ ہے؛ اور وہ جو ہم کو لوٹتے ہیں یہ ان کا بخرہ ہے۔

آہ! اے پھڑپھڑاتے ہوئے پنکھوں کی سرزمین جو کوش کی ندیوں کے پرے ہے؛ جو دریا کی راہ سے

بروی کے ناؤں میں پانیوں پر ایلچیوں کو بھیجتی ہے اور کہتی ہے کہ "اے تیز رفتار ایلچیو اس گروہ کے پاس جاؤ جو زور آور اور صاحب ہمت ہے، اور اس قوم کے پاس جو ابتک مہیب ہے۔ ایسی قوم جو زبردست اور فتحیاب ہے جسکی زمین ندیوں سے منقسم ہوئی۔ اے جہان کے سارے باشندو اور زمین کے رہنے والو جس وقت کہ پہاڑوں پر جھنڈا کھڑا کیا جائے، تم دیکھو، اور جس وقت کہ نرسنگا پھونکا جائے تم سنو کہ خداوند نے مجھ سے یوں فرمایا ہے کہ میں مقررہ مسکن میں چپ چاپ بیٹھوں گا، اور نگاہ کرتا رہوں گا، اس شدید گرمی کی مانند جو کڑی دھوپ کے وقت پڑتی ہے، اور اس شبنم ریز بادل کیطرح جو دروکی گرمی میں ہوتا ہے کہ فصل سے پیشتر جس وقت کلی کھل چکی اور پھول کی جگہ انگور لگے، جو پکنے پر ہیں اس وقت وہ ٹہنیوں کو ہنسوے سے کاٹ ڈالیگا، اور کونپلوں کو کاٹ کر جدا کرے گا، اور وہ پہاڑ کے شکاری پرندوں اور میدان کے وحشی درندوں کے لئے پڑی رہینگی، اور شکاری پرندے گرمی کے موسم میں ان پر لیٹیں گے،

اُس وقت اس قوم کی طرف جو زور آور اور صاحب ہمت ہے اس گروہ کی طرف جو ابتدا سے آجتک مہیب ہے، اُس قوم کی جانب جو زبردست اور ظفریاب ہے جسکی زمین ندیوں سے منقسم ہوئی ایک ہدیہ رب الافواج کو رب الافواج کے نام کے مکان پر جو کوہ صہیون ہے پہنچایا جائے گا"

پیش گوئی کے رنگ اور تشبیہ اور استعارات کے پیرایہ میں دمشق پر جو کچھ نوحہ خوانی کی گئی ہے اس سے کم از کم اتنا ظاہر ہوتا ہے کہ یسعیاہ نبی کے زمانہ میں یعنی آج سے قریباً تین ہزار برس پیشتر یہ ایک مضبوط شہر تھا جسکی سنگین دیواریں اہل شہر کی حملہ آوروں کے برخلاف حفاظت کرتی تھیں۔ اسکی سرسبز اور شاداب زمینوں میں نہریں بہتی تہیں، اسکی خوشحالی اور فارغ البالی ضرب المثل تھی، اسکی طاقت زبردست تھی۔ اور اسکے تعلقات مختلف سلطنتوں سے تھے، لیکن انقلاب زمانہ کا اثر ان پر بھی ہوا۔ اور چشم بد روزگار اسے بھی لگ گئی۔ اور ایک زمانہ میں یہ ایک اُجڑا ہوا شہر تھا، جہاں حضرت انسان نے عالیشان اور مضبوط، خوبصورت عمارتیں بنائی تھیں، وہاں چرندوں اور پرندوں نے بسیرا کیا،

. غالباً یہ خرابی شاہ عصایر نے دمشق میں پیدا کی، لیکن قدرت نے دمشق کو ایسا شہر نہ بنایا تھا کہ اس کا نشان صفحہ ہستی سے مٹ جاتا، بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ پرانے اور بوسیدہ درختوں کو کاٹ کر نئی پود لگانے کے لئے باغبان قدرت نے اسباب فراہم کئے تھے، کیونکہ دمشق پھر اپنی اصلی حالت پر آگیا، اگرچہ شاہ ارم رضین مارا گیا، اور اہل دمشق بحالت اسیر آوارہ وطن ہوئے، اگرچہ محاصرہ کے وقت شہر کو بہت نقصان پہنچا، مگر

دمشق اسی طرح آج بھی ہے جس طرح ابتدا میں تھا۔ اور اس کے دشمن یکے بعد دیگرے تباہ و برباد ہو گئے۔
نہ یہوداہ کی سلطنت رہی اور نہ اسرائیل کی۔ نہ نینوا کا نشان باقی ہے اور نہ بابل کے آثار ملتے ہیں۔
لیکن دمشق اسی طرح قائم ہے۔

دمشق کیسا معزز شہر ہے، کس قدر عالیشان سلطنتوں کے عروج اور زوال کا شاہد ہے کوئی شہر اسکی
قدامت یہ اسکی شہرت، کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ آرامیوں نے اسے بسایا، اسرائیلیوں نے اسپر حملے کئے
عراقیوں یعنی اہل نینوا، اور بابل نے اسکی تباہی پر کمر باندھی۔ مسیحؑ سے قریباً ساڑھے چار سو برس پیشتر
سکندر اعظم نے اسے سخر کیا، کچھ عرصہ یونانیوں اور کچھ مدت ایرانیوں کا دور دورہ رہا۔ ساٹھ برس
قبل از مسیحؑ پمپی اعظم نے اسے فتح کیا۔ اور خلافت اسلامی کے آغاز تک رومیوں کے قبضہ میں رہا۔

دنیا کی پرانی عظیم الشان سلطنتوں کی تواریخ میں دمشق کا تذکرہ موجود ہے۔ اور ہر ایک زمانہ میں دمشق
کی شہرت اور اسکی ثروت فاتحان عالم کو اپنی طرف کشش کرتی رہی ہیں۔

پیشتر اسکے کہ ہم دمشق کے متعلق حرف مدعا کا اظہار کریں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کتب مقدس میں جو کچھ
اسکی نسبت لکھا ہے بیان کر دیں۔

حضرت عیسٰیؑ کے زمانہ میں بنی اسرائیل اور دیگر شامی اقوام رومیوں کے محکوم تھے، اگرچہ حضرت عیسٰیؑ
نے دمشق میں اقامت اختیار نہیں کی۔ مگر وہ بزرگ جس نے مسیحؑ کو دریا یردن میں غوطہ دیا اور جس کے
ہاتھ سے آنحضرتؑ نے اصطباغ پایا یعنی یحیٰیؑ دمشق میں میٹھی نیند سوتے ہیں۔ اور وہ شخص جو درحقیقت موجودہ
کلیسائے مسیحی کا بانی ہے یعنی پولوس رسول نے اسی شہر میں کارہائے نمایاں کئے۔

شاؤل جس کا دوسرا نام پولوسؑ ہے رومی تھا۔ اور اس میں کچھ شک نہیں کہ وہ یہودیوں کا سخت
دشمن تھا، اور عیسائیوں سے اسے طبعی نفرت تھی، مفسرین اناجیل نے غلط فہمی یا بعض وجوہات کے باعث
پولوس کو خالص یہودی نسل ثابت کرنے کی کوشش کی ہے مگر خود "رسولوں کے اعمال" اسکے برخلاف
شہادت دیتے ہیں، پولوس یہودی تھا۔ یا رومی وہ عیسائیوں کا دشمن تھا اور یروشلم میں غریب حواریوں اور
بے کس عیسائیوں کو ستایا کرتا تھا۔ آخر دمشق میں اس ارادہ سے آیا کہ اس جگہ عیسائیوں کے جتھے کو توڑ دے
مگر بقول مصنف "اعمال" خداوند کا نور اسپر چمکا اور وہ راہ راست پر آگیا۔ اور مرتے دم تک مسیحؑ کا دم بھرتا رہا۔

حاشیہ نمبر ۷:- پولوس رسول کا مذکور اول چار اناجیل میں کچھ بھی نہیں، اعمال میں اسکی سرگزشت

دمشق میں یہودی عبادت خانوں کا تذکرہ بالخصوص کیا گیا ہے۔ پولوس اس امر کا خواہان تھا کہ عیسائیوں کو ستانے کے لئے ان عبادت خانوں سے سند ہاتھ لگ جائے۔ چنانچہ یروسلم سے دمشق تک سرگرمی سے سفر کیا۔ آفتاب غضب آلود نگاہوں سے اسکی دوڑ دھوپ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جب وہ دمشق کے نزدیک پہنچا تو زمین پر گر پڑا۔ لوگ اس کا ہاتھ پکڑ کر دمشق میں لائے۔ اور وہ تین دن تک نہ دیکھ سکا اور کھایا نہ پیا۔ بظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ "سرسام" میں مبتلا تھا۔ اگر خدا کا نور آسمان سے اس پر چمکا ہو تو تعجب نہیں۔ کیونکہ آفتاب کی حرارت اور روشنی کا اثر کچھ کم نہیں ہوتا۔

مفصل لکھی ہے۔ مگر مصنف خود پولوس رسول نہیں۔ اور یہ بھی معلوم نہیں کہ اعمال کا مصنف کون ہے۔ " مفسرین اناجیل نے بعض قرائن سے قیاس کیا ہے کہ یہ بھی حضرت لوقا کی تصنیف ہے۔ پولوس دراصل رومی تھا۔ اعمال باب ۲۲ آیت ۲۲ میں پولوس کی گرفتاری کا اس طرح ذکر کیا گیا ہے۔ کہ پولوس لوگوں کو اپنے تبدیل مذہب کے متعلق اپنی سرگزشت سنا رہا تھا۔ کہ کس طرح ابتداء میں مسیحی طریق والوں کو میں نے ستایا۔ قید کیا۔ مروا ڈالا۔ اور ستیفن حواری کو قتل کروایا۔ اور کس طرح دمشق کے قریب مجھ پر خدا کا نور چمکا اور راہ راست پر آیا۔ اور حننیاہ کے ہاتھ سے اصطباغ پایا۔ اور کس طرح یسوع مسیح یروسلم میں مجھ پر ظاہر ہوئے۔ اور کہا کہ "لوگ میرے حق میں تیری گواہی قبول نہ کرینگے۔ پولوس اس طرح مسیحی معجزات کا تذکرہ کر رہا تھا کہ لوگوں نے باواز بلند کہا کہ "ایسے شخص کو زمین پر سے فنا کر دے۔ کہ اسکا زندہ رہنا مناسب نہیں"۔ پلٹن کے سردار نے پولوس کو پکڑ کر حکم دیا کہ "اسے قلعہ میں لے جاؤ اور کوڑے مار کر اس کا اظہار لو تاکہ مجھے معلوم ہو کہ وہ کس سبب سے اس کی مخالفت میں یوں چلاتے ہیں"۔ پولوس نے صوبہ دار کو کہا کہ "کیا تمہیں روا ہے کہ ایک رومی آدمی کو کوڑے مارو اور وہ بھی قصور ثابت کئے بغیر"۔ صوبہ دار یہ سن کر پلٹن کے سردار کے پاس گیا۔ اور کہا "تو کیا کرتا ہے یہ تو رومی آدمی ہے"۔ پلٹن کے سردار نے پولوس سے پوچھا "کیا تو رومی ہے"؟

پولوس "ہاں"۔

سردار۔ "میں نے تو بڑی رقم دیکر رومی ہونے کا رتبہ حاصل کیا ہے"۔

پولوس۔ "میں تو پیدائشی رومی ہوں"۔

پلٹن کا سردار ڈر گیا کہ جس کو میں نے باندھا ہے وہ رومی ہے۔ اس بیان سے تو یہی کچھ ظاہر ہوتا ہے۔ کہ پولوس رومی تھا۔ مگر پولوس نے مختلف مقامات پر مختلف حسب نسب ظاہر کیا ہے۔ کوئی تو اسے مصری سمجھتا تھا

پولوس تو اس مصیبت میں مُبتلا تھا مگر دمشق میں ایک مرد خدا "حننیاہ" نامی "شارع مستقیم" میں رہتا تھا، اس کے ہاتھ سے آخر شفا پائی، اس کے بعد پولوس عیسائی ہو گیا۔ اور یہودیوں نے اس کے مار ڈالنے کی صلاح کی "۔ مگر اس سازش کا حال کھل گیا۔ اگرچہ یہودی جو پولوس کو قتل کرنا چاہتے تھے رات دن دروازوں پر لگے رہتے تھے مگر عیسائیوں نے اسے ایک ٹوکرہ میں بٹھایا اور دیوار شہر سے لٹکا کر اُتار دیا۔

(اعمال باب ۲۱ آیت ۳۸) اور وہ خود ایک جگہ اپنے آپ کو یہودی کہتا ہے۔ (باب ۲۲ آیت ۳) ہماری رائے میں مصری تو اسے غلط فہمی سے سمجھتے تھے۔ اور چونکہ اس نے یہودیوں کا مذہب اختیار کر لیا تھا، اس لئے یہودی قوم کے حقوق بھی حاصل کر لئے تھے۔ مگر وہ رومی نژاد تھا، مفسرین بائیبل غالباً اس وجہ سے پولوس کو یہودی ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں، تاکہ اس کے ایمان میں کوئی شک و شُبہ نہ رہے، ورنہ ایک ایسے شخص کے "اعمال" کی نسبت بہت کچھ کہا جا سکتا ہے جو حکمران قوم کا ایک فرد تھا، مسیحؑ اور ان کے حواریوں پر بغاوت کا الزام تھا اور حکمران قوم یقین کرتی تھی کہ مسیحؑ یہودیوں کا بادشاہ بننا چاہتا ہے۔ اور یہودیوں کو رومی قید حکومت سے آزاد کرنے کی کوشش کرتا ہے اِس لئے اس جماعت کو تفرقہ پردازی کے ذریعہ کمزور کرنے کے لیے یہ تجویز عمل میں لائی گئی۔ یہ امر قابل غور ہے کہ پولوس کبھی مسیحؑ کو زندگی میں نہیں ملا۔ اور کبھی آپ کے فیض صحبت سے مستفید نہیں ہوا۔ اور اِس لئے پہلی چار انجیلوں میں اس کا کچھ مذکور نہیں، صرف "اعمال" میں جس کے مصنف کا نام بھی معلوم نہیں اس کے کارنامے مندرج ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ پولوس کسی حواری سے بھی نہیں ملا، یا ارادتاً ان سے کنارہ کش رہا چونکہ اس کے ابتدائی حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ عیسائیت اور عیسائیوں کی بیخ کنی کے درپے تھا اِس لئے اس کے "اعمال" مابعد پر جو کچھ شک ہو سکتا ہے اسکی مزید تائید مذکورہ بالا واقعات سے بھی ہوتی ہے۔ اس نے عیسائیت میں ایسی باتوں کو رواج دیا جو صریحاً مسیحؑ کے قول و فعل کے مخالف ہے، مثلاً ختنہ کی رسم کو منسوخ کیا، حالانکہ خود مسیحؑ مختون تھے اور ختنہ کے برخلاف آنحضرتؑ نے کبھی تعلیم نہیں دی، غیر اقوام کو دعوت مذہب دی، اگرچہ مسیحؑ نے اپنے حواریوں کو اس سے منع کر دیا تھا۔

اِس میں کچھ شک نہیں کہ موجودہ عیسائیت کی بنیاد پولوس رسول نے رکھی، اور ہم یقین کرتے ہیں کہ اسکی کارروائیوں میں مسیحؑ کے حواری شامل نہ تھے، یہ بھی ممکن ہے کہ پولوس ایک مذہبی پیشوا بننا چاہتا تھا۔ اس لئے اس نے بہت کچھ شریعت میں اختراع سے کام لیا۔ بہرحال پولوس نے گوشۂ گمنامی سے نکل کر ایسی شہرت حاصل کی جو خاص خاص آدمیوں کو نصیب ہوتی ہے "۔

اعمال میں دمشق کے عبادت خانوں، اور شارع مستقیم، اور شہر کے دروازوں اور دیوار کا تذکرہ مجملاً کیا گیا ہے، جن کے متعلق ہم آیندہ فصلوں میں مفصل حالات لکھیں گے۔

کتب مقدس میں جو کچھ دمشق کے متعلق لکھا ہے ہم نے بالاختصار بیان کر دیا۔ اب ہم اس زمانہ میں آ گئے ہیں جو "موجودہ زمانہ" کا آغاز ہے، یعنی تاریکی کے زمانہ کے اختتام پر پہونچ گئے ہیں۔ اس وقت عرب میں "زمانہ جاہلیت" کے بعد بعثت کا دور دورہ تھا، اور ہجرت نے تواریخ اسلام کو شروع کر دیا تھا۔ اس وقت سے دمشق کے مفصل حالات کا پتہ ملتا ہے۔ اس سے پیشتر دمشق کی سرگزشت دمشق کی تواریخ کا دیباچہ سمجھنا چاہیئے۔

دور اول

"دمشق کا پہلا محاصرہ"

رومی سلطنت جسکی حکومت کا آغاز اٹلی سے ہوا۔ اور جسکی ایشیائی عالیشان عمارت سکندر اعظم کی فتوحات پر تعمیر ہوئی۔ اس وقت دو حصوں میں تقسیم تھی۔ یورپ پر وہی پرانا دارالسلطنت روم حکومت کرتا تھا، مگر سچ تو یہ ہے کہ اسکی شان و شوکت کا زمانہ ہو چکا تھا، یہ چراغ سحری کوئی دم کا مہمان تھا، اور تھوڑے عرصہ کے بعد گل ہو گیا۔ ایشیا اور افریقہ پر قسطنطنیہ حکمران تھا، اسکی مفصل تواریخ اور عروج و زوال کی داستان بہت طویل ہے۔ اس وقت قسطنطنیہ کے تخت پر "ہرقلیاس" جسے عربی مورخ "ہرقل" کہتے ہیں متمکن تھا۔ اس سے پیشتر "فوکس" شہنشاہ تھا، "ہرقل" نے "فوکس" کو تخت و تاج سے برطرف کر کے قتل کیا۔ اور وسیع شہنشاہت کا مالک بن بیٹھا، اس کا باپ افریقہ کا گورنر تھا۔ لوگ فوکس سے ناراض تھے۔ اور ہرقل کے باپ کو مدعو کیا تھا۔ مگر بوجہ ضعف العمری معذور تھا، اس لئے یہ کام جو باپ سے نہ ہو سکا بیٹے نے کیا، اور عوام الناس نے ہرقل کی حکومت کو خوشی خوشی قبول کیا، ہرقل جوانمرد سپاہی تھا، نہایت آسانی سے تخت و تاج غصب کر لیا۔

کسریٰ فوکس مقتول کا دوست تھا، کب گوارا کر سکتا تھا، کہ ایک دوست قتل ہو اور وہ چپکا بیٹھا رہے انتقام کے جوش سے اُٹھا، اور دریا فرات کو عبور کر کے شام میں داخل ہوا، تمام مشہور شہر یکے بعد دیگرے بجبر و قہر مسخر کر لئے۔ اس وقت ایرانی بادشاہ کا کمپ غوطہ دمشق تھا، جسکی نسبت گبن لکھتا ہے۔ کہ

یہ روح فزا وادی دمشق میں ہر ایک زمانہ میں شاہی شہر رونق کا باعث رہا ہے۔ یہ گوشہ عافیت ابھی تک رومی مورخین کی نظر نہیں پڑا تھا۔ لیکن خسرو نے کوہ لبنان پر چڑھنے سے پیشتر اور شام کے ساحلوں پر حملہ کرنے سے پہلے اسی جنت نظیر مقام پر قیام کیا ہوا تھا۔"

اس وقت ہرقل کو سخت مصیبت کا سامنا تھا۔ کسریٰ نے تمام شام اور ارض فلسطین پر قبضہ کر لیا۔ اور اس کے بعد افریقہ کا رخ کیا۔ اہل کتاب کی عبادت گاہوں کو آتشکدہ بنا دیا۔ نو ہزار عیسائی اس جنگ میں تہ تیغ بیدریغ ہوئے۔ اور شام کی تمام دولت و ثروت ایران میں جمع کر دی۔ سونا چاندی، صنعت و حرفت کے بیش قیمت نمونے اور خود اہل صنعت اور حرفت کو ایران میں لے گیا۔ اس وقت کسریٰ کی شان و شوکت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ نو سو ساٹھ (۹۶۰) ہاتھی شہنشاہ کی سواری کے واسطے موجود تھے۔ خیمہ و خرگاہ اور بار برداری کے لئے بارہ ہزار بڑے اور آٹھ ہزار چھوٹے اونٹ اور شاہی اصطبل میں چھ ہزار گھوڑے صبا رفتار اور باد پا تھے۔ چھ ہزار محافظ فوج در دولت پر کھڑی رہتی۔ اور بارہ ہزار غلام ہر وقت خدمت میں حاضر تھے۔ تین ہزار عورتیں جو ایشیا کی خوبصورتی کا انتخاب تھا کسریٰ کے عیش و عشرت کو مکمل کرتی تھیں۔ "گنج شایگان" اور "باد آورد" میں زر و جواہر کے انبار لگے ہوئے تھے۔ شاہی محل جس کی سقف کو چالیس نقرئی ستون سہارا دیتے تھے۔ اور جس پر تیس ہزار ریشمی اور زربفت کے منقش پردے لٹک رہے تھے۔ اور جس کے گنبد میں ہزار طلائی قمقمے آویزاں تھے سپہر کا نقشہ تھا جس کے گنبد نیلی فام میں آفتاب و مہتاب اور بیشمار روشن ستارے زینت کا باعث ہیں۔ یہی کسریٰ کا قصر ابیض تھا۔"

بقول گبن "اس وقت جب کہ ایرانی شہنشاہت انتہائے عروج پر تھی۔ اور کسریٰ اپنے شاہی محل میں عیش و عشرت میں منہمک تھا۔ اور ان اسباب عشرت پر جن کا تذکرہ کیا گیا ہے نظر کر رہا تھا۔ کہ عرب کے ایک شہر سے قاصد پیغام اسلام لیکر آیا۔ آتش پرست بادشاہ بھڑک اٹھا اور نامہ کو اپنے ہاتھ سے پرزہ پرزہ کر دیا۔ جب رسول کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو کسریٰ کی گستاخانہ حرکت کی اطلاع ہوئی۔ تو فرمایا کہ اسی طرح اسکی سلطنت اور اس کا حال ہوگا۔"

اس خونریز جنگ کے حالات میں جو رومیوں اور ایرانیوں کے درمیان ہوا۔ اور جس میں رومیوں کو نیچا دیکھنا پڑا گبن لکھتا ہے کہ "محمد عرب میں بیٹھ کر جو دونوں حریف عظیم الشان سلطنتوں کے کنارہ پر واقع ہے رومیوں اور ایرانیوں کی باہمی خونریز جنگوں اور تباہی دیکھ کر دل ہی دل میں خوش ہوتا تھا۔ اور ایرانی

فتح کی خبر سُنکر اس نے پیشگوئی کی کہ چند سال کے بعد فتح رومی علم کیطرف رجوع کرے گی"۔ گبن معذور ہے کیونکہ جو کچھ ہمیں معلوم ہے وہ نہیں جانتا۔ "غلبۃ الرّوم" شاہد ہے کہ اہل کتاب کی تباہی اور آتش پرست کسریٰ کی فتوحات نے رسولؐ خدا اور عام مسلمانوں کو سخت غمگین بنا رکھا تھا۔ کیونکہ کفار اور مشرکین کے مقابلہ میں اہل توحید کو اہل کتاب سے دلی ہمدردی تھی۔ اور کفار عرب خوش تھے کہ وہ لوگ جو محمدؐ کے اکثر عقائد میں ہم خیال ہیں تباہ ہو رہے ہیں۔ اس لئے گبن کا یہ لکھنا کہ "محمدؐ دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا" حقیقت حال کے بالکل مخالف ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ قرآنی پیشگوئی نے اس وقت مسلمانوں کو اس خوشی کا منتظر بنا دیا۔ جس کا وعدہ "غلبہ روم" کے ساتھ کیا گیا تھا۔

سنہ ۶۱۷ء میں خسرو پرویز شام اور دیگر ممالک کی فتوحات سے فارغ ہوا۔ سنہ ۶۲۵ء میں رومیوں نے از سر نو ان ممالک پر قبضہ کیا۔ یعنی "بضع سنین" میں فتح رومی علم پر لہرائی۔ یہ ایّام جو اہل کتاب کی خوشی کے تھے مسلمانوں کے واسطے بھی دونی خوشی کا موجب تھے۔ کیونکہ ایک تو کفار کو رومیوں نے شکست دی۔ اور دوسرے خود مسلمانوں نے بدر کے میدان میں نمایاں فتح حاصل کی۔ اور اس طرح اللہ تعالیٰ کا وعدہ بلفظہٖ پورا ہوا۔

"ہرقل" نے تین مہموں کے بعد ایرانیوں کو نیچا دکھایا۔ اور پھر وہی طاقت اور شوکت حاصل کر لی جو اس سے پیشتر تھی۔ اور تھوڑے عرصہ میں تمام اندرونی اور بیرونی خرخشوں اور حملوں سے بیفکر ہو گیا۔

"ہرقل" ایرانی مہم سے فارغ ہو کر یروسلم میں مقدس مقامات کی زیارت کے لئے آیا۔ اور اس جگہ بطریق سے دریافت کیا کہ "کیا مسیحؑ کا جسکی میں پرستش کرتا ہوں اور جس کا جسم تو بظاہر ایک تھا مگر دو فطرتیں تھیں۔ ارادہ بھی ایک تھا یا دو تھے"۔ جواب ملا کہ ارادہ ایک ہی تھا۔ اگرچہ یہ عجب فلسفیانہ سوال شہنشاہ کی طبیعت کی جودت کا نتیجہ تھا۔ مگر حق تو یہ ہے کہ بقول گبن اس وقت عیسائی دنیا مذہبی مباحثہ میں اس قدر اُلجھی ہوئی تھی۔ کہ کلیسائے مسیحی کی تاریخ نے دیگر واقعات کو پس پشت ڈال رکھا تھا۔ مذہب عیسوی مسیحؑ کی ذات سے اس قدر وابستہ ہے کہ اگر نصاریٰ یقین کر لیں کہ عیسیٰؑ فوت ہو چکے ہیں تو یہ مذہب بھی مردہ ہے۔ گویا اس مذہب کی بنیاد حضرت مسیحؑ کی ذات پر ہے۔ اس لئے اعمال اور پابندی احکام شریعت کی طرف ان کی توجہ کبھی مبذول نہیں ہوئی۔ صرف مسیحؑ کی ذات پر ایمان لانا نجات کا باعث ہے۔ کفارہ نے انہیں اعمال سے مستغنی کر دیا ہے۔ اور اس لئے عیسائی دنیا کی مذہبی تحقیقات تثلیث یا حلول و اتحاد میں

محدود رہی ہے۔ ابتدا میں اگرچہ حواریوں اور ان کے تابعین کی سادہ زندگی تقویٰ اور اطمینان قلبی میں بسر ہوئی۔ لیکن غیر اقوام میں اشاعت مذہب کے باعث عیسائی مشنریوں کو بت پرست اور مختلف عقاید کے لوگوں سے سابقہ پڑا۔ اور مشرکین کے اوتاروں اور دیوتاؤں پر مسیح کو ترجیح دینے کے لئے آنحضرت کی ذات میں ایسے اوصاف ثابت کرنے کی کوشش کی گئی۔ جنہوں نے خود یسوع مسیح کو دیوتا اوتار۔ خدا کا بیٹا۔ بلکہ خود خدا بنا دیا۔ اور آیندہ عیسائی نسلیں شرک کی مضرتوں سے محفوظ نہ رہیں۔ جس وقت عیسائیت شاہی مذہب ہوا۔ رومی اور یونانی فلاسفروں نے تثلیث کے مسئلہ میں وہ موشگافیاں کیں کہ عوام الناس نے مسیحی الوہیت کو تسلیم کرلیا۔ لیکن طبائع وخیالات اور ملکی آب ہوا اور رسم ورواج کے اختلاف نے اس شرک وحدت نما میں نزاع لفظی ومعنوی پیدا کردیا۔ اور رومی دور دورہ کے آخری دو سو میں پچاس برس مختلف عیسائی فرقوں کے عروج وزوال اور باہمی مقدس مذہبی جنگ میں بسر ہوئے جو خونریز تو نہ تھے۔ مگر بنیاد مذہب اور عوام الناس کے عقاید کو متزلزل کردیا۔ یورپ اور ایشیا اور افریقہ میں پیشوایان دین مسیحی نے ایک دوسرے کے برخلاف کفر کے فتوے صادر کئے۔ اور اس عرصہ میں مختلف عیسائی ممالک میں اپنے اپنے کلیسا قائم کئے۔ جن کے عقائد ایک دوسرے سے بہت مختلف تھے۔

ابتدا میں عیسائیت کی اشاعت بنی اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں میں ہوئی۔ یہودی جو موسوی شریعت سے بخوبی واقف تھے کسی ایسے مسیح کے منتظر نہ تھے جس کا مرتبہ انسانی درجہ سے بلند ہوتا اور نہ ان لوگوں نے مسیح کی پیروی ایسے کچھ اور سمجھ کر اختیار کی۔ مسیح کے حواری جو آنحضرت کو اپنا دوست، ہم وطن، پیر ومرشد سمجھ کر بے تکلف گفتگو کرتے تھے۔ اور اکثر اوقات مشورہ میں شریک ہوتے تھے۔ اور بعض اوقات اعتراض بھی جما دیتے تھے۔ آنحضرت کو ابن آدم ہی سمجھتے تھے۔ اور مسیح بھی ان کی نظروں میں اس سے زیادہ نہ جچتے تھے۔ مسیح کا بچپن، لڑکپن، جوانی اور بتدریج قد وقامت اور عقل کا بڑھنا انہیں اچھی طرح معلوم تھا۔ صلیب پر جسمانی اور روحانی تکالیف برداشت کرتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے۔ آنحضرت ان کے درمیان زندہ رہے اور فوت ہوئے۔ ان باتوں سے وہ انہیں صرف ایک فانی انسان ہی سمجھ سکتے تھے۔ وہ مصلح قوم تھے۔ اور انکی ذات سے کارہائے نمایاں ظہور میں آئے۔ نوع انسان بالخصوص یہودیوں سے دلی ہمدردی تھی اور نیک آدمی ایسے ہی ہوتے ہیں مسیح سے پیشتر بہت ایسے شخص ہو گذرے ہوئے اور ہونگے۔ یہودیوں کی تنگ دلی۔ فریسیوں

اور کاہنوں کی ایمان فروشی، پر ایک انسان کی طرح زبان طعن وملامت کھولی۔ اور یروشلم کی آئندہ بربادی پر پیش از وقت آنسو بہائے، یہ تمام شہادتیں انسانیت کی دلیل ہیں۔ اعجاز عیسوی بھی کچھ ایسی بڑی بات نہ تھی۔ آنحضرت سے پیشتر پیغمبروں حکیموں نے سخت سے سخت امراض کا علاج کیا۔ مایوس مریضوں کو شفا بخشی۔ مردوں کو زندہ کیا۔ بحر کو پھاڑا۔ آفتاب کو ٹھہرادیا۔ آتشی گاڑی میں آسمان پر چڑھ گئے۔ استعارہ کے رنگ میں تمام یہودی اپنے آپ کو "خدا کا بیٹا بلکہ پلوٹھا" سمجھتے تھے۔ ان کے بزرگ، متقی پرہیزگار لوگ، شہید تو بدرجہ اولیٰ اس خطاب کے مستحق تھے۔ اگر حضرت عیسیٰ کو یہودی عیسائی "خدا کا بیٹا" کہتے تھے تو فی الحقیقت وہ معنوی لحاظ سے ایسا نہ سمجھتے تھے اور نہ مسیح ایسے تھے۔ "ابیانیتی" اور "ناصری" فرقہ کے عیسائی جو ابتدا میں تھے مسیح کو انسان ہی سمجھتے رہے۔ اور پیغمبر سے زیادہ رتبہ نہ دیتے تھے۔

حاشیہ نمبر ۸۔ مسیح کی پیدائش کے واقعات اور وفات کے حالات عموماً ان کی الوہیت کی شہادت میں پیش کئے جاتے ہیں، مگر اس میں کچھ شک نہیں کہ پیدا ضرور ہوئے اور ماں کے پیٹ سے متولد ہوئے اور عام انسانوں کی طرح ان کی ولادت ہوئی۔ جو سرے سے منافی الوہیت ہے۔ ایسی پیدائش جو باپ کی وساطت کے بغیر ہو خلاف قانون قدرت تو نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ اس سے پیشتر آدم علیہ السلام کا ظہور بھی اسی طرح سے ہوا تھا بلکہ اس حیثیت سے وہ ممتاز ہیں۔ کیونکہ ان کی ماں بھی نہ تھی، اور تمام حشرات الارض اور برساتی کیڑے مکوڑے اور ادنیٰ درجہ کی مخلوق اسی طرح پیدا ہوا کرتی ہے۔ اور ہماری رائے میں یہ شہادت الوہیت انہیں مرتبہ انسانیت سے بھی گرا دیتی ہے۔ ہمارا عقیدہ حضرت عیسیٰ کی نسبت ایسا نہیں، ہم انہیں عالیشان پیغمبر سمجھتے ہیں نہ کہ ایسا مخلوق جو خود بخود پیدا ہو جاتا ہے، یہ نہایت ہی فاسد عقیدہ ہے جو ہمارے عیسائی بھائیوں نے اختراع کیا ہے فی الحقیقت یہ خیال زمانہ جاہلیت کا ہے جسے یورپی مورخین "ڈارک ایجیز" یعنی زمانہ تاریک کہتے ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ فی زمانہ بھی اسی خام خیال کو پختہ کیا جاتا ہے۔ دراصل ان لوگوں نے انسانی شرافت کو سمجھا ہی نہیں، انسان خلیفۃ اللہ فی الارض ہے اور جو کچھ مرتبہ اسے حاصل ہے وہ فرشتوں کو بھی نصیب نہیں ہوا۔ یہ بدیہی دلیل ہے کہ انسان دنیا کی ہر ایک چیز پر حکومت کرتا ہے، اور ہر ایک چیز اس کے تابع فرمان ہے۔ عجائبات قلب انسانی اور درجات روحانی کا اگر عیسائیوں کو علم ہوتا تو وہ کبھی حضرت مسیح کے لئے "انسان کامل" کے بغیر کوئی اور لقب یا خطاب انتخاب نہ کرتے۔ ہم کہتے ہیں کہ پیشوایان مذہب کی پیدائش اس رنگ میں ظاہر کرنا صرف تاریک زمانہ کا خاصہ تھا۔ اور یہ عقیدہ فاسد صرف

مگر زمانہ اپنا رنگ بدلتا گیا، وہ لوگ معدوم ہوتے گئے، اور بدعت اور شرک نے مذہب میں مستقل دخل پالیا، مقدس کتابیں نایاب تھیں۔ وہ بھی برباد ہوگئیں، یونانی ترجمے یا ترجموں کے ترجمے اور وہ بھی نقلوں کی نقل سے کئے گئے، اصلی محاورات اور فقرات کی لفظی بندش اور ان کے معانی غیر زبانوں کے ترجموں میں بدل گئے، افسوس ہے کہ عبرانی جو انجیل کی اصلی اور یہودیوں کی مادری زبان تھی، مسیح سے چند سال بعد مردہ ہوگئی، اور کچھ صدیوں کے بعد مردہ صد سالہ جو مبصر زندہ اور مردہ زبان میں فرق سمجھتے ہیں بآسانی سمجھ لیں گے کہ ایسے مذہب کا اثر کیا کچھ ہوسکتا ہے جسکی کتب مقدس مردہ زبان میں ہوں، وہ کہانتک عام فہم ہوسکتی ہیں، اور لفظوں اور روزمرّہ محاوروں کے معانی کی صحت کہاں تک درست ہوسکتی ہے،

عیسائیوں کے حصہ میں نہیں آیا۔ بلکہ دنیا کی تمام بت پرست قومیں اسی گمراہی میں بھٹکتی ہیں، مسیح کی پیدائش سے سینکڑوں بلکہ ہزارہا برس پیشتر دنیا کے مختلف حصوں میں ایسے اوتار اور دیوتا بیشمار گذرے ہیں، جو برساتی کیڑوں کی طرح پیدا ہوتے، اور انہیں سے بعض بدقسمت اب تک زندہ ہیں، ہندوستان، چین، مصر، یونان روم کی "مائی تھولوجی" نے عیسائیوں کو بھی انکا مقلد بنا دیا، اور سچ تو یہ ہے کہ وہ اس وقت معذور تھے، اس وقت اہل دنیا کا فہم حد بلوغت کو نہ پہونچا تھا، معقولی دلائل سے ان لوگوں کو سمجھانا بے سود تھا، اسی قسم کے کرشموں اور شعبدوں کے وہ معتقد تھے، یہ زمانہ ہی ایسا تھا اور عیسائیوں کو ان ہی لوگوں سے سابقہ پڑا، اور خود عیسائی بھی ایسے ہی دماغ کے آدمی تھے۔ اسی لئے تو مسیح تمام عمر ان سے پہیلیاں بجھواتے رہے، اور تمثیلوں میں گفتگو کرتے رہے، اور وہ پھر بھی نہ سمجھ سکے، اگر بت پرست اقوام کو ایسی ایسی باتیں بنا کر نہ پھسلاتے تو وہ مسیح کی ذات پر کیوں ایمان لانے لگے تھے، معلوم ہوتا ہے کہ مسیح کی پیدائش کی کہانی کسی نیک نیت عیسائی کا کام ہے جس نے نہایت دلیری سے ہندوؤں کے پرانوں، یا چینیوں کے افسانوں، یا غالباً مصر اور یونان کے بتخانوں سے یہ عقیدہ فاسد سرقہ کیا ہے، متی کے پہلے دو باب ہی ایک ایسی شہادت ہے جو عیسائی الوہیت کی دلیل میں بطور تحریری شہادت پیش کرسکتے ہیں اور یہ دونوں باب اصل کتاب کا جزو نہیں بلکہ زمانہ مابعد کی ایزاد ہے (گبن جلد پنجم)، ہماری رائے میں انجیل محفوظ کتاب نہیں، موجودہ زمانہ میں "پریس" نے کتب کو محفوظ کر دیا ہے گزشتہ زمانہ میں یہ صورت نہ تھی۔ اور انجیل کی حفاظت کا کسی زمانہ میں بندوبست نہیں کیا گیا، چند قلمی نسخے سخت نایاب تھے۔ ان کی نقلیں خاص خاص ہاتھوں میں تھیں، جو بہت جلد معدوم ہوگئیں۔ اصل زبان کے نسخے موجود نہیں، ترجموں نے بہت کچھ تحریف کو مداخلت کا موقع دیدیا، متی کے ابتدائی دو باب جو ہر ایک دلیل مسلمہ

ہماری رائے میں جس مذہب کی بنیاد کسی مردہ زبان پر ہے وہ خود مردہ ہے، خواہ یہ زبان عبرانی ہو، پہلوی ہو، یا سنسکرت ہو، توریت و انجیل، ژند اور وید کی زندگی کا خاتمہ ان زبانوں کے ساتھ ہی ہو چکا، اور قانون قدرت کے مخالف ہے کہ اس دنیا میں مردہ زندہ ہو، اور بالخصوص جن مذاہب کی ہستی کسی خاص شخص کی ذات سے وابستہ ہے، اسکا انجام مردہ زبان سے بھی بدتر ہے، مسیح ابھی تک زندہ ہوں یا عرصہ دراز سے فوت ہو چکے ہوں اس میں کچھ شک نہیں کہ ان کی زندگی انیس سو برس کی اس دنیا کی زندگی نہیں ہے۔

المختصر اس وقت عیسائی دنیا مسیح کی الوہیت اور تثلیث اور حلول و اتحاد کے مسائل کو معقولی دلائل سے حل کر رہی تھی کہ "ہرقل" کے پاس بھی دعوت اسلام کا پیغام پہنچا۔ عربی مورخ لکھتے ہیں کہ "ہرقل" کو اسلام کی حقانیت کا یقین ہو گیا تھا، مگر اس میں کچھ شک نہیں کہ اس نے کبھی اس کا اظہار نہیں کیا، ورنہ تخت و تاج کو خیرباد کہنا پڑتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کچھ عرصہ تک رومی سلطنت کے ساتھ عربوں کے تعلقات خوشگوار رہے اور اس عرصہ میں کسی قسم کی چھیڑ چھاڑ نہ ہوئی لیکن اسلام کی روزافزوں ترقی نے عیسائی پادریوں کو حاسد بنا دیا تھا۔ اور مسلمانوں کی طاقت نے رومی سلطنت کو خائف کر دیا۔ اور باہمی تعلقات کشیدہ ہوتے گئے۔ ۸ھ میں رسول خدا کے قاصد سرحد شام پر مارے گئے۔ اور عام مسلمانوں میں ایک جوش پیدا ہو گیا۔ اس لئے

پیدائش مسیح کی نہیں، صرف ایک دو لفظوں کے تغیر و تبدل سے تمام پیدائشی کہانی کو خاک میں ملا دیتے ہیں۔

یہ ہے مسیح کی پیدائش کی حقیقت۔ آنحضرت کی وفات ایک پامال شدہ مسئلہ ہے، اس پر ہم اس سے زیادہ کچھ کہنا نہیں چاہتے کہ مسیح صلیب پر ضرور لٹکائے گئے، مگر صلیب پر وفات نہیں پائی، لہذا اس قدر عرصہ میں کوئی شخص صلیب پر مر سکتا تھا، البتہ ان پر ایسی غشی طاری ہو گئی تھی کہ لوگوں کو شبہ ہو گیا تھا کہ وہ مر گئے ہیں، بیہوشی کے عالم میں انہیں صلیب سے اتارا گیا، اور مردہ سمجھ کر ایک قبر میں رکھا گیا۔ جس کا نقشہ اس کتاب میں ہم لکھ چکے ہیں، جس وقت وہ ہوش میں آئے، خود بخود قبر سے نکل آئے، غالباً یہ واقعہ رات کے کسی حصہ میں ہوا، اگر بالفرض محال یہ تسلیم کیا جائے کہ مسیح مصلوب ہوئے یعنی صلیب پر جان دی اور فی الحقیقت مر گئے تھے تو ہماری رائے میں یہ کوئی زبردست دلیل الوہیت نہیں، البتہ مر کر زندہ ہونا کچھ بات ہے، اگر آنحضرت قبر میں اسی طرح رہے جس طرح یونس مچھلی کے پیٹ میں جیسا کہ انجیل سے ظاہر ہوتا ہے تو یونس تو انسان تھے اور وہ مچھلی کے پیٹ میں بھی زندہ تھے، لیکن عیسائیوں کا خیال ہے کہ یسوع مسیح ضرور صلیب پر مر گئے، کیونکہ کفارہ کا اسکے بغیر خون ہوا جاتا ہے، مگر افسوس ہے کہ آنحضرت زندہ ہو کر دنیا میں تھوڑا عرصہ رہے، کچھ دنیا کی آب و ہوا

آنحضرتؐ نے زیدؓ بن حارثؓ کے ماتحت تین ہزار فوج شام پر حملہ آور ہونے کے لئے روانہ کی۔ زیدؓ آپؐ کے غلام تھے، لیکن اون مسلمانوں میں سے تھے جو سب سے پہلے آپ کی رسالت پر ایمان لائے تھے۔ اس وقت ان کے ماتحت قبیلہ قریش کے شرفاء اور آنحضرتؐ کے نامی اصحاب اور آپؐ کے چچازاد بھائی جعفرؓ بن ابی طالب بھی تھے۔ اسلامی اخوت نے فخر حسب و نسب اور ذاتی حیثیتوں کو مٹا دیا تھا۔ رسول خدا نے حکم دیا تھا کہ اگر زیدؓ شہید ہو جائیں تو ان کے بعد جعفرؓ اور اگر وہ بھی کام آئیں تو عبداللہ بن رواحؓ اور اگر وہ بھی مارے جائیں تو مسلمان جس شخص کو منتخب کریں اپنا سپہ سالار بنا لیں۔ مسلمان کوچ کرتے ہوئے شام کی سرحد پر آئے۔ ایک رات زیدؓ بن حارث نے عبداللہؓ بن رواحہ کو یہ شعر پڑھتے ہوئے سُنا، جو خود ان کے تصنیف کردہ تھے :-

اذا ادنیتنی وحملت رحلی	جب تو نے مجھے نزدیک کیا اور میرے کجاوہ کو کسا چار ماہ کی
مسیرۃ اربع بعد الحساء	مسافت کے لئے مقام حسا کے بھی آگے۔
فشانک فانعمی وخلاک ذم	اے دل اپنی شان کو دیکھ اور خوش ہو مذمت تجھ سے دور رہے؛
ولا ارجع الی اھلی ورائی	میں اس کے بعد اپنے اہل کی طرف نہ لوٹونگا۔
وجاء المؤمنون وغادرونی	مسلمان آئے اور مجھے شام کی مشہور خواب گاہ میں
بارض الشام مشھور الثواء	چھوڑ دیا۔
وردک کل ذی نسب قریب	اور عزیز و اقارب نے رشتہ توڑ کر خدا کے سپرد
الی الرحمٰن منقطع الاخاء	کر دیا۔
ھنالک لا ابالی طلع بعل	اس وقت نہ مجھے کسی بیوی سے شادی کی خواہش ہے اور نہ
ولا نخل اسافلھا رواء	ان کھجوروں کے باغ کی جنکے نیچے نہریں بہ رہی ہیں؛

زیدؓ ان اشعار سے بہت متأثر ہوئے۔

کی ناموافقت یا مردودیہودیوں کے خوف کے باعث یا کسی اور وجہ سے اس جگہ رہنا پسند نہ فرمایا، اور آسمان پر چڑھ گئے، یعنی دنیا میں ان کا عدم وجود یکساں ہے۔

یہ ہے اس مذہب کی حقیقت جسکا انحصار ایک فانی انسان کے وجود پر ہے؛ ایسی عمارت جو ریت پر تعمیر ہوئی ہے کب قائم رہ سکتی ہے۔ طوفان برپا ہوئے اور آندھیاں چلیں اور اس کے اجزاء کو پریشان کر دیا۔ یہ وہ تمثیل ہے جسکی نسبت مسیح نے فرمایا تھا کہ "جسکے کان سننے کے ہوں سُنے"۔ +

مقام "معان" پر مسلمانوں کو پرچہ لگا کہ "ہرقل" نے ایک لاکھ رومی اور ایک لاکھ عربی عیسائیوں کو مقابلہ کے لئے روانہ کیا ہے، جو اس وقت مقام "مآب" میں اس کا انتظار کر رہے ہیں، معان پر مسلمانوں نے دو دن مقام کیا، اور آپسمیں مشورہ کیا کہ رسول اللہ کو دشمن کی کثرت کی خبر دیکر کمک طلب کرنی چاہئیے لیکن عبداللہ بن رواحہ نے مسلمانوں کو جوش دلایا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان آگے بڑھے۔ اور شہر بلقاء کے نواح میں بمقام شراف رومیوں سے مڈبھیڑ ہو گئی، لیکن مسلمانوں کو اس جگہ سے ہٹنا پڑا۔ اور "موتہ" پر کیمپ قائم کیا، اس جگہ مسلمانوں اور رومیوں کے درمیان سخت خونریز جنگ ہوا، زید بن حارث[۹] سب سے آگے تھے، نہایت بہادری سے لڑے اور شہید ہو گئے، جعفر بن ابی طالب نے علم اپنے ہاتھ میں لیا اور آگے بڑھے، داہنا ہاتھ کٹ گیا تو بائیں ہاتھ میں علم لے لیا، وہ بھی کٹ گیا تو علم کو سینے سے لگا لیا، ستر زخم سینے پر کھائے اور گر پڑے، عبداللہ بن رواحہ نے علم کو تھاما، آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا رہے تھے اور یہ شعر پڑھتے تھے:-

یا نفس الا تقتلی تموتی	اے دل اگر تو قتل نہ ہوگا تو مرنا ایک دن ضرور ہے،
ھذا حیاض الموت قد صلیت	موت کے حوض لبریز ہیں اور تو نے بھی انہیں ڈھونڈھا ہے،
وما تمنیت فقد لقیت	تیری آرزوئے شہادت پوری ہوئی، اگر تو زید
وان تفعلی فعلہما ھدیت	اور جعفر کی طرح کام کرے گا تو مقصود پر پہونچ جائیگا،
وان تاخرت فقد شقیت	اور اگر ان سے پیچھے رہا تو نامراد رہے گا۔

عبداللہ بن رواحہ علم ہاتھ میں لئے ہوئے رومی صفوں میں گھسے اور ان کے پیچھے مسلمانوں نے بھی حملہ کیا، عبداللہ لڑتے ہوئے کام آئے، اس وقت خالد بن ولید نے مسلمانوں کو للکارا کہ اے مسلمانوں

حاشیہ نمبر ۹- زید بن حارث آٹھ برس کے تھے کہ ایک مرتبہ ان کی والدہ انکو ساتھ لے کر اپنے خاندان بنی معن سے ملنے گئیں، راستہ میں بنی تمین بن جبر کے سواروں نے انپر ڈاکہ مارا، زید گرفتار ہو کر بطور غلام بازار عکاظ میں بکے، رسول خدا نے نبوت سے پیشتر خدیجہؓ کے مال سے خرید کیا، خدیجہؓ نے آپ کو ہبہ کر دیا، آنحضرتؐ نے زید کو اپنا متبنیٰ بنا لیا، لوگ انہیں ابن محمدؐ کہتے تھے، لیکن جب یہ آیت نازل ہوئی کہ "ادعوھم لاٰبائھم" تو ابن حارث کہنے لگے، رسول خدا نے حضرت حمزہ اور زید میں مواخاۃ کرا دی تھی، زید اور ان کے والد کا قصہ حضرت یوسف اور یعقوب کے مشابہ ہے۔

آگے بڑھو۔ اس دن سیف اللہ کے ہاتھ میں نو تلواریں رومیوں کے خود پر ٹوٹیں۔ مسلمان ایسے جی توڑ کر لڑے کہ رومی پسپا ہو گئے۔ مگر اسلامی فوج کی قلت نے مسلمانوں کی پیشقدمی کو روک دیا۔ رات کی تاریکی نے پردہ داری کی۔ اور خالدؓ مسلمانوں کی پسماندہ فوج کو مدینہ منورہ کی طرف بچا کر لے آئے۔ رسولؐ خدا اور مسلمانوں نے اگر شہدا موتہ پر آنسو بہائے تو قدرتی امر تھا۔ لیکن اس واقعہ نے مسلمانوں میں ایک ایسا جوش پیدا کر دیا تھا کہ ایک اور مہم تیار ہو گئی جس کے سپہ سالار رسولؐ خدا بذات خود تھے۔ دس دن کے بعد چشمہ "تبوک" پر پہونچے۔ جو مدینہ اور دمشق کے درمیان واقع ہے۔ اس جگہ کوئی لڑائی نہ ہوئی۔ کیونکہ سرحدی قبائل نے جزیہ دینا پسند کیا۔ اور صلح و امن کا عہد باندھا۔

زیدؓ بچپن میں قید غلامی میں پڑے۔ آپ کے والدان کی جُدائی میں روتے پیٹتے معلوم نہیں تھا کہ بچہ زندہ ہے یا مر گیا۔ اور اگر زندہ ہے تو کہاں اور کس حال میں ہے؟

بکیت علی زید ولم ادر ما فعل	زید کے لئے رو رہا ہوں۔ مجھے معلوم نہیں کہ زید کو کیا ہوا۔ آیا
احی یرجی ام اتی دونہ الاجل	وہ زندہ ہے کہ پھر ملنے کی امید ہو یا اُسے موت آگئی۔
فواللہ ما ادری وان کنت سائلاً	خدا کی قسم میں نے تیری نسبت بہت دریافت کیا مگر کچھ پتہ نہ ملا۔ معلوم
اغالک سہل الارض ام غالک الجبل	نہیں کہ تجھے زمین ہموار غائب کر گئی یا پہاڑ نے چھپا لیا۔
فیا لیت شعری ھل لک الدھر رجعۃ	اے کاش مجھے معلوم ہوتا کہ تو کبھی نہ کبھی واپس آئیگا۔ دنیا میں میرا دل
فحسبی من الدنیا رجوعک لی علل	بہلانے کے لئے تیرے واپس لوٹنے کی امید کافی ہے۔
تذکرنیہ الشمس عند طلوعھا	آفتاب جب طلوع ہوتا ہے تو مجھے زید کی یاد آتی ہے اور جب غروب ہوتا
و یعرض ذکراہ اذا قارب الطفل	ہے تب بھی اسی کی یاد ہوتی ہے۔ (یعنی تمام دن اُسی کی یاد میں گذرتا ہے)
وان ھبت الارواح ھیجن ذکرہ	جب ہوائیں چلتی ہیں تو اسکی یاد تازہ ہوتی ہے۔ میرا رنج و غم اسکی یاد
فیا طول ما حزنی علیہ و یا وجل	میں بہت بڑھ گیا ہے۔
ساعمل نص العیش فی الارض جاھدًا	میں اسی رنج و غم میں گھل گھل کر مر جاؤنگا۔ اور گو اونٹ تھک جائے
ولا اسأم التطواف او تسام الابل	مگر میں طواف کرنے سے نہ تھکونگا۔
حیاتی او تاتی علی منیتی	یہاں تک کہ مجھے موت آجائے۔
و کل امرئ فان وان غرہ الامل	اور ہر آدمی مرنے والا ہے گو آرزو میں اس کو دھوکہ دیں۔

رسُولِ خدا انجگہ سے واپس ہو گئے؛ جس وقت آنحضرتؐ حجۃ الوداع سے فارغ ہوکر مدینہ منورہ میں آئے تو معلوم ہوا کہ "ہرقل" عرب پر حملہ کرنے کے لئے سرحد شام پر فوج جمع کر رہا ہے؛ آنحضرتؐ نے ایک لشکر

مما وصی بہ قیسا وعمرا کلاھما	میں زید کی تلاش کی وصیت قیس، عمرو، اور یزید اور جبل کو کر جاؤنگا
داوصی یزید اثم من بعدہ جبل	(جبلہ اور یزید زید کے اخیافی بھائی تھے)؛

کچھ آدمی قبیلہ کلب کے حج بیت اللہ کے لئے مکہ معظمہ میں آئے اور زید کو دیکھ کر پہچان لیا؛ زید نے بھی انکو شناخت کرلیا؛ اور کہا کہ میرے گھر والوں کو میری طرف سے یہہ اشعار پہنچا دینا کیونکہ مینے سنا ہے کہ میرے واسطے بہت غم کھاتے ہیں؛

احن الی قومی وان کنت نائیا	میں اپنی قوم کے لئے بہت رویا کرتا ہوں اگرچہ دور پڑا ہوں، اب
فانی قعید البیت عند المشاعر	میں کعبہ کے قریب ایک گھر میں رہتا ہوں؛
فکفوا من الوجد الذی قد شجاکم	لہذا تم اس غم سے جس نے تمہیں زخمی کر دیا ہے باز آؤ؛ اور
ولا تعملوا فی الارض نص الاباعر	اونٹ کی طرح محنت وتکالیف نہ اٹھاؤ؛
فانی بحمد اللہ فی خیر اسرۃ	الحمدللہ کہ میں قید ہوکر ایک عمدہ گھرانے کے ہاتھ پڑا یعنی معد کے
کرام معد کا برا مجد کا بر	گھرانے میں آیا جہاں عظمت وکرم موروثی ہے؛

یہ لوگ جب واپس ہوئے تو زیدؓ کے والد کو خبر دی اور مقام اور مالک کا پتہ دیا؛ زید کے والد اور چچا آپ کا فدیہ لے کر رسُول کریم کے پاس آئے؛ اور کہا کہ "اے عبدالمطلب کے صاحبزادے؛ اے ہاشم کے بیٹے؛ اے قوم کے سردار کے لڑکے"۔ ہم آپکے پاس اپنے لڑکے کے واسطے آئے ہیں؛ جو آپکے پاس ہے؛ پس اس کا فدیہ لیکر ہم پر احسان کیجئے اور ہمارے ساتھ اچھا سلوک کیجئے؛ آپ نے فرمایا کہ زید کو بلاؤ۔ اگر وہ تمہارے ساتھ جانے پر راضی ہو تو وہ آزاد ہے؛ اور اسکو اختیار ہے؛ اور اگر مجھے پسند کرے تو بخدا میں ایسا شخص نہیں ہوں کہ جب مجھے پسند کرے اسکی مرضی کے خلاف میں کسی کو اختیار دوں؛ مگر زیدؓ نے آنحضرتؐ کی مفارقت گوارا نہ کی؛ اس کے باپ نے کہا؛ "زید تیرا بُرا ہو کیا تو غلامی کو آزادی پر ترجیح دیتا ہے اور اپنے لواحقین پر غیروں کو پسند کرتا ہے"؛ زید نے کہا کہ میں نے اس آدمی میں وہ خوبیاں دیکھی ہیں کہ ان کو چھوڑ نہیں سکتا؛ جس وقت زید کے والد اور چچا کو یہ تمام حالات معلوم ہوئے تو ان کے دل خوش ہو گئے؛

زید کی نسبت بعض لوگوں کا خیال ہے کہ سب سے پہلے وہ اسلام لائے۔ اگر یہ غلط ہو تو اس میں کچھ شک نہیں کہ

بسر کردگی اسامہ بن زیدؓ شہید موتہ اس طرف روانہ کیا، اس لشکر میں حضرت عمرؓ بھی بطور ایک سپاہی اسامہ کے ماتحت تھے، یہ لشکر ابھی نواح مدینہ ہی میں تھا کہ رسولؐ اللہ نے اس دارفانی سے رحلت فرمائی۔

زید تیسرے یا چوتھے مسلمان ہیں۔ اور اس لئے رسولؐ خدا کو بہت عزیز تھے، غزوہ بدر میں شریک ہوئے اور فتح کا مژدہ مدینہ میں لیکر گئے، رسولؐ خدا نے ان کا نکاح اپنی لونڈی ام ایمن سے کر دیا۔ اور انہی سے اسامہؓ پیدا ہوئے، زید کا دوسرا نکاح زینب بنت جحش سے ہوا جو رسولؐ خدا کی پھوپھی کی بیٹی تھیں۔ اس نکاح کے متعلق دشمنان دین نے بہت کچھ بیہودہ اعتراض کئے ہیں مگر زیادہ تر افسوس اس امر کا ہے کہ۔

من از بیگانگاں ہرگز نہ نالم

ہمارے خوش اعتقاد مفسرین نے جھوٹی سچی روایتوں اور حکایتوں کا ذخیرہ اس قدر بہم پہونچایا ہے کہ دشمنوں کو نکتہ چینی کی بہت گنجائش ہے۔

ہمارے سامنے سورۂ "الاحزاب" ہے جسمیں اس واقعہ کی نسبت ان اعتراضوں کا شافی جواب دینے کے لئے کافی تحریری شہادت ہے، اعتراض یہ ہے کہ زید رسولؐ خدا کے متبنیٰ تھے۔ اور زینب زید کی منکوحہ عورت تھی، زید نے رسولؐ خدا کے ایما سے زینب کو طلاق دی اور خود آنحضرتؐ نے زینب کے ساتھ نکاح کر لیا۔

نبوت سے پیشتر جیسا کہ ہم لکھ چکے ہیں رسولِ خدا نے زید کو متبنیٰ بنایا تھا۔ ایام جاہلیت کی یہ ایک رائج رسم تھی، اور اس میں کچھ شک نہیں کہ منہ بولے بیٹے کو لوگ بیٹا ہی سمجھتے تھے۔ اور اس لئے اسکی منکوحہ عورت ان پر حرام ہوتی تھی۔ یہ رسم تبنیت ہندوستان کی بت پرست قوموں اور دیگر ممالک میں قدیم الایام سے اب تک جاری ہے لیکن اسلام نے جس طرح دیگر مذموم رسوم کی جڑ کاٹ دی، اسی طرح تبنیت کی بھی ایک حد تک بیخ کنی کر دی۔ چنانچہ قرآن مجید کی سورۃ۔ "الاحزاب" اس طرح شروع ہوتی ہے :۔

"یا ایها النبی اتق الله ولا تطع الکفرین والمنافقین ان الله کان علیما حکیما، واتبع ما یوحیٰ الیک من ربک، ان الله کان بما تعملون خبیرا۔ وتوکل علی الله۔ وکفیٰ بالله وکیلا۔ ما جعل الله لرجل من قلبین فی جوفه، وما جعل ازواجکم الّٰئ تظاهرون منهن امهٰتکم، وما جعل ادعیاءکم ابناءکم، ذالکم قولکم بافواهکم، والله یقول الحق وهو یهدی السبیل۔ ادعوهم لاٰبائهم هو اقسط عند الله"

"اے نبی اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو، اور کافروں اور منافقوں کی باتوں میں نہ آؤ، کیونکہ اللہ تعالیٰ علیم و حکیم ہے،

اور آپ کے بعد آپ کے یار غار صدیق اکبرؓ مسند خلافت پر متمکن ہوئے۔ اس وقت یمن اور دیگر مقامات کے لوگوں نے ارتداد اختیار کیا، اور زکاۃ دینے سے انکار کر دیا۔ اس لئے خلیفہ اوّل کو یہ مشورہ دیا گیا کہ

اور جس طرح تمہیں کہا جاتا ہے اسی طرح عمل کرو۔ اللہ تعالیٰ کو تمہارے ہر ایک عمل کی خبر ہے۔ اور اللہ پر بھروسہ کرو اور وہی اللہ تمہارا کارساز بس ہے "۔ کفار اور منافق تو پرانی لکیر کے فقیر ہیں، اور جو کچھ مذموم رسوم رائج ہیں ان کی پابندی پر متعصبانہ اصرار کرتے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ جسے ہر ایک چیز کا علم ہے۔ اور جس کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں ان کافروں اور منافقوں کے ساتھ ان کی بری رسموں اور رواجوں کی بیخ کنی کر رہا تھا، اور رسولِ کریم کو بذریعہ وحی ان کی مضرتوں سے آگاہ کیا۔ اور ان کو ترک کرنے کے لئے حکم دیا گیا، چنانچہ آپنے احکام الٰہی کی تعمیل میں ان کو چھوڑ دیا۔ اور مسلمانوں کو بھی یہی تعلیم دی۔ کفار اور منافق چہ میگوئیاں کرتے تھے، اس میں کچھ شک نہیں کہ رائج الوقت رسم و رواج کو خواہ وہ کیسے ہی مذموم کیوں نہ ہوں، کوئی شخص یک لخت توڑنے کی جرأت نہیں کرتا، ایسا شخص مورد طعن و تشنیع بن جاتا ہے، لیکن دنیاداروں کا ڈر اہل اللہ کو نہیں ہوتا۔ اور نہ وہ ان لوگوں کی پرواہ کرتے ہیں کہ کیا بکتے ہیں، وہ مصلح ہوتے ہیں اور ان کا مقصود اصلاح ہوتا ہے، لوگ ان کو کتنا ہی برا کیوں نہ کہیں، زیبا نہیں کہ وہ ان کی باتوں میں آکر مفید کام کو ترک کر دیں۔ ایامِ جاہلیت کی رسوم کا مثلاً دختر کشی، بیواؤں کی شادی نہ کرنا، عورتوں کو ذلیل و حقیر مخلوق سمجھ کر ذرا ذرا سی بات پر ناراض ہو کر طلاق دینا، وغیرہ وغیرہ۔ قلع قمع اسلام نے خاطر خواہ کیا، اسلام سے پیشتر یہ رسمیں دنیا کے ہر ایک حصہ میں رائج تھیں، لیکن اسلام کی اشاعت کے ساتھ مفقود ہوتی جاتی ہیں، ہندوستان میں ستی کی نہایت بری رسم اس لیے جاری تھی کہ بیوہ عورت کسی آدمی سے نکاح نہیں کر سکتی تھی، اور فرقہ ذکور جو اضعاف رسم و رواج تھا فطرتی تقاضا سے خائف تھا، اس لئے عورت کو مردہ خاوند کے ساتھ زندہ جلا دیا جاتا، قرین انصاف تو یہ تھا کہ اگر تقاضاء محبت اس پروانہ کو شمع مردہ پر جلنے کے لئے مجبور کرتا تو مردہ عورت کے ساتھ اس کا زندہ خاوند بھی جلا کرتا، مگر مرد اپنی ذات کو مکلف کیوں بناتے، اگر عورت ستی ہونا پسند نہ کرتی، تو اسے تمام عمر قدرتی خواہشات کا مقابلہ کرنا پڑتا، کسی زیور یا سامان حسن صورت کو استعمال نہ کر سکتی تھی، غرض زندگی اس تلخکامی سے بسر کرتی کہ جس سے زندہ درگور ہونا بدرجہا بہتر تھا، لیکن موجودہ زمانہ میں بیواؤں کی شادی کے متعلق عام تحریک ہندوؤں میں ہو رہی ہے، وہ اعتراف نہ کریں مگر اس میں کچھ شک نہیں کہ یہ سب کچھ اصلاحی کارروائیاں اسلام کی برکتوں کی بدولت ہیں، اسی طرح اگر مرد کبھی زوجہ کو ماں کہہ بیٹھتا تو وہ فی الحقیقت ماں ہی سمجھی جاتی اور ہمیشہ

شامی جھم کو واپس بلانا چاہئے، جب گھر کا انتظام خاطر خواہ ہو جائیگا تو ان کی خبر لینا۔ صدیق اکبرؓ نے کہا کہ "جو کام رسول اللہؐ نے شروع کیا میں اسے کبھی ادھورا نہ چھوڑونگا"۔ اور شام کی طرف

تعلقات زن وشوہر ٹوٹ کر والدہ وفرزند کے قائم ہو جاتے، اگر کسی کو بیٹا کہہ دیا تو وہ اصلی وصلبی بیٹے کی طرح تصوّر ہوتا۔ یہ باتیں صریحًا قانون قدرت کے مخالف ہیں، اصل اصل ہے اور نقل نقل ہے، ماں تو وہی ہے جس کے پیٹ سے پیدا ہوئے جو تعلقات ماں سے اسکے حقیقی بیٹے کو ہیں وہ کسی اور سے کبھی نہیں ہو سکتے، وہ ایک ایسا رشتہ ہے جو قدرت کے مضبوط ہاتھوں نے باندھا ہے، اور یہ صرف ہمارے مُنہ کی باتیں ہیں، کسی شخص کے سینے میں دو دل نہیں ہوتے۔ اور قدرتی میلان طبع ایک اور بات ہے اور مصنوعی تعلقات کچھ اور، اسی طرح ایک لڑکا کبھی حقیقی بیٹے کی شل نہیں ہو سکتا، اور وہ قدرتی محبت اور فطرتی تعلق جو باپ کو بیٹے سے ہے ایک مُنہ بولے بیٹے سے نہیں ہو سکتا"

اسلام جو نیچرل مذہب ہے اور جس کے احکام قانون قدرت کے مطابق ہیں، کب ایسی صنعت کو جائز رکھ سکتا ہے جو قدرت کے مخالف ہے، جب ایک غیر کا لڑکا حقیقی بیٹا نہیں ہو سکتا اور وہ دل جو قدرت نے سینے میں رکھا ہے کبھی اس سے اس حقیقی محبت سے پیش نہیں آتا، تو ایسے احکام کا جو ایک حقیقی بیٹے کے متعلق ہیں اس مُنہ بُولے بیٹے یعنی متبنّی پر اطلاق کس طرح ہو سکتا ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ متبنی کو اس کے اصلی باپ کا فرزند کہو، جیسا کہ وہ فی الحقیقت ہے اور جیسا کہ قدرت نے اسکو بنایا ہے، بیشک کسی غیر کے لڑکے کو بیٹا کہو اور اُس سے محبت کرو، اس کے ساتھ نیک سلوک کرو، لیکن قدرت ان جاہلوں پر ہنستی ہے جو اسکو اپنا اصلی بیٹا سمجھتے ہیں"

جب متبنّی حقیقی بیٹا نہیں ہو سکتا تو اسکی زوجہ کو وہ رتبہ کیسے مل سکتا ہے جو ایک صلبی بیٹے کی عورت کو حاصل ہے، اس لئے یہ اعتراض کہ آنحضرتؐ نے اپنے متبنّی کی عورت سے شادی کی نہایت نامعقول ہے، دشمنانِ دین نے اس واقعہ پر وہ حاشیہ چڑھایا ہے جو ایسی روائتوں پر مبنی ہے جن کا کذب مفصلہ ذیل آیات سے واضح ہوتا ہے:

"وما کان لمؤمن ولا مؤمنة اذا قضی الله ورسوله امرا ان یکون لهم الخیرة من امرهم ومن یعص الله ورسوله فقد ضل ضلالا مبینا - واذ تقول للذی انعم الله علیه وانعمت علیه امسك علیك زوجك واتق الله وتخفی فی نفسك ما الله مبدیه وتخشی الناس والله احق ان تخشٰه - فلما قضی زید منها وطرا زوجنٰکها لکی لا یکون علی المؤمنین حرج فی ازواج

کوچ کا حکم دیدیا۔
یہ تھیں اس عظیم الشان جنگ کا پیش خیمہ تھیں جسکا آغاز خلافت کے پہلے سال میں ہوا۔ اس وقت
مسلمانوں نے ایک ہی وقت میں فارس اور شام پر فوج کشی کی۔ ابو عبیدہ جراح کو دمشق اور شرجبیل بن

ادعیائھم اذا قضوا منھن وطراً۔ وما کان امر اللہ مفعولا۔"
اللہ اور رسول اگر کسی شخص کو ایک کام کرنے کا حکم دیں تو خواہ وہ مومن مرد ہو یا مومنہ عورت ہو اس حکم کی تعمیل سے
سر پھیر نا زیبا نہیں۔ کیونکہ اللہ اور رسول کبھی ایسا حکم نہیں دیں گے جو ان کی بہتری کے برخلاف ہو اس لئے ایسے
حکم سے روگردانی ہمو سمجھا اپنے نفع کو ضرر پہونچانا ہے۔ اور اس لئے گمراہی کی دلیل ہے۔ ان آیات میں زید کے طریق
عمل پر اللہ تعالیٰ نے سخت ناراضگی کا اظہار فرمایا ہے۔ کہ اے نبی تو اس شخص کو جس پر اللہ تعالیٰ نے احسان کیا کہ
اسکی پرورش کی۔ راہ مستقیم پر چلایا۔ اور غلامی سے نکال کر آزاد آدمیوں کے برابر کر دیا بلکہ ان سے بھی ممتاز بنا دیا
اس شخص کو تو کہتا تھا۔ امسك عليك زوجك واتق اللہ "کہ اپنی زوجہ کو مت چھوڑ اور خدا سے ڈر
لیکن اس نے یعنی زید نے اپنی زوجہ کو طلاق دیدی۔ اب سوال یہ ہے کہ زید نے زینب کو کس لئے طلاق دی۔
طلاق کا باعث یہ بیان کیا جاتا ہے کہ زینب قبیلہ قریش سے تھی۔ اور رسول خدا کی رشتہ دار تھی۔ زید کو پسند نہ کرتی
تھی جو غلام تھا اور جو کسی طرح اس کا ہمسر نہیں ہو سکتا تھا۔ چونکہ وہ زید کو حقیر سمجھتی تھی اس لئے زید نے تنگ آکر
اسے طلاق دیدی۔ یہ حکایت بالکل غلط ہے۔ اگر زینب زید کو ایسا ہی حقیر سمجھتی تھی تو ممکن نہیں کہ وہ ابتدا ہی سے
نکاح پر رضامند ہوتی۔ اور علاوہ ازیں زید کی عزت ہر ایک معزز صحابی کرتا تھا۔ بلکہ مورخین نے تو یہاں تک لکھا ہے
کہ اگر وہ زندہ رہتا تو تعجب نہیں کہ رسول خدا کے بعد وہی خلیفہ ہوتا۔ معقولی دلائل اور اصول درایت سے قطع نظر آیات
محولہ بالا پر غور کرو اگر زینب زید کو حقیر سمجھتی تو ایسا شخص جس سے رسول خدا محبت کرتے تھے۔ اور جسکی عزت ہر ایک
کی نگاہ میں مسلمہ تھی کیوں عتاب الٰہی کا مخاطب ہوتا۔ قصور تو زینب کا تھا کہ وہ زید کو حقیر سمجھتی تھی اس لئے زجر
کی وہ مستحق تھی نہ کہ زید۔ مذکورہ بالا آیات سے واضح ہوتا ہے کہ قصور سراسر زید کا تھا اور اس لئے رسول خدا نے
اُسے کہا کہ "اللہ سے ڈر اور اپنی زوجہ کو طلاق نہ دے"۔ اگر زینب کی طرف سے ابتدا ہوتی تو رسول کریم اسے
سمجھاتے بلکہ زید بھی یہی عذر پیش کرتا۔ اصل بات یہ ہے کہ زید نے زینب کو پسند نہ کیا۔ کیونکہ زینب حسن صورت
نہیں رکھتی تھی۔ آیات محولہ بالا کی مقدم آیات پر غور کیا جائے اور ان آیات موقع و محل آیات باب کے ساتھ تعلق
اس واقعہ پر مزید روشنی ڈالتا ہے۔

حسنہ کو اردن، اور عمرو بن العاص کو ارض فلسطین پر حملہ کا حکم تھا۔ مسلمان شام کے مختلف حصوں میں متفرق ہو گئے۔ ان کی کل جمعیت سات ہزار تھی۔ "ہرقل" نے ان کے مقابلہ میں پچاس ہزار سوار روانہ کیے۔ صدیق اکبرؓ کو دشمن کی کثرت کی اطلاع ملی۔ تو خالد بن ولید کو جو اس وقت عراق میں جنگ

؎ ان المسلمین والمسلمات والمؤمنین والمؤمنات والقانتین والقانتات والصادقین والصادقات والصابرین والصابرات والخاشعین والخاشعات والمتصدقین والمتصدقات والصائمین والصائمات والحافظین فروجھم والحافظات والذاکرین اللہ کثیرا والذاکرات اعد اللہ لھم مغفرۃ واجراً عظیماً۔

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے مرد اور عورت کے وہ تمام اوصاف بیان فرمائے ہیں جو مغفرت اور اجر عظیم کے مستحق ہیں۔ ایسے مرد اور عورت جو اوصاف متذکرہ بالا سے متصف ہوں۔ ایک دوسرے کے ساتھ باہمی تعلقات زن شوئی قائم کریں تو نہایت موزوں ہے۔ اور فی الحقیقت وہی مرد یا عورت مستحق عزت ہے جس میں یہ اوصاف موجود ہوں۔ مرد کو عورت کی ذات میں یہی وصف دیکھنے چاہئیں۔ اور اگر عورت کو خاوند کی ضرورت ہو تو یہی وصف معیارِ پسندیدگی ہیں۔ ان اوصاف میں حسن صورت کا کہیں ذکر نہیں۔ زید نے جب زینب کو زیورِ حسن سے معرا دیکھا تو طلاق کا ارادہ کرلیا۔ اور اسی واسطے مورد عتاب الٰہی ہوا۔ اگر زینب میں وہ خوبی نہ ہوتی جس کا تذکرہ آیات مذکورہ بالا میں کیا گیا ہے اور زید طلاق دیتا تو اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول اس پر ناراضگی کا اظہار نہ فرماتے۔ مگر چونکہ اسکی نظر ظاہری حسن صورت پر تھی۔ اور اس نے ان خوبیوں کی طرف توجہ نہ کی جن کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس لیے رسول اللہ صلعم نے فرمایا "امسک علیک زوجک واتق اللہ"۔ یہ روایت کہ زینب خوبصورت تھی اور اپنے حسب و نسب پر فخر اور زید سے نفرت کرتی تھی۔ اس لئے غلط ہے کہ مذکورہ بالا اوصاف کے منافی ہے۔ اور اس صورت میں زید واتق اللہ کا مخاطب نہ ہوتا۔"

زینب کو زید کے حسب و نسب وغیرہ کا بخوبی علم تھا لیکن نکاح سے پیشتر زید نے زینب کی صورت نہیں دیکھی تھی۔ ممکن ہے کہ اگر اسے اسکا علم ہوتا تو وہ انکار کر دیتا۔ جیسا کہ نکاح کے بعد اس نے کیا۔ ہماری رائے یہ ہے کہ زینب نہ صرف خوبصورت نہ تھی بلکہ کریہہ منظر تھی۔ اور طبعی نفرت کی وجہ سے زید بھی مجبور تھا۔"

رسول خدا نے متبنّی کی اصلی حیثیت کا اظہار لوگوں پر کر دیا تھا۔ اور اس جاہلانہ رسم کے برخلاف احکام الٰہی کی تبلیغ کر دی تھی۔ اس واقعہ نے اب عملی کاروائی کا موقع دیا۔ قدرتاً آنحضرتؐ کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اگر زید نے زینب کو طلاق

کر رہے تھے، لکھا کہ اپنے بھائیوں کی امداد کے لئے شام کی طرف جاؤ۔ خالد رضؓ نے ثمنہ بن حارثہ کو اپنے پیچھے چھوڑا اور خود شام کی حدود میں داخل ہو گئے۔ ہرقل نے بائیس ہزار سوار و پیادہ کو پہلی فوج کی کمک کے لئے روانہ کیا۔ اور اس کے بعد متواتر کمک بھیجتا رہا۔ اِدھر سے صدیق اکبر رضؓ نے

دی تو زینب کی آیندہ زندگی پر اسکا کیا اثر ہوگا، اگر کسی اور مومن مسلمان کو نکاح کرنے کے لئے کہو لگا تو جن وجوہات پر زید نے طلاق دی ہے وہی دوبارہ پیش ہو سکتی ہیں، اور علاوہ ازیں موجودہ صورت میں لوگ یہی کہیں گے کہ رسولؐ زینب سے خود نکاح کرنے سے اس لئے جی چراتا ہے، کہ وہ اسکو متبنّیٰ کی عورت ہے۔ اور اگرچہ "حلائل ابنائکم الذین من اصلابکم" کی آیت نے متبنّیٰ کی زوجہ کو حلال ٹھرایا ہے، مگر رسولؐ اپنی ذات کو اس کا پابند کرنا نہیں چاہتا، کیونکہ اس وقت اس رسم جاہلیت کے برخلاف اگر کوئی شخص عملی ثبوت دیسکتا تھا تو وہ رسولؐ خدا کی ذات تھی، اگر کوئی اور شخص زینب سے نکاح کر لیتا تو اس رسم جاہلیت کی بیخکنی عملاً نہیں ہو سکتی تھی" قیاس ہو سکتا ہے کہ رسولؐ خدا نے سمجھ لیا تھا کہ ایک تو زینب کے ساتھ کوئی شخص بخوشی خاطر نکاح نہیں کریگا۔ اور ہر ایک شخص آپکی ذات سے توقع کرے گا۔ کہ متبنّیٰ کی زوجہ کے ساتھ خود بھی نکاح کر کے احکام الٰہی پر عمل کریں؛ اور اگر آپنے زینب سے نکاح کر لیا۔ تو کفار اور منافقین کو چہ میگوئیوں کا کیا اچھا موقع ملیگا، فی الحقیقت مروجہ رسم کو توڑنا گو وہ نہایت مذموم اور خلاف قانون قدرت اور فطرت انسانی ہو آسان کام نہیں، اور رسولؐ خدا کو جس بات کا ڈر تھا وہ یہ نہیں تھا کہ وہ متبنّیٰ کی زوجہ کے ساتھ نکاح کرنا مکروہ سمجھتے تھے اور اس لئے احکام الٰہی کی تعمیل سے پہلو تہی کرنا چاہتے تھے، ڈر تھا تو یہ تھا کہ اب موقع اسپر عمل کرنے کا ہے لیکن کفار اور منافقین کیا کچھ نہ کہیں گے"۔ مگر اللہ تعالیٰ کو منظور یہ تھا کہ ایک مثال قائم ہو جائے، اور اگر رسولؐ نے باوجود موقع ہاتھ لگنے کے جرأت نہ کی تو آیندہ کون کریگا، اور اس طرح یہ رسم جاہلیت جاری رہیگی، اس لئے اللہ تعالیٰ نے ایسے اسباب جمع کر دیئے کہ کوئی اور شخص زینب کے نکاح پر رضامند نہ ہو اور خود رسول اللہ نکاح کریں"۔

ایک اور سوال یہ ہے کہ کیا رسولؐ خدا نے زینب کے ساتھ نکاح ایام عدت کے بعد کیا، آیات محولہ بالا کے بعد اور در اصل ساتھ ہی یہ آیت ہے:۔

"یاأیہا الذین امنوا اذا نکحتم المومنٰت ثم طلقتموھن من قبل ان تمسوھن فما لکم علیھن من عدۃٍ تعتدونہا، فمتعوھن وسرحوھن سراحاً جمیلاً"۔ یعنی اگر نکاح کے بعد عورت کو ہاتھ نہیں لگایا اور طلاق دیدی تو عدت کی ضرورت نہیں، قیاس غالب ہے کہ زید نے بوجہ کراہت نفس

بھی عرب کے مختلف شہروں میں نامے بھیجے کہ اپنے مذہب، قوم، اور ملک کو اغیار کے حملوں سے بچاؤ اور جہاد فی سبیل اللہ میں آگے بڑھو۔ خلیفہ کی آواز پر عرب کے مختلف شہروں سے مسلمان مدینہ منورہ میں جمع ہونے لگے اور صدیق اکبرؓ وقتاً فوقتاً انہیں فارس اور شام کی طرف روانہ کرتے رہے۔

شرجیلؓ بن حسنہ "بصری" کے سامنے پڑے تھے جو دمشق سے چار منزل پر تھا، بصری حوران کے علاقہ میں ایک مضبوط شہر تھا، چونکہ شام، عراق، اور حجاز کے کارواں اس جگہ جمع ہوا کرتے تھے۔ اس لئے بارونق شہر تھا۔ تجارت نے اسے دولتمند اور آباد اور محفوظ شہر بنا رکھا تھا، یہ وہی شہر تھا جہاں "دیر بصری" کی عمارت تھی، اور جس جگہ رسول خدا ایک تاجر کی حیثیت سے وارد ہوئے تھے اور اس جگہ بحیرہ راہب سے ملاقات ہوئی۔ شعراء عرب نے اس شہر اور دیر کے متعلق بہت کچھ لکھا ہے، صمہ بن عبد اللہ القشیری کہتا ہے:-

نظرت وطرف العین یتبع الھویٰ
بشرقی بصری نظرۃ المتطاول
لابصر نارا او قدت بعد ھجعتہ
لریا بذات الرمث من بطن حائل

زماخ بن میادہ کہتا ہے:-

زینب کو ہاتھ نہیں لگایا تھا، بصورت دیگر عدت ضروری تھی۔ اور ممکن نہیں کہ رسول خدا نے اسے اپنی ذات کے واسطے نظرانداز کر دیا ہو، کوئی ایسا مذہب نہیں جس نے "عدت" کو شرعاً واجب کر دیا ہو، اور کسی شارع نے "عدت" کی خوبیوں کو نہیں سمجھا اور نہ رواج دیا۔ یہ اسلام کی ابتدائی تعلیم ہے۔ رسول خدا کبھی ایسے مفید امر کو نظرانداز نہیں کر سکتے تھے۔

زید اور زینب کے تعلقات اور متعلقہ واقعات، کا تذکرہ رسول خدا کی عظمت، پرہیزگاری اور اعلیٰ صبر اور نفس کشی کو واضح بیان کرتا ہے۔ رسول خدا زینب کے قریبی رشتہ دار تھے اور آپ کے واسطے ابتداء میں اس سے شادی کرنا کچھ مشکل کام نہ تھا، اور اس لئے وہ تمام اعتراض جو آنحضرتؐ پر ان واقعات کے ضمن میں کئے جاتے ہیں بالکل بے بنیاد ہیں اور دشمنان دین کی افترا پردازی ہے۔ مصلحان قوم کے واسطے کیسا اچھا سبق ہے۔ جب وہ اصلاح کرنا چاہتے ہیں تو کسی بد زبان کی باتوں اور متعصب رسم بت پرست لوگوں کے طعن سے نہیں بچ سکتے۔ لیکن ان باتوں کا

الا لا تَلِطی السّتر یا ام جحدرِ

کفی بذری الاعلام من دوننا سترًا

اذا هبطت بصری تقطع وصلها

واغلق ثوّابان من دونها قصرا

فلا وصل الا ان تقارب بیننا

قلائص یجرن المطیّ بنا حسرا

فیا لیت شعری هل یحلّن اهلها

واهلی روضات ببطن اللوی خضرا

وهل تاتینی الریحُ تدرج موهنًا

بریّاک تعرو دری بها عقد اعصرًا

اہل شہر نے کھلے میدان میں سلمانوں کا مقابلہ کیا۔ اور اس میں کچھ شک نہیں کہ حریف کی زبردست طاقت کے سامنے شرحبیلؓ ٹھہر نہیں سکتے تھے، مگر خالدؓ بن ولیدؓ عین اس وقت عراق سے شام میں آئے اور اس امداد سے سلمانوں نے نہ صرف شہر فتح کر لیا۔ بلکہ "رومانس"۔ رومی گورنر نے اسلام قبول کر لیا۔ شام میں یہ پہلی فتح تھی جو سلمانوں نے بصری کی تسخیر میں حاصل کی۔ اس نمایاں فتح کے بعد خالدؓ نے شرحبیلؓ کو ملامت کرتے ہوئے کہا کہ "یہ آپ ہی کا حوصلہ تھا کہ ان گنتی کے آدمیوں کے ساتھ ایسے مضبوط شہر اور زبردست دشمن کے سامنے مقابلہ پر اڑے ہوئے تھے"۔ شرحبیلؓ نے جواب دیا کہ "میں تو ابوعبیدہؓ کے حکم کی تعمیل میں مجبور تھا"۔

صدیق اکبرؓ نے سیف اللہؓ کو افواج شام کا سپہ سالار مقرر کر دیا۔ اور اس دلاور سپاہی نے بصری کی تسخیر کے بعد دمشق کا رخ کیا۔ اور اس کے ساتھ ابوعبیدہؓ، عمروؓ بن العاص، یزیدؓ بن ابوسفیان کو امداد کیلئے

خیال نہیں کرنا چاہئے۔ اور اخلاقی جرأت کو کبھی ہاتھ سے نہیں دینا چاہئے۔ ان کی نیک نیتی۔ اور اصلاح کی ذاتی خوبی۔ آخر انہیں کامیاب کر دے گی"۔

یہی واقعہ جو دشمنان اسلام اعتراض کی صورت میں بیان کرتے ہیں آنحضرتؐ کی صداقت اور عظمت کی بیّن دلیل ہے۔

گل است سعدی و در چشم دشمنان خار است"۔

طلب کیا، خالدؓ نے درحقیقت جنگ کا ابتدائی نقشہ بدل دیا۔ اور تمام طاقت کو ایک جگہ جمع کر دیا۔

دمشق کو حصن الشام کہتے تھے، اور کچھ شک نہیں کہ یہ شہر تمام ملک میں نہایت مضبوط تھا۔ اور شام کی کلید تھا۔ اس وقت حوران کے علاقہ اور دمشق کی بیرونی آبادی اس شہر میں جمع ہو رہی تھی ہرقل کو بخوبی علم تھا کہ اگر دمشق ہاتھ سے گیا تو شام پر عربیوں کا بآسانی تسلط ہو جائیگا۔ اس لیے اس نے تجربہ کار چیدہ افسروں کے ماتحت دمشق کی حفاظت کے لئے لشکر جرار روانہ کیا، عربی اور یورپین مورخین نے اس محاصرہ اور خونریز لڑائیوں کے حالات مفصل لکھے ہیں، غوطہ دمشق میں عربی سپاہ پڑی ہوئی تھی، دو ماہ سے زیادہ عرصہ گذر گیا اور ابھی تک یہ مضبوط شہر مسخر نہ ہوا، مسلمانوں کو نہ صرف اہل شہر سے مختلف مقامات پر لڑنا پڑا بلکہ رومی جرنلوں کا مقابلہ جو وقتاً فوقتاً انطاکیہ سے محاصرہ اٹھانے کے لئے آتے کرنا پڑا ادھر سے مسلمانوں کو عرب سے برابر امداد ملتی تھی اور ادھر سے ہرقل متواتر کمک بھیجتا رہا، بقول گبن رومی سپاہ ستر ہزار کی تعداد میں حمص میں وردان کے ماتحت موجود تھی، یہ رومی سپاہ بادہ نخوت میں سرشار دمشق کی طرف بڑھ رہا تھا۔ خالدؓ نے خیال کیا کہ اگر اہل شہر کو بیرونی امداد مل گئی تو محاصرہ طول پکڑ جائیگا اس لیے ضرارؓ بن ازور کو وردان کے مقابلہ کے لیے روانہ کیا، اور بعد ازاں بذات خود اس طرف کوچ کر دیا، اس طرح کچھ عرصہ کے لئے دمشق کا محاصرہ اٹھا دیا گیا، دونوں فوجوں کا مقابلہ "اجنادین" کے میدان میں ہوا، اور دو سخت خونریز لڑائیوں کے بعد رومی سپاہ انطاکیہ، قیصریہ، اور دمشق کی طرف ہزیمت خوردہ بھاگ نکلی، خالد مظفر و منصور پھر دمشق کی طرف لوٹا، ان لڑائیوں میں جو محاصرہ دمشق کے ایام میں رومی اور عربی سپاہ کے درمیان واقع ہوئیں عربی عورتوں نے بھی کچھ کم حصہ نہیں لیا، چنانچہ ان میں سے ضرار کی ہمشیرہ خولہ بنت الازور اور ابان بن سعد بن العاص کی زوجہ سے کارہائے نمایاں ظہور میں آئے۔ ابان بن سعد رومی گورنر توما کے تیر سے دمشق کی دیواروں کے نیچے شہید ہوئے۔ میدان اجنادین میں اپنی چچیری بہن سے شادی کی تھی، دلہن کو خاوند کی موت کا جو کچھ صدمہ ہوا، وہ انتقام کے جوش میں بدل گیا، اور اس دلاور عورت نے خاوند کا بدلہ خاطر خواہ لیا۔"

اب دمشق کا محاصرہ نہایت سرگرمی سے کیا گیا، اگرچہ اہل شہر بیرونی کمک سے مایوس ہو چکے تھے۔ مگر ابھی تک وہ مقابلہ پر اڑے ہوئے تھے۔ دمشق کی مضبوط سنگین دیواروں پر آلات حرب اپنا کام کر رہے تھے، شہر میں رسد اور لڑائی کا سامان بہت موجود تھا، اور گرد و نواح سے بیشمار سپاہ شہر میں جمع ہو گئی تھی،

اس لئے امید تھی کہ شہر کی تسخیر میں ایک عرصہ دراز درکار ہوگا اور ممکن ہے کہ اس عرصہ میں ہرقل محاصرہ کے اٹھانے کا کچھ بندوبست کرے۔

عربیوں نے اپنی فوج کو شہر کے چاروں طرف پھیلا دیا۔ اور آمد و رفت کے تمام راستے بند کر دیئے۔ ابو عبیدہؓ "باب جابیہ" پر اور یزید ابن ابی سفیان "باب صغیر" پر اور شرجیل بن حسنہ "باب توما" پر اور عمرو بن العاص "باب الفرادیس" پر اور عبس بن ہبیرہ "باب الفرج" پر اور خالد "باب شرقی" پر متعین ہوئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ مقام جسے "دیر خالد" کہتے ہیں۔ اس وقت عربی سپاہ کا ہیڈکوارٹر تھا۔ بقول یاقوت یہ مقام باب الفرادیس کے بالمقابل ہے۔ اور باب شرقی سے ایک میل کے فاصلہ پر ہے۔ اسی جگہ عربی سپہ سالار کا خیمہ تھا۔ جس پر رایت العقاب لہرا رہا تھا۔ ضرار بن الازورؓ دو ہزار سواروں کے ساتھ طلایہ پر رہا۔

وقتاً فوقتاً طرفین میں چھوٹی چھوٹی لڑائیاں ہوئیں اور بعض اوقات محصورین شہر سے باہر نکل کر حملہ کی جرأت کرتے اور پسپا ہوکر شہر میں داخل ہو جاتے۔ عموماً شہر کی دیواروں سے پتھر اور تیر برسانے اور دیگر آلات حرب سے کام لیتے۔ اگرچہ سیف اللہؓ سے ہر ایک رومی افسر اور سپاہی اور اہل شہر خائف تھے مگر ابو عبیدہؓ کی رحمدلی سے بھی خوب واقف تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ اس بزرگ صحابی کے ذریعہ نرم شرطوں پر صلح ہو سکتی ہے۔ مگر خالدؓ اطاعت کے ساتھ کسی شرط کو قبول نہیں کریگا۔

حاشیہ نمبر ۱۰۔ اگرچہ دمشق میں اس وقت ہر ایک شخص کے منہ پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ اور اپنی جان کا فکر لاحق ہو رہا تھا۔ مگر ایسے آدمی بھی تھے جو کسی اور ہی دھن میں لگے ہوئے تھے۔ ایک رات ضرار بن الازور حسب معمول طلایہ پر تھا۔ اور دمشق کے گرد چکر لگا رہا تھا کہ وہ "باب کیسان" کے مقابل پہونچا۔ یہ دمشق کا آٹھواں دروازہ تھا۔ یکایک ضرار نے ایک گھوڑے کے ہنہنانے کی آواز سنی۔ ضرار اور اسکے رفقا خاموش کھڑے رہے یہاں تک سوار ان کے نزدیک آگیا۔ اسے فوراً گرفتار کر لیا۔ تھوڑے عرصہ کے بعد کچھ فاصلہ پر ایک اور سوار دکھائی دیا جس نے باآواز بلند کہا "جونا" یہ اس پہلے سوار کا نام تھا جو گرفتار ہو چکا تھا۔ ضرار نے گرفتار شدہ سوار کو جواب کے لئے کہا تاکہ وہ بھی آگے آئے اور گرفتار ہو سکے۔ اسپر سوار نے جواب دیا کہ "پرندہ جال میں پھنس گیا" دوسرا سوار فوراً واپس لوٹا اور پیشتر اسکے کہ ضرار یا کوئی اور شخص اسکا تعاقب کرتا وہ شہر کے اندر داخل ہوگیا۔ ضرار سخت غصہ میں آیا لیکن مناسب یہی خیال کیا کہ سپہ سالار کے حضور اسے حاضر کیا جائے

محصورین کے پاس اگرچہ اس وقت بھی سامان رسد بہت کچھ تھا اور سپاہ کی بھی کمی نہ تھی۔ لیکن آئے دن کی شکستوں، اور شہنشاہ کے تغافل، اور جان و مال کے نقصان سے ہمت ہار بیٹھے تھے۔

سوار سے خالدؓ نے استفسار کیا تو کہا " میں ایک شریف اور معزز آدمی ہوں۔ ایک نوجوان عورت کے عشق میں جان پر کھیل کر نکلا تھا۔ مگر آہ! مجھے ہر ایک موقع پر مایوسی کا منہ دیکھنا نصیب ہوتا ہے۔ اس عورت کے والدین میرے ساتھ نکاح پر رضامند نہ تھے۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ میری سچی محبت بے اثر تھی، کیونکہ یہ عورت بھی میری خواہاں تھی۔ آخر جب کوئی تجویز نہ سوجھی تو ہم دونوں نے بالاتفاق یہ ٹھہرایا کہ آج رات شہر سے کسی طرف نکل چلیں۔ یہ کچھ آسان کام نہ تھا۔ شہر ہر ایک طرف سے محصور ہے۔ لیکن ہماری آنکھیں ایسی رکاوٹوں کو دیکھ نہیں سکتی تھیں۔ باب کیسان ہی ایک ایسا دروازہ تھا جو ہمیں رستہ دیتا۔ دربان کو اس کے حوصلہ سے زیادہ دیکر اپنے ساتھ گانٹھا۔ شہر سے تو سلامت نکل آئے لیکن تمہارے سپاہیوں کا دھڑکا باقی تھا میں نے بھی مناسب خیال کیا کہ پہلے میں آگے بڑھوں۔ بلا سے اگر میں کسی مصیبت میں گرفتار ہو گیا، وہ تو بچ جاوے گی۔ آخر وہی ہوا جو مجھ جیسے بدبخت عاشق کی قسمت میں عموماً لکھا ہے "۔ خالدؓ نے کہا۔ " خیر اب تو تم اسیرانِ جنگ کے زمرہ میں شمار ہوتے ہو، ہاں اگر اسلام قبول کرو تو مخلصی کی صورت ہو سکتی ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ جب ہم شہر پر قابض ہوں تو وہ خوبصورت عورت تمہارے ہاتھ پڑے "۔ جونا نے اسلام قبول کیا۔ اب ہم اسے اسکے اسلامی نام یونس سے یاد کریں گے۔

یونسؓ خالدؓ کے ہمراہ اہل شہر کا مقابلہ کرتا رہا، کس بے صبری سے وہ اس وقت کا منتظر تھا جب شہر پر مسلمانوں کا قبضہ ہو اور اس وقت کے لئے اور اس موقعہ کے لئے وہ کیا کچھ نہ کرتا ہوگا۔ آخر وہ وقت بھی آگیا! اور یونس خالدؓ کے ساتھ شہر میں داخل ہوا لیکن اسے جب یہ علم ہوا کہ شہر پر بذریعہ صلح قبضہ ہوا ہے تو مایوس ہوگیا، مگر جب خالدؓ اور ابوعبیدہؓ اس امر پر متفق ہو گئے کہ نصف شہر پر شمشیر اور نصف پر صلح کا عمل ہے تو یونس کی جان میں جان آئی۔ کیونکہ اس حصہ میں جو بزور شمشیر فتح ہوا تھا اسکی معشوقہ کا گھر تھا، رات تو جوں توں کر کے بسر کی صبح وہ چند مسلمان سواروں کے ہمراہ معشوقہ کے مکان پر پہنچا۔ اس جگہ اس نے ایسی وحشتناک خبر سنی کہ بیچارہ دل پر ہاتھ رکھکر رہگیا، معشوقہ دلنواز نے جب اسے اپنی آنکھوں سے گرفتار ہوتا ہوا دیکھا تو اسکی زیست سے ناامید ہوگئی، لیکن اسکے بغیر زندگی کا بھی کچھ مزا نہ تھا۔ اس لئے ترک دنیا کیا اور ایک گرجا میں داخل ہوگئی، دستور یہہ تھا اور اب بھی رومن کیتھولک چرچ میں اسکی پابندی ہے کہ گرجا کے خادم مرد ہوں یا عورت تمام عمر شادی

اور علاوہ ازیں اہل شہر کا ایک بڑا حصہ جو فنون حرب سے واقف نہ تھا اور جس میں زیادہ تر اہل حرفت وتجارت تھے۔ خونریزی سے متنفر، اور امن پسند تھا۔ یہ فریق ابتدا سے صلح کا خواہاں تھا۔ دوسرا فریق جو لڑائی پر تُلا ہوا تھا بحالت یاس صلح پر مجبور ہو گیا۔"

نہیں کر سکتے تھے، دنیا بامید قائم۔ یونس کا عشق تقاضا کرتا تھا کہ دلدار کا سراغ نکالے۔ یار زندہ صحبت باقی۔ ممکن تھا بلکہ یونس کو امید تھی کہ غالباً وہ اس بیہودہ زندگی سے بیزار ہوگی، اور ضرور میرا ساتھ دیگی۔ لیکن اب ایک اور مشکل تھی۔ اس وسیع اور آباد اور بالخصوص موجودہ صورت میں جبکہ گرد و نواح کی آبادی کا ایک حصہ اسکی مضبوط دیواروں کی حفاظت میں آ گیا تھا شہر میں اس یوسف گم گشتہ کا پتہ لگانا کچھ آسان کام نہ تھا۔ شہر میں ایک نہیں دو نہیں بیسیوں چھوٹے بڑے گرجے تھے۔ مگر حضرت عشق یونس کو مایوسی کی اس حد تک پہونچنے نہیں دیتے تھے، جسکے بعد تمام کوششیں بیکار ہوتی ہیں۔ تمام دن اسکی تلاش میں بازاروں اور گلی کوچوں کی خاک چھانتا رات صبح کی امید پر بسر کرتا۔ تین دن اسی سرگردانی میں گذر گئے۔ آخر اس گرجا میں جو یوحنا کے نام سے مشہور ہے اس نے اپنی معشوقہ کو رہبانیت کے لباس میں دیکھا۔ یہ ناممکن ہے کہ اس نے یونس کو پہلی نظر میں نہ پہچانا ہو، اور دل پر ایک خاص اثر محسوس نہ کیا ہو۔ مگر

شرع گوید منع لب کن عشق گوید نعرہ زن،

یونس آگے بڑھا تو وہ کچھ گھبرا گئی، یونس کو اچھی طرح معلوم تھا کہ گرجا کے قواعد کیسے سخت ہیں اور کس سختی سے ان کی پابندی ہوتی ہے، اس لئے اس نے مناسب خیال کیا۔ کہ اپنے تبدیل مذہب کا اظہار اپنی معشوقہ پر کر دے۔ تاکہ وہ سمجھ لے کہ یونس رہبانیت کی قید سے آزاد ہے، اور چونکہ سلمانوں کا قبضہ تمام شہر پر ہو چکا ہے، اس لئے وہ بھی بآسانی خانقاہ سے نکل سکتی ہے، مگر اس کا اثر امید کے خلاف اس نوجوان خوب صورت عورت پر الٹا پڑا، یک لخت اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اور اس نے نہایت نفرت انگیز لب و لہجہ میں کہا۔ "مردود! میری آنکھوں سے دور ہو جا، تو نے خداوند یسوع مسیح کو چھوڑا، اب تیرا مجھ سے کچھ تعلق نہیں۔" اتنا کہہ کر یہ شعلہ خو خانقاہ کے ایک کمرہ میں داخل ہو گئی، اور بیچارہ یونس ہکا بکا کھڑا رہا۔ اس نے اس کنواری کے بت کو سیاہ لبادہ اوڑھے ہوئے جاتے دیکھا، لیکن اتنی جرأت نہ کر سکا کہ ایک قدم آگے بڑھے اور اسے روکے۔ رفتہ رفتہ حیرت مایوسی سے متبدل ہو گئی، اور غریب یونس خانقاہ سے باہر نکل آیا۔ وہ دمشق کے بازاروں سے گذر رہا تھا لیکن اسے علم نہ تھا کہ وہ کس طرف جا رہا ہے، اور اس وقت اسکے چاروں طرف کیا ہو رہا ہے، یکایک اس کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ جو کام منت

ایک رات کچھ سر برآوردہ فوجی افسر بطریق اور دیگر عمایدین شہر باب جابیہ سے نکل کر ابوعبیدہؓ کے پاس آئے، اور صلح کی درخواست کی، ابوعبیدہؓ نے معمولی شرطوں پر صلح منظور کر لی اور اہل شہر کے ساتھ معہ اپنے رفقا شہر میں داخل ہوئے، حسن اتفاق سے اسی وقت خالدؓ بن ولید باب شرقی کے راستہ بزور شمشیر شہر میں

دمشق سے نہیں نکل سکتا، وہ جب سے ہو سکتا ہے اس خیال کو رفتہ رفتہ تقویت ہوتی گئی، وہ ایک مسلمان تھا اور اسلامی فوج کا ایک سپاہی تھا، خالدؓ، یزیدؓ، شرجیلؓ، ضرارؓ، عبدالرحمنؓ، عمروؓ، رفیعؓ، سے افسر اسکے دوست تھے، اور ہر وقت اسکی امداد کے واسطے تیار رہتے، شہر اور اہل شہر پر مسلمانوں کا قبضہ تھا، مگر افسوس ہے کہ یہ خیال بھی آخر مایوسی میں بدل گیا

یہ حصہ شہر جسمیں خانقاہ واقع تھی بروئے صلح فتح ہوا تھا،

یونس کے دل میں مختلف اور متضاد خیالات کا ہجوم ہو رہا تھا، آخر وہ ایک پریشانی کے عالم میں باب جابیہ سے باہر نکلا، وہ چند قدم بڑھا ہوگا کہ اُسے ابوعبیدہؓ کا کیمپ دکھائی دیا، اس نے رومی گورنر دمشق تھومس (توما) اور ہر بیس بطریق کو ابوعبیدہؓ کے خیمہ سے نکلتے ہوئے دیکھا، وہ خیمہ کے پاس آیا تو اُس نے خالدؓ اور دیگر فوجی افسروں کو آپسمیں بحث کرتے ہوئے دیکھا، اس نے معلوم کر لیا کہ تھومس اور ہر بیس دمشق سے انطاکیہ کی طرف جانا چاہتے ہیں، اور انکی درخواست منظور ہو چکی ہے، اور غالباً آج یا کل وہ روانہ ہو جائینگے۔

ہم ان واقعات کو جو تھومس کی درخواست اور ابوعبیدہؓ کی رضامندی اور خالدؓ کے انکار وغیرہ کے متعلق ہیں مفصل بیان کرنا نہیں چاہتے صرف اسی پر اکتفا کرتے ہیں کہ تھومس جسکی نسبت عربی مؤرخ لکھتے ہیں کہ ہرقل شہنشاہ قسطنطنیہ کا داماد تھا، دمشق سے نکلنا چاہتا تھا، خالدؓ نے ابوعبیدہؓ کی سفارش پر منظور کر لیا، اور یہ قرار پایا۔ کہ

"تھومس اور اسی کے رفقا تین دن تک مسلمانوں کی ذمہ داری میں ہیں، ہر ایک شخص ایک ایک ہتھیار اور جس قدر سامان لے جانا چاہے لے جا سکتا ہے۔"

یونس گھبرا گیا کہ اگر "ایڈوسیا" جو اسکی معشوقہ کا نام تھا، تھومس کے ہمراہ چلی گئی تو میری تمام امیدوں کا خون ہو جائیگا اس لئے خالدؓ کو تمام گذشتہ حالات سنائے۔ اور یہ بھی کہا کہ اب سوائے اسکے کوئی اور تجویز نہیں کہ "ایڈوسیا" کو دمشق میں رہنے کے لئے مجبور کیا جائے، اگر وہ اس جگہ رہ گئی تو ممکن ہے کہ ایک دن مجھ سے خوش ہو جائیگی، بہر حال میری آنکھوں کے سامنے تو رہے گی، خالدؓ نے یونس کو بہت تسلی اور تشفی آمیز الفاظ میں کہا کہ گھبراؤ نہیں، دیکھو انجام کیا ہوتا ہے، میں تم سے پختہ وعدہ کرتا ہوں کہ جہاں تک مجھ سے ہو سکا میں تمہاری امداد کروں گا، تمہیں اچھی طرح سے معلوم ہے کہ دمشق میں آج کل دو عملی ہو رہی ہے، اگر ایڈوسیا اس حصہ شہر میں رہتی جو مفتوحہ

داخل ہوئے، ادھر سے ابو عبیدہؓ اور دوسری طرف خالدؓ آرہے تھے۔ دونوں کی ملاقات بمقام مقلاط یا دیر مریم کے سامنے ہوئی، خالدؓ کو جب معلوم ہوا کہ ابو عبیدہ نے اہل شہر سے صلح کرلی ہے، تو کہا، "میں اس وقت سپہ سالار ہوں، میں نے شہر بزور شمشیر فتح کیا ہے۔ اور اس لئے آپ کی صلح کا

بزور شمشیر فتح کیا ہے تو کچھ بڑی بات نہ تھی لیکن موجودہ صورت میں تمہیں صبر کرنا چاہئے۔"

یہ دن بھی گذر گیا، تھومس نے رات کے وقت تمام رومی فوج کو جمع کیا، اور غلہ اور بار برداری کا سامان اور اہل شہر میں سے مرد و عورت اور ان لوگوں کو ایک جگہ اکٹھا کیا جو دمشق سے نکلنا چاہتے تھے۔ علی الصباح یہ لوگ شہر سے نکلے، ابو عبیدہؓ اور خالدؓ اور دیگر افسران فوج اور یونس موقعہ پر موجود تھے۔ خالدؓ تو یہ دیکھتا تھا کہ شرائط مقررہ کی خلاف ورزی تو نہیں ہوئی، مگر یونس کی نگاہ ایڈرسیا کی جستجو میں ہر ایک شخص پر پڑتی تھی، آخر اسکی نظر ایک حسین عورت پر رک گئی، یہی ایڈرسیا تھی، اس نے فوراً خالدؓ کو اس طرف متوجہ کیا، اور نہایت رقت سے کہا "خدا کے لئے اسے روکو" خالدؓ نے جواب دیا "صبر کرو، مجھے ایک نہایت معقول تجویز سوجھی ہے، اس وقت یعنی تین دن تک ہم کچھ نہیں کرسکتے۔ اسکے بعد میں اس کا تعاقب کرونگا، اور پھر ایڈوسیا، تمہاری ہے" یونس کا چہرہ خوشی سے چمک اٹھا،

تین دن گذر گئے، یونس کا دل ہی جانتا تھا کہ یہ ایام اس نے کس طرح بسر کئے، غالباً حضرت یونسؑ کو مچھلی کے پیٹ میں وہ تکلیف محسوس نہ ہوئی ہوگی جو آپ کے ہمنام نے ان ایام میں برداشت کی، خدا خدا کرکے آخری دن کی شام ہوئی۔

قرص خورشید در سیاہی شد
یونس اندر دہان ماہی شد

چوتھے روز ایک اور حادثہ پیش آیا، یعنی ابو عبیدہ اور خالدؓ کے درمیان اس سامان رسد کے متعلق جھگڑا ہوا جو تھومس نے دمشق میں پیچھے چھوڑا تھا، اور اہل شہر نے ایام محاصرہ میں جمع کر رکھا تھا، خالدؓ کہتے تھے کہ ہمارا حق ہے اور چونکہ مسلمانوں کو اس وقت اسکی سخت ضرورت ہے اس لئے ہم اہل شہر سے بزور لے سکتے ہیں، ابو عبیدہؓ اسکے برخلاف تھے، یونس نے خیال کیا کہ میں کس قدر بدقسمت آدمی ہوں کہ ایک نہ ایک حادثہ ایسا واقعہ ہوجاتا ہے جو میری تمام امیدوں کو خاک میں ملا دیتا ہے۔ آخر خالدؓ سے کہا کہ تین دن کی بجائے چار روز ہو گئے۔ مگر آپ نے اقرار کے مطابق ان لوگوں کا تعاقب نہ کیا، خالدؓ نے اس تصفیہ کا فیصلہ واپسی پر

پابند نہیں ہو سکتا۔" اور اپنے رفقار کو حکم دیا کہ آگے بڑھو، ابو عبیدہؓ بہت برافروختہ ہوئے۔ اور کہا کہ مجھے امید نہیں تھی کہ تم میرے عہد کا پاس نہ کروگے۔" اس کے بعد فوج کو روکا اور کہا جب تک ہم دونوں کسی امر کا فیصلہ کر کے متفق نہ ہوں کوئی شخص اہل شہر سے کسی قسم کا تعرض نہ کرے، آخر یہ قرار پایا کہ چونکہ

سو توقف رکھا اور چار ہزار آدمیوں کے ساتھ اپنے دوست یونس کی خاطر تھومس کے نقش قدم پر یلغار کرتا ہوا چلا۔ خالدؓ کو یقین تھا کہ تھومس اور اسکے ہمراہی ابھی بہت دور نہ گئے ہوں گے، کیونکہ ان کے ساتھ عورتیں اور بچے اور سامان اس قدر تھا کہ پہاڑی راستے معمولی رفتار سے طے کرنا ناممکن تھا، مگر حریف توقع سے زیادہ راستہ طے کر چکا تھا، چار روز کا وقفہ پہلے مل چکا تھا۔ اب وہ ایام جو خالدؓ کو تعاقب میں گذرے اسپر زیادہ ہو رہے تھے، اس وقت ان لوگوں نے عیسائی عربوں کا لباس پہنا ہوا تھا۔ کیونکہ دشمن کے ملک میں کوچ کر رہے تھے، ڈر تھا کہ اگر کسی نے شناخت کر لیا تو اصل مدعا فوت ہو جائے گا، چونکہ اس وقت ہر ایک جگہ لڑائی کا بازار گرم تھا اس لئے اس لباس میں انہیں کوئی شناخت نہ کر سکا، دشوار گذار راستہ کی تکلیفوں کا اندازہ کرنا کچھ مشکل نہیں۔ مگر ہم اس کا تذکرہ نہ کریں گے، جفاکش عربی گھوڑے، سواروں کے استقلال سے بخوبی واقف تھے، رومیوں کے نقش قدم کا سراغ دور تک نمایاں تھا، اور علاوہ ازیں راستہ میں ان کی معمولی اشیاء پڑی ہوئی ملتی تھیں جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اسی راستہ سے گئے ہیں، یک لخت اس سراغ کا سلسلہ بھی منقطع ہو گیا، کیونکہ رومیوں نے کوہ لبنان کا راستہ لیا تھا، خالدؓ اسیطرح دن اور رات کوچ کرتا ہوا ایک سو پچاس میل کا فاصلہ طے کر گیا، راستہ میں وہ شہر پڑے جنکی مضبوط دیواروں کو دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ اگر ان لوگوں کو اس تعاقب کا علم ہو گیا تو سب محنت ضائع ہو جائے گی، لیکن خیر گذری، مگر پہاڑی راستہ کی خرابیوں کا اثر ظاہر ہو رہا تھا، پتھریلا راستہ سخت ناہموار تھا، قدم قدم پر گھوڑوں کی نعلوں سے شعلے نکلتے تھے، اور جب نعلیں ٹھوکروں سے علیحدہ ہو جاتیں تو سم پھٹ جاتے، اس صورت میں مجبوراً گھوڑوں سے اُترنا پڑا، لیکن پیدل چلنا بھی دشوار تھا، اگرچہ عربی ایک جفاکش قوم تھی لیکن اس وقت اکثر سپاہی نہ رہ سکے اور خالدؓ کے پاس اس خطرناک مہم کی شکایت کی، بیچارے یونس کا دل اندر ہی اندر بیٹھتا جاتا تھا، آخر خالدؓ سے کہا کہ اب فاصلہ تھوڑا سا رہ گیا ہے، غالباً ہم ان لوگوں کو چند قدموں پر دیکھیں گے، اگرچہ ہر ایک شخص تھک کر چور ہو رہا تھا، مگر خدا جانے حضرت عشق کیا بلا ہیں کہ یونس کو ان تکالیف کی مطلق پرواہ نہ تھی، خالدؓ بھی حیران تھا کہ کیا کرے، اس قدر دور منزلیں مارتے ہوئے آئے اب بے نیل مرام واپس لوٹنا شرمناک ہے، آخر یونس کو کہا کہ "اے باد صبا این ہمہ آوردۂ تست"

نصف شہر بزورِ شمشیر فتح ہوا۔ اس لئے اِس حصّہ شہر کو اسی طرح تصور کرنا چاہئے۔ اور دیگر نصف حِصّہ پر ابو عبیدہؓ کے عہد و پیمان کے مطابق عملدرآمد کیا جاوے۔" مگر یہ فیصلہ قطعی اور ناطق نہ تھا۔ اس لئے امیر المومنین کی خدمت میں تمام واقعات اور حالات کو ظاہر کیا گیا اور آخری حکم کی استدعا کی گئی کہ اس کے مطابق اہل دمشق سے سلوک کیا جائے۔"

اِسکے بعد عبدالرحمٰن کو کہا کہ رات میں نے خواب دیکھا ہے کہ میرا عمامہ سر سے گر پڑا ہے۔ خدا جانے اس مہم کا کیا انجام ہوگا۔"

دوسری مصیبت یہ نازل ہوئی کہ بارش شروع ہوگئی۔ رات کا وقت تھا۔ اندھیرے میں ہاتھ کو ہاتھ نہ سوجھتا تھا بجلی کی چمک اور رعد کی گرج اس خوفناک نظارہ کی دہشت کو دوبالا کر رہی تھی۔ ان مشکلات اور مصیبتوں کی داستان طویل ہے۔ آخر یہ گھڑی بھی ٹل گئی۔ لیکن خالدؓ کو ایک پہاڑی آدمی سے معلوم ہو چکا تھا کہ اسجگہ کے قریب شہنشاہ ہرقل بے شمار فوج کے ساتھ پڑا ہے۔ مگر یہ ارادہ کا پکا اپنی بات سے نہ پھرا اور اگرچہ رفقا شکایت کرتے تھے مگر اس نے ارادہ کر لیا کہ کل کا دن بھی دیکھ لیں۔"

علی الصباح عربی اس لمبے پہاڑی سلسلے سے نکل کر ایک سرسبز چراگاہ پر پہونچے۔ اس جگہ دیکھا کہ خودرو پہاڑی پھول شگفتہ ہو رہے ہیں۔ نہریں بہ رہی ہیں۔ اور بیش قیمت کپڑے جھاڑیوں پر پھیلے ہوئے ہیں یہ نہایت فرحت افزا مقام تھا۔ اسکے ساتھ ان کی نظر ان لوگوں پر پڑی جن کے تعاقب میں انہوں نے اس قدر فاصلہ طے کیا تھا۔ خالدؓ نے فوج کو چار حصّوں میں تقسیم کیا۔ ضرارؓ بن الازور۔ رفیعؓ بن عمیرہ۔ عبدالرحمٰنؓ بن ابوبکرؓ کو تین ہزار کا افسر مقرر کیا۔ اور خود ایک ہزار کے ساتھ آگے بڑھا۔ رومیوں کی حیرت کا اندازہ کون کر سکتا ہے آخر وہ بھی مقابلہ کو بڑھے۔ لڑائی آناً فاناً خوفناک صورت اختیار کرتی جاتی تھی۔ خالدؓ تھوماس کو پہچان کر صفیں چیرتا ہوا شیر کی طرح حملہ آور ہوا۔ اور آخر ایک ایسا ہاتھ دیا کہ تھوماس کا سر قلم ہوگیا۔ جسے عبدالرحمٰن بن ابوبکرؓ نے نیزہ پر آویزاں کر لیا۔ اب خالدؓ ہربیس کی تلاش میں تھا۔ لیکن عین اس وقت جبکہ وہ ادھر ادھر ہربیس کو ڈھونڈھ رہا تھا۔ ہربیس نے پیچھے سے آکر اس زور سے تلوار ماری کہ خود کو کاٹتی ہوئی عمامہ تک پہونچی۔ مگر خوش قسمتی سے تلوار ہربیس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ اور عمامہ کے ساتھ زمین پر آرہی۔ عبدالرحمٰن ابن ابوبکرؓ نے آگے بڑھ کر ہربیس پر وار کیا جس سے وہ جانبر نہ ہو سکا۔"

اِدھر تو یہ ہنگامہ برپا تھا۔ ادھر یونس کو اپنی معشوقہ کی تلاش تھی۔ رفیعؓ بن عمیرہ نے دور سے دیکھا کہ وہ ایک حویلی

جس دن دمشق فتح ہوا، حضرت صدیق اکبرؓ نے اس دارِ فانی سے رحلت فرمائی۔ اور عمر فاروق اعظمؓ آپ کے جانشین ہوئے۔ ابو عبیدہؓ اور خالدؓ کے تنازعہ کا معاملہ آپ کے سامنے پیش ہوا، تو آپ نے خالدؓ کو معزول کر کے ابو عبیدہ کو افواج شام کا سپہ سالار مقرر کر دیا۔ اور دمشق کے متعلق ابو عبیدہؓ کے حق میں فیصلہ کیا۔

دست و گریباں ہو رہا ہے۔ تھوڑی دیر میں اس نے اس عورت کو زمین پر گرا دیا۔ رفیعؓ سے نہ رہا گیا بے اختیار ہنس پڑا۔ عین اس وقت رفیعؓ پر پتھروں کی بوچھاڑ شروع ہو گئی۔ عورتوں نے اسے اکیلا گھوڑے پر سوار دیکھ کر حملہ کیا۔ ان میں سے ایک عورت نے بڑھ کر رفیعؓ کے گھوڑے کی پیشانی پر خنجر مارا۔ رفیعؓ نے غصہ میں تلوار اونچی کی تھی کہ اس عورت نے "الامان" کہا۔ رومی اس لفظ سے واقف تھے اور جانتے تھے کہ اگر عربیوں کے مقابلہ میں یہ لفظ استعمال کیا جائے تو امان مل جاتی ہے۔ بات اصل میں یہ تھی کہ رفیعؓ کی امداد کو اور بہت سے سوار آ گئے تھے۔ اور عورتوں کو گرفتار کر لیا۔

ادھر سے فارغ ہو کر رفیعؓ آگے بڑھا کہ دیکھیں یونس کس حال میں ہے۔ دیکھا کہ کھڑا آٹھ آٹھ آنسو رو رہا ہے اور اس کے پاؤں کے پاس ایک نازنین حسین عورت خون میں غلطاں و پیچاں پڑی ہے۔ رفیعؓ نے یونس سے استفسار کیا تو روتے ہوئے کہا:-

"آہ! دنیا میں مجھ سے زیادہ بدبخت کون ہوگا۔ یہ عورت جسکی لاش تم اس وقت دیکھ رہے ہو، میرے دل کی مالک تھی۔ اور دنیا میں اس سے زیادہ مجھے کوئی چیز عزیز نہ تھی۔ اس کے لیے میں نے کس قدر مصیبتیں برداشت کیں۔ اور اسی عورت کے واسطے تمہاری تکلیف کا باعث ہوا۔ ان سب باتوں کا انجام یہ ہوا جو تم اس وقت اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہو۔ میں نے اسکی منت کی کہ میرے ساتھ چلو۔ نہ مانا۔ آخر زبردستی اسکو گرفتار کیا۔ ظالم نے خنجر نکال کر اپنے جگر میں بھونک لیا۔ اے دوست میں اب جی کر کیا کرونگا۔"

رفیعؓ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور کہا کہ "دوست صبر کرو۔ دیکھو اگر یہ عورت تمہارے ہاتھ نہیں آئی تو میں اس سے ہزارہا درجہ بہتر ایک اور عورت تمہاری نذر کرتا ہوں۔ حسن صورت میں تمہاری معشوقہ سے بہتر ہے۔ اور علاوہ ازیں زر و جواہرات سے لدی ہوئی ہے۔" اتنا کہہ کر رفیعؓ نے اس عورت کو پیش کیا جس نے اسکے گھوڑے کو زخمی کیا تھا۔ یونس نے اسکو پہلی ہی نظر میں پہچان لیا کہ یہ شہنشاہ ہرقل کی بیٹی ہے۔ یونس کا عشق صادق تھا۔ اس نے تبسم کرتے ہوئے جس میں زہر کی تلخی ملی ہوئی تھی سر ہلایا۔ لڑائی کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ خالدؓ کو بخوبی علم تھا کہ اس جگہ ٹھہرنا سخت خطرناک ہے۔ اس لئے فوراً واپس لوٹا۔

ہماری رائے میں یہ فاروق اعظم کی اعلیٰ قابلیت کی بیّن دلیل ہے کہ اپنے خالدؓ کو ایک نہایت اہم ذمہ داری کے کام سے سبکدوش کر دیا۔ خالدؓ میں ایک دلاور جنگجو سپاہی کے جوہر موجود تھے۔ اور اسکا اظہار ان لڑائیوں میں خالدؓ کی تلوار سے بہتر کسی اور شخص نے نہیں کیا۔ وہ ہمیشہ لڑائی کے موقعہ پر سب سے آگے ہوتا، اور جس جگہ دشمن کا زیادہ زور ہوتا خالدؓ وہاں موجود ہوتا۔ اور اسمیں کچھ شک نہیں کہ ممالک شام کی تسخیر سیف اللہ نے کی، اِس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ خالد نہایت سخت گیر سپاہی تھا۔ اور اس کے ساتھ فنون حرب سے بھی آگاہ تھا۔ لیکن جوش شجاعت میں اس سے ایسے اُمور سرزد ہو جاتے جو بے اعتدالی کی حد تک پہنچ جاتے۔ رسُول اللہ کے زمانہ میں ایک مہم سپرد کی گئی خالدؓ قبیلہ بنی خذیمہ کی طرف روانہ کی گئی تھی۔ اس لڑائی میں خالدؓ نے ایسے لوگوں کو بھی قتل کر دیا جو کسی طرح جائز نہ تھا، رسُول اللہ کو اطلاع ہوئی، تو فرمایا۔ "یا اللہ

ابھی وہ دمشق کی حدود میں داخل نہیں ہوئے تھے کہ دیکھا کہ ان کے عقب میں طوفان گرد و غبار بلند ہے۔ خالدؓ سمجھ گیا کہ جس بات کا ڈر تھا وہی ظہور میں آیا، اس لئے فوج کو آراستہ کیا۔ لیکن یکایک یہ غبار ٹھہر گیا اور ایک شخص سفید جھنڈا لیئے ہوئے باہر نکلا، معلوم ہوا کہ ہرقل نے ایک فوج اس غرض سے بھیجی کہ اپنی لڑکی کا فدیہ دے کر مسلمانوں سے واپس لے۔

خالدؓ نے ہرقل کی لڑکی کو نہایت عزت اور احترام سے واپس کر دیا۔ مگر ایلچی کو اتنا کہا کہ "شہنشاہ کو کہدو کہ اگرچہ اوسکی لڑکی اس وقت سے آزاد ہے مگر وہ دن آتا ہے کہ خود ہرقل ہمارے قبضہ میں ہوگا۔"

ہم اس داستان کو جو فی الحقیقت نہایت دلخراش ہے ختم کرنا چاہتے ہیں۔ خالدؓ اور اس کے رفیق مع الخیر دمشق میں پہونچ گئے، فاروق اعظمؓ کو جب اس مہم کی اطلاع ہوئی تو خالدؓ کو سپہ سالاری سے معزول کر دیا۔ یونس کے دل پر اگرچہ سخت صدمہ پہونچا تھا۔ مگر عربوں کے ساتھ بھی اسے ایک قسم کا برادرانہ تعلق پیدا ہو گیا تھا۔ اسکے دل پر ان کی عبادت کا طریقہ، راست گفتاری، پرہیزگاری، اور وفا نے بہت گہرا اثر کیا۔ وہ پکا مسلمان ہو گیا، اور مسلمانوں کے ہمراہ مخالفین سے لڑتا رہا۔ آخر یرموک کے جنگ میں شہید ہوا۔ (انا للہ وانا الیہ راجعون۔ گبن، اوکلی، الواقدی)۔

مذکورہ بالا قصہ کسی معتبر مسلمان مورخ نے نہیں لکھا، اور ہم کسی طرح اس روایت پر اعتبار نہیں کر سکتے جسکی تائید نہ تو طبریؒ اور نہ ابن اثیرؒ اور نہ کسی اور مؤرخ نے کی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ صرف عیسائی مؤرخین کی اختراع ہے۔ خود گبن تسلیم نہیں کرتا کہ توما شہنشاہ ہرقل کا داماد تھا۔

میں خالدؓ کے فعل سے بری الذمہ ہوں۔" پھر آپ نے ان مقتولین کی دیت ادا کی۔ اور ان کا جس قدر مال ضایع ہوا تھا اسکی قیمت بھی دی۔ اور ان لوگوں کے وارثوں کو اس سے زیادہ دیا۔ جتنا وہ طلب کرتے تھے صدیق اکبرؓ نے مرتدین عرب کے مقابلہ میں خالدؓ کو روانہ کیا تو ضرورت سے زیادہ سختی کی۔ اور مالک بن نویرہ کو مرتد سمجھ کر قتل کر دیا۔ اسپر بعض اصحاب جن میں حضرت عمرؓ بھی شامل تھے سخت برافروختہ ہوئے۔ دمشق کی تسخیر میں رسول اللہ کے ایک معزز صحابی کے عہد کا پاس نہ کرنا ایسے امور ہیں جو دور اندیشی کے مخالف ہیں۔ فاروق اعظمؓ انہیں کب نظرانداز کر سکتے تھے۔ ابو عبیدہؓ ایک روشن دماغ۔ دور اندیش۔ اور نرم مزاج بزرگ تھے۔ ان واقعات سے جو مورخین نے فتح شام کے ضمن میں لکھے ہیں بخوبی ثابت ہوتا ہے کہ وہ اسی ممتاز عہدے کے قابل تھے۔ جو ابتدا میں صدیق اکبرؓ اور بالآخر فاروق اعظمؓ نے انکی ذات کے واسطے تجویز کیا۔ کچھ شک نہیں کہ ابتداء میں ضرورت اس امر کی تھی کہ خالدؓ سا سخت گیر آدمی دشمنوں کے مقابلہ میں بحیثیت سپہ سالار موجود ہو۔ کیونکہ رومیوں کو قدر عافیت اسی صورت میں ہو سکتی تھی۔ وہ خالدؓ کے نام سے کانپتے تھے۔ مگر ابو عبیدہؓ کی موجودگی سے وہ خوش تھے۔ اکثر شہر بذریعہ صلح فتح ہوئے اور یہ صرف ابو عبیدہؓ کے ذریعہ سے۔ جس قدر مشہور لڑائیوں میں مسلمانوں کو کامیابی ہوئی۔ وہ صرف خالدؓ کی تلوار سے۔ درشتی و نرمی بہم در بہ است۔" ایسے مہیب دشمن کے مقابلہ میں جسکے زیر فرمان تمام مہذب دنیا تھی۔ اور جس کے قبضہ میں وہ اسباب اور سامان حرب تھا جس سے عربی سپاہ بالکل ناواقف تھی۔ جسکی تعداد عربیوں کے مقابلہ میں ایک اور دس کی نسبت رکھتی تھی۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ تھی۔ ابو عبیدہؓ اور خالدؓ سے افسروں کا کام تھا۔

خالدؓ کا تنزل سپہ سالاری سے معمولی حیثیت کے سپاہی پر معمولی بات نہیں۔ جہاد فی سبیل اللہ کے معانی سمجھنے کے لئے اسی ایک واقعہ پر غور کرو۔ ابو عبیدہؓ اکثر کہا کرتے تھے کہ "میں نے خالدؓ کو ایک سپاہی کی حیثیت میں کام کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ واللہ وہ سپہ سالار سے بڑھ کر کوشش کرتا ہے۔ اور اس کے کسی فعل سے ظاہر نہیں ہوتا کہ وہ موجودہ ذلت اور گذشتہ فخر کو محسوس کرتا ہے۔" اگر یہ دیکھنا مطلوب ہو کہ اسلام ہم سے کس امر کی خواہش کرتا ہے تو ان بزرگوں کے قول و فعل پر فکر کرو۔ وہ ہر ایک کام نیک نیتی سے کرتے تھے اور اگر کبھی غلطی کی تو مورد طعن و تشنیع ہوتے۔ اور اپنی اصلاح میں کوشش کرتے۔ یہ کیسا نازک موقع تھا کہ مسلمان دشمنوں کے مقابل میں اور ایسے دشمن کے مقابل میں جسکی عظمت اور شان مسلمہ تاریخی ثبوت ہے۔ لڑ رہے تھے۔ اور دو سر آوردہ افسران فوج کی رائے میں اختلاف ہو گیا۔ ابھی فتوحات کا سلسلہ شروع ہوا تھا۔ اور

تمام لڑائیاں جو مسلمانوں کو اجنادین اور دمشق کی دیواروں کے نیچے پیش آئیں آئندہ جنگوں کی خونناک پیش گوئیاں تھیں۔ عین اس وقت ایک سپہ سالار کا بے غرتی سے سپاہی کی حیثیت پر تنزل فاروق اعظمؓ کے حکم کا محرک حکمت اور مصلحت وقت کے منافی ہے۔ لیکن نہیں یہ خیال غلط ہے۔ اور واقعات ایسے غلط ثابت کرتے ہیں۔ اس وقت نہ صرف خالدؓ بلکہ ہر ایک شخص خلیفہ کے جائز حکم سے سر پھیرنے کا خیال نہیں کر سکتا تھا۔ اور خود خلیفہ کو مسلمانوں کی ذات اور ایمان پر پورا اعتماد تھا۔ وہ نیک نیتی سے ایک دفعہ عمرؓ کی مخالفت پر کھڑے ہو سکتے تھے لیکن ان سے کبھی توقع نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ دیدہ دانستہ ایسا فعل کریں گے جو اسلام کے مخالف اور مسلمانوں کی خرابی کا موجب ہو۔ یہ اسلام تھا جو انکا دستور العمل تھا اور یہ لوگ مسلمان تھے آخر کار حضرت عمرؓ نے عاملوں کو نامے لکھے کہ "میںنے خالدؓ کو کسی اور وجہ سے معزول نہیں کیا۔ مدعا یہ تھا کہ خالدؓ کو معلوم ہو جائے ملک شام اسکے زور بازو سے فتح نہیں ہوا اور تمام مسلمانوں کو یقین ہو کہ صرف فضل ایزدی سے یہ نمایاں فتوحات حاصل ہوئی ہیں۔ خالدؓ کی وفات پر بنی مغیرہ کی عورتیں ایک گھر میں جمع ہو کر رونے لگیں۔ حضرت عمرؓ نے سن کر کہا کہ "ابو سلیمان (خالدؓ) کا ماتم اگر عرب کی عورتیں کریں تو بجا ہے۔ لیکن نوحہ خوانی سے منع کر دیا"

مسلمانوں نے خلافت فاروقی میں ملک شام، مصر اور ایران پر بالاستقلال قبضہ کر لیا۔ اور یہ ممالک قیصر اور کسریٰ کی حکومت سے ہمیشہ کے لئے نکل گئے۔ اس وقت سے آج تک کوئی کسریٰ روئے زمین پر نہیں ہوا اور جب مسلمانوں نے قسطنطنیہ فتح کیا تو رومی شہنشاہت کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ اور ان ممالک پر آج تک مسلمانوں کا قبضہ ہے"

ابو عبیدہ نے فتح دمشق کے بعد یزید بن ابو سفیان کو اس شہر کا حاکم مقرر کیا۔ ۱۸ھ میں شام میں طاعون پھوٹ پڑا۔ اسے طاعون عمواس کہتے ہیں۔ فاتحان شام میں سے ابو عبیدہؓ، معاذ بن جبلؓ، شرجیل بن حسنہؓ، اور یزید بن ابو سفیان نے اس مہلک بیماری سے وفات پائی۔ حضرت عمرؓ بذات خود شام میں تشریف لائے اور دمشق کی حکومت یزید کے بھائی معاویہ بن ابو سفیان کو تفویض کی۔ فاروق اعظمؓ کے زمانہ میں معاویہ کی حکومت دمشق کے علاقہ تک محدود تھی۔ حضرت عثمانؓ ذی النورین کے عہد میں معاویہ کل ملک شام کا عامل مقرر ہوا۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت ایک مشہور واقعہ ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عرب خانہ جنگی میں مبتلا ہو گیا۔ جسمیں بنو ہاشم اور بنو امیہ دو زبردست حریف طاقتوں نے خلافت کو وراثت میں تبدیل کرنیکے لئے

جان توڑ کوشش کی۔ بالآخر بنوامیہ کامیاب ہوئے۔ اور معاویہ بن ابوسفیان نے خاندان امیہ کی بنا ڈالی۔ اور دمشق اسلامی مقبوضات کا پایہ تخت قرار پایا۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت، اور باہمی خانہ جنگی بنوامیہ کے اقتدار کا باعث ایسے واقعات ہیں جو ہم کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کرنا چاہتے ہیں۔

جب حضرت ابراہیم نے حجاز میں اوس مقام پر جہاں مکہ معظمہ آباد ہے۔ کعبۃ اللہ کی بنیاد رکھی جس کی نسبت لکھا ہے کہ "ان اول بیتٍ وضع للناس للذی ببکۃ مبارکاً وھدی للعالمین۔ فیہ آیات بینٰتٍ مقام ابراھیم، ومن دخلہ کان اٰمناً، وللہ علی الناس حج البیت من استطاع الیہ سبیلا۔ ومن کفر فان اللہ غنی عن العالمین"۔ (پ ۳۔ ع ۹) اور اپنے بڑے بیٹے حضرت اسمٰعیل کو اس جگہ آباد کیا۔ تو اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی کہ "ربنا انی اسکنت من ذریتی بوادٍ غیر ذی زرعٍ عند بیتک المحرم، ربنا لیقیموا الصلوٰۃ فاجعل افئدۃ من الناس تھوی الیھم وارزقھم من الثمرات لعلھم یشکرون"۔ آپ کی دعا مقبول ہوئی۔ اور دور دور سے لوگ کعبۃ اللہ کی زیارت کے لئے مکہ میں آتے۔ ہر سال خاص خاص موسموں میں اس جگہ حجاج کا ہجوم ہوتا۔ اور خرید و فروخت کی کثرت کا یہ حال تھا کہ مکہ ان ایام میں تجارت کی منڈی بن جاتا۔ اسمیں کچھ شک نہیں کہ بذاتہ سرزمین حجاز "غیر ذی ذرع" ہے۔ اس جگہ انسانی آبادی کا محرک صرف کعبۃ اللہ کی عمارت کی حفاظت کے لئے قدرت کے زبردست ہاتھ کر رہے تھے۔ بیت المقدس جو ایک عرصہ دراز بعد تعمیر ہوا۔ کئی دفعہ برباد ہوا۔ لیکن اولوالعزم فاتحان دنیا کبھی کعبۃ اللہ کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھ سکتے تھے۔ اگر کبھی کسی کو اسکے خوفناک ریگستانوں میں قدم رکھنے کی جرأت ہوئی تو ہر ایک ذرہ کو دشمنی پیکر بستہ پایا۔ اور سموم اور صرصر نے وہ تھپیڑے دیئے کہ منہ کی کھا کر اپنا سا منہ لیکر لوٹ گئے۔ بنواسمٰعیل اس جگہ آزادانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ اونکی ہمسائیگی میں مصر، شام، اور ایران متمدن دنیا تھی۔ لیکن وہ ان سے بے خبر تھے۔ مگر جس آزادی اور دلیری کے بیج ان کے دل و دماغ میں نشو و نما پا رہے تھے۔ اوس سے ہمسائیہ متمدن زمینیں خالی تھیں۔ عربی غیور طبیعتیں ایک عرصہ دراز تک حکومت سے ناآشنا رہیں۔ بنواسمٰعیل کا ہاتھ ایک دوسرے کے برخلاف معمولی اختلاف پر ایسا دراز ہوتا کہ خانہ جنگی کی آگ برسوں تک مشتعل رہتی۔ ان کا زمانہ جاہلیت بھی ان کے لئے قابل فخر ہے۔ ان کی شمشیر اور تیغ زبان کے جوہر قیامت تک یادگار زمانہ رہیں گے۔

"وادِ غیر ذی ذرع" نے ایسے انسان پیدا کئے جن کے مختصر حالات ہم لکھنا چاہتے ہیں۔ لیکن

اس میں کچھ شک نہیں کہ یہ زمین خشک اور بے آب و گیاہ ہے - اور اگر اس جگہ کعبۃ اللہ نہ ہوتا تو یہ
کبھی آباد نہ ہوتی۔ چونکہ مکہ میں حج ہوتا تھا اس لئے لوگ دور دراز ممالک سے کعبہ کی زیارت کے لئے آیا کرتے
تھے، اور اس لئے عرب میں حجاز اور حجاز میں مکہ سب سے زیادہ مشہور اور ممتاز تھے۔ اور کعبۃ اللہ ہی عربیوں کی
دولت و ثروت اور عزت کا باعث تھا۔ اس لئے یہی ایک ایسی عمارت تھی جسکی حفاظت کے ساتھ عربی
عظمت کا قیام تھا، اور قدرتاً ان کے دلوں میں "بکہ مبارکہ" کی عزت ہر ایک چیز سے زیادہ تھی - اور سچ
تو یہ ہے کہ اسکا متولی ہی قوم کا سردار ہوتا، اس لئے کچھ تعجب کی بات نہیں اگر حجابۃ کعبہ کے لئے عرب کے
مختلف قبائل جان توڑ کوششیں کرتے رہے اور کعبۃ اللہ پر قبضہ رکھنے کے لئے اپنا خون پانی کی طرح بہا
دیتے، اصحاب الفیل جس کا تذکرہ قرآن شریف میں بھی ہے یمن کی تاریخی قوم تھی - اون کے سردار ابرہہ
نے جس کا مذہب عیسائیت تھا، مکہ معظمہ پر فوج کشی کی، کیونکہ شام کا متعصب پادری جس نے ابرہہ کو
اس حملہ کے لئے اکسایا، کعبۃ اللہ کی روز افزون ترقی کے ساتھ عوام الناس کے حسن عقیدت کو جو اسجگہ
ہزاروں کی تعداد میں دور دراز ممالک سے حج کے لئے جمع ہوتے دیکھ نہیں سکتا تھا - ابرہہ کی مہم کا مدعا
صرف کعبۃ اللہ کی بربادی تھی، عبد المطلب جو اس وقت کعبۃ اللہ کے متولی تھے لوگوں کے کہنے سننے
پر اور اس خیال سے کہ ابرہہ کے ایلچی نے علی الاعلان کہہ دیا تھا کہ والئی یمن کو اہل مکہ سے کچھ غرض نہیں، اور
اس لئے وہ خونریزی کا خواہاں نہیں ہے، ابرہہ کی ملاقات کو گئے، آپ کے بلند قامت اور خوبصورت چہرہ نے
ابرہہ کے دل پر بڑا اثر کیا، بذریعہ ترجمان گفتگو ہوئی تو ابرہہ کو معلوم ہوا کہ آپ کعبہ کے متولی اور قوم کے سردار
ہیں - قدرتی خوبیوں اور ذاتی امارت نے ابرہہ کو بالکل گرویدہ کر لیا - ارادہ کیا کہ اگر عبد المطلب سفارش کریں تو کعبہ کی
بربادی سے باز آوے، اور اس لئے پوچھا کہ کس غرض سے آنا ہوا، جواب دیا کہ تیری فوج نے میرے بائیس[۲۲]
اونٹ گرفتار کئے ہیں، واپس دلا دو، ابرہہ نے کہا کہ میں نے تو خیال کیا تھا کہ تم دانا اور ہوشیار آدمی ہو
لیکن معلوم ہوا سخت بیوقوف ہو - کیا تمہیں معلوم نہیں کہ میں اس جگہ صرف خانہ کعبہ کی بربادی کا عزم بالجزم
کرکے آیا ہوں جو تمہارے اور تمام عرب کا مایۂ ناز اور فخر ہے اور تمہاری عظمت اور سرداری صرف اسی
عمارت کی بنیاد پر منحصر ہے، عقلمندی کی دلیل تو یہ تھی کہ مجھ سے التجا کرتے اور میں تمہاری خاطر اپنا ارادہ فسخ
کر دیتا - تمہاری قوم اور تمام عرب مدت العمر تمہارے ممنون احسان رہتے - نہ صرف یہی بلکہ ہمیشہ تمہاری
اولاد فخریہ بیان کرتی کہ ہمارے جد نے خانہ کعبہ کو بربادی سے بچا کر عرب کی عزت رکھ لی - یہ کیا حماقت ہے

کہ اس وقت چند اونٹوں کا خیال پیدا ہوا۔" عبدالمطلب نے جواب دیا کہ "میں اونٹوں کا مالک ہوں، مجھے تو اپنی ملک کا فکر کرنا چاہیئے، خانہ کعبہ کا مالک آپ اپنے گھر کی فکر کرے گا۔"

اس میں کچھ شک نہیں کہ حجاز میں یہی عمارت تھی جو حضرت ابراہیم کے وقت سے مرجع خلائق تھی ورنہ عرب کی سنگلاخ اور ریگستانی زمین تو فی الحقیقت "وادٍ غیر ذی ذرع" تھی۔ اسکے صحرا کف دست ریگستان ہیں جن میں کہیں کہیں ریت کے تودے اُٹھتے ہوئے نظر آتے ہیں منطقہ حارہ کے آفتاب کی حرارت اور صرصر اور سموم سی زہریلی ہوائیں جو اس جگہ ہمیشہ طوفان برپا کرتی ہیں ان سُرخ ریتیلے صحراؤں کو ایک آگ کا سمندر بنا دیتی ہیں جو کرۂ نار میں لہریں لے رہا ہے، پانی جو مایۂ زندگی ہے اس جگہ کوسوں تک نظر نہیں آتا۔ کوئی دریا نہیں جو خشک زمین کو سیراب کرے۔ جھلسی ہوئی پہاڑیوں پر اگر کہیں کچھ سبزہ ہے تو صرف شبنم کے قطروں سے پیاس بجھاتا ہے۔ بارش کا پانی اس جگہ آب حیات ہے جسے تالابوں اور حوضوں میں جمع کیا جاتا ہے۔ کنوئیں اور قدرتی چشمے اس جگہ پوشیدہ دفینے ہیں جن کی تلاش میں بادیہ نشین عربی مال مویشی لئے پھرتے ہیں۔"

مکہ میں اہل مکہ کا سردار کعبۃ اللہ کا متولی ہوتا۔ اس لئے ہر ایک قبیلہ کی یہی کوشش رہی کہ کعبۃ اللہ ان کے قبضہ میں ہو۔ دوسری صدی عیسوی میں بنو خزاعہ جو یمن سے اس جگہ آکر آباد ہو گئے تھے سب قبیلوں پر غالب آئے۔ اور کعبۃ اللہ پر اُنکا قبضہ ہوگیا۔ پانچویں صدی عیسوی تک ان کا دور دورہ رہا۔ لیکن رفتہ رفتہ عدنانیوں نے غلبہ حاصل کرلیا۔ اور ان میں سے کنانہ اور کنانہ کا قبیلہ قریش سب قبیلوں میں ممتاز ہوگیا۔ قصی اس وقت قریش کا سردار تھا۔ ذاتی قابلیت اور دانائی کی وجہ سے رفتہ رفتہ اس قدر عروج حاصل کیا کہ متولی کعبہ کی لڑکی سے جو بنو خزاعہ سے تھا شادی کرلی اور خُسر کی وفات پر کعبہ کی خدمت اسکے ہاتھ میں آگئی۔ گویا امارت بنو خزاعہ سے قریش میں منتقل ہوگئی۔ بنو خزاعہ نے جانیں لڑا دیں۔ لیکن کچھ فائدہ نہ ہوا۔ اور کعبہ کی خدمت کے ساتھ امارت بالاستقلال قریش میں آگئی۔ اس وقت قصی نے نہایت ہوشیاری اور دانائی سے کام کیا۔ اپنے بھائی بندوں کو جو قریش ہی کے قبیلہ سے تھے خاص مکہ میں جمع کرلیا۔ اور مکہ کو چار حصوں میں تقسیم کرکے اپنے بھائیوں کو بانٹ دیا۔ قریش نے اس جگہ اپنے اپنی ملک میں مکانات تعمیر کرلئے۔ اور مستقل سکونت اختیار کرلی۔ نہ صرف قریش نے قصی کو اپنا سردار تسلیم کرلیا بلکہ حجاز میں اسکی امارت کا ہر ایک قبیلہ معترف تھا۔"

قصی کے چار بیٹے تھے۔ ان میں سے سب سے چھوٹا عبد مناف اسکا جانشین ہوا عبد مناف کے بھی چار بیٹے تھے۔ ان میں سے عبد الشمس سب سے بڑا تھا اور دوسرا ہاشم اور تیسرا مطلب اور چوتھا نوفل تھا۔ عبد مناف کے بعد ہاشم باپ کا جانشین ہوا عبد شمس مر چکا تھا۔ اس کے بیٹے امیہ نے دعویٰ کیا کہ امارت کا حق اُس کے باپ کا تھا اور اس کے بعد جانشینی کا مستحق میں ہوں۔ بقول طبری اس وقت امارت کے نشان چار تھے۔ اول "رفادہ"۔ دوم "نیران"۔ سوم "لوا" اور چہارم "ندوہ"۔ یعنی محتاجوں اور مسافروں کو کھانا کھلانا "رفادہ" کہلاتا تھا۔ اور عرفات سے واپسی کے وقت تاریکی شب میں روشنی کا انتظام "نیران" تھا۔ اور لوا جنگی پھریرا تھا۔ کعبۃ اللہ کے پہلو میں ایک جگہ کا نام "دار الندوہ" تھا۔ اس جگہ اہل قریش جمع ہوتے۔ اور ہر ایک قضیہ کا فیصلہ اور مہم کی نسبت مشورہ باتفاق رائے کرتے۔ ابتدا میں حجابۂ کعبہ کے ساتھ یہ چار نشان امارت بھی ایک ہی شخص قصیٰ کی ذات میں ظاہر تھے۔ وہی کعبہ کا متولی تھا اور حجاج کے آرام و آسائش کے لیے ہر ایک انتظام اسکے ہاتھ میں تھا۔ جب کوئی مہم پیش آتی تو وہی اہل قریش میں سے کسی کو سپہ سالار مقرر کرتا اور اُس کا امتیازی نشان لوا ہوتا جو قصیٰ اپنے ہاتھ سے ایک نیزہ پر پھریرا باندھکر بناتا۔

ندوہ یعنی شورت میں سب لوگ اسی کی ہاں میں ہاں ملاتے۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ نشان خدمات کی صورت میں مختلف قبائل میں تقسیم ہوگئے۔ لوا قریش کا جنگی نشان بن گیا جس کا نام رایت العقاب تھا۔ سپہ سالار اور امیر قافلہ قوم اور کاررواں کا رہنما ہوتا۔ اور یہ خدمت عبد الشمس کے گھرانے میں بالاستقلال تھی۔

حاشیہ نمبر ۱۱۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ اہل مکہ کا اس وادی میں رہنا جس میں نہ زراعت ہو سکتی تھی اور نہ پانی میسر تھا۔ ناممکن ہوتا اگر حضرت ابراہیم کی دعا مقبول نہ ہوتی۔ چونکہ خانہ کعبہ کو ان کے بسر اوقات کے اسباب سے بہت کچھ تعلق تھا اس لیے انہوں نے ہمیشہ اسکی حفاظت اور اسکی حالت درست رکھنے کی طرف پوری توجہ کی۔ اس جگہ لوگ دور دور سے زیارت کعبۃ اللہ کو آتے۔ اس لیے زائرین کے آرام و آسائش کے متعلق اہل مکہ نے حتی المقدور سب سامان مہیا کئے ہوئے تھے۔ اہل قریش نے خانہ کعبہ کے آس پاس پانی کی سبیلیں لگا رکھی تھیں اور مہمان سرائے اور دیگر خورد و نوش اور رہائش کے اسباب جمع کئے ہوئے تھے۔ خانہ کعبہ کے گرد و زمین کا ایک بہت بڑا حصہ حرم کے نام سے موسوم تھا جس میں خون گرانا ممنوع تھا۔ مدعا یہ تھا کہ جو لوگ اس جگہ آئیں وہ امن و آسائش سے رہیں۔ یہ آرام و آسائش اور خورد و نوش اور رہائش کے اسباب جو اہل مکہ نے لوگوں کے لئے جمع کئے ہوئے تھے خدمات کی صورت میں ہر ایک قبیلہ کے متعلق ہو گئے تھے اور یہ خدمات حسب

کوئی کام بنی امیہ کے مشورہ کے بغیر نہیں ہو سکتا تھا یہ اور دیگر خدمات اگرچہ مختلف قبایل کے سپرد تھیں لیکن فی الحقیقت یہ سب کام متولی کعبہ کے زیر نگرانی سرانجام پاتے۔ اس لئے حجابۃ کو جو امتیاز ان خدمات میں تھا وہی متولی کعبہ کو دیگر سرداران قبایل پر حاصل تھا۔ امیۃ نے ہر دلعزیزی پیدا کرنے کے لئے عام فیاضانہ

ضرورت روز بروز بڑھتی گئیں اور رسُول کریم کی بعثت سے پیشتر تو اکثر خدمات معین ہو چکی تھیں جو مختلف قبایل بالاستحقاق سرانجام دیتے تھے۔ اور فی الحقیقت یہ خدمات تھیں جو کاروبار سلطنت اور حکومت کے معنی رکھتی تھیں جو صرف قبیلہ قریش میں محدود تھیں۔ ہاشم۔ امیہ۔ نوفل۔ عبدالدار۔ اسد تیم۔ مخزوم۔ عدی۔ جمح۔ اور سہم کے متعلق ایک ایک یا زاید خدمت یا خدمات تھیں:۔

(۱) "سدانۃ" اس کا دوسرا نام "حجابۃ" بھی ہے۔ اس خدمت کا والی کعبہ کا حاجب اور فی الحقیقت متولی ہوتا تھا۔ خانہ کعبہ کی کنجی اسی کے پاس رہتی تھی۔ وہی لوگوں کے لئے کعبہ کا دروازہ کھولتا تھا۔ اور بعد ازاں قفل لگا دیتا تھا۔ سب سے زیادہ معزز اور خدمت یہی منصب حجابۃ تھا جو بنو ہاشم میں بالاستقلال تھا۔ اور اسی منصب کے لئے بنو ہاشم اور امیہ میں خاندانی عداوت کی بنیاد پڑی۔

(۲) "سقایۃ"۔ اس خدمت کا والی مکہ میں پانی کے کمیاب ہونے کی وجہ سے حاجیوں کو پانی پلانے کی فکر رکھتا اور آب رسانی کا اہتمام کرتا۔ چمڑے کے حوض بنوا کر کعبہ کے آس پاس رکھتا اور کنوؤں سے میٹھا پانی مشکوں اور پکھالوں میں بھروا کر اونٹوں پر بار کر کے منگواتا اور ان حوضوں میں ڈلواتا۔ "زمزم" سے پیشتر یہی صورت رہی۔ اس کے بعد پانی "زمزم" سے ہی مہیا کیا جاتا۔ یہ خدمت بھی بنو ہاشم کے کنبہ میں تھی۔ خلیفہ ثانی کے عہد میں حضرت عباسؓ اور حضرت علیؓ کے درمیان خدمت سقایۃ کے متعلق جھگڑا ہوا تو حضرت عمرؓ نے حضرت عباسؓ عم رسول اکرمؐ کے حق میں فیصلہ دیا۔ اس کے بعد یہ خدمت بالاستقلال بنو عباس میں منتقل ہو گئی۔

ضرورتاً یہ خدمت بھی اہم اور بغایت قابل وقعت تھی۔ قرآن شریف (پارہ ۱۰۔ سورہ التوبہ) میں عوام الناس کے خیال کی تردید کی گئی کہ سقایۃ الحاج اور عمارۃ مسجد الحرام ایسی خدمات ہیں جو ایمان باللہ والیوم الآخرۃ اور جہاد فی سبیل اللہ کے برابر ہیں۔ "اجعلتم سقایۃ الحاج وعمارۃ المسجد الحرام کمن اٰمن باللہ والیوم الاٰخر وجاھد فی سبیل اللہ۔ لایستون عند اللہ۔ واللہ لایھدی القوم الظالمین۔ الذین اٰمنوا وھاجروا وجاھدوا فی سبیل اللہ باموالھم وانفسھم اعظم درجۃ عند اللہ۔ واولئک ھم الفائزون"۔

دعوتیں دیں اور بقول طبری تمام مال واسباب مسرفانہ ضیافتوں میں صرف کردیا۔ کامیابی نہ ہوئی تو بزور شمشیر اپنے دعوے کی تائید کرنا چاہتا تھا۔ مگر پنچایت نے ہاشم کے حق میں فیصلہ دیدیا۔ آخر امیہ غم وغصہ میں وطن مالوف کو خیرباد کہہ کر شام کی طرف چلا گیا۔ اور جبتک ہاشم زندہ رہا۔ واپس نہ آیا۔ اس عرصہ میں بذریعہ تجارت اس کے پاس دولت بہت کچھ جمع ہوگئی۔ اور وہ غربت میں بھی آسودہ حال اور فارغ البال تھا۔ اگرچہ وہ مکہ

(۳) "رفادۃ" یہ رقم ہوتی تھی جسے اہل قریش ہر موسم میں اپنے مالوں سے نکال کر صاحب رفادۃ کے پاس جمع کردیتے تھے۔ اسی آمدنی سے وہ کھانے پکوا کر محتاجوں کو کھلاتا تھا۔ سب سے پہلے جس نے رفادۃ کا حکم جاری کیا وہ قصی تھا۔ اسکے بعد بنی نوفل کے گھرانے میں یہ منصب رہا۔ کچھ عرصہ بعد بنی ہاشم کے خاندان میں منتقل ہوگیا۔

(۴) "لوا" رایت العقاب۔ اہل قریش کا جنگی نشان تھا۔ لڑائی کے موقع پر باہر نکال لیتے۔ بنو امیہ مستقل علم بردار تھے یعنی سپہ سالاری کی خدمت ان کے سپرد تھی۔

(۵) "ندوہ" یہ ایک عمارت تھی جسے قصی نے کعبہ کے پہلو میں تعمیر کیا تھا۔ اس میں اہل قریش کے سردار جمع ہوکر مشورہ کیا کرتے تھے۔ اس میں کوئی شخص جسکی عمر چالیس سال سے کم ہو شریک نہ ہوسکتا تھا۔ یہ بھی شرط تھی کہ کوئی عورت یا مرد اس گھر کے سوا اور کہیں شادی کی رسوم عقد ومناکحت ادا نہ کرسکتا تھا۔ بالغ لڑکیوں کو زنانہ لباس بھی اسی گھر میں پہنایا جاتا تھا۔ دار الندوہ بنی عبد الدار کے قبضہ میں تھا۔ جنگی نشان بھی اسی جگہ مرتب کیا جاتا۔

(۶) "سپہ سالار" یا "سالار قافلہ" بنوامیہ تھے۔ اور اس لئے بلحاظ جنگی قوت اور بوجہ تجارت دولت و ثروت اس خاندان میں نسبتاً زیادہ تھی۔

(۷) "مشورۃ" دار الندوہ مشورۃ کے لئے خاص تھا لیکن بنی اسد ایسا خاندان تھا جس کے سامنے ہر ایک معاملہ مشورہ کے لئے پیش کیا جاتا اور پھر اُن کے ذریعہ دیگر لوگوں پر ظاہر کیا جاتا۔

(۸) "اشناق" خوں بہا اور تاوان کی وصولی بنی تیم کے سپرد تھی جسکی وجہ سے یہ خاندان بطور حکم بھی کام کرتا تھا۔

(۹) "سفارۃ" جب اہل قریش کسی دوسرے عربی قبیلہ سے جنگ کرتے اور بضرورت صلح شرائط اور عہد وپیمان کی گفتگو سفیر کے ذریعہ طے ہوتی۔ اور خاندانی فخر اور مفاخرۃ سفیر ہی کے ذریعہ ہوتا۔ اس صورت میں سفیر کو حکم تسلیم کیا جاتا۔ زمانہ جاہلیت میں قریش کے سب سے پچھلے سفیر عمر بن الخطاب تھے۔ جو قبیلہ بنی عدی کے رکن تھے۔

سے دور تھا۔لیکن وطن اور اپنے دعویٰ کو کبھی فراموش نہیں کیا۔ہاشم کی وفات کے بعد وہ مکہ میں آیا۔اس وقت ہاشم کا بھائی اور اُمیہ کا چچا مطلب متولی کعبۃ اللہ تھا۔تجربہ نے امیہ کو بہت کچھ دنیا کے نشیب و فراز کا علم سکھا دیا تھا۔ان نے سمجھ لیا کہ ابتک جو کچھ اُسنے اپنے دعویٰ کی تائید میں کوشش کی وہ صریحاً باطل تھی۔اور سچ تو یہ ہے کہ اس وقت وہ ابتدائی جوش و خروش اسمیں نہ تھا۔اس لئے اُس نے گذشتہ تکالیف سے جو بوجہ جلا وطنی اوسے برداشت کرنی پڑیں دانائی کا سبق ہی سیکھا۔لیکن قدرتاً جو کچھ اثر دونوں خاندانوں میں بزرگوں کی ذاتی عداوت سے پیدا ہو چکا تھا۔وہ اب مٹانے سے نہ مٹ سکتا تھا۔اور نہ خود امیہ اور نہ حریف قبیلہ بنوہاشم نے اس کے مٹانے کی کوشش کی۔اُمیہ تو صرف اس لئے خاموش تھا کہ بظاہر اوسے کامیابی کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی اور وہ مناسب موقع کی تلاش میں تھا۔بنوامیہ کے دلوں میں انتقام کا جوش تھا۔بنوہاشم کی نگاہ اس قدر بلند تھی کہ وہ بنواُمیہ سے بکشادہ پیشانی ملنا بھی عار سمجھتے تھے۔غرض اسی طرح قریباً دس سال کا عرصہ گذر گیا۔اس عرصہ میں بنوامیہ کا اقتدار روز بروز بڑھتا گیا جسکی وجہ یہ تھی کہ تجارت اون کے ہاتھ میں تھی مکہ سے شام اور دیگر ممالک کو جس قدر تجارتی قافلے جاتے اون کے سالار بنوامیہ ہی ہوتے۔تجارت نے اون کے گھر مال و دولت سے بھر دیئے۔اس کے ساتھ اکثر لڑائیوں میں بنوامیہ ہی سپہ سالار ہوتے۔اُن کی تعداد بھی بہ نسبت

(۱۰) "ایسار"۔اہل قریش کو جب کبھی جنگ یا سفر درپیش ہوتا یا اور کوئی اہم معاملہ کی نسبت تشویش ہوتی تو تیروں پر فال ڈالتے۔اور مہورت یا شگن لیتے۔یہ کام بنی جمح کے گھرانے کے لوگ کرتے۔

(۱۱) "اموال محجرۃ"۔دیوتاؤں اور بتوں کے نام پر نقد و زیور نذر کیا جاتا۔یہ کام بنی سہم کے سپرد تھا۔

(۱۲) "عمارۃ"۔سے مراد یہ تھی کہ خانہ کعبہ میں کوئی شخص فحش یا خلاف تہذیب گفتگو نہ کرے۔اور شور و غوغا نہ مچائے۔

مذکورہ بالا خدمات کے علاوہ اور بھی ایسی ضرورتیں تھیں جو بصورت خدمات قریش میں منقسم تھیں۔اہل قریش نے ان خدمات میں انتظام ملک اور دین اور نظم حکومت اور جنگ وغیرہ سب امور کو جمع کر لیا تھا۔اور اس میں کم و بیش ہر ایک قبیلہ قریش کا حصہ تھا۔یعنی حکومت میں خواہ وہ کیسی ہی نرالی طرز کی تھی ہر ایک قبیلہ شریک تھا اور بلحاظ وقعت منصب اور خدمت ہر ایک قبیلہ کی عزت تھی۔حجابۃ اور سقایۃ اور عمارۃ وغیرہ ایسی خدمتیں تھیں جن کا تعلق خانہ کعبہ سے تھا۔اور اس لئے ان کا متولی ایک خاص امتیازی اعزاز کا مستحق سمجھا جاتا تھا۔ایسی ایسی خدمات یا مناصب حاصل کرنے کے لئے مختلف قبایل قریش اور بالخصوص بنوہاشم اور بنوامیہ میں رشک و حسد

دیگر قبایل کے زیادہ تھی، اس لئے اون کی جاہ و حشمت نے ان کا اقتدار بڑھا دیا، اون کی جنگی طاقت سے حریف قبایل خائف تھے، اور بہ لحاظ کثرت نفوس اون کا غلبہ اور عزت تھی۔ امیہ کا بیٹا حرب چراغ خاندان پیدا ہوا اور ابوسفیان ابن حرب نے عبدالشمس کا نام روشن کر دیا"

مطلب کے بعد عبدالمطلب ابن ہاشم متولی ہوا۔ اسکے عہد میں اصحاب الفیل کا واقعہ یعنی یمنی بریدہ ابرہہ کا سانحہ پیش آیا۔ اور اسی سال عبدالمطلب کے سب سے چھوٹے بیٹے عبداللہ کے گھر وہ نور ظاہر ہوا جس نے تمام دنیا کو منور کر دیا"

اگرچہ بہ لحاظ جاہ و حشمت اور کثرت نفوس بنو امیہ کا اقتدار بنو ہاشم سے زیادہ تھا۔ لیکن حجابتہ کعبۃ اللہ جو نسلاً بعد نسلاً موخر الذکر خاندان میں بطور ارث چلی آتی تھی۔ بنو ہاشم کی بزرگی اور خاص امتیازی عزت کا سبب تھی جسے بنو امیہ باوجود متواتر کوششوں کے حاصل نہ کر سکے۔ لیکن انکے پاس ایسے اسباب جمع ہو رہے تھے جو حصول امارت کا ذریعہ ہو سکتے ہیں۔ اور اس میں کچھ شک نہیں کہ انہی اسباب کی بدولت جس قدر بنو امیہ زبردست بن گئے بنو ہاشم کمزور ہوتے گئے"

ایام جاہلیت یعنی پیغمبرؐ کی بعثت سے پیشتر تواریخ عرب ان خانہ جنگیوں کے باعث جو عرب کے مختلف قبایل میں ذرا ذرا سی بات پر برسوں ابتدائی زور شور سے جاری رہتیں نہ صرف دلچسپ ہے بلکہ اون واقعات کو جنہیں ہم "دمشق" کے حالات میں قلمبند کرنا چاہتے بخوبی واضح کرتی ہے۔ مذکورہ بالا واقعات سے اتنا تو ضرور ظاہر ہوتا ہے کہ بنو ہاشم اور بنو امیہ میں خاندانی کاوشوں کا کیا باعث تھا جو نہ صرف روز بروز بڑھتی گئیں بلکہ دونوں خاندانوں میں اس قدر مغایرت پیدا کر دی کہ ان کا اتفاق اجتماع ضدین ہو گیا۔ لیکن یہ کچھ تعجب کی بات نہیں کہ اس قدر عداوت اور خصومت کے ہوتے دونوں خاندان ایک ہی جگہ بود و باش رکھتے تھے۔ انھیں

پیدا ہو گیا۔ لیکن باوجود آئے دن کے جھگڑوں اور لڑائیوں کے وہ کبھی پسند نہیں کرتے تھے کہ غیر اقوام کا غلبہ ہو۔ کیونکہ ایسی صورت میں حکومت میں ان کا کوئی حصہ نہ رہتا۔ یہ خدمات فی الحقیقت حکومت ہی سمجھی جاتی تہیں، اور بالخصوص سقایۃ الحاج اور عمارۃ مسجد الحرام ایسی خدمات تھیں کہ ہر ایک قبیلہ اسکے لئے کوشش کرتا تھا، ایام جاہلیت کی تواریخ کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ مختلف قبایل میں رشک و حسد انہی خدمات کی وجہ سے پیدا ہو جایا کرتا تھا، اسلام نے جاہلیت کے ساتھ اس عجیب و غریب حکومت کا بھی خاتمہ کر دیا، اور تمام عرب کو جہاد فی سبیل اللہ کی طرف متوجہ کر دیا"

اکثر تلوار چلتی لیکن عام جلسوں اور ضیافتوں میں شریک ہوتے۔ اور کبھی پسند نہ کر سکتے تھے کہ اُنپر قریش کے سوائے کسی اور کا غلبہ ہو۔ وہ خود ایک دوسرے پر غالب آنا چاہتے تھے، لیکن آل غالب کو کوئی غیر قوم مغلوب نہیں کر سکتی تھی۔ دائمی مفارقت اور ایسی مغایرت جو دو مختلف قوموں میں پائی جاتی ہے، ان میں موجود نہ تھی۔ اس کا باعث یہ ہے کہ دونوں خاندانوں کی رگوں میں ایک ہی تر و تازہ اور خالص خون تھا۔ اگرچہ اسباب ایسے جمع ہو رہے تھے کہ وہ ہمیشہ ایک دوسرے کی ترقی کو رشک و حسد کی نگاہ سے دیکھتے لیکن قومیت کے اس جزو اعظم کو کبھی علیحدہ نہیں کر سکتے تھے۔ جنگ حنین میں جبکہ ابتداءً مسلمانوں کو شکست ہوئی تو مخالفین میں سے کلاہ بن خنبل نے جو صفوان کا اخیافی بھائی تھا۔ کہا۔

"الا بطل السحر الیوم"۔

صفوان[۱۲] نے جواب دیا "اسکت فض اللہ فاک لان یربنی رجل من قریش احب الی عن یربنی رجل من ھوازن"۔ اس فقرہ سے ان غیور طبیعتوں کے اندرونی حالات کا بخوبی انکشاف ہوتا ہے

حاشیہ نمبر ۱۲ - صفوان بن امیہ بن حلف بن وہب بن خذافہ بن جمح قرشی جمحی رسول اللہؐ کے اصحاب میں سے تھے۔ ان کے والد غزوہ بدر میں بحالت کفر کام آئے، جب پیغمبرؐ نے مکہ فتح کیا تو صفوانؓ اپنے دادا کے پاس بھاگ گئے، عمر بن وہب جو ان کے چچا کے بیٹے تھے درمیان میں آئے، اور رسولؐ خدا نے دو ماہ بقدر مسافت امان دی اور اپنا عمامہ جسے پہنکر مکہ معظمہ میں داخل ہوئے تھے بطور نشان امان عطا فرمایا، صفوانؓ اونٹ پر سوار ہو کر عمیرؓ کے ہمراہ رسول اللہؐ کے حضور آئے اور اسوقت جبکہ آپکے پاس لوگوں کا مجمع تھا پہونچے اور بآواز بلند کہا کہ "اے محمدؐ عمیر کہتا ہے کہ آپ نے مجھے دو ماہ تک امان دی ہے"، آنحضرتؐ نے کہا کہ "اے ابو وہب سواری سے اترو" جواب دیا کہ صاف صاف فرمائیے۔ فرمایا کہ "اچھا بقدر مسافت چار ماہ امان دی جاتی ہے"۔ سواری سے اُترے اور حنین تک رسول اللہؐ کے ہمراہ گئے۔ آنحضرتؐ نے آپ سے کچھ ہتھیار مانگے۔ آپنے کہا کہ خوشی سے مانگتے ہو یا جبراً طلب کرتے ہو، فرمایا خوشی سے عاریتاً مانگتا ہوں اگر ضائع ہو گئے تو قیمت دی جائیگی۔ غزوہ حنین میں یہ کفار کے ساتھ تھے۔ مگر مسلمانوں کو آخر میں فتح ہوئی تو غنیمت سے آپ کو بھی حصہ دیا گیا۔ رسول اللہ کی فیاضی نے گرویدہ بنا لیا، اور کہا اس قدر فیاضی نبوت کا خاصہ ہے مسلمان ہوئے تو پکے مسلمان بنے۔ مکہ میں مقیم رہتے تھے اور ان سے کہا گیا کہ جس نے ہجرت نہیں کی وہ ہلاک ہو جائے گا اور بغیر ہجرت کے اسلام قبول نہ ہوگا،

الغرض یہی حالت تھی کہ قبائل قریش میں سے بنوامیہ اور بنو ہاشم اپنی اپنی حریفانہ کوششوں میں مشغول تھے کہ حضرت محمدؐ نے تبلیغ کا کام شروع کر دیا۔ اہل مکہ کی توجہ اس طرف لگ گئی۔ اگرچہ اس وقت تمام دنیا آپ کی مخالفت پر آمادہ ہو گئی۔ اور اگر بنوامیہ یا دیگر قبائل نے علی الاعلان دشمنی کا اظہار کیا تو بنو ہاشم نے بھی دعوت اسلام سے انکار کر دیا مگر ایک بات ضرور تھی۔ بنو ہاشم ہمیشہ آپ کی حمایت بوجہ قرابت کرتے رہے اور یہ ایک قدرتی بات تھی۔ اور عربی طبیعت کا بالخصوص خاصہ تھا کہ وہ اپنے آدمی کو کسی حالت میں دشمن کے ہاتھ میں دیکھ نہیں سکتے تھے۔ ایک روز حسب معمول پیغمبر لوگوں کو دعوت اسلام دے رہے تھے کہ ابوجہل آ پہونچا۔ اور رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے سخت نامناسب اور ناشائستہ کلمات کہے۔ رسول کریم کی خاموشی نے اوسکی اور زبان دراز کر دی۔ گالیاں دینے لگا۔ عالی حوصلہ نبی نے اس یاوہ گو اور دریدہ دہن کی کسی بات کا کچھ جواب نہ دیا۔ اور سکوت اختیار کیا۔ اسپر ابوجہل نے پھر ایک پتھر مارا اور آپکے سر سے خون بہنے لگا۔ اب ابوجہل کے بھی حواس باختہ ہو گئے۔ اسے معاً خیال پیدا ہوا کہ بنو ہاشم اسے زندہ نہ چھوڑینگے رسول خدا بھی اچھی طرح جانتے تھے کہ ابوجہل کے دل میں کیا خیال گذرا ہے مگر آپ خانہ جنگی کو پسند نہ فرماتے تھے اور اس لئے صبر کیا۔ اور چپکے گھر کی طرف چلے گئے۔ ابوجہل بھی لوٹ گیا اور قریش کی مجلس میں جو کعبہ کے پہلو میں ہر روز منعقد ہوتی آیا۔ حضرت حمزہ[۱۳] جو اس وقت بحالت کفر تھے حسب معمول شکار کھیل کر کعبہ کی طرف آرہے تھے۔ اون کی عادت تھی کہ ہر روز شکار کے لئے باہر جایا کرتے اور گھر جانے سے پہلے کعبہ کا طواف کرتے اور پھر مجلس قریش میں آتے۔ اس وقت عبداللہ بن جدعان تیمی کی لونڈی اون سے دوچار ہوئی۔ اور کہا

اسلئے مدینہ میں ہجرت کر آئے۔ رسول اللہ نے انکی کیفیت سنکر فرمایا کہ فتح مکہ کے بعد ہجرت ضروری نہیں۔ زمانہ جاہلیت میں بھی اشراف قریش تھے۔ اور فیاضانہ دعوتیں دیتے۔ لوگ انہیں "سداد البطحا" کہتے۔ نہایت فصیح زبان تھے۔ انکی خاندانی فیاضی مشہور تھی۔ انکی وفات حضرت عثمانؓ کے ہنگامہ میں ہوئی۔ اور بعض اقوال کے مطابق ۳۲ھ میں ہوئی۔ ان کے بیٹے عبداللہ جو باپ کی طرح فیاض تھے عبداللہ بن زبیرؓ کے ہمراہ مکہ میں شہید ہوئے۔"

حاشیہ نمبر ۱۳ — حضرت حمزہ بن عبدالمطلب بن ہاشم بن عبد مناف بن قصی رسول اللہ کے چچا تھے۔ انکی کنیت ابویعلی اور بعض لوگ ابوعمارہ کہتے ہیں جو آپکے صاحبزادوں کے نام ہیں۔ آنکی والدہ ہالہ بنت وہب بن عبد مناف بن زہرہ تھیں یعنی حضرت آمنہ بنت وہب والدہ رسول کریم کی چچا کی بیٹی۔ صفیہ بنت عبدالمطلب والدہ حضرت زبیرؓ کے حقیقی بھائی تھے۔ رسول خدا کے چچا اور رضاعی بھائی بھی ہیں۔ کیونکہ پیغمبر اور حضرت حمزہؓ کو "ثوبیہ" نے دودھ

"اے ابو عمارہ (عمارہ آپکے صاحبزادہ کا نام تھا) کاش تم اوس مصیبت کو دیکھتے جو تمہارے بھتیجے محمد کو ابھی ابھی ابوالحکم (ابوجہل) کے ہاتھ سے پہونچی ہے۔ بخدا اس نے تمہارے بھتیجے کو گالیاں دیں اور مارا اور محمد نے اوسے کچھ نہیں کہا۔" حضرت حمزہ کو سخت غصہ آیا اور کعبہ کا طواف بھی بھول گئے۔ سیدھا قریش کی مجلس میں ابوجہل کی تلاش میں گئے۔ دیکھا کہ لوگوں کے ساتھ بیٹھا ہوا باتیں کر رہا ہے۔ آپکے ہاتھ میں اس وقت کمان تھی۔ اس زور سے ابوجہل کے سر پر ماری کہ خون بہنے لگا۔ بنی مخزوم اپنے آدمی کو بچانے اور انتقام کے لئے کھڑے ہو گئے۔ لیکن دور اندیش ابوجہل نے خود اُنہیں روک دیا۔ اور کہا کہ "ابتدا میری طرف سے ہوئی ہے اور میں نے اون کے بھتیجے کو سخت گالیاں دی ہیں۔"

ابوطالب نے جو اس وقت متولی کعبہ تھے اگرچہ دعوت اسلام کو قبول نہیں کیا۔ لیکن جب کفار مکہ نے اونسے کہلا بھیجا کہ اپنے بھتیجے کو منع کر دو کہ ہمارے خداؤں کی مذمت نہ کرے تو پیغمبر کو سمجھایا کہ "قوم سچ کہتی ہے اگر تم ہمارے دیوتاؤں کو بُرا کہو گے تو وہ تمہیں تکلیف دینگے۔" رسول خدا آبدیدہ ہو کر بولے کہ "میں نہیں کہتا۔ اللہ تعالٰی کا ارشاد ہے جو میری زبان پر جاری ہے۔ اور اگر قوم آفتاب اور ماہتاب کو میرے داہنے اور بائیں ہاتھ پر رکھدیں تو بھی میں احکام خداوندی سے ایک حرف کم نہ کرونگا" اتنا کہہ کر آپ باچشم پُرآب باہر نکلے۔ ابوطالب کا دل بھی بھر آیا۔ اور واپس بلا کر بغل میں لے لیا۔ اور کہا کہ "بیفکر رہو جب تک میں زندہ ہوں تمہیں کوئی شخص تکلیف نہیں دیسکتا۔"

آپکے دادا عبدالمطلب کے زمانہ میں اگرچہ مخالفت کی کوئی انتہا نہ تھی مگر کوئی شخص آپ کو جسمانی تکلیف اور اذیت پہونچانے کی جرأت نہ کر سکتا تھا۔ ابوطالب نے جہاں تک ہو سکا آپ کو دشمنوں کے ہاتھ سے بچانے کی کوشش کی۔ مگر ادھر تو آنحضرت کی دعوت کا اثر چند سر برآوردہ لوگوں کے دلوں پر ہو گیا۔ اور اودھر کفار و مشرکین نے مخالفت کے ساتھ آپ کو طرح طرح کی اذیتیں پہونچائیں۔ ابوطالب کے بعد عباس بن عبدالمطلب سردار ہوا تو دشمنانِ دین نے آپکے قتل کا مصمم ارادہ کر لیا۔ آپنے طائف کی طرف ہجرت کی۔ اس جگہ بھی آپکے ساتھ سخت بدسلوکی ہوئی۔ اور لوگوں نے آپ پر پتھر برسائے۔ آپ افسردہ خاطر ہو کر

پلایا تھا جو ابولہب کی لونڈی تھی حضرت حمزہؓ رسول اللہ سے دو سال یا کچھ زاید سال بڑے تھے۔ ابوجہل کی شرارت آپ کا باعث اسلام ہے۔"

طائف سے نکل کر ایک باغ کی طرف جو شہر کے قریب تھا اور شیبہ[۱۴] بن عتبہ بن ربیعہ بن عبدشمس کی ملکیت تھا آئے۔ شیبہ نے ایک غلام کے ہاتھ انگور طبق میں لگا کر بھیجے۔ اپنے حریف قبیلے کے ایک رکن مگر قریبی رشتہ دار کے ساتھ اہل طائف کی بدسلوکی اسے سخت ناگوار معلوم ہوئی۔ مگر دیگر وجوہات بھی تھیں اس لئے اپنے آپ کو آنحضرتؐ پر ظاہر نہ کیا۔

اِن واقعات سے اس قدر ظاہر ہو گیا ہو گا کہ قومیت کو اہل قریش کبھی کسی وقت اور کسی جگہ فراموش نہیں کرتے تھے۔ اگرچہ وہ خود ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے اور باتوں باتوں میں پرانے زخموں کو آب شمشیر سے تازہ کر دیتے تھے حضرت حمزہ کی حمایت ابوجہل کے برخلاف اور شیبہ کی خاطر و تواضع اہل طائف کی بدسلوکی پر ایسی مثالیں ہیں جو اس وقت عرب کے قومی اور خاندانی اوصاف کو واضح طور پر بیان کرتی ہیں۔

پیغمبرؐ نے مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کی تو رفتہ رفتہ آپ کی جمعیت بڑھتی گئی اور آخر خود متولی کعبہ یعنی عباسؓ نے بھی بصدق دل اسلام قبول کیا اور مکہ سے مدینہ میں آ کر آباد ہو گئے۔ اس وقت جبکہ کل بنو ہاشم اور بنو عبدالمطلب مکہ کو چھوڑ گئے۔ بنوامیہ کے لئے میدان خالی تھا۔ اس لئے یہی لوگ ریاست اور صدر اعزاز پر متمکن ہو گئے۔ مسلمانوں اور اہل مکہ کے درمیان خونریز جنگ ہوئے جن میں سے بدر اور اُحد کی لڑائیاں بہت مشہور ہیں۔ جنگ بدر میں سرداران بنی عبدشمس عتبہ و ربیعہ و ولید اور عقبہ وغیرہم کے مارے جانے سے ابوسفیان[۱۵] بالاستقلال سردار تسلیم کیے گئے۔ اور حق تو یہ ہے کہ ابوسفیان نے ذاتی قابلیت سے اپنے آپ کو

حاشیہ نمبر ۱۴۔ شیبہ رسول اللہ کے صحابی ہیں۔ امیر معاویہ کے ماموں تھے۔ جنگ یرموک میں ایک آنکھ جاتی رہی۔ امیر معاویہ کے زمانہ میں وفات پائی۔

حاشیہ نمبر ۱۵۔ صخر نام ہے اور کنیت ابوسفیان ہے۔ اور نسب صخر ابن حرب بن امیہ بن عبدشمس بن عبد مناف بن قصی بن کلاب بن مرہ بن کعب بن لوئی ہے۔ ابوسفیان کی والدہ صفیہ نبیؐ کی زوجہ میمونہ کی پھوپھی تھیں۔ واقعہ فیل سے دس سال پہلے پیدا ہوئے اور فتح مکہ کی شب اسلام لائے۔ ابتدا میں رسول اللہ کے سخت مخالف تھے۔ بالآخر مسلمان ہوئے تو خدمات اسلام بھی کیں۔ اکثر کہا کرتے تھے کہ رسول اللہ جب میرے مخالف تھے تو مخالفت بطریق احسن کرتے اور جب دوست ہوئے تو ایسے کہ آپ کا نظیر نہیں۔ ابوسفیان کی ایک آنکھ غزوہ طائف میں پھوٹ گئی تھی۔ اور دوسری آنکھ جنگ یرموک میں شہید ہوئی اس جنگ میں

اس عہد مکے بالکل موزون اور مستحق بنا دیا۔ جنگ اُحد میں جبکہ اہل مکہ گذشتہ شکست کا جو بدر میں کھا چکے تھے داغ مٹانے کے لئے نکلے تو سپہ سالاری کا اعزاز اور فتح کا فخر ابوسفیان کی ذات سے وابستہ تھا۔ اس کے بعد غزوہ احزاب اور دیگر لڑائیوں میں بھی ابوسفیان ہی سپہ سالار تھے۔ فتح مکہ کے بعد ابوسفیان بھی ایمان لے آئے اور پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "من دخل دار ابی سفیان فھو امن"

اس وقت جبکہ عرب نور ہدایت سے معمور ہو گیا ایام جاہلیت کا خاتمہ ہو گیا۔ خانہ جنگی کی آگ بجھ گئی اور ہر ایک شخص ایک دوسرے سے حقیقی بھائی کی طرح ملتا۔ بیشک عرب پر اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا احسان تھا کہ اسلام نے ان کو ایک دوسرے کا بھائی بنا دیا"

انما المومنون اخوۃ۔

ایام جاہلیت میں ان خاندانی خصومتوں اور نفسانی غرضوں کو بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کا احسان ظاہر

وہ مسلمانوں کے واعظ تھے اور نہایت بہادری سے لڑے۔ زمانہ جاہلیت میں ابوسفیان ان لوگوں میں سے تھے جن کی بات رد نہ کی جاتی تھی عہد اسلام میں ان کی رائے کی کچھ وقعت ہی نہ تھی۔ سنہ ۳۱ھ میں وفات پائی۔ اٹھاسی برس کی عمر تھی"

حاشیہ نمبر ۱۶۔ پیغمبر نے مکہ میں اول مہاجرین کی اور بعد ازاں مدینہ منورہ میں مہاجرین اور انصار میں "مواخاۃ" کی رسم قائم کی۔ مدعا یہ تھا کہ تمام مسلمان ایک دوسرے کو اپنا بھائی سمجھیں اور ذاتوں کا امتیاز بالکل اُٹھ جائے۔ اس سے پیشتر اہل عرب کی جو کچھ حالت تھی وہ ہندوستان میں قدیم الایام سے اب بھی موجود ہے۔ ہر ایک قبیلہ وصف اضافی کو ہنر ذات سمجھتا تھا اور جو کچھ انہیں اسیر فخر تھا وہ دیگر قبائل سے مغایرت پیدا کرتا تھا۔ مواخاۃ کا اثر اسلامی سوسائٹی پر ایسا اچھا ہوا کہ ہر ایک شخص یہ سمجھتا تھا کہ تمام مسلمانوں کا فرض ہے کہ میری امداد کریں اور یہ کہ میں دنیا میں اکیلا نہیں ہوں۔ رسول اللہ نے عبدالرحمن بن عوف کا جو عشرہ مبشرہ میں سے تھے اور ان چھ آدمیوں میں سے تھے جنکی نسبت حضرت عمرؓ نے وصیت کی تھی کہ ان میں سے ایک کو میرے بعد خلیفہ منتخب کرنا بھائی چارا سعد بن ربیع سے قائم کر دیا تو سعد نے کہا "بھائی میرے پاس کچھ مال ہے وہ میرے اور تمہارے درمیان نصف نصف تقسیم ہونا چاہیے"۔ عبدالرحمن نے شکریہ کے ساتھ انکار کیا اور کہا اللہ تعالیٰ تمہارے مال میں برکت دے۔ میں محنت سے روپیہ کماؤنگا"۔ اسی طرح دیگر صحابہ کا حال تھا کہ ان میں اخوۃ ایسی قائم ہو گئی تھی کہ بیدریغ ہر ایک چیز باہم تقسیم کرنے پر راضی تھے۔ فی الحقیقت یہ اللہ تعالیٰ کا احسان

کرتی ہے کہ کس طرح اسلام نے یک لخت اُن کے دل کدورتوں سے صاف کر دیئے اور وہ اپنے آبائی جھگڑوں سے دست بردار ہوکر ایک دوسرے کو اپنا حقیقی بھائی سمجھتے ہیں۔ فی الحقیقت مذہب جو قومیت

تھا کہ وہ قوم جو سراسر نفاق اور نتیجۃً جنگ وجدل کی مجسم مثال تھی اسلام کی برکتوں سے مستفید ہوکر ایک ایسے اتحاد اور اتفاق کی نظیر ثابت ہوئی جسکا نظیر تواریخ عالم کے صفحات پر نہیں ملتا۔ یہ مبالغہ نہیں۔ اسلام نے "اخوۃ" جزو مذہب قرار دیا۔ اور کسی دوسرے مذہب میں یہ بات نہیں ہے؛

قومیت جیسا کہ موجودہ زمانہ میں سمجھا گیا ہے بنی نوع انسان کے باہمی تعلقات ہیں جو یا تو قرابتاً یا ضرورتاً نفع ونقصان کے اشتراک یا مذہب کے ذریعہ پیدا ہوتے ہیں۔ یہ تو ناممکن ہے کہ ایک شخص کا تعلق بذریعہ قرابت کسی ملک کے تمام باشندوں سے ہوجائے اور یہ بھی ممکن نہیں کہ مختلف اقوام کا فائدہ یا نقصان باہم مشترک ہو۔ اسلئے جہاں تک ان دو اجزاء قومیت کا تعلق ہے یہ سمجھنا چاہئے کہ یہ ایسے ذریعہ نہیں جو دو ممالک یا دو اقوام یا سوسائٹی میں مضبوط رشتہ پیدا کرتے ہیں۔ البتہ مذہب ایک ایسا رشتہ ہے کہ اسکی موجودگی میں دونوں دوسرے رشتے بھی بودے ثابت ہوئے ہیں؛ اب سوال یہ ہے کہ دنیا میں کوئی ایسا مذہب ہے جسکی تعلیم ایسا قوی رشتہ پیدا کرتی ہے جسکی دنیا کو ضرورت ہے؛ جہاں تک ہمیں معلوم ہے دنیا میں کوئی مذہب سوائے اسلام کے نہیں جو اس ضرورت کو پورا کر سکے؛ ہندوستان میں ہندوؤں کا کوئی مذہب نہیں جو موجودہ زمانہ کی ضروریات کے مطابق اور پسندیدہ ہو اسکے تمام فرقے رسم ورواج کے پابند ہیں اور ان کی بنیاد ذاتوں کے امتیاز پر ہے جو سرے سے ایک عام اتحاد اور اس لئے قومیت کے مخالف ہے۔ عیسائیت میں اگرچہ ذاتوں کا امتیاز نہیں مگر اسنے قومیت کے اجزاء میں مذہب کو تسلیم نہیں کیا؛ جیسا کہ عیسائی دنیا کی تواریخ سے واضح ہوتا ہے اور مذہب کو ذریعہ اتحاد وقومیت سمجھنا عیسائیت کی تعلیم نہیں۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ موسوی شریعت میں اسکی جھلک نظر آتی ہے لیکن یہ مذہب صرف ایک قوم کا مذہب ہے۔ جسکا تعلق بہ لحاظ قرابت باہم ایسا مضبوط ہے کہ مذہبی رشتہ اس کے مقابلہ میں ہیچ ہے۔ اور انہیں غیر اقوام سے ہمیشہ نفرت رہی ہے؛ غرض دنیا میں کوئی مذہب سوائے اسلام کے ایسا نہیں ہے جو مذہب کو قومیت کا جزو اعظم قرار دیتا ہے۔ اور اس کے ذریعہ تمام دنیا کے لئے موقع ہے کہ ایک قوم بن جائے؛

موجودہ زمانہ میں اور غالباً آئندہ زمانہ میں بھی "قومیت" ہی اتفاق واتحاد کا ذریعہ ہے اور ہوگی لیکن جیسا کہ میں نے بیان کیا ہے اس کے اجزاء میں سے مذہب ایک ایسا جزو ہے جو مسلمانوں کی ترقی کا باعث ہوگا جیسا کہ

کا جزو اعظم ہے اس وقت تک قبایل عرب میں قابل لحاظ نہ تھا۔ اس وقت تک صرف قرابت کا رشتہ ایسا تھا جسنے مختلف قبایل کو ایک قوم کی صورت میں ظاہر کر رکھا تھا۔ مگر چونکہ غیر اقوام سے اُنہیں بہت کم

ابتداء میں ہوا۔ اسلام بذاتہٖ ایک مذہب ہے اور مسلمان اس حیثیت سے کہ وہ ایک مذہب کے پابند ہیں اسمیں "اخوۃ" قائم رکھتے ہیں۔ اور خواہ ان میں بعد المشرقین ہو خواہ وہ کسی نسل سے ہوں خواہ ان کے دیگر اغراض مشترکہ ہوں وہ جب تک اسلام اپنا مذہب سمجھتے ہیں ایک دوسرے کے بھائی ہیں"۔

اِسلام میں کیسے زبردست دلایل ہیں جو اسکی حقانیت کو ثابت کر رہے ہیں۔ اور ہر ایک شخص جو دنیاوی ترقی اور اخروی سرخروئی حاصل کرنا چاہتا ہے کس آسانی اور یقین کے ساتھ صرف قبولیتِ اسلام کے ذریعہ کر سکتا ہے"۔ یہ امر تو واضح ہے اور اسے دلایل سے ثابت کرنے کی ضرورت نہیں کہ قرابت کا تعلق بلحاظ بُعد کے کمزور ہوتا جاتا ہے"۔ اور بسا اوقات ذاتی اغراض رشتہ قرابت کو نظر انداز کر دیتی ہیں۔ تواریخ عالم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں بیشمار قومیں کچھ عرصہ کے لئے ابھریں انکا عروج ہوا۔ اور زوال کے بعد خاک مذلت میں مل گئیں۔ رومیوں اور ایرانیوں اور یونانیوں اور مصریوں اور بیشمار قوموں کی تواریخ ہمارے سامنے ہے"۔ یہ ایسی قومیں تھیں جنکی قومیت کی بنیاد ایک "خون" پر تھی۔ اور اس حیثیت سے ان کا نفع و نقصان بھی مشترک تھا۔ مگر جوں جوں قرابت میں بُعد ہوتا گیا اور گزشتہ تعلقات کی یاد ہمدردی کے ولولوں سے خالی ہوگئی۔ ذاتی اغراض نے قرابت کا کچھ پاس نہ کیا تو ایک قوم کے مختلف قبایل بن گئے۔ اور پھر علیحدہ رہایش اور دیگر وجوہات کے باعث تفرقہ پڑتا گیا۔ وہ اتحاد اور اتفاق جو ابتدا میں تھا رفتہ رفتہ کم ہوتے ہوتے مفقود ہو گیا۔ اسلام سے پیشتر کوئی ایسا مذہب جس نے مذہب کو جزو قومیت قرار دیکر اشاعت کی ہو دنیا کو نہیں ملا تھا۔ اس لئے یہ کہنا کچھ مبالغہ آمیز نہیں کہ اس سے پیشتر دنیا ایک ایسے اتحاد سے ناآشنا تھی جو مذہب کے ذریعہ پیدا ہو سکتا ہے یوں تو مشنری مذہب بدھ بھی تھا اور عیسائیت کو بھی ایسا بنایا گیا ہے لیکن ان مذاہب کو قومیت میں کچھ حصہ نہیں ملا۔ ہم یہ بھی نہیں کہتے کہ اسلام نے ہمیشہ عملاً قومیت میں حصہ لیا ہے۔ لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ علمی اصول اس میں ابتدا ہی سے موجود تھے۔ اور عملاً ہر ایک قوم نے جس نے اسلام قبول کیا۔ خواہ وہ حاکم تھی یا محکوم بحیثیتِ مذہب اختلاط اور اتحاد کو جگہ دی"۔ "بغداد" کے صفحات پر دیلمی سلجوقی اور ترکی اقوام کے عروج کا پتہ ملتا ہے لیکن یہ کس قدر تعجب انگیز امر ہے کہ عربوں سے اسکا اختلاط اسلام کے لئے مضر ثابت نہیں ہوا"۔ اسلام میں جہاں اور خوبیاں ہیں ایک یہ وصف بھی ہے کہ قومیت میں اس کا تعلق کمزور نہیں ہوتا۔ دیگر اجزاء

سابقہ پڑا اس لئے اسی حد تک ان کے اغراض مشترک تھے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ بحیثیت افراد قوم اون میں ایسی خوبیاں بکثرت تھیں جو صرف فیاض بہادر اور عالی حوصلہ لوگوں میں نظر آتی ہیں۔ مذہب نے انکی بالکل کایا پلٹ دی۔ ریگستان کے ذرے جنمیں اتحاد ناممکن نظر آتا تھا جب کبھی متفقہ طاقت کے ساتھ طوفان کی صورت میں اُٹھے تو دنیا کو خس و خاشاک سے پاک کر دیا۔ ان واقعات کو جن کا تذکرہ ہم نے اشارتاً کیا ہے مؤرخین اور محققین بیان کرتے ہوئے اسلام کی برکتوں کا اعتراف کرتے ہیں۔ اور اس میں کچھ شک نہیں کہ اسلام اور صرف اسلام ہی دنیا میں ایک ایسا مذہب ہے جو ہر ایک مسلمان کے دل پر حکومت کرتا ہے اور خواہ ان میں بعد المشرقین ہو اسی ایک رشتہ سے وہ ایک دوسرے کے قریب ہیں یہ رشتہ اخوت جو اسلام نے مسلمانوں میں قایم کیا ہے کسی ذاتی امتیاز کو تسلیم نہیں کرتا۔ اور سب کو اللہ تعالیٰ کے حضور دوش بدوش خواہ وہ شہنشاہ ہے یا گدا ایک ہی جگہ کھڑا کر دیتا ہے۔ موجودہ زمانہ میں اگرچہ مخالفین اسلام ایسے علمی اصول بتلاتے ہیں لیکن جس زمانہ کا ہم ذکر کر رہے ہیں اُس وقت اسکی صورت عملی تھی۔"

قومیت کا جب غلبہ ہو تو کسی قوم کا عروج ہو سکتا ہے لیکن آجتک کسی قوم کا عروج بالاستقلال نہیں ہوا۔ کچھ عرصہ کے بعد اسے زوال ضرور ہوا ہے۔ بلکہ تجربہ ہمیں بتاتا ہے کہ جس قوم کا آج عروج ہے کل زوال بھی ہوگا۔ کیونکہ ضرور ہے کہ قرابت کو بُعد کے ساتھ اور ذاتی اغراض کو نفاق کی وجہ سے کسی وقت کمزوری لاحق ہو۔ اصل بات یہ ہے کہ موجودہ زمانہ سے پیشتر مسلمانوں کو اس امر کی ضرورت نہیں تھی کہ قومیت کا فائدہ مذہبی حیثیت سے اُٹھائیں۔ اب تک جس قدر مسلمان قوموں کو عروج حاصل ہوا وہ انہی اصولوں پر ہوا جس پر دیگر اقوام کی ترقی مبنی تھی۔ اگرچہ اسمیں کچھ شک نہیں کہ انکی ترقی کا ممد اسلام بھی تھا۔ مگر اب ہم ایک ایسے زمانہ میں موجود ہیں جو تقاضا کرتا ہے کہ قومیت کا غلبہ بقدر اوسکی طاقت کے ہو۔ اسلام میں یہ خوبی ہے اور اصولاً وہ جزو قومیت ہے اور مسلمان اب اس حیثیت سے مستفید ہو رہے ہیں اور یہ امید کی جاتی ہے کہ کچھ عرصہ تک اسلام تمام مسلمانوں کو ایک قوم بنا دیگا۔ اور اگر ہماری پیش گوئی جو واقعات کے نتایج پر مبنی ہے پوری ہوگئی اور ہمیں یقین ہے کہ ضرور پوری ہوگی تو یہ عروج بالاستقلال ہوگا۔ اس کے بعد کسی زوال کا ڈر نہیں کیونکہ دیگر اجزا قومیت کی طرح مذہب کا تعلق کمزور نہیں ہوتا یہ صداقت اسلام کی زبردست دلیل ہے کہ کس طرح مختلف اقوام کے دلوں کو ملاتا ہے اور کس طرح ان میں ہمدردی پیدا کرتا ہے۔ یہ سب کچھ "انما المومنون اخوۃ" کی بدولت ہے۔"

پیغمبرِ خدا کا وہ خطبہ جو آپ نے فتح مکہ کے بعد پڑھا مسلمانوں کو ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے۔ آپ نے سب لوگوں کو جو اس وقت موجود تھے مخاطب کر کے فرمایا اور ایسی باتیں بیان فرمائیں جو ہمیشہ مسلمانوں کا دستور العمل ہونی چاہئیں۔ اور بالخصوص یہ فقرات تو آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہیں "ان اللہ اذھب عنکم غیبۃ الجاھلیۃ وفخرھا بالآباء انما انتم بنو آدم و آدم من تراب" فرمایا کہ لوگ دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک نیک پرہیزگار جس کی عزت اللہ تعالیٰ کے حضور مسلمہ ہے اور دوسرا بدکار بدبخت جو خدا کے سامنے ذلیل و خوار ہے۔ زمانہ جاہلیت کا تکبر اور باپ دادا پر فخر کرنا ممنوع ہے ہم سب بنی آدم ہیں اور آدم کی اصل مٹی ہے۔" پھر یہ آیت پڑھی "انا خلقناکم من ذکر و انثیٰ وجعلناکم شعوباً وقبائل لتعارفوا ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم ان اللہ علیم خبیر۔"

یعنی ذاتی امتیاز تو صرف معرفت کا ذریعہ ہے نہ کہ کوئی قابلِ فخر امر۔ وصف اضافی کبھی ہنر ذات ہو سکتا ہے، ہرگز نہیں۔ اس لئے اپنے حسب و نسب پر فخر کرنا جیسا کہ ایامِ جاہلیت میں عرب کا دستور تھا بالکل بیہودہ بات ہے۔ تقویٰ ہی صرف ایک ایسی عزت کا مستحق بناتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک مسلّم ہے۔ اور تعجب ہے کہ ہر ایک قبیلہ اپنے حسب و نسب پر فخر اور تکبر کرتا ہے حالانکہ سب آدمی ایک ہی تخم کی اولاد ہیں اس لئے بحیثیت بنی آدم اُن کا فخر بالکل بیجا ہے۔ اور کسی شخص کو نسبتاً کسی دوسرے شخص پر جو اُس کا بھائی ہے کوئی امتیاز نہیں ہو سکتا۔ اگر انسان حیوانات اور نباتات پر یہ فخر کرے کہ وہ اشرف المخلوقات ہے تو یہ کچھ بات ہے ایک انسان کا دوسرے انسان پر بہ لحاظ انسانیت و آدمیت فخر کرنا بالکل بے معنی ہے۔ اور زیادہ تر تعجب یہ ہے کہ آدم کی اصل مٹی ہے اس لئے شیوہ خاکساری ہونا چاہیے۔ نہ کہ تکبر و فخر۔

ایک مرتبہ شاش بن قیس جو مسلمانوں کا سخت دشمن تھا اور جس طرح اس دنیا میں اندھا تھا اُسی طرح "فی الآخرۃ اعمیٰ" تھا۔ ایک مقام پر جہاں اصحابِ رسول اللہ بیٹھے ہوئے تھے گذرا جب اُسے یہ معلوم ہوا کہ یہ قبیلہ اوس اور خزرج کے لوگ ہیں تو ایک یہودی جوان کو جو اسکے ہمراہ تھا کہا کہ ان لوگوں کے پاس گذرتا ہوا وہ اشعار پڑھ جو "بعاث" کے واقعہ کے متعلق ہیں "بعاث" اوس و خزرج کے ایک مشہور لڑائی کا نام ہے جو ایامِ جاہلیت میں دونوں قبایل میں واقع ہوئی تھی جس وقت یہودی نے ان اشعار کو پڑھا پرانا واقعہ یاد آگیا۔ اور دونوں قبیلوں کی رگوں میں خون جوش

مارنے لگا۔ اور اپنے بزرگوں کی تعریف فخریہ بیان کرنے لگے جس سے حریف قبیلہ کی ذلت منظور تھی
بات بڑھ گئی۔ ادھر سے اوس بن قبطی اُٹھے اور خزرج کی طرف سے جبار بن صخر طیش میں آکر کہنے لگے کہ
" خدا کی قسم اگر تمہاری خواہش ہو تو ہم بعاث کے واقعہ کو آج پھر دکھا سکتے ہیں"۔ یہ گویا اعلان جنگ تھا
دونوں فریق ایک دوسرے سے جدا ہوئے اور مسلح ہو کر مقام ظاہرہ میں جمع ہو رہے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم کو خبر مل گئی۔ آپ وہاں تشریف لائے۔ اور انہیں مخاطب کرکے فرمایا " مسلمانو! خدا سے
ڈرو۔ خدا سے ڈرو۔ کیا ایام جاہلیت کی مذموم رسوم کو تم پھر رواج دینے لگے ہو حالانکہ میں تم میں
موجود ہوں۔ اور اللہ تعالیٰ تمہیں اسلام کی طرف ہدایت کرچکا ہے۔ تم اس سے مشرف ہوئے۔ اور
امور جاہلیت سے کنارہ کیا۔ تمہیں کفر سے نجات ملی۔ اور اللہ تعالیٰ نے تم میں رشتہ اخوت قائم کردیا
اب پھر تم اپنے آبائی کفر کی طرف رجوع کرتے ہو"۔ رسول خدا کے کلام نے ایسا اثر کیا کہ سب رونے لگے اور
فوراً ہتھیار زمین پر رکھ دیئے۔ اسکے بعد باہم ایک دوسرے سے بغلگیر ہوئے۔ آیات " قل یاھل الکتاب
لم تکفرون بآیات اللہ واللہ شھید علی ما تعملون یا اھل الکتاب لم تصدون عن سبیل اللہ
من اٰمن الخ " اور " یا ایھا الذین اٰمنوا ان تطیعوا فریقاً من الذین اوتوا الکتاب یردوکم بعد ایمانکم
کافرین الآیت الخ " ان مذموم رسوم جاہلیت کی طرف اشارہ کر رہی ہیں جنکی طرف اہل کتاب بوجہ بغض
اور کینہ کی وجہ سے جو انہیں اسلام کے ساتھ تھا مسلمانوں کو متوجہ کر رہے تھے۔ مدعا یہ تھا کہ موجودہ اتفاق
واتحاد جسکو اسلام نے مسلمانوں میں پیدا کردیا تھا اور جو اُن کی اپنی خرابی کا باعث تھا دور کردیں۔ مگر اللہ تعالیٰ
نے اسلام اور مسلمانوں کو ان کے شر سے بچالیا۔ اور اپنی نعمت کو پورا کردیا۔ اگرچہ کفار و مشرکین کو برا
معلوم ہو"۔

رسول اللہ کے زمانہ میں جبکہ لوگ جوق جوق آکر بطیب خاطر ایمان لاتے تھے اور رفتہ رفتہ
تمام عرب مسلمان ہو گئے اور آیۃ " الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام
دیناً " نازل ہوئی۔ عرب میں بالکل امن تھا۔ بت و بت خانہ کی جگہ مساجد قائم ہوگئیں اور صدائے ناقوس
کی بجائے تکبیر کی آواز سنائی دیتی۔ تمام قبائل عرب جو اسلام سے مشرف ہو چکے تھے اب ایک ایسی قوم
تھی جو اتفاق واتحاد کی مجسم مثال تھی۔ اسلام نے خاندانی خصومتوں کو بالکل مٹادیا اور کوئی شخص آبائی فخر
اور نسبی شرافت کا اظہار نہ کرتا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سب ایک ہی خاندان کے آدمی ہیں جیسا کہ وہ در حقیقت

تھے۔ اسلام نے انہیں مساوی حقوق عطا کیے، اور "اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم"
نے صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت اور رسول کریم کی اطاعت اور خلفا کی فرمانبرداری سکھادی۔
اس وقت مختلف قبایل عرب خواہ وہ ہاشمی تھے یا بنو امیہ صرف اُسی عزت کے مستحق تھے جو اُنکی
ذاتی قابلیتیں اور زہد تقویٰ وغیرہ تقاضا کرتے تھے حسب و نسب پر کچھ موقوف نہ تھا خلیفہ اول و دوم
کے عہد خلافت میں بھی یہی حال رہا۔ تاریخ اسلام کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبرؐ اور صدیق اکبرؓ
اور فاروق اعظمؓ نے کبھی کسی شخص کی عزت بہ لحاظ خاندانی وجاہت نہیں کی، حضرت عمرؓ کا تو قول تھا
کہ "ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم" فی الحقیقت اللہ اور رسول کریم اور آپکے اول دو جانشینوں کی نظر و
میں وہی زیادہ عزت کا مستحق تھا جو زیادہ متقی تھا جس نے اسلام کی زیادہ خدمت کی اور جسکی ذات سے
مسلمانوں کو زیادہ نفع پہونچتا۔ اس زمانہ میں معیار بزرگی یہی کچھ تھا لیکن زمانہ مابعد میں اگرچہ خلافت کا کام
انہی اصولوں پر چلتا رہا۔ مگر اس میں کچھ شک نہیں کہ قومیت کا خیال بھی عملاً اپنا اثر دکھانے لگا۔ مگر پیشتر
اس کے کہ ہم ان واقعات کو بیان کریں جو بنوامیہ اور بنو ہاشم کے کارنامے ہیں مناسب معلوم ہوتا ہے
کہ اسجگہ یہ بھی بتادیں کہ صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ کے عہد خلافت میں ان دونوں قبیلوں کی کیا حالت تھی؟
یہ امر کہ رسول اللہ نے تمام ذاتی امتیاز قطعاً اٹھا دیا تھا اور مسلمانوں کو حسب و نسب پر فخر اور تکبر
کرنے کی ممانعت کردی تھی۔ قرآن شریف اور احادیث سے بخوبی واضح ہوتا ہے جسکا ثبوت ہم کسی قدر
دے چکے ہیں آپنے ہر ایک موقع پر اس کا عملی ثبوت دیا۔ اور اگرچہ خود ہاشمی تھے لیکن بنو ہاشم کو کبھی دوسرے
مسلمانوں پر ترجیح نہیں دی، جنگ اُحد میں حضرت حمزہؓ شہید ہوئے۔ جو نہ صرف ہاشمی تھے بلکہ آپکے
عم مکرم بھی تھے اور بحالت کفر آپ کی حمایت کرتے تھے۔ اور جب مسلمان ہوئے تو اسلام کی خدمت میں
جان تک فدا کردی، آپ کی لاش کے ساتھ جو کچھ وحشیانہ سلوک کیا گیا تھا قدرتاً آپکے دل پر سخت صدمہ
ہوا۔ اور آپنے فرمایا کہ ستر کفار کے ساتھ جب مجھے قابو ملا یہی سلوک کرونگا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے خبردار کردیا۔
"وان عاقبتم فعاقبوا بمثل ما عوقبتم بہ ولئن صبرتم لھو خیر للصابرین واصبر وما صبرک
الا باللہ" یعنی انتقام کی بھی ایک حد ہے۔ اگر کسی کو تکلیف دو تو اتنی ہی جتنی تمہیں اسکے ہاتھ سے پہونچی
ہے۔ اور اگر صبر کرو تو یہ سب سے بہتر ہے۔ مگر صبر بھی للہ باللہ ہوگا کسی اور خیال سے۔ اگر رسول خدا اس
وقت حضرت حمزہؓ کے انتقام کے لیے تلوار اٹھاتے تو پرانی خاندانی کاوشوں کے ساتھ ایام جاہلیت

پھر عود کر آتے۔ اگر اس واقعہ کے متعلق زیادہ غور و خوض کیا جائے تو ہمارے دعویٰ کی اور بھی تائید ہوگی۔ اس وقت اگرچہ مسلمانوں اور کافروں میں جنگ ہو رہا تھا مگر فریقین کے سردار کون تھے؟ بنو امیہ اور بنو ہاشم! مگر یہ لڑائی اون لڑائیوں سے بالکل مختلف تھی جو ایام جاہلیت میں ان قبایل کے درمیان ہوتی تھیں۔ اس جنگ میں ایک ہی قبیلہ کے آدمی ایک دوسرے کے برخلاف لڑ رہے تھے۔ حالانکہ جاہلیت میں معاملہ بالکل برعکس تھا۔ کفار مسلمانوں کے قلع قمع کے واسطے درپے تھے کہ اسلام کی بیخکنی کریں۔ اور مسلمان مدافعت کے اصولوں پر جنگ کرتے تھے۔ جنگ بدر اسکی ایک عمدہ اور واضح مثال ہے۔ اس جنگ میں نہ صرف بنو امیہ ایک دوسرے کے مقابل تھے بلکہ ہاشمی بھی رسولؐ خدا کے خون کے پیاسے تھے۔ ان لڑائیوں نے قرابت کو نظر انداز کر دیا تھا۔"

حضرت ابو بکرؓ کے عہد خلافت میں بنو امیہ اور بنو ہاشم کو نہ ایک دوسرے پر اور نہ کسی اور مسلمان پر ترجیح تھی۔ ایک دفعہ رؤسا قریش نے صدیق اکبرؓ سے شکایت کی کہ "اون کا رتبہ مہاجرین اولین کے برابر نہیں سمجھا جاتا"۔ اور اسکے ساتھ یہ بھی شکایت تھی کہ انہیں مجلس شوریٰ میں شریک نہیں کیا جاتا"۔ آپؓ نے فرمایا کہ "اپنے بھائیوں کیطرح جہاد کرو۔ اسلام کو مخالفین کی ایذا رسانی سے مستغنی بنا دو۔ مرتدین عرب کی سرکوبی کرو جس سے اسلام اور مسلمانوں کو تقویت ہو"۔ صدیق اکبرؓ کے قول سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت معیار عزت و حرمت اسلام اور مسلمانوں کی خدمت تھی۔ حسب نسب پر فخر کرنے کا زمانہ ایام جاہلیت ہی تھے۔ اسلام نے مسلمانوں کی ترقی اور عزت صرف ذاتی قابلیتوں پر منحصر رکھی۔ فتح مکہ سے پیشتر بنو امیہ کی ریاست اور امارت مسلمہ تھی اور ان سے پیشتر بنو ہاشم کا اعزاز ہر ایک شخص کے دل پر تھا۔ لیکن اسلام نے جس طرح جاہلیت کے مذموم رسوم کا قلع قمع کیا اسکے ساتھ وہ اسباب بھی معدوم ہو گئے جو مختلف قبایل کے غلبہ اور اقتدار اور عزت کا ذریعہ تھے۔ اس وقت مسلمانوں کے حقوق مساوی تھے۔ اور ہر ایک شخص کے لئے میدان ترقی کھلا تھا خواہ وہ کسی حیثیت کا تھا۔ مگر وہ یقیناً امید کر سکتا تھا کہ اپنی ذاتی قابلیت سے امارت کے درجہ پر پہونچ سکتا ہے۔ حضرت اسامہؓ آنحضرتؐ کے غلام تھے۔ آپؐ نے انہیں آزاد کر دیا تھا نہ صرف یہی بلکہ عامل بھی مقرر فرمایا۔ غزوہ موتہ میں جس کا ذکر ہم آیندہ فصلوں میں کریں گے۔ اسامہؓ اسلامی لشکر کے سردار تھے اور اس میں حضرت عمرؓ منجملہ دیگر صحابہ آپ کے ماتحت کر دیئے گئے۔ اور کل اسلامی فوج پر جو اس وقت رومیوں کے مقابلہ کے لئے تیار ہو رہی تھی۔ اسامہؓ کے والد زید سپہ سالار تھے

اور اس لشکر میں جعفر بن ابی طالب اور عبد اللہ بن رواحہ ان کے ماتحت تھے۔ اُسامہ کا رنگ سیاہ تھا اور ناک چپٹی تھی لیکن رسُول اللہ کو اس درجہ محبوب تھے کہ انہیں "حب رسول" کہتے تھے۔

بیشمار واقعات تواریخ اسلام میں اس دعوے کی تائید میں ملینگے کہ رسُول خدا اور صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ کے زمانہ میں مسلمان ایک دوسرے کے بھائی تھے اور اونکے حقوق مساوی تھے۔ اگر کسی شخص کو ترجیح تھی تو اوسکی ذاتی قابلیت کی وجہ تھی۔ جب حضرت عمرؓ نے صحابہ کے وظیفے مقرر کئے تو حضرت اُسامہؓ بن زید کا وظیفہ پانچہزار مقرر کیا۔ اور اپنے بیٹے عبد اللہ کا دو ہزار۔ شکایت کی کہ اسامہ کو مجھ پر ترجیح دیجاتی ہے حالانکہ میں اُن کاموں میں شریک ہوا ہوں جن میں اُسامہؓ نہیں ہوئے۔ فاروق اعظمؓ نے جواب دیا کہ اسامہ رسُول خدا کو تجھ سے زیادہ محبوب تھے۔

اِس میں کچھ شک نہیں کہ بنوامیہ اور بنوہاشم کو جب کسی اسلامی خدمت کا موقعہ دیا گیا تو انہوں نے اپنی قابلیت کا اظہار بخوبی کیا۔ لیکن اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ بنوہاشم کا جو کچھ اعزاز اول دو خلفاء کے عہد میں تھا وہ سوائے حضرت عثمانؓ بن عفان بنوامیہ کے کسی اور رکن کو حاصل نہیں ہوا۔ اور یہ بالکل سچ ہے کہ نہ تو رسولؐ خدا نے اور نہ پہلے دو خلیفوں نے بنوہاشم اور بنوامیہ کو اس سے زیادہ اقتدار دیا جسکے وہ مستحق تھے۔

ہم نے بالاختصار دونوں خاندانوں کے ابتدائی حالات تنقیدی اصول کے مطابق بیان کر دیئے ہیں چونکہ "دمشق" کا تعلق انہی دو خاندانوں سے ہے اِس لئے ہم نے عمداً اُن واقعات کو جو تواریخ اسلام میں قابل ذکر ہیں مگر رسالت اور صدیقی اور فاروقی خلافت کے متعلق ہیں نظر انداز کر دیا ہے۔ حکومت امیہ کے اسباب اور ابتدائی حالات اور دیگر متعلقہ واقعات کا تذکرہ ہم دوسری فصل میں کرتے ہیں۔

دوسری فصل

پیغمبرؐ کی وفات کے بعد حضرت ابو بکرؓ صدیق اکبر خلیفہ ہوئے۔ رسُول اللہ نے اپنے بعد کسی شخص کو خلافت کے لئے نامزد نہیں کیا۔ مہاجرین اور انصار نے بالاتفاق آپ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ اور

آپ کی خلافت ہر ایک شخص نے برضا و رغبت تسلیم کر لی۔ آپ کے بعد حضرت عمرؓ خلیفہ ہوئے۔ صدیق اکبرؓ نے آخری ایام خلافت میں اپنے جانشین کے متعلق صحابہ سے مشورہ کیا تو ہر ایک شخص نے حضرت عمرؓ کو انتخاب کیا۔ اس لئے آپ نے حضرت عثمانؓ بن عفان کو بلا کر کہا کہ لکھو:۔

"بسم اللہ الرحمن الرحیم - ھذا ما عھد ابوبکر بن ابی قحافہ فی اٰخر عھدہ بالدنیا خارجًا منھا و عند اول عھدہ بالاٰخرۃ داخلاً فیھا حیث یؤمن الکافر و یوقن الفاجر و یصدق الکاذب انی استخلف علیکم بعدی عمر بن الخطاب فاسمعوا لہ و اطیعوا و انی لم اٰل اللہ و رسولہ و دینہ و نفسی و ایاکم خیرا فان عدل فذلک ظنی بہ و علمی فیہ و ان بدل فلکل امرءٍ ما اکتسب و الخیر اردت و لا اعلم الغیب و سیعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون والسلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ"

حضرت عمرؓ کا انتخاب صحابہ کے مشورہ اور خلیفہ کی وصیت سے ہوا۔ اور تمام صحابہؓ نے بالاتفاق برضا و رغبت آپ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ اول دو خلفاء کا انتخاب ہر طرح موزون ثابت ہوا۔ اور ان ایام میں مسلمانوں نے وہ ممالک فتح کیے جو آجتک اون کے قبضہ میں ہیں۔ اسلام کا سکہ فی الحقیقت اسی زمانہ میں بیٹھا۔ اور ایسے کہ اس کا اثر قیامت تک زائل نہ ہوگا"

جس وقت حضرت عمرؓ کو ایک مجوسی ابو لولو کے خنجر سے مہلک زخم لگے تو صحابہ نے آپ سے خلافت کے متعلق سوال کیا۔ آپ نے عثمان، علی، طلحہ، زبیرؓ[1]، عبدالرحمن بن عوف اور سعد بن ابی وقاص کا نام لے کر کہا کہ بکثرت رائے انہیں سے ایک کو منتخب کر لو۔ پھر وصیت کی کہ میرے بعد جو شخص

حاشیہ نمبر ۱:- حضرت زبیرؓ ابن عوام بن خویلد بن اسد بن عبد العزی بن قصی بن کلاب بن مرہ بن کعب بن لوئی قرشی اسدی کنیت ابو عبد اللہ تھی ان کی والدہ صفیہ بنت عبد المطلب ہیں جو رسول خدا کی پھوپھی تھیں۔ اس طرح آپ رسول اللہ کے پھوپھی کے بیٹے اور خدیجہ بنت خویلد کے بھتیجے تھے۔ آپ لڑکپن ہی میں مشرف باسلام ہوئے۔ اور غالبًا اس وقت چار شخص مسلمان تھے۔ جب آپنے اسلام قبول کیا حبش اور مدینہ کی طرف ہجرت کی۔ اور احد، خندق، حدیبیہ، خیبر، فتح مکہ اور طائف میں رسول اللہ کے ہمراہ رہے اور فخریہ بیان کرتے تھے کہ میرے جسم میں کوئی عضو ایسا نہیں ہے جو رسول اللہ کے ہمراہ زخمی نہ ہوا ہو۔ آپ کا فخر بالکل سچا تھا۔ آپ عشرہ مبشرہ میں سے ایک ہیں۔ حضرت عمرؓ نے اپنے بعد

خلیفہ ہو خوف خدا اور مہاجرین و انصار کا خیال رکھے مسلمانوں کے ساتھ عدل کرے اور اسی قسم کی اور بھی باتیں کیں ؛

آپ کو اُن چھ اشخاص میں شمار کیا جو مستحق خلافت تھے۔ اور کہا تھا یہ وہ لوگ ہیں جن سے رسول خدا تا دم عمر خوش رہے ؛ حضرت زبیرؓ کی بہادری اور سخاوت ضرب المثل تھی حسانؓ مداح رسول اللہؐ نے زبیرؓ کی تعریف میں یہ شعر کہے ہیں :-

اقام علی عهد النبی وهدیه	رسول اللہؐ کے حواری (زبیرؓ) نبی کے عہد اور روش پر قایم رہے
حواریه والقول بالفعل یعدل	اور قول فعل سے سچا سمجھا جاتا ہے ؛
اقام علی منهاجه وطریقه	وہ نبی کی راہ اور ان کے طریقہ پر قایم رہے۔ اہل حق سے
یوالی ولی الحق والحق اعدل	محبت کرتے رہے اور حق بہت عمدہ چیز ہے ؛
هو الفارس المشهور والبطل الذی	وہ ایسے مشہور شہسوار اور ایسے بہادر ہیں کہ اس دن وہ حملہ
یصول اذا ما کان یوم محجل	کرتے تھے جب لوگ چھپتے پھرتے تھے ؛
وان امرأ کانت صفیه امه	بیشک یہ وہ شخص ہے جسکی والدہ صفیہ تھی اور وہ شیر ہے
ومن اسد فی بیته لمرفل	جو اپنے گھر میں رہتا ہے ؛
له من رسول الله قربی قریبة	رسول خدا سے انہیں قرابت قریبہ ہے اور اسلام کی مدد
ومن نصرة الاسلام مجد موثل	کرکے ایک بڑی عزت حاصل کی ؛
فکم کربة ذب الزبیر بسیفه	بہت ایسی مصیبتیں تھیں جن کو زبیرؓ نے اپنی تلوار سے مصطفےٰ سے
عن المصطفی والله یعطی ویجزل	دفع کیا ؛ اور اللہ بڑا صاحب بخشش ہے ؛
اذا کشفت عن ساقها الحرب حشها	جب نار حرب مشتعل ہوتی تھی تو وہ تلوار لیکر موت کی طرف
بابیض سباق الی الموت یرفل	دوڑتے تھے ؛
فما مثله فیهم ولا کان قبله	پس انکا مثل نہ ان میں اس وقت تھا اور نہ ان سے
ولیس یکون الدهر ما دام یذبل	پہلے ہوا۔ اور نہ اب قیامت تک ہوگا ؛

ان اشعار میں شاعرانہ مبالغہ نہیں ہے۔ ہر ایک دعوٰی کا ثبوت موجود ہے۔ اور حسانؓ نے بھی واقعات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ زبیرؓ نے فتح مصر میں بھی بہت حصہ لیا۔ خلیفہ دوم کے عہد میں عمروؓ بن العاص کے ماتحت

صحابہ میں سے یہ چھ شخص جو حضرت عمرؓ نے انتخاب کیئے نہایت ہی قابل آدمی تھے۔ انکی نسبت حضرت عمرؓ کی اپنی یہ رائے تھی کہ ان سے زیادہ صحابہ میں سے کوئی شخص خلافت کا مستحق نہیں۔

پہلا شخص جو سیڑھی لگا کر دیوار قلعہ پر چڑھا زبیرؓ تھا۔ خلیفہ سوم کے عہد میں جب عبد اللہؓ بن سعد گورنر مصر تھا تو دریائے نیل سے بحیرہ اقیانوس تک کل ممالک کی تسخیر کا ارادہ کیا گیا۔ اس لئے بیس ہزار کی جمعیت کے ساتھ زبیرؓ عبد اللہ بن سعد کی کمک کو روانہ ہوئے۔ عبد اللہؓ نے چالیس ہزار سوار و پیادہ کے ساتھ "ٹرپولی" کا محاصرہ ڈالا۔ محاصرہ طول پکڑ گیا اور اس اثنا میں بطریق "گریگری" ایک لاکھ رومی سپاہ اور شمالی افریقہ کے مور اور معاون لیکر محصورین کی امداد کے لئے آپہونچا۔ عبد اللہ کو مجبوراً محاصرہ اُٹھانا پڑا۔ کھلے میدان میں بطریق پڑا تھا۔ صبح سے دوپہر تک جنگ و جدل کا بازار گرم رہا۔ تمازت آفتاب کا اثر فریقین پر یکساں ہوا۔ اور دونوں فوجیں کچھ دیر کے لئے جدا ہوئیں۔ لڑائی پھر شروع ہوئی۔ لیکن عبد اللہؓ اپنے خیمہ میں تھا کہ زبیرؓ آپہونچے میدان جنگ میں سپہ سالار کو اودھر اودھر دیکھا نظر نہ آیا۔ آخر دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ خیمہ میں پڑا ہے۔ نہایت برافروختہ ہوئے اور سیدھے خیمہ میں آکر ملامت کی کہ مسلمانوں کے افسر کے لئے نہایت نازیبا امر ہے۔ کہ عورتوں کی طرح خیمہ میں بیٹھ رہے۔ عبد اللہؓ نے جواب دیا کہ بطریق نے اعلان کر دیا ہے کہ جو شخص اسلامی سپہ سالار کا سر میرے پاس لائیگا میں اُسے اپنی لڑکی اور دس ہزار درہم سُرخ دونگا۔ اس لئے ہر ایک شخص کی نظر مجھ پر ہے۔ مینے خیال کیا کہ اگر میں مارا گیا تو مسلمان شکستہ دل ہو کر بھاگ جائینگے۔ اِس لئے اپنی حفاظت کی یہی تجویز سوچی کہ خیمہ میں پڑا رہوں۔ زبیرؓ نے کہا کہ یہ نہایت نامعقول تجویز ہے۔ مردِ خدا باہر نکلو اور اعلان کردو کہ جو شخص بطریق کو قتل کرے گا۔ انعام میں بطریق کی لڑکی اور دس ہزار درہم سُرخ دیا جائیگا۔" یہ نہایت معقول تجویز تھی چنانچہ اسپر عمل کیا گیا۔ سخت خونریز لڑائی کے بعد مسلمان غالب آئے اور رومی سپاہ نے پیٹھ دکھائی۔ اور بطریق کی لڑکی بھی اسیرانِ جنگ میں عبد اللہؓ کے سامنے پیش ہوئی۔ یہ بہادر عورت اپنے باپ کے ہمراہ میدان جنگ میں تھی اور اسی جگہ گرفتار ہوئی۔ بحالت اسیری اسکی نظر زبیرؓ پر پڑی۔ آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ عبد اللہ کو معلوم ہوا کہ زبیرؓ ہی اسکے باپ کا قاتل ہے۔ اس لئے مقررہ انعام زبیرؓ کو دینا چاہا۔ زبیرؓ نے کہا کہ میں فی سبیل اللہ جہاد کرتا ہوں۔ میری ذاتی اور نفسانی اغراض اسمیں مطلق نہیں اور یہ اعلان تو مینے اس لئے تجویز کیا تھا کہ مسلمانوں کے دل بڑھیں ورنہ میری کوئی خاص غرض نہ تھی"+

+ ہمیں اس روایت کی صحت پر کامل یقین نہیں اگرچہ اسے گبن نے بحوالۂ "اوکلی" لکھا ہے۔ اوکلی میں یہ واقعہ متن میں نہیں بلکہ حاشیہ میں لکھا ہے معلوم ہوتا ہے کہ اس لڑائی میں زبیرؓ بذاتہ شریک تھے۔ بلکہ ان کے بیٹے عبد اللہؓ شامل تھے۔ ممکن ہے کہ یہ حکایت عبد اللہ بن زبیرؓ کی ہو۔"

ان میں سے سوائے دو موخر الذکر اصحاب نے خلافت میں بہت کچھ حصہ لیا جنکا تذکرہ ہم مناسب موقع پر کریں گے۔ فاروق اعظم رضؓ کی وفات کے بعد یہ بزرگ ایک جگہ جمع ہوئے اور پہلے بالاتفاق تین

زبیر رضؓ کے کارناموں کا تذکرہ ایک مستقل دفتر میں تحریر ہو سکتا ہے'۔ اور وہ خوبیاں جو اس بہادر شخص کی ذات میں تھیں مسلم الثبوت ہیں۔ جنگ جمل میں حضرت علیؓ کا مقابلہ کیا۔ اور جب ابن جرموز نے وادی سباع میں آپ کو قتل کیا اور آپ کا سر حضرت علی رضؓ کے سامنے پیش ہوا تو اسد اللہ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اور فرمایا کہ زبیر رضؓ کے قاتل کو دوزخ کی بشارت دو۔ ابن جرموز نے کہا :-

اتیت علیا براس الزبیر — میں علی رضؓ کے پاس زبیر کا سر لے گیا

ارجو لدیہ بہ الزلفتہ — اسکے ذریعہ مجھے امید تقرب تھی۔

فبشر بالنار اذ جئتہ — مگر جب میں اُن کے پاس گیا تو انہوں نے مجھے دوزخ

فبس البشارۃ والتحفہ — کی بشارت دی کیسی بُری بشارت اور کیسا بُرا تحفہ ہے؛

وسیان عندی قتل الزبیر — میرے نزدیک قتل زبیر رضؓ اور مقام ذو الجحفہ میں گوز شتر

وخرطۃ عتر بذی الجحفہ — دونوں برابر ہیں؛

زبیر رضؓ کے صاحبزادہ مصعب رضؓ جس وقت بصرہ کے عامل مقرر ہوئے تو ابن جرموز چھپ رہا کہ مبادا والد کا انتقام مجھ سے نہ لے۔ مصعب رضؓ نے سُن کر کہا کہ میں اسے قتل نہ کرونگا کیونکہ میرے باپ کا مرتبہ ابن جرموز کی حیثیت سے بہت زیادہ ہے۔ وہ دونوں برابر نہیں "۔

شخص منتخب کیے۔ حضرت زبیرؓ نے حضرت علیؓ اور حضرت سعدؓ نے حضرت عبدالرحمنؓ اور حضرت طلحہؓ نے حضرت عثمانؓ کی نسبت رائے دی۔ بعد ازاں ان تینوں نے آپس میں مشورہ کیا۔ حضرت عبدالرحمنؓ خلافت سے دست بردار ہو گئے۔ اور پھر حضرت علیؓ اور عثمانؓ نے انہی کی رائے پر خلافت کا فیصلہ چھوڑ دیا۔

حضرت عبدالرحمنؓ بن عوف نے آخر میں حضرت عثمانؓ کے حق میں رائے دی۔ اور پھر بالاتفاق اکثر صحابہ نے انہیں خلیفہ تسلیم کر لیا۔ جنمیں حضرت علیؓ بھی تھے۔ حضرت عبدالرحمنؓ نے کس طرح اور کیوں حضرت عثمانؓ کو منتخب کیا؟ ایسے سوال ہیں جسکے جواب میں مؤرخین نے بہت کچھ لکھا ہے اور واقعات پر بحث کی ہے لیکن افسوس ہے کہ جس قدر روایتیں ہمیں اس انتخاب کے متعلق معلوم ہیں وہ اس قدر متضاد ہیں کہ مؤرخین نے مختلف زمانوں میں اپنے نتائج اخذ کرتے ہوئے سخت غلطی کھائی ہے۔ ہم نہیں چاہتے کہ اسی غلطی میں پڑ کر خلافت [۱۸] و امامت پر بحث کریں لیکن چونکہ اسکا تعلق دمشق سے بہت گہرا ہے اسلئے ہم اس مسئلہ کو کچھ رائے قائم کیے بغیر نہیں چھوڑ سکتے"۔

حاشیہ نمبر ۱۸ — خلافت اور امامت کے جھگڑے اسلامی تاریخ کے ابتدائی ایام سے چلے آتے ہیں اور اگرچہ فی زمانہ خلافت اور امامت جزو مذہب بن گئے ہیں مگر ابتدا میں یہ صورت نہ تھی۔ آہستہ آہستہ اسپر مذہبی رنگ چڑھتا گیا اور انہی جھگڑوں کی بنیاد پر مختلف فرقے بن گئے۔ جو اس مسئلہ پر ایک عرصہ سے بحث کر رہے ہیں لاکھوں مسلمانوں کا خون پانی کی طرح بہ گیا لیکن اس امر کا فیصلہ نہ ہوا کہ خلافت اور امامت کیا ہے اور اس کا کون مستحق ہے؟ اس منصب کے کیا فرائض ہیں اور کس طرح سر انجام ہوتے ہیں؟ ہم کیا اور ہماری بساط کیا کہ اس دقیق مسئلہ کی الجھنوں کو سلجھائیں۔ ہماری رائے یہ ہے کہ اسلام نے سب سے بہتر طرز حکومت کی تعلیم دی۔ اور دنیا نے تسلیم کر لیا ہے اور تجربہ سے ثابت ہو چکا ہے کہ سب سے بہتر طرز حکومت وہی ہے جس میں ہر ایک شخص کے حقوق مساوی ہوں جسمیں ہر ایک شخص کو اپنی قابلیت کے اظہار کا موقع ملے جسمیں ہر ایک شخص جس قدر چاہے ترقی کر سکتا ہے۔ جسمیں ترقی کے وسائل ذاتی کوشش اور خداداد قابلیت ہیں۔ خلافت جو حضرت صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ کا عہد تھا سب سے بہتر حکومت ہے۔ اور اسی روش پر حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کا انتخاب ہوا؟

امیر معاویہؓ اگرچہ بذاتہ خلافت کے مستحق تھے مگر آپنے اسلامی طرز حکومت کو بدل دیا اور آپ کے جانشین آپکے رشتہ دار تھے جس وقت آپنے اپنے بیٹے یزید کی نسبت بیعت لینے کی کوشش کی تو سخت مخالفت ہوئی۔ اور لوگوں نے صاف صاف الفاظ میں کہا کہ معاویہ خلافت کو حکومت ہرقلیہ بنانا چاہتا ہے۔ کہ ایک ہرقل مر جائے تو اسکا جانشین دوسرا

اسمیں کچھ شک نہیں کہ حضرت عثمانؓ کا انتخاب نیک نیتی سے ہوا۔ اور وہ مستحق خلافت بھی تھے۔ اور
انھوں نے بارِ خلافت نیک نیتی سے اپنے سر پر لیا اور حتی المقدور اسے اس طرح چلایا کہ ہم سوائے تعریف کے
اور کچھ نہیں کہہ سکتے۔ لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ نادانستہ آپ سے ایسی لغزشیں وقوع میں آئیں
جسکا اثر طرزِ حکومت پر بہت بُرا پڑا۔ اس مقام پر ہم انہی اُمور کا تذکرہ کرنا چاہتے ہیں۔

ہرقل ہو" یعنی خلافت کو شخصی حکومت بنا دیا ہے۔ اس کے بعد شخصی حکومت قائم رہی۔ خاندان امیہ کو زوال آیا
تو عباسیہ کو عروج ہوا۔ المنصور عباسی کے عہد میں محمد المہدی ہاشمی نے خروج کیا تو منصور کو سخت فکر لاحق ہوا۔ ایک
خط لکھا کہ اگر اطاعت کرو تو تمہیں اور تمہارے کل خاندان والوں اور تمہارے فرمانبرداروں کو امن دیتا ہوں اور
تمہارے اور ان کے مال و اسباب کی حفاظت کا ذمہ وار ہوتا ہوں۔ ایک لاکھ درہم دونگا اور جہاں خواہش ہو رہو
محمد المہدی نے جواب لکھا کہ تم فرعون ہو اور تمہارے مطیع فرعونی ہیں۔ ہم بنی اسرائیل کے مشابہ ہیں جن کے
ساتھ تم نے طرح طرح کے ظلم روا رکھے۔ حالانکہ فی الحقیقت سلطنت ہمارا حق ہے۔ اور تم ہمارے ہی سبب اس کے
مدعی بنے۔ اور تمہاری کامیابی ہمارے ہی باعث ہوئی۔ لوگوں نے یہ سمجھا کہ تم ہماری امداد کر رہے ہو۔ اور اس لئے
وہ تمہارے ساتھ ہو گئے۔ اب تم نے تقویت حاصل کر کے ہمارا حق غصب کر لیا ہے۔ تم ہمارے مطیع تھے۔ اب
مختار بن بیٹھے ہو۔ ہمارا باپ علیؓ وصی اور امام تھا۔ ہم اُسکے وارث تھے۔ تم اسکے جانشین کس طرح ہو سکتے ہو
حالانکہ اُس کے حقیقی وارث یعنی ہم زندہ ہیں۔ بنو ہاشم میں کسی شخص کا سلسلہ قرابت ایسا نہیں ہے جیسا کہ ہمارا
سلسلہ قرابت سابقیت اور فضل کا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں تم پر شرف دیا ہے اور برگزیدہ بنایا ہے نبیوں
میں ہمارے والد محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جو سب سے افضل ہیں اور سلف میں علیؓ ہیں جو سب سے پہلے اسلام لائے۔
اور بیبیوں میں خدیجہؓ طاہرہ ہیں جنہوں نے سب سے اول قبلہ رو نماز پڑھی۔ اور لڑکیوں میں بہترین دختران رسول
صلے اللہ علیہ وسلم اور ان میں سے فاطمہؓ سیدۃ النساء عالمین۔ اور مولودین اسلام میں حسنؓ و حسینؓ جوانان جنت کے
سردار ہیں۔ میں باعتبار نسب بہترین بنی ہاشم ہوں۔ مجھ میں کسی عجمی کا میل نہیں اور نہ میں کنیزک زادہ ہوں۔ اور
نہ میرے سلسلہ میں یہ عیب ہے۔ قدیم الایام سے میرے آبا و اجداد و امہات ممتاز چلے آئے ہیں۔ میں اسکا بیٹا ہوں
جس کا مرتبہ سب سے بڑا ہے (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) میں اس کا فرزند ہوں جسپر دوزخ میں کمتر عذاب ہوگا (ابو طالب)
میں اللہ تعالیٰ کو ضامن دیکر تمہیں امان دیتا ہوں اگر اطاعت کرو۔ اور میں تم سے زیادہ مستحق خلافت ہوں۔ اور
عہد کا پورا کرنے والا ہوں۔ تم نے مجھ سے پہلے بھی چند لوگوں کو امان دی تھی۔ ان لوگوں میں سے تم مجھے کس کی

حضرت عمرؓ کے بعد اگرچہ بنو امیہ اور بنو ہاشم دعویدار خلافت نہ تھے لیکن نظر انتخاب انہی دو بزرگوں حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ پر پڑتی تھی جو شجر امیہ اور ہاشمیہ کے ثمر تھے۔ اگرچہ حضرت عثمانؓ کا انتخاب اسلامی اصول خلافت پر ہوا لیکن معناً بنو امیہ کے ہاتھ میں حکومت آگئی۔ اور یہی حال اس وقت بھی ہوتا اگر حضرت علیؓ خلیفہ مقرر ہوتے جیسا کہ واقعات نے آخر ثابت کر دیا۔ ہم اس کا الزام ان نیک نیت خلفاء

امان دیتے ہو۔ ابن ہبیرہ یا عبداللہ بن علی یا ابو مسلم کی۔

اس خط میں محمد المہدی نے اپنا استحقاق خلافت خاندانی شرافت پر رکھا ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قرابت خلافت اور امامت کی دلیل خیال کی ہے۔ اس خط میں منصور کی ذات اور اُسکی بدعہدی پر سخت چوٹیں تھیں کہ وہ کنیزک زادہ ہے اور لوگوں کو امان دیکر فریباً قتل کیا۔ منصور نے جو کچھ جواب لکھا وہ بھی قابل ملاحظہ ہے:۔

"تمہارے فخر کا دار و مدار عورتوں کی قرابت پر ہے۔ جس میں صرف ابلہ فریب باتیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے عورتوں کو چچاؤں۔ باپوں۔ عصبہ اور ولیوں کی طرح نہیں بنایا۔ اللہ تعالیٰ نے چچا کو باپ کا قائم مقام بنایا ہے۔ بلکہ کتاب اللہ میں وہ قریب ترین ان پر مقدم ہے۔ اور اگر اللہ تعالیٰ عورتوں کی قرابت کا پاس کرتا تو آمنہ (مادر رسول اللہ) ان میں سے نہایت قریب اور عزیز اور بڑی حق والی ہوتیں۔ اور سب سے پہلے جنت میں داخل ہوتیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو جو گذر گئے ہیں اپنی مرضی سے پیدا کیا اور برگزیدہ کیا۔ اور تم نے فاطمہ ام ابی طالب اور اس سے پیدا ہونے کا ذکر کیا ہے اسکی تو یہ حالت ہے کہ اس کا کوئی لڑکا اور کوئی لڑکی اسلام سے بہرہ ور نہیں ہوئی۔ اور اگر اللہ تعالیٰ مردوں میں سے کسی کو بوجہ قرابت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دائرہ اسلام میں داخل کرتا تو عبداللہ کو اور بیشک وہ ہر طرح سے دنیا و آخرت میں بہتر تھے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کے لئے جسکو چاہا اختیار کیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ "انک لا تھدی من احببت ولکن اللہ یھدی من یشاء وھو اعلم بالمھتدین" (بے شک تو (اے محمدؐ) جسکو چاہے ہدایت نہیں کر سکتا۔ مگر اللہ جسکو چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے اور ہدایت پانے والوں کو خوب جانتا ہے)۔ اللہ تعالیٰ نے محمدؐ کو مبعوث کیا اور آپکے چار چچا اسوقت تھے۔ اللہ جل شانہٗ نے آیہ کریمہ "وانذر عشیرتک الاقربین" (اور ڈرا تو اپنے قریب ترین عزیزوں کو) نازل فرمائی۔ آنحضرتؐ نے ان لوگوں کو عذاب الٰہی سے ڈرایا اور دین حق کی طرف دعوت دی۔ ان میں سے دو نے (عباسؓ و حمزہؓ) نے اسلام قبول کیا۔ ان میں سے ایک (عباس) میرا باپ تھا

راشدین کو کسی طرح نہیں دیسکتے۔ بلکہ یہ کہنے کے لئے مجبور ہیں کہ اُن کی ذات ستودہ صفات اُن اتہامات اور الزامات سے بالکل پاک ہے جو اُن کے نادان دوست ناسمجھی سے اور متعصب دشمن دانستہ اُنپر لگاتے ہیں۔ بلکہ جو کچھ ہوا وہ نادان دوستوں کی ناسمجھی اور دشمنوں کے تعصب سے ہوا۔"

اور دونوں (ابوطالب اور ابولہب) نے انکار کیا۔ ان میں سے ایک (ابوطالب) تمہارا باپ تھا۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کا سلسلہ ولدیت آپ سے منقطع کر دیا۔ اور آنحضرتؐ میں اور ان دونوں میں کوئی عزیزداری اور ذمہ و میراث قائم نہ کی۔ تمہارا یہ زعم ہے کہ تم ایسے شخص کے بیٹے ہو جو دوزخیوں میں سب سے کمتر عذاب میں ہوگا (ابوطالب) اور تم خیر الاشرار کے لڑکے ہو۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر کرنے میں کوئی صغیر نہیں ہوتا اور عذاب میں خفیف و آسان نہیں ہوتا۔ اور شر میں کوئی بہتر نہیں ہوتا۔ کسی مرد مومن کو جو اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتا ہو یہ مناسب نہیں ہے کہ دوزخی ہونے پر فخر کرے۔ اور عنقریب تم خود دوزخ میں جاؤ گے۔ اور قریب ہے کہ ظالم جان لینگے کہ کس کروٹ وہ اُلٹے پلٹے کئے جائینگے۔ تم نے لکھا ہے کہ حسنؓ عبد المطلب سے دوہرا سلسلہ قرابت رکھتے تھے۔ اور تمہیں رسول اللہ سے دو طرفہ تعلق قرابت ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ خیر الاولین و آخرین رسول اللہ ہیں ان کو ہاشم اور عبد المطلب سے صرف ایک پدری تعلق تھا اور تمہارا یہ زعم کہ تم بہترین بنو ہاشم ہو اور یہ کہ تمہارے آبا و اجداد و امہات ان میں زیادہ مشہور تھے۔ اور یہ کہ تم میں کسی کنیزک کا لگاؤ نہیں ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ تم نے کل بنو ہاشم سے اپنے آپ کو مفتخر بنا دیا ہے! غور کرو۔ تف ہو تم پر۔ کل اللہ تعالیٰ کو کیا جواب دوگے۔ تم حد اعتدال سے تجاوز کر گئے ہو۔ اور تم نے اُس سے بڑھکر اپنا فخر جتایا ہے جو تم سے ذاتاً وصفاتاً بہتر ہے (ابراہیم بن رسول اللہ جو حضرت ماریہ قبطیہ کے بطن سے پیدا ہوئے جسے نجاشی نے رسول کریمؐ کو تحفۃً بھیجا تھا) اور بالخصوص تمہارے باپ کی اولاد میں سے کوئی بہتر اور افضل سوائے کنیزک زادوں کے نہیں ہے۔ بعد وفات رسول اللہ تم میں علی بن حسین (امام زین العابدین) سے افضل کوئی شخص پیدا نہیں ہوا۔ اور وہ کنیزک زادہ تھے۔ اور کچھ شک نہیں انکا مرتبہ حسنؓ بن حسینؓ تمہارے دادا سے بڑا ہے۔ اور ان کے بعد تم میں کوئی شخص محمدؓ بن علی کی طرح نہیں ہوا انکی دادی کنیزک تھیں اور کچھ شک نہیں کہ محمد بن علی تمہارے باپ سے بہتر ہیں۔ اور نہ کوئی انکے لڑکے جعفر کی مثل ہوا۔ اور انکی دادی بھی کنیزک تھیں۔ اور جعفر تم سے بہتر ہیں۔ تمہارا یہ کہنا کہ تم رسول اللہ کے لڑکے ہو غلط ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ "ما کان محمد ابا احد من رجالکم" (محمد تم لوگوں

فی زمانہ ہم ٹھنڈے دل سے اون واقعات پر جو اس وقت ظہور میں آرہے ہیں غور کرتے ہوئے
جو کچھ رائے قائم کریں کر سکتے ہیں اور اس لئے نتیجۃً خلفاء کی قابلیتوں پر نسبتاً بحث کر سکتے ہیں
لیکن فی الحقیقت اس طرح رائے قائم کرنا اور واقعات پر بحث کرنا ایک ایسی غلطی ہے جس کے نتائج سے
کوئی مؤرخ جو تاریخ اسلام لکھتا ہے بچ نہیں سکتا۔ کیونکہ ہم ایسے اصول موضوعہ کو مدنظر رکھکر بحث کرتے ہیں

میں سے کسی کے باپ نہیں) تم لوگ ان کی لڑکی کے لڑکے ہو جو بلاشک قرابت قریبہ ہے۔ مگر اسکو میراث
نہیں پہنچ سکتی۔ اور نہ یہ ولایت کی وارث ہو سکتی ہے اور نہ اسکو امامت جائز ہے۔ پس تم اس قرابت کے
ذریعہ کس طرح وارث ہو سکتے ہو۔ تمہارے باپ نے ہر طرح سے اسکی خواہش کی تھی۔ فاطمہؓ کو دن میں نکالا تھا
اور در پردہ ان کو بیمار کیا۔ اور رات کے وقت دفن کیا۔ بایں ہمہ لوگوں نے سوائے ابوبکرؓ او عمرؓ کسی کو منظور
نہ کیا۔ اس طریقہ میں مسلمانوں میں کچھ اختلاف نہیں ہے کہ نانا۔ ماموں۔ اور خالہ مورث نہیں ہوتے۔
اور جو تم نے علیؓ اور ان کے سابق الاسلام ہونے کی وجہ سے فخر کیا ہے اسکا یہ جواب ہے کہ رسول اللہ نے
بوقت وفات دوسرے کو نماز پڑھانے کا حکم دیا تھا۔ بعد ازآں لوگ ایک کے بعد دوسرے کو امام بناتے گئے
(ابوبکرؓ و عمرؓ) اور ان کو (علیؓ) منتخب نہ کیا۔ حالانکہ یہ بھی ان چھ بزرگوں میں تھے لیکن سب نے ان کو
قابل نہ سمجھا اور چھوڑ دیا۔ اور ان کو مستحق خلافت نہ سمجھا اور عبدالرحمٰنؓ نے عثمانؓ کو ان پر مقدم کر دیا۔ طلحہؓ
اور زبیرؓ ان سے لڑے (جنگ جمل) اور سعدؓ نے انکی بیعت سے انکار کیا اور معاویہؓ کی بیعت کر لی۔
تمہارے باپ نے پھر خلافت کی تمنا کی اور لڑے (جنگ صفین) اور ان سے انکے مصاحب علیحدہ ہو گئے
اور حکم (عمرو بن العاص و ابو موسیٰ) مقرر کرنے سے پہلے اُن کے ہوا خواہ انکے استحقاق میں شک و شبہ
کرنے لگے۔ پھر انہوں نے دو شخصوں کو برضامندی حکم مقرر کیا۔ اور ان کو اللہ کا عہد و میثاق دیا۔ ان
دونوں نے ان کی معزولی پر اتفاق کر لیا۔ پھر حسنؓ خلیفہ ہوئے۔ انہوں نے امامت و خلافت کو معاویہؓ
کے ہاتھ کپڑوں اور دراہم کے عوض فروخت کر دیا۔ خود حجاز میں چلے آئے اور اپنے ہوا خواہوں کو معاویہؓ
کے سپرد کر دیا۔ اور حکومت کو نااہل کے حوالہ کر دیا۔ اور بلا استحقاق وجانہ مال لے لیا۔ پس اگر تمہارا اس میں
کچھ حق بھی تھا تو تم نے اسکو فروخت کر ڈالا۔ اور قیمت وصول کر لی۔ پھر تمہارے چچا حسینؓ نے ابن مرجانہ
(ابن زیاد) پر خروج کیا۔ ان لوگوں نے تمہیں قتل کیا۔ خرما کی ڈالیوں پر سولی دی۔ آگ میں جلایا۔ اور شہر بدر
کیا۔ ہم نے تمہارے خون کا بدلہ ان سے لیا۔ اور تمہیں ان کے ملک اور زمین کا مالک بنا دیا۔ اور تمہارے

جو کسی طرح صحیح نہیں ہیں۔ کیونکہ امامت وخلافت کو مذہب اسلام کا ایک جزو لاینفک سمجھ رکھا ہے۔
ہماری رائے میں اسلام بحیثیت مذہب حکومت سے غنی ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ اسکی بیشمار دنیوی
برکتوں میں سے اُن آئین وقوانین کی تعلیم بھی ہے جو حکومت سے متعلق ہیں۔ ایمان اور عمل صالح ایک مسلمان
خلیفہ کے لئے نہایت ضروری ہیں۔ اور یہ دونوں باتیں خلفاء راشدین میں بدرجہ اولیٰ موجود تھیں وہ
خلافت کے مستحق تھے اور خلیفہ مقرر ہوئے۔ ہم اُنہیں خلیفہ برحق ہی سمجھتے ہیں لیکن اُن کے عہد حکومت کو

باپ دادا کا نام بلند کیا۔ اور فضیلت دی کیا تم اسکے ذریعہ ہمیں مقتول کیا چاہتے ہو۔ تمہارا باپ جدال و قتال
میں مبتلا کیا گیا۔ اور بنو امیہ ان پر ایسے ہی لعنت کرتے تھے جیسا کہ کفار پر نماز فرائض میں۔ ہم نے جھگڑا کیا۔
ان کے فضائل بیان کئے۔ انپر سختی کی۔ اور ان کی حرکات ناشائستہ کی سزا دی۔ تم جانتے ہو کہ ہم لوگوں
کی بزرگی جاہلیت میں حجاج کے پانی پلانے اور ولایت زمزم پر منحصر تھی۔ اور یہ عباس کے بھائیوں میں سے
صرف عباس ہی کے لئے مخصوص تھی۔ تمہارے باپ نے اس معاملہ میں ہم سے جھگڑا کیا۔ عمرؓ نے ہمارے
حق میں فیصلہ کیا۔ پس جاہلیت اور اسلام میں برابر اسکے مالک ہم ہی رہے۔ اور یہ تمکو معلوم ہے کہ بعد
نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے بنی عبدالمطلب میں سے کوئی شخص سوائے عباس کے باقی نہ تھا۔ پس وراثت
چچا کی طرف منتقل ہوگئی۔ پھر بنی ہاشم میں سے متعدد اشخاص نے خواہش خلافت کی۔ مگر ان کے لڑکے
کے سوائے کوئی کامیاب نہ ہوا۔ سقایہ تو انکا تھا ہی میراث نبی بھی ان کی طرف منتقل ہوگئی۔ اور خلافت
ان کے لڑکوں میں چلی آئی۔"

محمد المہدی نے خلافت کی بنیاد قرابت رسول اللہ اور آبا و اجداد کی خدمات پر رکھی ہے اور اسے وراثت
سمجھا ہے۔ المنصور نے بھی اس کے معنے یہی کچھ سمجھے اور قرابت ہی استحقاق خلافت قرار دیا ہے
دونوں فریق اپنے حقوق بہ لحاظ قرابت پیش کرتے ہیں۔ آخر جب دلایل سے قائل نہ ہوئے تو برہان
قاطع یعنی تلوار نے فیصلہ کر دیا۔

قرابت پر جو کچھ فخر بنو فاطمہ یا بنو عباس کو تھا وہ کسی حد تک بجا ہے لیکن ہماری رائے میں استحقاق
خلافت کا معیار یہ نہیں ہو سکتا۔ اس پر مزید بحث ہم اگلی فصلوں میں کریں گے۔

اُس نگاہ سے نہیں دیکھتے جس سے علمارِ اسلام دیکھنے کے عادی ہیں بلکہ ایک مورخ کی حیثیت سے دیکھتے ہیں۔ ہماری آزادانہ اور کسی قدر دلیرانہ رائے یہی ہے کہ حضرت عثمانؓ کے انتخاب نے بنوامیہ کو حاکم بنا دیا۔ یہ ممکن ہے کہ اگر اس وقت حضرت علیؓ منتخب ہوتے تو یہی منصب ہاشم کے خاندان میں منتقل ہو جاتا۔ کیونکہ جس وقت اسد اللہ خلیفہ ہوئے تو بنوہاشم کی طرف سے خلافت کو موروثی بنانے کے لئے کچھ کم کوششیں ظہور میں نہیں آئیں ناکامیابی کی وجہ صرف یہی ہے کہ ان کا حریف خاندان قابض ہو چکا تھا اور وہ ایسا زبردست تھا کہ ان کی متفقہ طاقت بھی اُس کے مقابلہ میں کمزور ثابت ہوئی۔

حضرت عثمانؓ کا عہد خلافت بارہ برس تک رہا۔ آپ کی خلافت سے پہلے ایران اور شام اور مصر فتح ہو چکے تھے۔ آپکے زمانہ میں فتوحات کا سلسلہ شمالی افریقہ اور ہندوستان تک پھیل گیا۔ فاروق اعظمؓ کے وقت مصر پر عمرو بن العاص عامل تھے جو فاتح مصر بھی تھے۔ حضرت عثمانؓ نے انہیں معزول کر کے عبد اللہ بن ابی سرح[۱۹] کو مقرر کیا۔ کوفہ پر سعد بن وقاص عامل تھے ان کو بھی معزول کر دیا اور اپنے ایک قریبی رشتہ دار ولید بن عقبہ کو مقرر کیا۔ شام کے ایک حصہ پر معاویہؓ بن ابی سفیان حکمران تھے آپنے انھیں کل ممالک شام کی حکومت دیکر سیاہ و سپید کا مالک بنا دیا۔ مروان جو آپ کا بہت قریبی رشتہ دار تھا آپ کا مشیر و فی الحقیقت

حاشیہ نمبر ۱۹ عبد اللہ بن سعد بن ابی سرح بن حارث بن حبیب بن خذیمہ ابن مالک بن جبل بن عامر بن لوی قریشی ہیں حضرت عثمانؓ کے رضاعی بھائی تھے۔ عبد اللہؓ بن سعد کی نسبت بعض روایتیں ایسی مشہور ہیں جنپر ہمیں اعتبار نہیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ آنحضرتؐ نے کتابت کی خدمت ان کے سپرد کی ہوئی تھی۔ یہ مرتد ہو کر مشرکین مکہ سے مل گئے۔ اور کہتے تھے کہ محمدؐ تو میرے ہاتھ میں کٹھ پتلی کی طرح تھا۔ میں نے دیدہ و دانستہ غلط لکھا۔ اور جو کچھ چاہتا تھا غلط لکھتا تھا۔ آنحضرتؐ مجھے عزیز حکیم لکھاتے تھے تو میں کہتا تھا کہ کیا علیم حکیم لکھوں تو کہتے کہ ہاں یہی لکھو یہ بھی درست ہے۔ جب مکہ فتح ہوا تو آنحضرتؐ نے عبد اللہ بن سعد اور عبد اللہ بن خنظل اور مقیس بن صبابہ کے مار ڈالنے کا حکم دیا۔ اور فرمایا کہ یہ لوگ اگر خانہ کعبہ کے پردوں میں چھپے ہوئے بھی ملیں پھر بھی قتل کرو۔ حضرت عثمانؓ نے عبد اللہؓ بن سعد کو پناہ دی اور پھر آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر کیا۔ سفارش کی۔ آنحضرتؐ دیر تک خاموش رہے۔ آخر معاف کر دیا جب عثمانؓ چلے گئے تو آنحضرتؐ نے فرمایا کہ میری خاموشی کی وجہ یہ تھی کہ اس اثنا میں کوئی شخص تم میں سے اسے قتل کر دیتا۔ ایک انصاری نے کہا کہ آپنے آنکھ سے اشارہ کر دیا ہوتا آپنے فرمایا کہ نبی کی آنکھ کو خائن نہ ہونا چاہیے۔

مدارالمہام تھا۔ اسے ملک افریقہ کا خمس معاف کر دیا۔ اور اپنے عزیز و اقارب کو تھوڑے عرصہ میں مالامال اور حکمران بنا دیا۔ ان سب کا نتیجہ یہ ہوا کہ عام مسلمان آپ کے برخلاف چہ میگوئیاں کرنے لگے اور آخر علانیہ مخالفت کی۔ آپ سے اگر اس بیجا رعایت کے متعلق سوال ہوتے تو جواب یہ ملتا کہ اگرچہ متقدم خلفاء نے ایسا نہیں کیا مگر میں حکم خدا کے مطابق صلہ رحم کرتا ہوں۔ ایک حد تک آپ کا جواب نہایت معقول ہے لیکن اس امر کا نتیجہ وہی ہوا جو قدرتاً ہونا چاہئے۔

ہماری رائے میں عبداللہ بن سعد کا اسلام لانا فتح مکہ سے پیشتر ثابت نہیں ہوتا اور قرآن شریف کی بعض آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ اسکے کاتب ایسے آدمی نہ تھے جو کسی وقت مرتد ہو سکتے تھے۔ یا انکی صفت تھی ہمارا ایمان ہے کہ قرآن کی کتابت میں کبھی کسی قسم کی غلطی واقع نہیں ہوئی۔ وہ لوح محفوظ میں تھا اور اسکی حفاظت کے ایسے سامان مہیا کئے گئے تھے کہ کسی مقدس کتاب کو نصیب نہیں ہوئے۔ جو کچھ اس زمانہ میں قرآن کریم کی حفاظت کی تدابیر کی گئیں تھیں ان کا بقیہ اب بھی ہم میں ہزاروں قرآن شریف کے حافظ موجود ہیں۔ ہماری رائے میں جو الزام عبداللہ بن سعد پر لگایا جاتا ہے قرآن شریف کی یہ آیت ان سب کا جواب ہے۔

"اِنَّ لَہٗ لَحَافِظُوْن"

گبن لکھتا ہے کہ "عبداللہ نے ابتدا میں اسلام کو قبول کیا اور بوجہ اس کے کہ کتابت میں ید طولیٰ رکھتا تھا کاتب وحی کے مہتم بالشان عہدہ پر ممتاز ہو گیا۔ مگر وہ مرتد ہو گیا اور دیدہ و دانستہ غلط لکھا۔ اور پھر ان غلطیوں پر مضحکہ اڑایا۔ مکہ کو بھاگ گیا۔ اور اس جگہ رسول خدا کی لاعلمی پر ہنسی اڑاتا رہا۔ فتح مکہ کے بعد رسول خدا کے پاؤں پر گرا۔ اس کے اشک ندامت اور عثمانؓ کی سفارش سے رسول اللہ نے طوعاً و کرہاً معاف کر دیا۔ مگر فرمایا اس قدر عرصہ خاموشی کا مدعا یہ تھا کہ کوئی ہوا خواہ اس نابکار کا خون گراتا۔ اس نے اسلام کی خدمت بظاہر وفاداری اور ذاتی قابلیت کے ساتھ کی اور حق تو یہ ہے کہ اسکی اپنی بہبودی کے برخلاف تھا اگر اب وہ اسلام سے کنارہ کشی کرتا"

من از بیگانگان ہرگز نہ نالم۔ کہ بامن ہرچہ کرد آن آشنا کرد۔ گبن نے جو کچھ لکھا ہے وہ مسلمان مؤرخین کی جھوٹی سچی روایتوں سے لیا ہے۔ اگر عبداللہ بن سعد عثمانؓ کے رضاعی بھائی نہ ہوتے اور مصر کا گورنر مقرر نہ کیا جاتا تو انپر یہ اتہام کبھی نہ لگایا جاتا۔ یہ ممکن ہے کہ وہ مسلمان ہونے سے پیشتر اسلام کے سخت مخالف تھے اور مسلمانوں کے درپے آزار بھی تھے اور اس لئے انکا خون مباح کر دیا گیا ہو لیکن ہمیں اس امر کے باور کرنے میں

عبداللہ بن ابوسرح مصر میں ایک ایسے شخص کا جانشین مقرر کیا گیا تھا جو ذہانت مجسّم تھا اور اس زمانہ میں اسکے پایہ کے مدبّر اور منتظم بہت کم تھے۔ عمرو بن العاص فاتح مصر تھا اور نہ صرف مصر اور مصریوں پر خوش اسلوبی سے حکومت کرنے کے قابل تھا بلکہ وہ اس لائق تھا کہ جہاں اور جس قوم پر عامل ہوتا اُس سے ہر ایک شخص خوش رہتا۔ مصر پر اُس نے جس طرح حکومت کی زیادہ تر اسی کا اثر تھا کہ عبداللہ بن ابوسرح کی حکومت سے لوگ بیزار ہو گئے۔ اور دار الخلافت میں اس کے برخلاف شکایت کرنیکے لئے آئے۔ یہ شکایتیں خواہ کسی قدر مبالغہ آمیز ہوں لیکن عبداللہ بن ابوسرح کی ناقابلیت کی کافی دلیل تھیں حضرت عثمانؓ نے اُسے معزول کرنے سے انکار کیا۔ طلحہؓ نے حضرت عثمانؓ سے سختی کے ساتھ گفتگو کی اور حضرت عایشہؓ نے متنبہ کیا اور حضرت علیؓ نے اسکی معزولی پر زور دیا۔ آخر حضرت عثمانؓ نے اُسے معزول کر دیا۔ اور اُسکی جگہ لوگوں نے محمدؓ بن ابوبکرؓ کو منتخب کیا۔ عبداللہ کی معزولی اور محمدؓ کی تقرری کا فرمان لکھا گیا۔ مگر مروان کی شرارت سے بنا بنایا کام بگڑ گیا۔ محمدؓ بن ابوبکرؓ جن کے ہمراہ اس وقت مہاجرین اور انصار کی بھی ایک جماعت تھی مدینہ سے ابھی تیسری منزل پر پہونچے تھے کہ ایک شخص کو دیکھا کہ مدینہ کی طرف سے سانڈنی اُڑائے چلا آرہا ہے۔ صحابہ نے جو اس وقت محمدؓ کے ہمراہ تھے اسکو گرفتار کر لیا۔ بدحواس سوار ایسی بے تکی ہانکنے لگا کہ سب کے دل میں طرح طرح کے خیالات پیدا ہو گئے۔ اوسکی تلاشی لی گئی تو مشکیزہ سے ایک خط بنام عبداللہ بن ابوسرح منجانب امیر المومنین عثمانؓ برآمد ہوا مضمون یہ تھا کہ محمدؓ اور اُس کے رفقا کو قتل کر دو۔ اور ان کے

تامل ہے کہ رسول اللہ نے یہ ایسا حکم دیا ہو کہ انہیں حرم کعبہ میں بھی قتل کر دو۔ یہ درست ہے کہ انکی باریابی کا باعث عثمانؓ تھے لیکن ہمیں یقین نہیں کہ رسول اللہ نے انکا قتل ایسی حالت میں جائز سمجھا ہو۔ ہمارے پاس بیشمار مثالیں ایسی موجود ہیں جو اس امر کو بخوبی ثابت کرتی ہیں کہ جو شخص صرف "لاالٰہ الااللہ" کہہ دیتا رسول اللہ اسکا خون جائز نہیں سمجھتے تھے۔ بہرحال عبداللہ بن سعد پر ارتداد کا اتہام بے بنیاد ہے۔ وہ ایک نہایت قابل آدمی تھا۔ اس نے دریائے نیل سے لیکر تمام شمالی افریقہ فتح کیا۔ تواریخ اسلام میں جہاں خالد بن ولید اور عمرو بن العاص کا نام لیا جاتا ہے عبداللہ بن سعد بھی اسی فہرست میں شمار ہوتا ہے اس میں کچھ شک نہیں کہ عمرو بن العاص ایک ایسا شخص تھا جو اس زمانہ میں فرد تھا۔ اور اگر واقعات عبداللہ بن سعد کے خاطر خواہ ہوتے تو وہ بھی کم پایہ کا شخص نہ تھا افسوس ہے کہ اندرونی بدامنی اور بددلی کی وجہ سے وہ مصر کی حکومت سنبھال نہ سکا۔

فرمان تقرر کو باطل سمجھو۔ یہ خط اور سانڈنی سوار جو امیر المومنین کا غلام تھا مدینہ میں عام لوگوں کے سامنے پیش ہوئے۔ آخر معلوم ہوا کہ یہ شرارت مروان کی ہے حضرت عثمانؓ بے قصور ہیں لیکن آپ نے مطالبہ پر مروان کو لوگوں کے سپرد کرنے سے انکار کر دیا۔ لوگوں نے آپ کے مکان کا محاصرہ کر لیا۔ اگرچہ بنو امیہ نے مقابلہ کیا اور کسی شخص کو دروازہ میں گھسنے نہ دیا۔ لیکن چند آدمی دیوار پھاند کر داخل ہو گئے۔ مروان تو بچکر نکل گیا لیکن خلیفہ سوم قتل کئے گئے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ جس وقت لوگوں نے حضرت عثمانؓ کے مکان کا محاصرہ کیا ہوا تھا حضرت علیؓ، طلحہؓ اور زبیرؓ نے اپنے صاحبزادوں کو خلیفہ کی حفاظت کے واسطے بھیجا تھا۔ اگرچہ یہ لوگ زخمی ہوئے لیکن دروازہ میں کسی کو گھسنے نہ دیا۔ اس واقعہ کو ہر ایک مؤرخ نے بیان کیا ہے۔ اس لئے ہم اسی سرِ دست غلط نہیں کہہ سکتے۔ مگر بلا تامل اسکی صحت پر یقین بھی نہیں کر سکتے۔ اگر اس واقعہ کو ان روایتوں پر رکھا جائے۔ جو ہر ایک مؤرخ نے حضرت علیؓ کی خلافت اور جنگ جمل کے ضمن میں بیان کی ہیں تو معلوم ہو جائیگا کہ یا تو یہ واقعہ یا یہ روایات مبینہ غلط ہیں کیونکہ دونوں ایک دوسرے کی مخالف ہیں۔ ہم اسے کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کرتے ہیں:

حضرت عثمانؓ کی خلافت اور آپ کا قتل بنو امیہ کی حکومت کے اسباب ہیں اور فی الحقیقت مؤخر الذکر واقعہ خلافت سے بڑھکر وقعت رکھتا ہے۔ خلیفہ سوم خود اموی تھے اور ان کے عہد میں مختلف ممالک پر بنو امیہ کے تقرر سے اس خاندان کی طاقت بہت بڑھ گئی۔ لیکن اگر خلیفہ سوم کے قتل کا واقعہ ظہور میں نہ آتا تو آپ کے جانشین کے لئے اس طاقت کو توڑ دینا اگر آسان نہیں تو بہت مشکل بھی نہ تھا۔ صرف بنو امیہ عام مسلمانوں کے مقابلہ میں کچھ حقیقت نہ رکھتے تھے۔ لیکن اس واقعہ نے بنو امیہ کی حمایت پر صحابہ کی ایک جماعت کھڑی کر دی۔ حضرت عثمانؓ کے قتل نے لوگوں کو آپ کے قصاص کیطرف متوجہ کر دیا اور قدرتاً ان لوگوں سے ہمدردی تھی جو نہایت زور سے اس کا مطالبہ کر رہے تھے:

طلحہؓ اور زبیرؓ جنھوں نے ابتدا میں حضرت علیؓ کے ہاتھ طوعاً یا کرہاً بیعت کی حضرت عائشہ صدیقہؓ کو ہمراہ لئے کر بصرہ میں آئے اور اس جگہ حضرت عثمانؓ کے خون کا مطالبہ کیا۔ جس وقت حضرت علیؓ کو اسکی

حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد نہ تو حضرت علیؓ اور نہ امیر معاویہ کی بیعت کی۔ اس پر آشوب زمانہ میں ایسے لوگ بھی تھے جو بالکل علیحدہ رہے اور کسی فریق کا ساتھ نہ دیا۔ ان میں سے عبداللہ بن سعد بھی تھا۔

اطلاع ملی تو سخت متفکر ہوئے اور فرمایا کہ "اس وقت مجھے چار آدمیوں کی مخالفت کی خبر سنائی گئی۔ سب سے زیادہ بارعب اور سخی طلحہؓ ہیں اور سب سے زیادہ بہادر زبیرؓ ہیں اور لوگ سب سے زیادہ حضرت عائشہؓ کی عزت و حرمت کرتے ہیں اور سب سے زیادہ مالدار یعلی بن منیہ ہیں۔ مگر واللہ انہوں نے مجھ میں کوئی عیب نہیں نکالا نہ مجھے حب جاہ ہے اور نہ ہوائے نفسانی کے تابع ہوں۔ بلکہ وہ مجھ سے اوس حق کو طلب کرتے ہیں جسکو انھوں نے خود چھوڑ دیا ہے اور اُس خون کا قصاص مانگتے ہیں جس کا باعث وہ خود ہوئے ہیں۔ بیشک ان کا یہ اپنا فعل ہے۔ میں اس کام میں ان کا شریک نہ تھا۔ اگرچہ عثمانؓ پر اعتراض کرنے میں ان کے ساتھ تھا۔ قتل عثمانؓ کا گناہ خود انہیں لوگوں پر ہے۔ ان لوگوں نے مجھ سے بیعت کی اور اب فسخ کر دی جسکی وجہ وہ کچھ بیان نہیں کر سکتے۔ کیونکہ ان کو میرے ظلم اور عدل میں موازنہ کرنے کا موقع نہیں ملا۔ میں اللہ تعالیٰ کی حجت پر جو ان کے اوپر ہے قائم ہوں اور اللہ تعالیٰ کے علم پر جو ان کے متعلق ہے قناعت کرتا ہوں۔ باوجود ان سب باتوں کے میں انہیں بلاؤں گا ان سے معذرت کروں گا۔ اگر وہ قبول کرلیں تو بہتر کیونکہ توبہ قبول کی جاتی ہے اور حق تو اس امر کا زیادہ مستحق ہے کہ اسکی طرف رجوع کیا جائے اور اگر یہ لوگ میرا عذر قبول نہ کرینگے تو تلوار کی باڑھ کا مزہ چکھا دونگا۔ میری تلوار ہر باطل کو قطع کرنے اور اسپر فتح پانے کے لئے کافی ہے۔"

اس میں کچھ شک نہیں کہ حضرت علیؓ کو اس وقت سخت مشکل کا سامنا تھا جیسا کہ ان کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے۔ طلحہؓ و زبیرؓ عشرہ مبشرہ میں سے تھے اور ان چھ اشخاص میں سے تھے جن میں سے ایک کو حضرت عمرؓ نے اپنے بعد خلیفہ منتخب کرنیکے لئے وصیت کی تھی۔ حضرت زبیرؓ رسول اللہ کے قریبی رشتہ دار تھے ان کی والدہ صفیہ بنت عبدالمطلب آنحضرتؐ کی پھوپھی تھیں اور ام المومنین خدیجہؓ بنت خویلد کے بھتیجے تھے۔

جنگ احزاب میں جس وقت رسول اللہ نے تین دفعہ پوچھا کہ "کفار کی خبر میرے پاس کون لائے گا" تو حضرت زبیرؓ نے تینوں مرتبہ جواب دیا کہ "میں"۔ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ "زبیرؓ میرے حواری ہیں"۔ اسلامی خدمت میں آنحضرتؐ کے زمانہ میں جو کچھ انہوں نے کوشش کی حضرت علیؓ بھی اوسکی تصدیق فرماتے ہیں۔ خود ان کا قول تھا کہ "میرے جسم میں کوئی ایسا عضو نہیں ہے جو رسول اللہ کے ہمراہ زخمی نہوا ہو"۔ حضرت حسانؓ بن ثابت جو رسول خدا کے مداح تھے حضرت زبیرؓ کی تعریف میں بھی رطب اللسان ہیں

ان کی بہادری کے حضرت علیؓ بھی معترف تھے؛

حضرت طلحہؓ وہ بزرگ صحابی ہیں جن کو آنحضرتؐ نے تین مختلف موقعوں پر تین مختلف القاب سے یاد فرمایا۔ احد کے روز "طلحۃ الخیر" کہہ کر پکارا۔ اور غزوہ تبوک میں "طلحۃ الفیاض" فرمایا اور حنین کے دن "طلحۃ الجواد" فرمایا۔ جنگ احد میں رسول اللہ کے لئے سپر کا کام دیا۔ ایک تیر کو ہاتھ پر روکا جس سے آپ کی ایک انگلی بیکار ہوگئی تھی۔ اور ایک تلوار کا زخم سر پر لگا؛

ام المومنین حضرت عایشہ صدیقہؓ کی موجودگی سے اس جنگ کی صورت جو جمل کے نام سے مشہور ہے کچھ اور ہو گئی حضرت علیؓ کو اسی بات کا دھڑکا تھا۔ یہ جنگ اس قدر خونریز ہوئی کہ تیرہ ہزار آدمی طرفین کا قتل ہوا۔ نہایت تعجب کی بات ہے کہ مسلمانوں کے خون اس قدر سفید ہو گئے تھے کہ اس قدر خونریزی کو جائز سمجھا؛

ہم نہیں کہہ سکتے کہ اگر حضرت طلحہؓ وزبیرؓ جو اس وقت جبکہ طرفین میں آتش جنگ مشتعل ہو رہی تھی اور وہ محمل جس میں حضرت عایشہ صدیقہؓ تھیں تیروں سے خارپشت کی صورت بنگیا تھا اس وقت جبکہ ہر طرف خون کا دریا بہتا تھا۔ حضرت علیؓ کے کہنے سننے پر یا خود بخود میدان جنگ سے کنارہ نہ کرتے تو نتیجہ کیا ہوتا۔ فتح وشکست تو اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ مگر اس میں کچھ شک نہیں کہ ایک خون کے عوض تیرہ ہزار بے گناہ مسلمانوں کا خون پانی کی طرح بہ گیا؛

معلوم نہیں کہ یہ روایت کہ طلحہؓ وزبیرؓ صرف حضرت علیؓ کے کہنے پر اپنے رفقاء سے علیحدہ ہو گئے کہاں تک صحیح ہے۔ راویان خوش گفتار یوں بیان کرتے ہیں کہ حضرت علیؓ نے دونوں کو آواز بلند پکار کر اپنے پاس بلایا اور پھر ایک ایک حدیث جسکو وہ فراموش کر چکے تھے اور جو رسول خدا نے بطور پیش گوئی اس واقعہ جمل کے متعلق بیان کی تھی اونہیں سنائی سُنکر سخت نادم ہوئے۔ اور اگرچہ یہ فساد خود انہوں نے برپا کیا تھا اپنے رفقا یا اون لوگوں کو جو انکے کہنے سننے پر نکل آئے تھے چھوڑ کر حضرت علیؓ کے ساتھ ہو گئے؛ مگر حضرت طلحہؓ تو اس جگہ مروان کے تیر سے شہید ہوئے اور حضرت زبیرؓ کو جبکہ وہ جنگ سے واپس ہو گئے اثناء راہ میں بمقام وادی سباع ابن جرموز نے قتل کیا۔ یہ ایسی روایتیں ہیں جنپر ہم یقین نہیں کر سکتے؛

اگرچہ فتح وظفر حضرت علیؓ کو نصیب ہوئی مگر یہ بالکل سچ ہے کہ شکست سے زیادہ انکو غم لاحق ہو گیا؛

یہ خونریز لڑائی جس میں اس قدر عالی مرتبہ صحابہ اور جوان ہمت مسلمان خاک و خون میں مل گئے اس عظیم الشان جنگ کا پیش خیمہ تھی جس کے استقبال کے لئے شام سے تجربہ کار فوجیں امیر معاویہؓ اور عمرو بن العاصؓ سے فیاض اور مدبر سپہ سالاروں کے ماتحت اس طرف بڑھ رہی تھیں اور اس کا علم حضرت علیؓ کو بخوبی تھا کہ یہ فیصلہ کن لڑائی ناگزیر ہے۔ +

اس خونریز جنگ کا اثر جسکے مقتولوں کی اقل تعداد ہم نے تیرہ ہزار لکھی ہے (بعض مورخین اس سے زیادہ اور مختلف تعداد بیان کرتے ہیں) اس قدر ضرور ہوا کہ حضرت علیؓ نے مظفر و منصور میدان کارزار سے مراجعت کی لیکن "باب علم" کو اچھی طرح معلوم تھا کہ اونکی خلافت کا جسکی ابتداء خانہ جنگی سے ہوئی ہے انجام کیا ہوگا۔ اب تک بنو امیہ میں سے ایک شخص نے بھی ان کے ہاتھ پر بیعت نہیں کی۔ مقتولان جمل میں سے اکثر ایسے قبایل کے آدمی تھے جنہیں نہ تو بنو ہاشم اور نہ بنو امیہ سے کوئی ہمدردی تھی۔ خود بانیان فساد میں سے طلحہؓ تو بنو تیم سے تھے اور زبیرؓ رسول اللہ کے قریبی رشتہ دار تھے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ان دونوں نے حضرت علیؓ سے بیعت بھی کی تھی۔ ان کے مخالف تو یہ کہتے ہیں کہ بطوع خاطر اور موافق بکراہت کہتے ہیں۔ اور بقول حضرت علیؓ یہ بیعت اس وقت تک فسخ نہیں ہوسکتی تھی جبتک وہ ابوترابؓ میں ایسے عیب نہ بتاتے جو عدل و انصاف کے برخلاف ہیں۔ اور چونکہ انہوں نے خون عثمانؓ کا مطالبہ انکی عدالت میں نہیں کیا۔ اور نہ خلیفہ نے کوئی ایسا فیصلہ کیا جو ظلم پر مبنی ہوا سلیئے وہ اسد اللہؓ کو ظالم نہیں کہہ سکتے اور نتیجتہً بیعت فسخ بھی نہیں ہوسکتی۔ یہ نہایت معقول دلایل ہیں۔ مگر اسی صورت میں جب اُن کی بیعت بطوع خاطر تسلیم کیجائے۔ لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ بیعت بکراہت ہوئی ہو؟ کیونکہ اسکے بعد وہ فوراً مکہ معظمہ کیطرف چلے گئے۔ اور اس جگہ ام المؤمنین عایشہ صدیقہ کو کل حالات سے آگاہ کیا۔ اور پھر بصرہ کی طرف کوچ کرتے ہوئے حضرت عثمانؓ کے خون کے مطالبہ کے ساتھ اعلان جنگ کر دیا۔ اگر وہ خود خلافت کے خواہاں تھے یا حضرت علیؓ پر خون عثمانؓ کا شبہ کرتے تھے تو اس میں کچھ شک نہیں کہ انہوں نے کبھی بخوشی خاطر بیعت نہیں کی۔ اون کے مخالف اس بات پر زور دیتے ہیں کہ خود غرضی نے انہیں آمادہ فساد کیا۔ اور خون عثمانؓ کا مطالبہ صرف ایک بہانہ تھا جسکی آڑ میں اپنا مطلب نکالنا چاہتے تھے۔ اس صورت میں بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ بیعت برضا و رغبت نہیں ہوئی۔ دوسری صورت کے متعلق یہہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ فی الحقیقت حضرت علیؓ پر خون عثمانؓ کا شبہ تھا؟ اس کا جواب تو بجائے خود

اس پر زیادہ غور کرتے ہوئے ہمارے کمزور دل لرزتے ہیں۔ کیونکہ ہم اصحاب رسول اللہ کی نسبت کسی قسم کی بدگمانی کفر سمجھتے ہیں۔

حضرت علیؓ خود مقر ہیں کہ مخالفین نے ان پر خون عثمانؓ کا شبہ کیا ہے۔ بنو امیہ نے اگر آبائی خصومت کی وجہ سے آپ کی بیعت نہیں کی تو سوائے اسکے اور کیا باعث ہو سکتا ہے کہ وہ آپ پر اس کا شبہ ضرور کرتے تھے۔ طلحہؓ اور زبیرؓ بنو امیہ سے نہ تھے۔ اگر وہ خود غرض نہ تھے تو اسمیں کچھ شک نہیں کہ خون عثمانؓ کا شبہ آپ کرتے تھے۔ لیکن ان صورتوں میں بنو امیہ کا ذاتی عناد اور مؤخر الذکر دو اصحاب رسولؐ کی نفسانی اغراض قابل غور شبہ پیدا کرتی ہیں۔ اور یہ ممکن ہے کہ اگرچہ طلحہؓ و زبیرؓ اور بنو امیہ کے اغراض مختلف ہوں لیکن خلافت کے جھگڑے میں حضرت علیؓ کو اپنا دشمن سمجھکر موافق ہو گئے ہوں۔ اگر حضرت علیؓ پر خون عثمانؓ کا دھبہ ہاتھ پر آپنے طوعًا یا کرہًا بیعت کی تھی) شبہ اس واسطے نہیں ہو سکتا کہ آپ کے اوصاف حسنہ اور خصایل جمیلہ اسکے مقتضی نہیں اور ایسا فعل آپ سے صادر نہیں ہو سکتا تھا تو طلحہؓ اور زبیرؓ پر خود غرضی کا الزام اور اس لئے فسخ بیعت کا جرم بھی بیجا ہے۔ بنو امیہ یا وہ لوگ جو اس وقت آپکے مخالف تھے حضرت علیؓ کو اس باغیانہ سازش کا شریک سمجھتے تھے جسکا شکار حضرت عثمانؓ ذوالنورین ہوئے۔ اگرچہ قاتلوں کا پتہ نہ چلا لیکن مخالفین کہتے تھے کہ قتل آپکے ایماء سے ہوا ہے اور قاتلوں کا عدم پتہ صرف آپ کے اغماض اور چشم پوشی کا نتیجہ تھا۔

واقعات سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ واقعہ قتل سے پیشتر وہ اون لوگوں کے شریک تھے جو حضرت عثمانؓ کی خلافت پر اعتراض کرتے تھے لیکن وہ اوس سازش میں شریک تھے جو خلیفہ سوم کے قتل کے بارہ میں یہی لوگ کر رہے تھے۔ اگرچہ ہمیں وجدانی یقین ہے کہ جو کچھ حضرت علیؓ نے اپنی نسبت ان واقعات کے متعلق فرمایا۔ سچ ہے۔ اور آپکے دامن پر خلیفہ کے خون کا داغ نہ تھا لیکن واقعات کی رو سے ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ مخالفین نے جو کچھ شبہ آپ پر کیا وہ بے بنیاد نہ تھا۔ ابو خلدہ الحنفی کہتے ہیں کہ میں نے حضرت علیؓ سے سنا ہے کہ بنو امیہ سمجھتے ہیں کہ مینے حضرت عثمانؓ کو قتل کر دایا۔ واللہ نہ میں نے قتل کروایا اور نہ کسی طرح قتل میں امداد دی بلکہ لوگوں کو منع کیا۔ مگر اونھوں نے میرا کہنا نہ مانا۔ حضرت حسنؓ فرماتے ہیں کہ جس وقت حضرت عثمانؓ قتل کیئے گئے حضرت علیؓ مدینہ منورہ میں موجود بھی نہ تھے۔ اس وقت کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔ ان روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بیشک حضرت علیؓ حضرت عثمانؓ کے خون میں شریک نہ تھے۔

لیکن یہ کہ آپ نے اور حضرت طلحہؓ و زبیرؓ نے اپنے بیٹوں کو خلیفہ کی حفاظت کے لئے بھیجدیا تھا بالکل جھوٹی کہانیاں ہیں۔ اگر واقعات کی صورت اس طرح ہوتی تو آپ پر شبہ کرنے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ مگر آپ کے مخالفین یہ کہتے تھے کہ اگرچہ آپ اس وقت مدینہ منورہ میں موجود نہ تھے لیکن اُس شورش میں شریک تھے جو حضرت عثمانؓ کے برخلاف برانگیختہ کی گئی تھی اور عین وقت پر مدینہ سے کھسک جانا بھی بے معنی نہ تھا۔ یہ تو واقعات کی صورت تھی مخالف اور موافق دونوں جس طرح چاہتے اسپر حاشیہ چڑھاتے لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اگرچہ حضرت علیؓ خلیفہ سوم کے قتل کے خواہان نہ تھے لیکن چونکہ اونہوں نے اون پر سختی سے اعتراض کئے تھے اور اسکے تھوڑے عرصہ بعد واقعہ قتل ہوا۔ اِس لئے اگر مخالفین نے آپ پر شبہ کیا تو نیک نیتی سے کیا۔

اِس وقت مسلمانوں کی جماعت میں ایک ایسا گروہ بھی تھا جو حضرت علیؓ کو خلیفہ برحق سمجھتا تھا۔ اور اگرچہ حضرت عثمانؓ کا قتل ایک مظلوم کی شہادت خیال کرتا تھا لیکن اون لوگوں کو معذور سمجھتا تھا۔ جنہوں نے خلیفہ سوم کا اس آڑے وقت میں ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ فی زمانہ ہماری بھی یہی رائے ہے کہ حضرت علیؓ معذور تھے۔ اور خلافت کے مستحق تھے لیکن جیسا کہ ہم لکھ چکے ہیں کہ آپکے مخالفین کا یہ دعوے کہ حضرت علیؓ ہی خلیفہ سوم کے قتل کا باعث ہوئے ہیں بے دلیل ثابت نہیں ہوتا۔ اگر حضرت علیؓ خلیفہ سوم کا ساتھ چھوڑنے میں معذور تھے تو مخالفین بھی آپ پر خون کا شبہ کرنے میں مجبور تھے۔ ابتدا میں حضرت علیؓ باغیوں کے ساتھ خلیفہ اور خلافت پر اعتراض کرنے میں شریک تھے۔ اور آخر میں جبکہ شورش کی صورت نہایت خوفناک بن گئی تھی آپنے باغیوں اور خلیفہ دونوں سے کنارہ کیا جس کا نتیجہ جسکی شاید حضرت علیؓ کو توقع نہ تھی یہ ہوا کہ خلیفہ کے مکان واقع دار الخلافت مدینۃ النبیؐ اور روز روشن میں حضرت عثمانؓ قتل کئے گئے۔ اور اسپر طرہ یہ کہ باغیوں کا پتہ نہ چلا۔ اِس جرأت اور بیباکی کا کیا باعث تھا۔

دمشق میں امیر معاویہؓ کو اس واقعہ دلخراش کی خبریں بذریعہ انصار و مہاجرین جو کچھ موصول ہوئیں ان میں حضرت علیؓ کی نسبت صاف صاف الفاظ میں یہ بیان کیا گیا تھا کہ خلیفہ سوم صرف حضرت علیؓ کے اغماض اور کنارہ کشی کے باعث شہید ہوئے۔ اور اگر آپ حضرت عثمانؓ کی امداد پر کھڑے ہو جاتے تو ممکن نہ تھا کہ باغیوں کو اس قدر بیباکانہ جرأت ہوتی۔

ہم اسپر اس سے زیادہ بحث نہیں کرتے۔ ہماری رائے میں حضرت علیؓ بھی معذور تھے اور آپکے مخالفین

کا شبہ بھی بیجا تھا۔ اگر حضرت علیؓ نے خلیفہ سوم کا ساتھ چھوڑ دیا تو طلحہؓ و زبیرؓ کا فسخ بیعت کرنا قابل اعتراض نہیں ہو سکتا؛

اس پر آشوب زمانہ میں جبکہ ایک فریق حضرت علیؓ سے خون عثمانؓ کا مطالبہ کر رہا تھا جس کا نتیجہ جنگ جمل ہوا مسلمانوں کی ایک جماعت خاموشی کے ساتھ اس طوفان کو اٹھتا ہوا اور فریقین کو برباد ہوتا ہوا دیکھ رہی تھی۔ اگرچہ فریقین انہیں اپنی امداد کے لئے بلا رہے تھے لیکن انہوں نے کسی کا ساتھ نہ دیا۔ حضرت اسامہ بن زید بن ثابت ان لوگوں میں سے تھے۔ حضرت علیؓ کی نہ تو بیعت کی اور نہ کسی جنگ میں ان کا ساتھ دیا حضرت علیؓ نے انہیں مدعو کیا تو جواب دیا کہ اگر آپ اپنا ہاتھ کسی اژدہے کے منہ میں ڈالدیں تو میں بھی آپکے ساتھ ڈالدوں گا۔ مگر اس معاملہ میں معذور ہوں۔ آپ کو یاد ہے کہ جب میں نے کفار میں سے ایک شخص کو جہاد میں گرفتار کیا تو اس نے کہا "اشہدان لاآلہ الااللہ"۔ مگر میں نے اسے قتل کر دیا اور یہ واقعہ رسول اللہ کے سامنے بیان کیا تو آپنے فرمایا۔ "اے اسامہ بروز قیامت لاآلہ الااللہ کا کیا جواب دوگے"۔ میں نے عرض کی یا رسولؐ اوس نے صرف جان بچانے کے لئے لاآلہ الااللہ کہدیا تھا؛ آپنے پھر فرمایا "اے اسامہ لاآلہ الااللہ کا کیا جواب دوگے"۔ قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا۔ اس واقعہ نے آپکے دل پر ایسا اثر کیا کہ آپ بار بار یہی فرماتے تھے کہ "اے اسامہ لاآلہ الااللہ کا کیا جواب دوگے"۔ اور میری یہ حالت تھی کہ دل ہی دل میں کہتا تھا کاش میرا گذشتہ اسلام کالعدم ہو جاتا اور میں آج مسلمان ہوا ہوتا"۔ اسکے بعد میں نے عرض کی کہ "میں عہد کرتا ہوں کہ آیندہ ایسے شخص کو جو لاآلہ الااللہ کہتا ہو قتل نہ کروں گا"؛

حضرت علیؓ خود اہبان بن صیفی غفاری کے پاس تشریف لے گئے اور پوچھا "اے ابو مسلم تم میرا ہاتھ میرے مخالفوں کے برخلاف کس لئے نہیں بٹاتے۔ اور کیا چیز مانع ہے کہ اس کام میں کچھ حصہ نہیں لیتے"۔ جواب دیا کہ "میرے خلیلؐ اور آپکے ابن عمؐ کی وصیت مانع ہے۔ مجھے آنحضرت نے فرمایا کہ جب فتنہ کا زمانہ ہو تو تم لکڑی کی تلوار بنالینا؛ چنانچہ میں نے اسکی تعمیل میں فی الواقع لکڑی کی تلوار بنالی ہے۔ دیکھئے وہ لٹک رہی ہے"؛

اس جماعت کی علیحدگی نے حضرت علیؓ کو نتیجۃً اتنا ہی نقصان پہونچایا جتنا مخالفین کو فائدہ ہوا اگر واقعہ قتل عثمانؓ ظہور میں نہ آتا تو جنگ جمل بھی نہ ہوتا اور یہ لوگ بھی آپ کا ساتھ دیتے۔ اور پھر کوئی شخص

آپ کے سامنے دم نہ مار سکتا۔ بنوامیہ اگر برخلاف تھے تو آسانی سے اُن کی بغاوتیں فرو ہو سکتی تھیں کیونکہ وہ کبھی ایسی جمعیت بہم نہ پہونچا سکتے جو اس واقعہ نے اُن کے علم کے نیچے جمع کر دی۔

بالفرض بنوامیہ آبائی خصومت کی باعث حضرت علیؓ کے برخلاف تھے۔ اور طلحہؓ اور زبیرؓ نے ہوائے خلافت میں آتش جنگ مشتعل کی۔ لیکن اس میں کچھ شک نہیں کہ خون عثمانؓ ایک عمدہ بہانہ تھا اور اس کے مطالبہ نے عام لوگوں کو اُن کی تائید میں کھڑا کر دیا۔ اِس لیئے درحقیقت خون عثمانؓ ہی بنوہاشم کی کمزوری اور بنوامیہ کی حکومت کا باعث ہوا۔ جنگ جمل نے خلیفہ چہارم کی جنگی طاقت کو بہت کچھ صدمہ پہونچایا اور ابھی اس کا اثر زایل نہ ہوا تھا کہ امیر معاویہؓ افواج شام کے ساتھ صفین میں صف آرا ہوئے۔

جنگ جمل اور صفین کی لڑائیوں میں بہت بڑا فرق ہے۔ اگرچہ اس وقت عرب میں بچہ سے بوڑھے تک سپاہیانہ زندگی بسر کرتا تھا۔ لیکن بصرہ اور کوفہ کے لوگوں کو شامی تجربہ کار فوجوں سے کچھ نسبت نہ تھی۔

جنگ جمل میں طلحہؓ اور زبیرؓ کے اثر نے اون لوگوں کو جمع کر لیا تھا جن میں سے اکثر صرف ہوا خواہی کے جوش میں گھر سے نکلے تھے۔ درحقیقت اس وقت حضرت علیؓ کے مقابلہ میں ایسا دشمن نہ تھا جو اسد اللہ پر غالب آسکتا۔ مگر خلیفہ چہارم کو طلحہؓ اور زبیرؓ اور ام المومنینؓ کے اثر کا ڈر ضرور تھا۔ اور اگر وہ سرعت کے ساتھ حریف کی پیش قدمی کو نہ روکتے تو تھوڑے عرصہ میں اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ حضرت علیؓ کے پُرزور ہاتھ بھی اس فتنہ کو فرو نہیں کر سکتے تھے۔ اس وقت حضرت علیؓ کو خاطر خواہ کامیابی ہوئی۔ لیکن جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ جمل جنگ صفین کا پیش خیمہ ہے۔ شام اون مسلمانوں کی چھاونی تھی جن کے ہاتھوں نے اس ملک کو فتح کیا تھا جنکی شمشیر آبدار کے سامنے قیصر دم بخود تھا۔ یہی مسلمان اس وقت تجربہ کار افسروں کے ماتحت عراق پر بڑھ رہے تھے۔ کچھ شک نہیں کہ اس وقت دونوں لشکر ایسے افسروں کے ماتحت کام کر رہے تھے جن کا نظیر تواریخ اسلام میں اسکے بعد نظر نہیں آتا۔ فریقین نے اپنی کل طاقت میدان کارزار میں جمع کر دی۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ یہ جنگ جس میں بہت سی معرکہ آرائیاں ہوئیں ایسا خونریز ثابت نہیں ہوا جیسا کہ امید کی جاتی تھی ورنہ یقیناً مسلمانوں کی تباہی کے ساتھ اسلام کا بھی خاتمہ ہو جاتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دور اندیش افسران فوج اس نتیجہ پر پہلے ہی سے پہنچ گئے تھے۔ اور اس لیے صلح

واتحاد کے لئے متواتر کوششیں کرتے رہے۔ طبری نے اس جنگ کے واقعات مفصل بیان کئے ہیں اور بالخصوص ان امور کا بھی تذکرہ کیا ہے جو صلح کے متعلق تھے لیکن افسوس ہے کہ ان میں سے اکثر واقعات بیّنہ قابل اعتبار نہیں۔ ایلچیوں کی گفتگو اموی دربار میں ایسے الفاظ سے شروع ہوتی ہے جو بایہ تہذیب اور ادب سے ساقط ہے۔ اور پند ونصائح کا دفتر جو درشتی اور سختی سے امیر معاویہؓ کے سامنے کھولا گیا اسکی نسبت ہم بلا تامل کہہ سکتے ہیں کہ یا تو یہ اختراعی روایت ہے یا حضرت علیؓ کے ایما اور ہدایت کے مطابق کارروائی نہ تھی۔ بلکہ اسکا محرک نادان دوستوں کا دلی جوش اور ناعاقبت اندیشی تھی۔ کیونکہ حضرت علیؓ کا علم وفضل اور علو مرتبہ کبھی اوس ناشائستہ گفتگو کو جائز نہیں رکھ سکتا تھا جو صریحاً اون کے مدعا کے مخالف تھا۔ تو تو اور میں میں کا نتیجہ کبھی صلح نہیں ہو سکتی۔ اور تعجب ہے کہ ایسے آدمی کس لئے ایلچی منتخب ہوئے جو اپنے فرائض کو انجام دینے کے بالکل ناقابل تھے۔ بجائے اسکے کہ ٹھنڈے دل سے مخالفوں کی گفتگو سنتے اور آشتی اور نرمی سے باتیں کرتے۔ اور جس غرض کے لئے اونہیں بھیجا گیا تھا۔ اوسے خوش اسلوبی سے انجام دیتے۔ یہ ایلچی جو حضرت علیؓ کی طرف سے امیر معاویہؓ کے پاس صلح کا پیغام لیکر گئے۔ جنگ کا اعلان دے کر آئے۔

دوسرے روز اس مشہور ومعروف جنگ کا آغاز ہو گیا۔ طرفین نے اپنی فوجوں کو سات حصوں میں تقسیم کیا اور میدان جنگ میں قائم کر دیا۔ ماہ ذی الحجہ میں متواتر چھوٹی چھوٹی لڑائیاں ہوتی رہیں جنکا کچھ نتیجہ نہ نکلا۔ دریائے فرات پر اس وقت عربی طاقت بحالت سکون خیمہ زن تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی فریق ایک دوسرے پر بہیئت مجموعی حملہ کرنے کی جرأت نہ کرتا تھا۔ اور کسی کو ایک دفعہ جم کر لڑنا منظور نہ تھا۔ ذالحجہ کے اختتام پر ماہ محرم کا چاند دکھائی دیا تو بوجہ حرمت جنگ موقوف ہو گیا۔ اس عرصہ میں پھر صلح واتحاد کی سلسلہ جنبانی ہوئی۔ لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ کیونکہ حضرت علیؓ شامیوں کو اپنی بیعت کے لئے کہتے تھے اور امیر معاویہؓ خون عثمانؓ کا مطالبہ کرتے تھے۔ اور قاتلان عثمانؓ کو طلب کرتے تھے۔ محرم کے اختتام پر پھر آتش جنگ بھڑک اٹھی۔ لیکن ابھی تک کوئی خونریز لڑائی نہیں ہوئی اور اس لئے اس جنگ کا نتیجہ ابھی تک کسی فریق کے حق میں اچھا یا برا نہ تھا۔ درحقیقت فریقین لڑنا پسند نہیں کرتے تھے۔ اور انکے دل صلح کی طرف جھکے ہوئے تھے۔ اور اگر ایلچی اپنی ذاتی اغراض اور خواہشات کو کچھ عرصہ کے لئے نظر انداز کر دیتے تو اس وقت تک جو کچھ خونریزی ہوئی کبھی نہ ہوتی لیکن افسوس ہے کہ فریقین نے ایسے ایلچی

منتخب کئے جو کسی طرح اس خدمت کے لئے موزون نہ تھے۔ اور اس لئے چند ماہ تک باہمی رسل و رسایل کا کچھ اثر ظہور میں نہ آیا۔

ہم نہیں چاہتے کہ اون مبالغہ آمیز روایتوں کو جنپر ہم کسی طرح اعتبار نہیں کر سکتے معرض تحریر میں لائیں۔ جو کچھ ایک فریق کی مدح اور دوسرے کی مذمت میں مؤرخین نے لکھا ہے وہ صرف راویوں کی خوش اعتقادی اور دلی بغض کا نتیجہ ہے۔ اور ہم پسند نہیں کرتے کہ یہ روایتیں ایسی دنیا کے سامنے پیش کریں جو واقعات کو تنقیدی نظر سے دیکھتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس جنگ کے حالات نہایت مبالغہ آمیز روایتیں ہیں جن میں خوش اعتقادی نے فضایل کے پیرایہ میں جھوٹ ملا دیا ہے۔ لیکن غور و فکر سے صحیح صحیح واقعات کا پتہ آسانی سے مل سکتا ہے۔

تاریخ اسلام میں یہ وہ زمانہ تھا جبکہ ہر ایک شخص خلیفہ وقت کے ساتھ اکثر حیثیتوں میں ہمسری اور برابری کا دعوی کرتا تھا۔ اور باوجود احساس اطاعت و ادب خلافت خلیفہ کو کبھی حق سے تجاوز کرنے کی اجازت نہ دیتا تھا۔ وہ آزادی جسکا خاتمہ اموی شخصی حکومت نے کر دیا۔ اس وقت ہر ایک مسلمان کے قول و فعل سے ظاہر ہوتی تھی۔ وہ واقعات جو خلیفہ سوم کے قتل اور جنگ جمل و صفین سے متعلق ہیں اس دعوی کی زبردست تائیدی شہادت ہیں۔ فی زمانہ ہماری ذاتی رائے کسی خاص شخص یا فریق کی نسبت خواہ کچھ ہی ہو۔ انصاف تقاضا کرتا ہے کہ اوس زمانہ کے حالات اور واقعات کی بنا پر اُن لوگوں کے خصایل اور قول و فعل کی نسبت رائے قائم کرنی چاہیئے۔ مؤرخین نے بیشمار ایسے واقعات لکھے ہیں جن سے بخوبی ثابت ہوتا ہے کہ عربی نہایت آزاد منش اور دلیر اور بہادر قوم تھی۔ ہم ان واقعات کو اس جگہ مثالاً بیان نہیں کرتے صرف اسی قدر کہنا چاہتے ہیں کہ ان اوصاف کے قیصر و کسری بھی معترف تھے۔ اگر فی زمانہ مسلمان قبول نہ کریں تو کچھ مضائقہ نہیں۔ کوئی شخص جو آزاد اور دلیر ہوگا کبھی ضمیر فروش نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کسی فریق پر بزدلی کا الزام اور خود غرضی اور بے ایمانی کا اتہام واقعات کے مخالف ہے۔

اس وقت صفین میں دریائے فرات کے کناروں پر دو لاکھ کے قریب سوار و پیادہ کی جمعیت تھی اور اس میں کچھ شک نہیں شامی تعداد میں زیادہ تھے۔ اور نیز سامان حرب بہ نسبت عربوں کے زیادہ تھا اور اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا۔ ان میں وہ بہادر سپاہی تھے۔ یا اون بہادروں کی اولاد تھی جنہوں نے

ایران وشام ومصر کو فتح کیا تھا - علاوہ ازیں ان میں ایسے مدبر موجود تھے جن کا نظیر تواریخ عالم میں مشکل سے ملیگا - ایک شخص انہیں ایسا تھا جسکی نسبت گبن لکھتا ہے کہ "عمرو بن العاص اکیلا ایک فوج کے برابر تھا" باوجود اس قدر لاؤ لشکر اور سامان حرب و جنگی طاقت کے کسی طرح یقین نہیں ہو سکتا کہ شامیوں نے جب بزور شمشیر حصول غلبہ ناممکن دیکھا نہیں بلکہ شکست کھائی تو "الحرب خدعة" پر عمل کیا - اور فریب سے کام لیا۔

واقعات جنگ سے ظاہر ہوتا ہے مسلمان عموماً مسلمانوں کا خون بہانا پسند نہیں کرتے تھے اس لئے آغاز جنگ سے پیشتر ہی صلح کے خواہان تھے - اور اس لئے برابر ایلچیوں کی آمد و رفت اثناء جنگ میں بھی جاری رہی ہے - لیکن جیسا کہ ہم نے لکھا ہے - یہ ایلچی اس خدمت کے بالکل موزون نہ تھے - ان کے ذریعہ سے کچھ کام نہ نکلا - اگرچہ اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ انکی معرفت بار بار صلح کا پیغام عام مسلمانوں کی تحریک کا نتیجہ تھا جس سے فریقین کی دلی کیفیت کا صحیح صحیح اندازہ ہو سکتا ہے۔

ماہ ذالحجہ میں جنگ کا آغاز ہوا اور چھوٹی چھوٹی لڑائیوں سے باہمی چھیڑ چھاڑ جاری رہی - لیکن ان لڑائیوں میں بھی صلح کی جھلک نظر آتی تھی - فریقین ایک دوسرے سے ملتے اور اس طرح اُن کے خیالات کا تبادلہ ہوتا رہتا - ماہ محرم کی حرمت نے دونوں فوجوں کے ہاتھ روک دیئے - اور اس عرصہ میں صلح و اتحاد کی باتیں اپنا اثر کرتی ہیں - افسوس ہے کہ ہر ایک موقعہ پر ایسے شخص ایلچی منتخب ہوتے رہے جو جوش دل کے باعث کبھی کامیاب نہ ہوئے بلکہ یہ کہنا کچھ بیجا نہ ہوگا کہ صرف یہی لوگ مسلمانوں میں خونریزی کا باعث ہوئے - اپنے فرائض منصبی ان لوگوں نے اپنے افسروں کی تعریف و توصیف اور سخت کلامی کے ساتھ مطالبات کا تذکرہ کرنا ہی سمجھا - غیور طبائع پر اسکا اثر یہی کچھ ہوا کہ تین ماہ تک دونوں فوجیں ایک دوسرے کے مقابل پڑی رہیں - کبھی کبھی اپنی تیغ آبدار کے جوہر دکھاتے - اور بعض دفعہ تو خونریز لڑائیاں بھی ہوئیں عمار بن یاسر رسول اللہ کے مشہور صحابی حضرت علی کے جان نثاروں میں سے تھے - رایت ان کے ہاتھ میں تھا اس لئے بذات خود داد شجاعت نہ دے سکتے تھے - ایک شخص کو کہا کہ تھوڑی دیر کے لئے اس رایت کی حفاظت کرنا تاکہ مجھے بھی اس جنگ میں کچھ حصہ لینے کا موقع ملے - اس نے جواب دیا کہ رایت کی حفاظت لڑنے مرنے سے بہتر ہے - مگر ان کے اصرار پر رایت ان کے ہاتھ سے لے لیا - معزز صحابی شمشیر بکف شامیوں کی صفوں میں گھس آئے - اور اسی جگہ کام آئے - ان کے قتل کا افسوس

ہر ایک مخالف و موافق کو ہوا۔ امیر معاویہؓ نے عمروؓ بن العاص کو کہا کہ "دیکھتے ہو کیسے کیسے معزز لوگ ہماری وجہ سے جان پر کھیل رہے ہیں"۔ عمروؓ بن العاص نے آہ بھر کر کہا "کاش آج سے بیس برس پہلے میں قبر میں ہوتا"۔

ان واقعات پر اگر غور کیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ فریقین کس بددلی سے لڑ رہے تھے۔ اور اگرچہ پرجوش اصحاب دونوں جانب سے مرنے مارنے پر تلے ہوئے تھے لیکن فی الحقیقت ان کی تعداد بہت کم تھی اور یہ لوگ یا تو میدان جنگ میں کام آئے یا رفتہ رفتہ دیگر مسلمانوں کے ہم خیال طوعاً یا کرہاً ہو گئے۔ عام مسلمان اس وقت صلح پر جھکے ہوئے تھے لیکن میدان جنگ میں کوئی شخص اپنے خیالات کا اظہار کر کے بزدلی کا ملزم بننا نہیں چاہتا تھا۔ اور غالباً آخر دم تک یہ خواہش دل ہی دل میں رہتی۔ اگر ایک شخص اور صرف ایک شخص کا حزم و احتیاط اور دوراندیشی اسکے اظہار کا باعث نہ ہوتی۔ یہ شخص عمروؓ بن العاص فاتح مصر تھا۔ فریقین کے دلی خیالات کا علم اسے بخوبی تھا۔ اور یہ بھی جانتا تھا کہ مسلمانوں کی خواہش صلح ایلچیوں کے ذریعہ پوری نہیں ہو سکتی۔ اس لئے اس دانا شخص نے خود انہی لوگوں کو صلح کا موقعہ دیدیا جو دل سے اسکے خواہاں تھے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ ابھی تک اسکا یہ خیال تھا کہ حسب معمول ایلچیوں کے ذریعے سے ان شرائط پر صلح ہو جائیگی جو طرفین انصافاً منظور کر سکتے تھے لیکن واقعات نے ثابت کر دیا کہ یہ ناممکن الوقوع امر تھا۔ اور چونکہ عمارؓ بن یاسر کے قتل سے جنگ کی صورت نہایت خوفناک ہو گئی تھی اس لئے دوراندیش مدبر تاڑ گیا کہ اگر یہی صورت رہی تو خواہ کسی فریق کا غلبہ ہو مسلمانوں کی تباہی میں کچھ شک نہیں۔ دوسرے دن جب کہ دونوں فوجیں ایک دوسرے کے مقابل صف بستہ کھڑی تھیں اور تھوڑی دیر میں امید کی جاتی تھی کہ ایک سخت خونریز اور غالباً فیصلہ کن لڑائی واقع ہو گی۔ عمروؓ بن العاص کے حکم سے قرآن شریف نیزوں پر بلند کئے گئے۔ آناً فاناً اس بحر موجزن میں جو دریائے فرات کے ساتھ ایک اور خون کا دریا بہانے کے لئے تیار ہو رہا تھا سکون پیدا ہو گیا۔ ہر ایک شخص نے خوشی خوشی لڑائی سے ہاتھ روک لیا۔ اور اس طرح جنگ صفین کا خاتمہ ہو گیا۔ اور اس طرح ایک شخص کی عقل خداداد نے مسلمانوں کو تباہی سے بچا لیا۔

جنگ صفین جس کا خاتمہ صلح پر ہوا اگرچہ ہماری رائے میں جنگ جمل سے زیادہ خونریز نہیں تھا۔ لیکن تواریخ اسلام میں بہ لحاظ نتائج خاص وقعت کے قابل ہے۔ خون عثمانؓ اس جنگ کا بہانہ یا باعث تھا اور اس میں کچھ شک نہیں کہ اگر یہ باعث نہ ہوتا تو جنگ صفین بھی وقوع میں نہ آتا۔ یہ ممکن تھا کہ بنی امیہ

خلافت کے لئے ہاتھ پاؤں مارتے۔ لیکن انہیں کبھی کامیابی نہ ہوتی۔ اس کے مطالبہ پر انکی حمایت پر عام مسلمانوں کی ہمدردی تھی۔ اور اس سے بنی امیہ نے وہ فائدہ اٹھایا جسکی غالباً ابتدا میں انہیں امید نہ تھی اور جس کا عام مسلمانوں کو وہم وگمان بھی نہ تھا۔ خون عثمانؓ کا مطالبہ یعنی جنگ کا خاتمہ تو صفین پر ہوگیا۔ اور صلح کی شرائط حکمین (ابو موسیٰؓ اور عمروؓ بن العاص)، کے فیصلہ پر جو انہوں نے آٹھ ماہ بعد "دومتہ الجندل" پر دیا طے ہوگئیں۔ آٹھ مہینے کے عرصہ میں ابتدائی خیالات کی بالکل کایا پلٹ گئی تھی۔ فریقین کی پولیٹیکل چالوں کا اثر حکمین کے فیصلہ پر ضرور ہوا۔ لیکن ہماری رائے میں جو کچھ اس زمانہ کے حالات تقاضا کر رہے تھے وہی کچھ فیصلہ کی صورت تھی۔ اس فیصلہ کے متعلق جس قدر روایتیں بیان کیجاتی ہیں۔ انمیں اس قدر مبالغہ اور جھوٹ کی آمیزش ہے کہ ایک محقق بمشکل انپر اعتبار کرے گا۔ ان روایتوں سے قطع نظر کر کے ہم اس واقعہ کی تصدیق پر تیار ہیں کہ ابو موسیٰؓ کی یہ رائے تھی کہ حضرت علیؓ اور امیر معاویہؓ دونوں کو خلافت سے برطرف کیا جائے اور پھر شوریٰ کے فیصلہ پر خلیفہ کا انتخاب ہو۔ عمرو بن العاصؓ اس سے ایک حد تک متفق تھے، یعنی حضرت علیؓ کے عزل کا ان کے حکم کو اختیار تھا۔ لیکن امیر معاویہؓ کی برطرفی انہیں منظور نہ تھی، حکمین نے اپنا اپنا فیصلہ سنا دیا۔ اگر اسے منظور کیا جاتا تو امیر معاویہؓ بلا شرکت غیرے دنیائے اسلام پر بحیثیت خلیفہ حکمران ہوتے، لیکن ابو موسیٰؓ کا فیصلہ اسی فریق نے رد کیا جن کے وہ حکم تھے۔ اور عمرو بن العاصؓ کی رائے بحال رہی۔ لیکن حکمین کے فیصلہ کی ترمیم اس طرح کی گئی کہ ممالک اسلام حضرت علیؓ اور امیر معاویہؓ کے درمیان انصافاً تقسیم ہو گئے جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ کوفہ[۲۰] اور دمشق کو دار الخلافتین کا اعزاز حاصل ہوگیا۔ مدینہ منورہ سے انتقال خلافت ہمیشہ کے لئے ہوگیا، کوفہ

حاشیہ نمبر ۲۰ - کوفہ کی بنا سنہ ۱۶ھ میں حضرت عمرؓ کے عہد میں سعدؓ بن وقاص نے ڈالی۔ تعمیر کی کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ سعدؓ نے ملک عراق کی فتح اور ایران کی تسخیر کے بعد پائے تخت مداین میں قیام اختیار کیا۔ آب ہوا کی ناموافقت سے عربیوں کے رنگ، رو متغیر ہو گئے۔ اس لئے حضرت عمرؓ کے حکم سے سعدؓ نے سلیمانؓ اور حذیفہ کو اس غرض سے روانہ کیا کہ کوئی ایسی جگہ تلاش کریں جو دریا کے کنارہ اور خشکی سے متصل اور مقر خلافت کے درمیان کوئی دریا یا پل حایل نہ ہو۔ نہر فرات کے اوس کنارہ پر جو فرات اور حیرہ کے مابین واقع ہے ایک قطعہ اراضی پسند کیا گیا۔ ابتدا میں بانسوں کے مکانات تعمیر کئے گئے۔ ایک دفعہ آگ لگ گئی۔ تو عمرؓ نے خشت خام کی عمارتوں کی اجازت اس شرط پر دی کہ کوئی شخص تین گھروں سے زیادہ نہ بنائے،

حضرت علیؑ کی زندگی تک یعنی بہت تھوڑا عرصہ پایہ خلافت رہا۔ درحقیقت خلافت بالاستقلال دمشق میں منتقل ہوگئی؛

اِس فصل کو ہم انہی واقعات پر ختم کرتے ہیں۔ اگلی فصل میں اُن واقعات کا تذکرہ کریں گے جو دمشق کی قابل رشک عزت کا باعث ہوئے"۔

اور مکانات بہت بلند تعمیر نہ کئے جائیں؛

کوفہ ایک عربی چھاونی تھی خشت خام کے مکانات کے گرد عربی خیمے تھے خلیفہ دوم نے کبھی کسی شخص کو پختہ مکان بنانے کی اجازت نہ دی۔ مدعا یہ تھا کہ عربی اس جگہ منتقل رہائش کے اسباب جمع نہ کر سکیں اور ہر وقت سفر کے لئے طیار رہیں۔ بوقت ضرورت ایسے مکانوں کو چھوڑنا شاق نہ گذرے۔ رفتہ رفتہ کوفہ ایک شہر بن گیا۔ اور آخر حضرت علیؑ کے عہد میں دار الخلافت مدینہ سے کوفہ میں منتقل ہوگیا؛

حضرت علیؑ نے کوفہ کو کس لئے دار الخلافت کے لئے منتخب کیا؟ اور مدینۃ النبی سے کس لئے ہجرت کی؟ ان سوالوں کا جواب چند الفاظ میں یہ ہے کہ ان واقعات نے جن کا تذکرہ ہم کر چکے ہیں حضرت علیؑ کو مجبور کیا کہ عرب سے نکل کر عراق میں اقامت اختیار کریں۔ بات یہ ہے کہ عرب کو ان پر اور ان کو عرب پر اعتماد نہ تھا خالص عربی نسلیں بنو اُمیہ کی معاون تھیں اس لئے قدرتاً آپ کو ایسے لوگوں سے امداد طلب کرنی پڑی جو اہلبیت کی محبت کا دم بھرتے تھے۔ کوفہ میں عربیوں اور عراقیوں اور ایرانیوں کی آبادی کے اختلاط نے ایک عجیب صورت پیدا کر رکھی تھی۔ ایک ہی جگہ مختلف اقوام کی موجودگی میں کبھی شورش کا احتمال نہ تھا؛ عربیوں کے مقابل ایرانی اور ایرانیوں کے مقابل عراقی امداد مل سکتی تھی؛ اور ابتدائی خیال یہ تھا کہ ہیج ہواخواہوں کو ایک جگہ جمع کیا جائے۔ اس تضاد اثر سے جو مدینہ میں اپنا کام کر رہا تھا۔ بچنے کے لئے بظاہر انتقال دار الخلافت کے سوا کوئی اور بہتر تجویز نہ تھی۔ مگر افسوس ہے کہ اس وقت اس کا نتیجہ بھی مضر ثابت ہوا؛

انتقال دار الخلافت ان واقعات کی جو اس وقت اسلامی دنیا میں پیش آرہے تھے۔ بخوبی تشریح کرتا ہے اسکا تذکرہ ہم مفصل کریں گے؛

فصل سوم

جنگ جمل اور صفین کا باعث خون عثمانؓ تھا اور دمشق جمل اور صفین کے سبب پایہ خلافت بن گیا اس لیے یہ کہنا کچھ بیجا نہ ہوگا کہ خون عثمانؓ ہی ایک ایسا واقعہ ہے جس کا نتیجہ بنو امیہ کی حکومت ہے پیشتر اسکے کہ ہم دمشق کی نسبت بہ حیثیت دار الخلافت کچھ لکھیں اون اسباب کا تذکرہ جو بنی امیہ کی حکومت کا باعث ہوئے مفصل کرتے ہیں۔ یہ اسباب جنگ صفین میں پیدا ہو گئے تھے۔ یہ بالکل صحیح رائے ہو کہ جنگ صفین بہ لحاظ نتائج ایک نہایت ہی مہتم بالشان واقعہ ہے۔ اور اس سے زیادہ قابل بعت خون عثمانؓ کی دلخراش داستان ہے۔

جس وقت نیزوں پر مصحف بلند کیا گیا حضرت علیؓ کی فوج دو جماعتوں میں تقسیم ہوگئی۔ ایک فریق جو تعداد اور اثر میں کم تھا لیکن لڑنے مرنے کے لیے دلیرانہ قدم آگے رکھتا تھا صلح کے برخلاف رائے دیتا۔ دوسرا فریق جس میں اکثر عراقی تھے کہتا تھا کہ دعوت قرآن سے انکار کرنا کفر ہے اور چونکہ دل سے صلح کا خواہان تھا اس لیے مخالف الرائے اصحاب سے بگڑ بیٹھا۔ اگرچہ جنگ کا خاتمہ ہوگیا لیکن جان نثاروں کی ایک بڑی تعداد حضرت علیؓ سے اسی وقت سے علیحدہ ہوگئی۔ یہ فریق بعد میں "خوارج" کے نام سے مشہور ہوا۔ اگرچہ ان لوگوں کو امیر معاویہؓ سے کوئی ہمدردی نہ تھی لیکن ان کی علیحدگی بنی ہاشم کی کمزوری کا باعث ہوئی اور جس قدر ہاشمی طاقت کمزور ہوتی گئی امیہ زور پکڑتے گئے۔

۳۷ھ میں حضرت علیؓ انہی لوگوں کی سرکوبی کے لیے نہروان کی طرف کوچ کر رہے تھے۔ خوارج دن بدن زور پکڑتے جاتے تھے۔ اگرچہ حضرت علیؓ نے نہایت کوشش کی کہ ان لوگوں کو پھر اپنے ساتھ ملائیں مگر کچھ فائدہ نہ ہوا۔ نرمی و ملاطفت سے کام لیا اور اکثر اوقات بطریق احسن مناظرہ بھی کیا لیکن خوارج راہ راست پر نہ آئے۔ ان لوگوں نے اپنا شعار لاحکم الا اللہ مقرر کیا ہوا تھا۔ مدعا یہ تھا کہ چونکہ جنگ صفین کا خاتمہ کلام اللہ پر ہوا تھا۔ اس لیے خلافت کا فیصلہ بھی کتاب خدائے عز و جل پر ہونا چاہیے تھا۔ عمرو بن العاصؓ اور ابو موسیٰؓ کو حکم مقرر کرنا شرک تھا۔ اور ان کی رائے پر خلافت کا فیصلہ کفر تھا۔ ان لوگوں نے امیر معاویہؓ کے ساتھ حضرت علیؓ کو بھی مطعون کیا۔ اور کفر و شرک کا فتویٰ ان کے برخلاف صادر کیے۔ عام مسلمان ان کی

باتوں میں آ گئے۔ اور ان کی جمعیت روز بروز بڑھتی گئی۔ اور آخر ان لوگوں نے عبید اللہ بن وہب راسبی کو اپنا امیر مقرر کیا اور نہروان پر جمع ہونے لگے۔ یہ مقام "بغداد" اور "واسط" کے درمیان دریائے دجلہ سے چار میل جانب شرق واقع ہے۔ اس جگہ قریب پچیس ۲۵ ہزار خوارج جمع ہو گئے۔ اور عام مسلمانوں کو جو ان کے عقائد سے مخالفت کرتے قتل کرتے۔ حضرت علیؓ کو اطلاع ہوئی تو اون لوگوں کے راہ راست پر لانے کے لئے نہروان پر آئے۔ اور اپنے لشکر کے باہر ایک جھنڈا نصب کر کے اعلان کر دیا کہ جو شخص اسکے نیچے آئیگا امان پائے گا۔ اسکے بعد اتمام حجت کی اور خوارج کو سمجھایا کہ اپنی حرکات ناشائستہ سے باز آئیں۔

بات اصل میں یہ ہے کہ حضرت امیرؓ خوارج سے جنگ کرنا نہیں چاہتے تھے۔ اول تو آپ کا یہ خیال تھا کہ یہ لوگ جنگ صفین سے پیشتر میرے جان نثار ہوا خواہ تھے۔ ایک معمولی بات پر اختلاف ہو گیا اور ممکن ہے کہ نرمی اور ملاطفت سے باز آئیں۔ دوم حضرت علیؓ کو ان لوگوں کا اس قدر خوف نہ تھا جس قدر امیر معاویہؓ کا فکر لاحق ہو رہا تھا۔ آپ کا ارادہ تھا کہ پہلے شام کی مہم سے فراغت ہو تو پھر ان لوگوں کا بندوبست ہو جائیگا اس وقت حضرت علیؓ نے عبید اللہ امیر خوارج کو کہلا بھیجا کہ "تم میرے دوست تھے اور دوست بھی ایسے کہ پسینہ کی جگہ خون بہانے کو تیار رہتے۔ اب بلا وجہ دشمنی پر کمر بستہ ہو۔ آؤ پھر وہی رشتہ اخوت و مروت قائم کریں اور بالاتفاق شام کا قصد کریں"۔ جواب ملا کہ "تمہارا ارادہ ہے کہ پھر شامیوں سے جنگ ہو اور وقت پر پھر حکم مقرر کیے جائیں"۔ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ "حکم میں نے مقرر نہیں کئے تھے بلکہ تمنے مجھے مجبور کیا تھا۔ اب بجائے اسکے کہ تم اپنی غلطی پر نادم ہو تم الٹا مجھے شرمندہ کرتے ہو"۔ خوارج نے کہا کہ "ہم اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہیں اور اس وقت بھی کیا تھا۔ اور حکمین کے تقرر کے برخلاف تھے لیکن تم اسپر قایم رہے ہم کہتے تھے کہ۔ لاحکم الا اللہ۔ لیکن تم عمرو بن العاصؓ اور ابو موسیٰؓ کے فیصلہ کے منتظر تھے۔ ہم کہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق میدان جنگ میں خلافت کا فیصلہ ہونا چاہیے۔ مگر تم نے دو شخصوں کی رائے پر رضامندی ظاہر کی اور انہیں آٹھ ماہ کی مہلت دی۔ اے علیؓ! تم نے اللہ عزوجل کا ارشاد کہ۔ ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ہم الکافرون ان الحکم الا للہ۔ فراموش کر دیا۔ اور دو آدمیوں کی ذاتی رائے کو اسپر مقدم کر دیا۔ اگر ہم سے غلطی ہوئی تو ہم نادم ہوئے اور توبہ کی۔ تم نے صریحاً کفر کیا اب توبہ کرو اور از سر نو مسلمان بنو۔ اگر تم نے ہماری نصیحت پر عمل کیا تو ہم تمہارے ساتھ ہیں اور شامیوں سے لڑینگے"۔ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ "معاذ اللہ۔ میں وہ شخص ہوں کہ سب سے پہلے اسلام قبول کیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ رہا۔ اور میں نے کبھی کوئی ایسا فعل نہیں کیا جو کفر کی حد تک پہونچتا ہو۔ جنگ صفین میں جب تم نے مصحف کو دیکھکر ہتھیار رکھدیئے اور میں نے چار و ناچار تمھارا کہا مانا۔ اور جو کچھ عہد کیا اس پر قائم رہا۔ میں ہرگز اسے توڑ نہیں سکتا تھا۔ کیونکہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ "اوفوا بالعهد الله اذا عاهدتم"۔ اور حکم کا تقرر اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے مطابق ہوا تھا کہ "یحکم به ذوی عدل منکم"۔ چونکہ حکم کا تقرر بحکم اللہ ہوا اس لئے کوئی کفر و شرک نہیں"۔ خوارج نے کہا کہ "بیشک لا یحکم الا بحکم الله ولا حکم الا الله"۔

حضرت علیؓ نے دیکھا کہ لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں ماننگے اس لئے ارادہ کر لیا کہ پہلے گھر کی خبر لینا چاہئے۔ پھر شام کا قصد کریں گے۔ حضرت علیؓ کے اعلان امن پر خوارج کا اکثر حصہ آپ سے آملا۔ لیکن ابھی تک عبید اللہ بن وہب مخالفت پر اڑا ہوا تھا۔ حضرت علیؓ نے اسے ایک اور موقع دیا۔ اور اعلان کر دیا کہ جب تک خوارج حملہ آور نہ ہوں اس طرف سے پیش دستی نہ کی جاوے۔ آخر خوارج نے جنگ کی ابتدا کی۔ اور ایک سخت خونریز جنگ کے بعد پیٹھ دکھائی۔ اور جدھر جس کا منہ اٹھا بھاگ کھڑا ہوا۔ انکا تعاقب نہایت سرگرمی سے کیا گیا۔ انبار۔ مداین۔ اور شہرزور اور دیگر مقامات پر بقیۃ السیف سے مٹھ بھیڑ ہوئی اور سوائے چند گنتی کے آدمیوں کے کوئی نہ بچا۔

خوارج کا قلع قمع خاطر خواہ ہوگیا۔ لیکن اس عرصہ میں امیر معاویہؓ بیفکر نہ تھا۔ وہ برابر اپنے حریف کی طاقت کم کرنیکے لئے جوڑ توڑ میں لگا ہوا تھا۔ ادھر حضرت علیؓ خوارج کی بیخکنی کر رہے تھے۔ اور ادھر امیر معاویہؓ مصر پر قبضہ کرنے کی فکر میں تھا۔ اس وقت قیس بن سعد حضرت علیؓ کیطرف سے عامل مصر تھا۔ یہ شخص اعلیٰ درجہ کا مدبر تھا۔ اور حضرت علیؓ کے دلی ہواخواہوں میں سے تھا۔ مصر ایک ایسی جگہ تھی جہاں کسی معمولی عقل و ہمت کے آدمی کا کام نہ تھا کہ حکومت کر سکے۔ ابتدا میں قیس کو سخت مشکلات کا مقابلہ کرنا پڑا۔ اکثر اشخاص نے خراج ادا کرنے سے انکار کر دیا اور عذر یہ کیا کہ ابھی تک خانہ جنگی کا خاتمہ نہیں ہوا ہے قسمت جس شخص کے حق میں فیصلہ کرے گی وہی شخص اس ملک کا مالک ہوگا۔ اگرچہ یہ عذر نہایت نامعقول تھا لیکن قیس نے مصلحتاً خاموشی اختیار کی۔ اور نرمی اور ملاطفت سے ان لوگوں کو راہ راست پر لایا۔ ایک گروہ نے اگرچہ خراج قبول کیا لیکن بیعت سے صاف انکار کر دیا۔ کہ دو بادشاہ ایک اقلیم میں نہیں رہ سکتے۔ ان میں سے غالب کی اطاعت کریں گے۔ قیس نے اس وقت ان لوگوں سے بزور شمشیر

بیعت لینا صریحاً مصلحت کے خلاف سمجھا۔ اور اس لیئے جو کچھ کسی نے خلاف کہا اغماض کیا۔ رفتہ رفتہ ملک میں امن ہوتا گیا اور قیسؓ کے اخلاق حمیدہ کا ہر ایک شخص مداح بن گیا۔ امیر معاویہؓ نے قیس کو نامہ لکھا اور دعوت دی۔ قیس نے جواب لکھا کہ "دیکھیئے پردۂ غیب سے کیا ظہور میں آتا ہے۔ خانہ جنگی کا خرخشہ مٹ جائے تو پھر دیکھا جائیگا"۔

امیر معاویہؓ نے پھر لکھا کہ صاف صاف کہو کہ میرا ساتھ دوگے یا نہیں۔ اگر دوستی کا اظہار کرتے ہو تو صاف الفاظ میں کرو۔ اور اگر دشمنی پر کمر بستہ ہو تو ویسے کہو"۔ قیس درحقیقت امیر معاویہؓ کو باتوں میں ٹالنا چاہتا تھا۔ اور اس امر کا خواہان تھا کہ کچھ عرصہ تک یعنی جبتک مصر میں اسکے قدم اچھی طرح جم جائیں اور اہل مصر حضرت علیؓ کی اطاعت پر ثابت قدم ہو جائیں مصر بیرونی اور اندرونی خرابیوں سے پاک ہو جائے امیر معاویہؓ کی توجہ اس طرف نہ ہو لیکن شام اور مصر میں کچھ ایسا قدرتی تعلق ہے کہ حاکم شام کو قدرتاً مصر کا خیال ہونا چاہیئے۔ اور امیر معاویہؓ ایسا شخص نہ تھا کہ مصر کے بغیر آرام سے بیٹھتا۔ ابتداء میں امید بندھ گئی کہ مصر کی حکومت بغیر خونریزی کے ملتی ہے۔ کیونکہ قیس نے ان لوگوں کو جو بیعت سے انکار کرتے تھے مجبور نہ کیا تھا۔ لیکن آخر وانا امیر تاڑ گیا کہ قیس کا مدعا کیا ہے۔ اگرچہ امیر معاویہ کسی قدر مایوس ہو گیا۔ مگر ان باتوں کا نتیجہ خاطر خواہ ان کے حق میں مفید ثابت ہوا۔ لوگوں نے حضرت علیؓ کے پاس شکایت کی قیس نے ان لوگوں کو بیعت پر مجبور نہیں کیا جو مصر میں معاویہؓ کے ہواخواہ ہیں۔ اور معاویہؓ سے خط وکتابت کر رہا ہے۔ حضرت علیؓ نے عبداللہؓ بن جعفر الطیار اور محمد بن ابو بکرؓ کے مشورہ سے قیس کو لکھا کہ جو لوگ بیعت سے انکار کرتے ہیں ان کے ساتھ جنگ کرو۔ قیس نے جواب میں لکھا کہ جنگ مصلحت کے سراسر خلاف ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ دشمن کیطرف سے مطمئن ہو کر ان لوگوں کی خبر لوں۔ سردست ان لوگوں کو بیعت پر مجبور کرنا اور انکار پر جنگ کرنا اپنی طاقت کو کمزور کرنا ہے۔ تدبیر یہی ہے کہ جس وقت دشمن کی طرف سے اطمینان ہو جائیگا۔ یہ لوگ خود بخود بیعت پر رضی ہو جائینگے"۔ اس نامہ کا اثر حضرت علیؓ پر یہ ہوا کہ قیس کی طرف سے شک و شبہ پیدا ہو گیا۔ قیس کو معزول کر کے محمدؓ بن ابو بکرؓ کو حاکم مصر مقرر کیا۔ محمدؓ بن ابی بکرؓ نے عنان حکومت ہاتھ میں لیتے ہی ان لوگوں سے جنگ شروع کر دیا جو بیعت علیؓ سے انکار کرتے تھے۔ دو دفعہ لشکر کشی کی۔ اور شکست فاش کھائی۔ حضرت علیؓ کو اطلاع دی تو آپنے سمجھ لیا کہ یہ کام سوائے مالک بن اشتر اور قیس بن سعد کے اور کسی سے سرانجام نہ پائے گا۔

قیس نے تو انکار کر دیا۔ مگر مالک مصر کی طرف روانہ ہو گیا۔ ابھی راستہ ہی میں تھا کہ قضا الٰہی سے سفر آخرت پیش آیا۔ کہتے ہیں کہ معاویہؓ کے ہوا خواہوں نے شہد میں زہر دے دیا تھا۔ امیر معاویہ نے سنا تو کہا۔

حضرت علیؓ کو سخت قلق ہوا۔ محمد بن ابی بکرؓ کو نامہ لکھا کہ دشمنوں پر سختی کرو جب تک اطاعت نہ کریں یہ لوگ جن سے محمدؓ جنگ کر رہا تھا مصر میں فی الحقیقت بنی امیہ کے ہوا خواہ تھے۔ انکا سردار ایک شخص معاویہ بن خدیج تھا۔ اگرچہ اسکی حیثیت اس درجہ کی نہ تھی کہ محمدؓ کے مقابل صف آرا ہوتا۔ مگر اسے در پردہ شام سے برابر امداد مل رہی تھی۔ مالک بن اشتر کے انتقال پر محمد بن ابی بکرؓ نے ارادہ کر لیا کہ باغیوں سے ایک دفعہ خوب جی کھول کر لڑوں۔ اس وقت اس کے ہمراہ چار ہزار کی جمعیت تھی۔ اور یہ عجب بات ہے کہ معاویہ بن خدیج کا لڑکا اسکی فوج میں تھا۔ اور باپ کی مخالفت پر اڑا ہوا تھا۔ ممکن ہے کہ محمدؓ کو کامیابی ہوتی۔ لیکن اس اثنا میں عمرو بن العاص سات ہزار کی جمعیت سے مصر پر اُتر آیا۔ محمدؓ کا بھائی عبد الرحمٰنؓ اسکے ہمراہ تھا۔ شہر کے اندر اور باہر قتل و غارت کا بازار گرم تھا۔ آخر محمد بن ابی بکرؓ تنہا رہ گیا۔ اور معاویہ بن خدیج کے ہاتھ پڑا۔ عبد الرحمٰن نے عمرو بن العاص سے سفارش کی۔ عمرو نے معاویہ بن خدیج کو کہلا بھیجا کہ محمدؓ کو عبد الرحمٰن کے حوالہ کر دو۔ مگر اس نے جواب دیا کہ میں نے اپنے بیٹے کے خون سے دریغ نہیں کیا۔ محمدؓ کو کس طرح چھوڑ سکتا ہوں۔ ایک گھوڑے کا پیٹ چاک کر کے محمدؓ کو زندہ بند کر کے آگ میں جلا دیا۔

اس واقعہ نے امیہ کو بالاستقلال مصر کا مالک بنا دیا۔ اور اس طرح حضرت علیؓ کے ہاتھ سے ایک اور ملک نکل گیا۔ جو انکی کمزوری اور حریف کی طاقت بڑھانے کا باعث ہوا۔

اس وقت مطلع دنیائے اسلام پر تیرہ و تار گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ خانہ جنگی کی آگ ایسی مشتعل ہو رہی تھی کہ اگر اللہ تعالیٰ کا فضل شامل حال نہ ہوتا تو کچھ شک نہیں عرب اور شام کو خاک سیاہ بنا دیتی۔ اسلام کی بنا کچھ ایسی مضبوط تھی کہ اسے جنبش نہ ہوئی مگر اس میں کچھ شک نہیں کہ مسلمانوں کے زوال کے اسباب اسی زمانہ میں پیدا ہو گئے تھے۔ امیہ اور بنو ہاشم میں خلافت کے جھگڑے تو ایام جاہلیت سے چلے آتے تھے۔ مگر افسوس ہے کہ اسلامی زمانہ میں اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ خلافت اور سلطنت دونوں تباہ ہو گئے۔ اس وقت ایک خاندان کے رکن اتفاق اور امن سے ایک گھر میں زندگی بسر نہیں کر سکتے تھے۔ اگر باپ امیہ کا طرفدار ہے

توبیٹا بنوہاشم کا ہوا خواہ ہے۔ دو حقیقی بھائی ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے۔ وہ اخوت جو اسلام نے قائم کی اس خانہ جنگی نے توڑ دی۔ یہ ممکن ہے کہ ہر ایک شخص نیک نیتی سے ہاشمیہ و امیہ کی لڑائی میں حصہ لیتا تھا۔ لیکن اس کا انجام کیا ہوا۔ ایک شخص جو ٹھنڈے دل سے ان واقعات پر غور کرتا ہے اور اُس عالیشان زمانہ کو دیکھتا ہے جو صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ کی خلافت میں مسلمانوں کو نصیب ہوا تو کچھ شک نہیں کہ وہ ضرور اس نتیجہ پر پہونچے گا کہ فاروق اعظمؓ کے بعد کوئی ایسا شخص خلیفہ ہونیکے قابل تھا۔ جو بنوامیہ اور بنوہاشم سے نہ ہوتا۔ اگر ایسی صورت ہوتی تو قتل و غارت کی یہ دلخراش داستان جو ہم بیان کر رہے ہیں اور جو نے فی الحقیقت مسلمانوں کی تباہی کا باعث ہوئی نہ سنتے۔ عبید اللہ بن زیاد، مختار ثقفی حجاج بن یوسف اور ابو مسلم خراسانی جن کے مہیب نام سنکر بدن کے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں دنیا میں گمنام اشخاص ہوتے۔

فی زمانہ یہ آرزو کہ کاش حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے بجائے کوئی ایسا شخص خلیفہ ہوتا جیسا کہ پہلے دو اصحاب رسول کریم تھے صرف ہماری ہی دلوں میں نہیں ہے بلکہ "خوارج" کے حالات سے واضح ہوتا ہے کہ یہ خیال اس وقت بھی خاص خاص دماغوں میں پیدا ہو گیا تھا۔ مگر افسوس ہے کہ دلی مدعا پورا کرنے کے لئے خوارج نے ایسی کارروائیاں کیں جو انتہا درجہ تک پہونچ گئی تھیں۔ خانہ جنگی کی آگ چار سال سے مشتعل ہو رہی تھی اور ابھی تک اس کے فرو ہونیکی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ ہزارہا بندگان خدا کا خون پانی کی طرح بہ چکا تھا۔ مگر ابھی تک کچھ فیصلہ نہ ہوا۔

سنہ ۴۰ھ میں مسجد کوفہ میں تین شخص جمع ہوئے۔ اور امیر معاویہؓ۔ عمرو بن العاصؓ اور حضرت علیؓ کے قتل پر آپس میں عہد کیا۔ ان کا خیال تھا کہ یہی تین آدمی ایسے ہیں جن کی ذات سے دنیا، اسلام تباہ ہو رہی ہے اور اگر یہ موجود نہ ہوں تو امن ہے۔ مسلمان جس طرح چاہیں اور جسکو چاہیں خلیفہ بنائیں۔

۱۷ ماہ رمضان اس تجویز پر عمل کرنے کی تاریخ مقرر ہوئی۔

ان میں سے "برک بن عبد اللہ التیمی" تو شام کی طرف اور "عمرو بن بکیر التیمی" مصر کی جانب امیر معاویہؓ اور عمرو بن العاصؓ کو قتل کرنے کے لئے روانہ ہوئے۔ عبد الرحمن ابن ملجم المرادی کوفہ میں تاریخ مقررہ کا انتظار کرنے لگا۔ آخر یوم معہود آ گیا۔ علی الصباح جبکہ مؤذن لوگوں کو نماز کے لئے بلا رہا تھا۔ امیر معاویہؓ مسجد میں داخل ہوئے۔ حاضرین تعظیم کے لئے اُٹھے۔ ان میں برک بن عبد اللہ بھی تھا۔ موقع پاکر تلوار

نکالی کچھ آدمیوں نے بھانپ لیا۔ گرفتار کرنے کے لیے ہاتھ بڑھائے۔ مگر اس نے نہایت سرعت سے امیر معاویہؓ پر وار کیا۔ تلوار شانہ پر پڑی۔ مگر مہلک زخم نہ آیا۔ اسکی پاداش میں برکؒ قتل کیا گیا چند روز علاج کیا گیا۔ اور امیر معاویہؓ کا زخم بالکل بھر گیا مصر میں اس روز عمرو بن العاصؓ بیمار پڑا تھا۔ انکی جگہ خارجہ بن حفتہ العامری امام تھا۔ عمرو بن بکیر نے موقع پاکر تلوار کا ایسا ہاتھ دیا کہ بیچارہ ناکردہ گناہ امام اسی جگہ سرد ہوگیا۔ قاتل گرفتار ہوکر عمرو بن العاصؓ کے سامنے آیا تو اسے اپنی غلطی کا علم ہوا۔ یہ شخص بھی کیفر کردار کو پہنچا کوفہ میں حضرت علیؓ نماز صبح کے لئے دار الامارۃ سے باہر نکلے۔ عبد الرحمٰن گھات میں بیٹھا ہوا تھا جس وقت اس کے قریب آئے ظالم نے اس زور سے وار کیا کہ تلوار دماغ سے کن پٹی تک اتر آئی۔ دو روز تک زندہ رہے اور بروز ہفتہ اس دار ناپائیدار سے انتقال فرمایا۔

امیر معاویہؓ کے لئے میدان خالی پڑا تھا حضرت حسن[21] ابن علیؓ خونریزی سے متنفر تھے۔ اہل عراق اور کوفہ نے جمع ہوکر بہت کچھ اُکسایا کہ امیر معاویہؓ پر فوج کشی کی جائے۔ چار و ناچار گھر سے نکلے۔ امیر معاویہؓ

حاشیہ نمبر ۲۱ — امام حسنؓ حضرت علیؓ کے بڑے بیٹے فاطمہ زہراؓ دختر رسول اللہؐ کے بطن سے تھے۔ مؤرخین نے آپکے خصائل کا تذکرہ کرتے ہوئے ایسی بے تکی ہانکی ہے کہ درایتاً پایہ اعتبار سے ساقط ہے۔ روایتیں مشہور ہیں کہ امام حسنؓ کی طبیعت عیش پسند تھی اور اس لئے بیشمار عورتوں سے نکاح کیا۔ اور طلاق دی۔ یہاں تک ان لغو روایتوں میں مبالغہ کیا گیا ہے کہ خود حضرت علیؓ نے عوام الناس میں اعلان کر دیا تھا کہ کوئی شخص میرے بیٹے کو لڑکی نہ دے۔ ہم ان بیہودہ روایتوں کی تردید نہایت زور سے کرتے ہیں اور اپنے دعوے کی تائید میں انہی خصائل حسنہ کو پیش کرتے ہیں جو امام موصوف کی ذات ستودہ صفات میں بدرجہ اولیٰ بالاتفاق موجود تھے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ یہ بزرگ جو رسول کریم کا نواسہ اور حضرت علیؓ کا بیٹا تھا۔ ایسی حرکات کا مرتکب ہوتا جو سراسر ان خصائل حسنہ کے مخالف اور متضاد ہیں؟ امیر معاویہؓ کے ساتھ امام حسنؓ کا معمولی شرائط پر صلح کرنا اور خویش و اقارب کی طعن اور تشنیع کا مورد بننا۔ مؤرخین کو ضرور مغالطہ میں ڈالتا ہے کہ امام حسنؓ طبعاً عیش پسند اور آرام طلب تھے۔ یہ تواریخی واقعات جنکی صحت سے انکار نہیں ہوسکتا۔ ہماری رائے میں آنجناب کی وقعت کو اور بھی بڑھا دیتے ہیں یہ دوراندیشی جس کا ثبوت امام حسنؓ نے دیا ان کی طبعی نیکی کی زبردست دلیل ہے۔ وہ ان واقعات سے جو حضرت علیؓ کو پیش آچکے تھے۔ اور ان نتائج سے جو ان سے پیدا ہوئے یا ہوسکتے تھے بخوبی واقف تھے۔ وہ ناکامیابی اور وہ بے فائدہ خونریزی جو بنو ہاشم

بھی افواج شام کے ساتھ عراق کی سرحد پر آئے - اور منتظر تھے کہ حضرت حسنؓ اس جگہ تک استقبال کے لئے آئیں - امام حسنؓ مداین میں کسریٰ کے کوشک سفید میں اُترے - لوگوں نے بہت کچھ کہا - مگر

کی کوششوں کا انجام تھا - ایسے اُمور تھے جنہیں امام حسنؓ سا دوراندیش آدمی نظرانداز نہیں کر سکتا تھا - اور یہ بھی اِس لئے کہ وہ خودغرض نہ تھے اور اخوت اسلامی نے انہیں صلح جو اور امن پسند بنا دیا تھا - آج ہم ٹھنڈے دل سے اوس پُرآشوب زمانہ کے واقعات پر غور کرتے ہوئے - امام حسنؓ کی دُور اندیشی اور صلح جو اور امن پسند طبیعت کی تعریف کرتے ہیں - اگر وہ بے وفا کوفیوں اور دیگر غدار عراقیوں کی باتوں میں آکر طرح جنگ دیتے تو کچھ شک نہیں کہ مزید خونریزی کے بعد ایسے نتیجہ پر پہونچتے جس کا علم انہیں بخوبی تھا - وہ صلح پر مجبور ہوتے لیکن ایسی صلح پر جس میں کچھ عزت نہ تھی اور جسکی شرائط مخالف فریق کی رائے وضع کرتی - ہماری رائے میں امام حسنؓ کو جیسی اسلام اور مسلمانوں سے ہمدردی تھی اور سچی ہمدردی تھی اس کا نظیر اوس زمانہ میں کیا اسکے بعد آج تک ایسا نظر نہیں آتا - یہ ممکن ہے کہ وہ سپاہی نہ تھے - لیکن عبداللہؓ بن زبیرؓ سے بڑھکر مدبر تھے ایک دوراندیش آدمی جسکی صائب رائے گذشتہ اور موجودہ واقعات سے نتایج اخذ کرتی ہے اور آیندہ حالات کا یقینی علم حاصل کرتی ہو ایک ایسا "مدبر" ہے جسکی وقعت سیاسی دنیا میں مسلّمہ ہو - ان لوگوں کی فہرست میں امام حسنؓ کا نام نامی بھی ہے اسکے ساتھ جب ہم ان اُمور پر غور کرتے ہیں کہ کس طرح آنجناب نے ذاتی خواہشات کو امن خلائق کی نذر کر دیا تو یہ وقعت اس درجہ بڑھ جاتی ہے - آل رسُول اور اولاد علیؓ کے فخر کا باعث ہو؛

طبری نے ان واقعات کو جو امام حسنؓ کی بیعت سے تعلق رکھتے ہیں - اگرچہ بالتفصیل بیان نہیں کیا لیکن جو کچھ لکھا ہے کافی ہے اور اُن اُمور پر روشنی ڈالتے ہیں جو امام حسنؓ کے خصائل کے ضمن میں بیان کئے ہیں بقول طبری حضرت علیؓ کی تجہیز و تکفین کے بعد اہل کوفہ اور عراق نے ہجوم کیا اور امام حسنؓ کے دست حق پرست پر بیعت کی - اور شام پر فوج کشی کی استدعا کی - امام حسنؓ نے صاف انکار کر دیا اور اہل عراق کو مخاطب کر کے کہا کہ "لوگو میرا دل تمہاری حرکتوں سے سرد ہو گیا ہے - جو کچھ تم نے میرے باپ سے سلوک کیا وہ مجھ سے پوشیدہ نہیں - اور اب جس طرح مجھے خراب کرنا چاہتے ہو اسکا علم مجھے بخوبی ہے - وہ زخم جو تمہارے ہاتھ سے مجھے پہونچے ہیں ابھی ہرے ہیں اور ان کے اندمال کی توقع تمہاری تدبیروں سے نہیں ہو سکتی - میں تمہاری بیعت سے بیزار ہوں - میرے لئے معاویہ کی بیعت کرنا بہ نسبت اسکے بہتر ہے کہ تم میرے ہاتھ پر بیعت کرو"-
اس کے بعد امام حسنؓ نے امیر معاویہؓ سے بیعت کی اور دیگر فرزندان امیر المومنین علیؓ نے بھی بیعت کی -

ایک نہ سُنی۔ اور امیر معاویہؓ کو صلح کا پیغام دیا۔ معمولی شرائط پر صلح ہوگئی۔ اور امیر معاویہؓ کل دنیاء اسلام پر بلا شرکت غیرے قابض ہوگیا"۔

لیکن امام حسینؓ نے انکار کر دیا۔ امام حسنؓ نے سختی سے کہا کہ "بیعت کرو"۔ چارہ ناچار بیعت کی۔ ان واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ امام حسنؓ نہایت دوراندیش تھے اور مسلمانوں کے لئے صلح اور امن پسند کرتے تھے۔

شرائط صلح میں ایک شرط یہ تھی کہ امیر معاویہ پانچہزار درم جو اس وقت کوفہ کے بیت المال میں تھے امام حسنؓ اور اُن کے لواحقین کو دیگا۔ اور شہر واراب کا سالانہ خراج (ایک لاکھ درہم) ہر سال امام حسنؓ کو دیگا۔ طبری نے لکھا ہے کہ امام حسنؓ نے یہ شرط اس واسطے لگادی تھی کہ حضرت علیؓ نے وراثت میں صرف آٹھ سو درم (۸۰۰) چھوڑا تھا جو امام حسنؓ اور دیگر مستحقین وراثت کے لئے کافی نہ تھا۔ امام حسنؓ نے اس خیال سے کہ مبادا فقر و فاقہ کی نوبت پہنچ جائے۔ سالانہ وظیفہ لینا منظور کر لیا۔ ہماری بھی یہی رائے ہے کہ اگر امام حسنؓ کو وراثت میں کافی روپیہ ملتا تو یہ جوانمرد سالانہ وظیفہ کی بھی پرواہ نہ کرتا۔ اگرچہ اس قسم کے وظائف عام مسلمانوں کو حسن خدمت یا کسی اور وجہ سے ہمیشہ ملا کرتے تھے۔

ایک اور شرط جو بعض مورخین نے اس عہدنامہ کا جزو اعظم قرار دی ہے اور جسے طبری اور بعض مورخین نے نہیں لکھا یہ ہے کہ امیر معاویہؓ اور امام حسنؓ کے مابین یہ عہد ہوا تھا کہ ان دونوں میں سے جو شخص دوسرے کی موت کے بعد زندہ رہے وہ بلا شرکت غیرے کل مقبوضات اسلام کا مالک ہوگا۔ یہ ایک ایسی شرط ہے جس پر ہم تنقیدی بحث کرنا چاہتے ہیں۔ اس شرط کی صورت یہ ہے کہ:-

(۱) امام حسنؓ نے امیر معاویہؓ کے ہاتھ پر بیعت کی اور خلافت ان کے ہاتھ میں دیدی۔ (۲) امیر معاویہؓ تاحین حیات خلیفہ رہیں۔

(۳) اگر امام حسنؓ کی زندگی میں امیر معاویہؓ کا انتقال ہو جائے تو وارث خلافت امام حسن ہونگے۔

(۴) بصورت دیگر امیر معاویہؓ خلافت پر بحال رہیں گے۔

یہ چار شقیں اس شرط عہدنامہ کی ہیں۔ بلحاظ اُن واقعات کے جو اس زمانہ میں تاریخی حیثیت رکھتے ہیں ہم بلا تامل کہہ سکتے ہیں کہ یہ اختراع ہے اور فی الحقیقت کوئی ایسی شرط عہدنامہ میں نہ تھی۔ امیر معاویہؓ کو حضرت علیؓ پر نمایاں کامیابی ہوئی تھی جس کا تذکرہ ہم کر چکے ہیں اور بنی امیہ کا اقتدار اور طاقت تقاضا کرتی تھی کہ انہیں کامیابی ہو۔ اور اگر اس کامیابی کے بعد امیر معاویہؓ اس شرط پر بنو ہاشم سے صلح کی خواہش کرتے تو ہرگز توقع نہیں ہو سکتی کہ بنو امیہ رضامند ہوتے۔ جو دولت انہیں بزور شمشیر اور ذاتی غلبہ کے باعث نصیب ہوئی تھی وہ کبھی پسند نہ کرتے کہ اس طرح بغیر جد و جہد ان کے ہاتھ سے نکل جائے۔ امیر معاویہؓ عمر میں امام حسنؓ سے بڑے تھے اور یہ امید ہو سکتی

فصل چہارم

"خلافت"

جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کیا تو ملایکہ سے ارشاد فرمایا کہ "اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً" ملایک نے دریافت کیا کہ "اَتَجْعَلُ فِیْھَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْھَا وَیَسْفِکُ الدِّمَآءَ ۔ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِکَ وَنُقَدِّسُ لَکَ" اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ "اِنِّیْ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ" اسکے بعد لکھا ہے کہ "وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ کُلَّھَا ثُمَّ عَرَضَھُمْ عَلَی الْمَلٰٓئِکَۃِ فَقَالَ اَنْبِئُوْنِیْ بِاَسْمَآءِ ھٰٓؤُلَآءِ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ"

مذکورہ بالا آیات سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو۔ ارض، میں اپنا خلیفہ یا نائب بنایا اور

تھی کہ قدرتاً ملک الموت کی نگاہ پہلے عمر رسیدہ پر پڑی۔اس حالت میں کیا بنوامیہ پسند کرتے کہ امارت بنوہاشم میں منتقل ہو اور امیر معاویہ اور امام حسنؑ ان حالات سے بیخبر تھے۔امیر معاویہؓ سے کبھی توقع نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ اپنی موت کو ایک سخت خونریزی کا باعث بنائے یا بنوامیہ کو انہیں مشکلات میں چھوڑ جائے جن کو رفع کرنے میں اس نے جان توڑ کوششیں کیں اور تمام عمر صرف کر دی۔امام حسنؓ بھی ایسے بھولے بھالے سیدھے سادے آدمی نہ تھے کہ ان حالات کو نظر انداز کر کے صرف اس امید پر ادھار کھا کر بیٹھ رہتے، کہ غالباً عنان خلافت ایک دن اُن کے ہاتھ میں ہوگی۔انہیں بخوبی علم تھا کہ بنوامیہ کے اقتدار کے اسباب کیا ہیں۔وہ اچھی طرح واقف تھے کہ نہ صرف شام بلکہ تقریباً کل خالص عرب امیہ کے پشت پناہ تھے۔اور کوفی اور عراقی پرلے درجہ کے بے وفا اور بودے ہیں۔کبھی ممکن نہیں کہ بنوہاشم کو اس صورت میں کامیابی ہو۔اور اس وقت کچھ کام نہ بنا جب حضرت علیؓ کے علم کے نیچے صحابہ کرام کی ایک جماعت اور عراقی طاقت جمع تھی۔جبکہ بنوہاشم کا اقتدار بنوامیہ کا حریف تھا۔اس حالت میں جبکہ انکی اپنی طاقت بہت کمزور ہو گئی تھی اور بے وفا عراقیوں کی ہواخواہی ناقابل اعتماد تھی کب امید ہو سکتی ہے کہ امام حسنؓ کے دل میں یہ خوش کن خیال باقی تھا کہ صلح و آشتی کے ذریعہ بنوہاشم مالک خلافت ہو سکتے ہیں۔ہماری رائے میں وہ خلافت سے اس وقت دست بردار ہوئے جب دور اندیشی نے آیندہ واقعات کا حال ان پر آئینہ کر دیا۔

اسی لئے انسان اشرف المخلوقات ہے - اس امر کے متعلق زیادہ بحث کی ضرورت نہیں کہ انسانی وجود
اللہ تعالیٰ نے زمین میں ایسا مخلوق کیا ہے جو تمام دیگر ارضی مخلوقات سے اشرف ہے - اللہ تعالیٰ کے اسماء
اور آدم کے اسماء صفاتی ایک ہی ہیں - خواہ یہ اسماء مشروطی ہوں یا ثابت لیکن دیگر مخلوقات ارضی میں

اس وقت تک امیر معاویہؓ کا قبضہ مصر و شام اور دخل عرب و عراق کے ایک حصہ پر ہو چکا تھا - اور اگر امام حسنؓ صلح کیطرف مایل نہ ہوتے تو یقیناً یہ حصہ ملک بھی ان کے ہاتھ سے نکل جاتا - ہم یہ نہیں کہتے کہ امام حسنؓ نے مجبوراً صلح کی - لیکن یہ ضرور کہیں گے کہ اگر وہ نہ کرتے تو مجبوراً کرنی پڑتی - ان واقعات اور حالات کے لحاظ سے یہ شرط جس کا ذکر ہم اوپر کر چکے ہیں بالکل بے معنی ہے اور ایسے عہدنامہ کا جزو نہیں ہو سکتی جو امام حسنؓ اور امیر معاویہؓ یا بنو ہاشم اور بنو امیہ کے درمیان ہوا - قیاس ہو سکتا ہے کہ یہ عہدنامہ فی الحقیقت دو قبیلوں میں نہیں ہوا بلکہ ایسے دو شخصوں میں ہوا ہے جو دعویدار خلافت تھے - اور اس لئے ان میں سے ہر ایک کی اغراض اپنی ذات تک محدود تھیں - یہ غلط ہے - اور ان واقعات کے رو سے غلط ہے جو بالاتفاق صحیح ہیں اور جن کا تذکرہ ہم کر چکے ہیں - اور علاوہ ازیں استحقاق خلافت کا فیصلہ دو شخصوں کے عہد و پیمان پر نہیں ہو سکتا تھا جیسا کہ ہم آیندہ فصلوں میں ثابت کرینگے - کیونکہ بنو امیہ بنو ہاشم کے غلبہ کو کبھی پسند نہیں کر سکتے تھے -

حضرت علیؓ کے بعد امام حسنؓ کا جانشین ہونا ایک واضح دلیل اس دعویٰ کی ہے کہ فریقین خلافت کو وراثت بنا رہے تھے -

اور آپ کے بعد حضرت امام حسینؓ کا خروج مزید ثبوت اس دعویٰ کا ہے - اور اس میں تو کچھ کلام ہی نہیں کہ بنو امیہ نے خلافت کو وراثت بنا کر چھوڑا - اس لئے اگر کچھ جھگڑا تھا تو دونوں قبیلوں میں تھا -

ایک اور واقعہ جسے تنقیدی نظر شک و شبہ سے دیکھتی ہے - امام حسنؓ کی وفات کے متعلق ہے - روایت ہے کہ آپ کو زہر دیا گیا اور زہر دینے والا آپ کی بیوی جعدہ بنت اشعث بن قیس تھی - مؤرخین جو اس روایت کو نقل کرتے ہیں ابن اثیر اور علامہ جلال الدین سیوطی اور طبری وغیرہ ہیں - طبری لکھتا ہے کہ :-

" جب حسنؓ معاویہؓ سے بیعت کر چکے تو مؤخر الذکر آپ کی ہلاکت کی فکر میں ہوا - اسماء بنت الاشعث بن قیس کو کہلا بھیجا کہ اگر حسنؓ کو زہر سے ہلاک کر دو تو تمہارا نکاح اپنے بیٹے یزید سے کر دونگا - اسماء راضی ہو گئی تو ایک کپڑا زہر آلود بھیجدیا - جس وقت حسنؓ غسل سے فارغ ہوئے تو اس کپڑے سے بدن صاف کیا - زہر جسم میں سرایت کر گیا - دو دفعہ پیشتر زہر دیا گیا تھا یہ تیسری دفعہ تھی مگر اب کے جانبر نہ ہو سکے - اور بعض کہتے ہیں کہ معاویہ نے زہر آلود شربت

یہ بات نہیں پائی جاتی۔ آدم کا سمیع و بصیر۔ حکیم و علیم و قدیر و مرید وغیرہ ہونا بدیہی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ "آدم" اسی واسطے خلافت کا مستحق ٹھہرا کہ اس میں اللہ تعالیٰ کے صفات موجود ہیں۔ اس لئے ہم اسے ایک اصول خلافت قرار دیتے ہیں کہ نائب میں منیب کے اوصاف کی موجودگی نہایت ضروری ہے۔ انکی

بھیجا تھا۔ حضرت امام حسنؓ کی وفات ۵۱ھ ماہ شعبان میں ہوئی۔ "واللہ تعالیٰ اعلم"

ابن اثیر اس واقعہ کو اس طرح لکھتا ہے کہ:—

"حضرت حسنؓ کی تاریخ وفات میں اختلاف ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ۴۹ھ میں بعض ۵۰ھ میں اور بعض ۵۱ھ میں تاریخ وفات بیان کرتے ہیں۔ سبب یہ ہوا کہ ان کی بی بی جعدہ بنت اشعث نے زہر ملادیا تھا۔ چالیس دن تک اسہال آتے رہے اور اسی سے وفات ہوگئی۔ جب ان کا مرض بڑھ گیا تو اپنے بھائی حسینؓ کو کہا کہ مجھے تین مرتبہ زہر ملایا گیا مگر اب کی دفعہ ایسا ہلاہل ہے کہ جگر کے ٹکڑے ٹکڑے ہوگئے ہیں۔ حضرت حسینؓ نے پوچھا کہ کس نے زہر ملایا تو کہا کہ تم کیوں پوچھتے ہو۔ کیا تم ان لوگوں سے لڑنا چاہتے ہو۔ میں انہیں اللہ عزوجل کے حوالہ کرتا ہوں۔"

علامہ جلال الدین سیوطی لکھتے ہیں کہ:—

"آپکی شہادت ۴۹ھ میں اور بقول بعض راویان ۵ ربیع الاول ۵۰ھ میں واقع ہوئی۔ آپکی بیوی جعدہ بنت الاشعث نے یزید کے وعدہ نکاح پر زہر دیدیا تھا۔ حضرت امام حسینؓ نے بہت دفعہ پوچھا کہ کس نے زہر دیا ہے مگر آپ نے نہ بتایا اور فرمایا کہ جس پر میرا شبہ ہے اگر وہی شخص میرا قاتل ہے تو اللہ تعالیٰ سخت انتقام لینے والا ہے ورنہ میرے واسطے کوئی کیوں قتل کیا جائے۔"

ہم نے عبارت اس واسطے نقل کردی ہے کہ جو کچھ اختلاف ان مؤرخین میں ہے وہ ظاہر ہوجائے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اگر حضرت امام حسنؓ کو زہر دیا گیا تھا تو یہ امر کہ کس شخص نے زہر دیا۔ ایک راز سربستہ ہی رہا۔ فی الحقیقت نہ امام حسنؓ کو اور نہ کسی اور شخص کو معلوم ہوا کہ یہ شرارت کس شخص کی ہے۔ آپ کی بیوی اور امیر معاویہ اور یزید پر محض تہمت یا شبہ ہے۔ طبری کی نسبت تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اسکی تحریر بالکل غلط ہے۔ اور غالباً اس کا اپنا بیان نہیں بلکہ زمانہ مابعد کی ایزاد ہے۔ اور اگر اسکی ذاتی رائے بھی یہی ہو تو بھی ناقابل اعتبار ہے۔ معاویہ کو امام حسنؓ سے کچھ پرخاش نہ تھی وہ خود اسکے ہاتھ پر بیعت کرچکے تھے اور وہ دیگر ہوا خواہان کو بھی بیعت پر مجبور کیا تھا۔ اگر معاویہ کو کچھ خیال تھا تو اس صورت میں ہوسکتا تھا اگر اسکے بعد امام حسنؓ وارث تخت و تاج ہوتے

عدم موجودگی میں استحقاق خلافت ثابت نہیں ہوتا۔

قرآن شریف کی دوسری آیت جس سے ہم خلافت زیر بحث کے متعلق استدلال کرنا چاہتے ہیں یہ ہے کہ :-

"قل اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول، فان تولوا فانما علیہ ما حمل و علیکم ما حملتم، و ان تطیعوہ تھتدوا، و ما علی الرسول الا البلاغ المبین، وعد اللہ الذین امنوا منکم و عملوا الصلحت لیستخلفنھم فی الارض کما استخلف الذین من قبلھم و لیمکنن لھم دینھم الذی ارتضی لھم و لیبدلنھم من بعد خوفھم امنًا یعبدوننی لا یشرکون بی شیئًا، و من کفر بعد ذلک فاولئک ھم الفاسقون"۔

مگر ہم ثابت کر چکے ہیں کہ طبری نے اس کا تذکرہ نہیں کیا اور عہدنامہ میں ایسی کوئی شرط نہیں تھی۔ یزید اگر قاتل تھا تو اسکو بھی اسی صورت میں امام حسنؓ کی ہلاکت مدنظر ہو سکتی تھی جب معاویہ کے انتقال کے بعد وہ تخت و تاج سے محروم رہتا۔ مگر یہ صورت ہی نہ تھی۔ اس لئے خواہ مخواہ معاویہ اور یزید کو قاتلان امام حسنؓ سمجھنا غلطی ہے۔ اور سب سے زیادہ شرمناک یہ امر ہے کہ آپ کی بیوی کو خائن اور قاتل قرار دیا جاتا ہے کچھ بعید نہیں ہے ان مؤرخین سے کہ بلا تامل ایسی ایسی بے سروپا روایتوں کو تاریخی واقعات کا رتبہ دیں جو امام حسنؓ کو شہوت پرست اور کیا کچھ کہتے ہوئے نہیں شرماتے۔ چنانچہ لکھتے ہیں کہ :-

"امام حسنؓ نے نوے عورتوں سے نکاح کیا تھا۔ عورتیں آپ پر عاشق ہو جایا کرتی تھیں۔ آپکی اس عادت سے یہاں تک اندیشہ پیدا ہو گیا تھا کہ قبائل کی آپسمیں عداوت نہ پڑ جائے۔ اور آپ طلاق بہت دیا کرتے تھے۔ سوا اُس کے جسکو آپ سے محبت ہو جاتی۔ حضرت علیؓ کو اہل کوفہ سے کہنا پڑا کہ میرے بیٹے کو لڑکیاں نہ دو وہ طلاق بہت دیا کرتے ہیں لیکن اہل ہمدان نے کہا خواہ کچھ ہو وہ طلاق دیں یا نہ دیں ہم سے یہ تو نہیں ہو سکتا کہ اپنی لڑکیاں ان کے نکاح میں نہ دیں"۔

ان مؤرخین کو اتنا تو معلوم نہیں کہ حضرت امام حسنؓ کب فوت ہوئے۔ طبری ماہ شعبان ۴۹ھ اور ابن اثیر ۴۹ھ یا ۵۰ھ یا ۵۱ھ اور علامہ جلال الدین سیوطی ۴۹ھ یا ربیع الاول ۵۰ھ لکھتا ہے۔ اس واقعہ کی صحت اور ان مؤرخین کی رائے یا روایت کا موازنہ اسی سے ہو سکتا کہ صحیح تاریخ وفات کا علم نہیں۔ اور اسپر طرہ یہ کہ خود لکھتے ہیں کہ امام حسنؓ نے کسی شخص کا نام نہیں لیا۔ کہ وہ میرا قاتل ہے اور

"اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ اے محمدؐ کہدو کہ اللہ اور اس کے رسُول کی اطاعت کرو اور اگر لوگ اللہ اور اسکے رسُول سے روگردانی کرینگے تو ہر ایک شخص کی ذمہ داری اپنی اپنی ذات تک محدود ہے۔ رسُول کا کام تو صرف تبلیغ ہے اور اسکی ذمہ داری کی حد بھی یہیں تک ہے کہ اسنے احکام آلہی اور ارشاد خداوندی کو علی الاعلان لوگوں تک پہنچادیا۔ اب اگر لوگ نہ مانیں اِس کے جواب دہ وہ خود ہیں اِن میں سے جو آدمی اللہ اور رسُول کے مطیع ہیں یعنی مومن اور ایسے صالح ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ جس طرح اون سے پہلے لوگ خلیفہ ہوئے اسی طرح ان کو بھی دنیا میں خلیفہ بنائے گا۔ اور جب ان کو خلافت ملیگی تو یہ دین (الاسلام) جو اِن کے لئے پسند کیا گیا ہے اِس طرح قائم کر دیا جائیگا کہ اسکی بنیاد مضبوط ہو جائیگی اور موجودہ خوف و خطر جو انہیں لاحق ہے وہ زائل ہو جائیگا وہ امن میں ہونگے۔ اور اللہ تعالیٰ کی عبادت میں کسی غیر اللہ کو شریک نہ کرینگے۔ اسپر اگر کسی نے کفر کیا تو وہ فاسق ہے۔"

ہم نے اِن آیات کا ترجمہ مشرح بیان کر دیا ہے۔ ان سے واضح ہوتا ہے خلافت سے پیشتر مسلمانوں پر ایک ایسا زمانہ آیا تھا کہ وہ گنتی کے آدمی تھے اور کفار کا یہ غلبہ تھا کہ بیچارے مذہبی فرائض بحالت امن ادا نہیں کر سکتے تھے۔ مشرکین انہیں اجازت نہیں دیتے تھے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی توحید بیان کریں اور شرک سے نفرت ظاہر کریں اس وقت جو کچھ مسلمانوں کی حالت تھی اسے یاس سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے

یہ بھی معلوم نہیں کہ زہر کس طرح دیا گیا۔ ان حالات پر غور کرنے سے ایک منصف مزاج شخص کہہ سکتا ہے کہ اصل واقعہ پر کیا کچھ حاشیہ چڑھایا گیا ہے۔ اور اسے کس رنگ میں ظاہر کیا گیا ہے۔ ہماری رائے میں امام حسنؑ کو زہر نہیں دیا گیا اور نہ آپ مسموم ہوئے۔ مرض اسہال موت کا باعث ہوا۔

آپ نہایت حلیم اور منکسر المزاج متین اور کریم النفس اور خونریزی سے سخت متنفر تھے۔ آپ کی وہ تقریر جو خلع خلافت کے وقت آپنے فرمائی آب زر سے لکھنے کے قابل ہے۔ فرمایا کہ:۔

"اے لوگو اللہ تعالیٰ نے تمہیں ہمارے بنی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ ہدایت کی اور میرے ذریعہ تمہاری جانوں کی حفاظت کی۔ یاد رکھو سب سے زیادہ عقلمندی تقویٰ ہے اور نادانی بدکاری ہے۔ یہ معاملہ جو معاویہ اور ہمارے درمیان اختلاف کا باعث ہوا تھا ہمارے دونوں کے حقوق کے متعلق ہے اِس لئے یا تو وہ مجھ سے زیادہ حقدار ہیں یا میں انسے زیادہ حق رکھتا ہوں۔ اگر میرا حق ہے تو مینے اللہ عزوجل اور امتِ محمدی کی اصلاح اور تمہاری جانوں کی حفاظت کے لئے ترک کر دیا ہے۔"

اس وقت مسلمانوں کو تسلی دی کہ ہم تمہارے واسطے دین اسلام پسند فرما چکے ہیں اور اسے قائم کر کے رہینگے۔ گھبراؤ نہیں وہ وقت آتا ہے کہ کفر و شرک کا استیصال خاطر خواہ ہو جائے گا۔ اور تم امن چین سے عبادت کرو گے اور جس طرح تم سے پیشتر دنیا پر اقوام کا غلبہ رہا ہے اسی طرح تم بھی غالب آؤ گے"۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ نظیرًا ان اقوام یا اشخاص کو پیش کیا گیا ہے جو مسلمانوں سے پیشتر حکمران تھیں اور نتیجہ یہ ہے کہ قانون قدرت یہ ہے کہ وہی قوم یا افراد قوم غلبہ حاصل کرتے ہیں جو ان اوصاف سے متصف ہوں جن کا تذکرہ جا بجا قرآن شریف میں کیا گیا ہے۔ مثلاً بنی اسرائیل کی ابتدائی حالت کیا تھی۔ کس طرح ان کے ترقی کے اسباب جمع ہوئے۔ اور پھر ان کا عروج کیسا ہوا۔ حضرت موسٰی اور رسول اللہ کے حالات بہت مشابہ ہیں اس لئے توریت اور قرآن شریف میں آپ کو مثیل موسٰی لکھا ہے۔ غالباً "کما استخلف الذین من قبلھم" سے مراد بنی اسرائیل ہی ہیں۔ اگر دیگر اقوام کی طرف اشارہ بھی ہو تو بعید نہیں۔ بہر حال مسلمانوں کو ان اقوام کی ابتدائی حالت کی طرف متوجہ کیا ہے۔ بنی اسرائیل ابتداءً مصر میں قبطیوں کے غلام تھے اور نہایت ذلیل اور مسکین تھے۔ ان غریبوں پر جو کچھ ظلم و ستم حکمران قوم نے روا رکھا تھا وہ تواریخی واقعات ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انکی فریادرسی اور ان میں سے حضرت موسٰی کو پیدا کیا۔ اگر حضرت موسٰی کی پرورش بنی اسرائیل کے ہاتھ میں ہوتی تو کچھ شک نہیں کہ قدرتًا وہ بھی پست خیال اور حوصلہ کے آدمی ہوتے اور وہی غلامی اور ذلت ان کے نصیب ہوتی جو ان کے بھائی بندوں کے حصہ میں آئی تھی۔ مگر اسباب کچھ ایسے جمع ہو گئے کہ انکی پرورش اور تعلیم کا کفیل شاہی خاندان ہو گیا۔ وہ تمام اوصاف جو ایک حکمران قوم میں پائے جاتے ہیں حضرت موسٰی کی ذات میں موجود ہو گئے۔ اور قدرتًا جو کچھ ہمدردی انہیں بنی اسرائیل سے تھی تقاضا کرتی تھی کہ حضرت موسٰی اپنے بھائی بندوں کو قید غلامی سے آزاد کرنے کی کوشش کریں۔ بالآخر وہ کامیاب ہوئے اور بنی اسرائیل شام پر قابض ہو گئے۔ اسی طرح مسلمان جنکی ابتدائی حالت بنی اسرائیل سے بہت مشابہ ہے بلکہ ان سے زیادہ ذلت اور مسکنت کے ساتھ زندگی بسر کر رہے تھے آخر مثیل موسٰی انہیں اس جگہ سے نکال لائے۔ اور یثرب کی طرف ہجرت کی۔ رفتہ رفتہ انہیں تقویت ہوتی گئی اور لوگ "دین اللہ" میں بکثرت داخل ہونے لگے۔ اسکا انجام یہ ہوا کہ اسلام اور مسلمانوں کا

کیسا عالی شان اور کیسا عالی ہمت یہ شخص تھا جس کا نظیر دنیا میں نہیں ملتا آپ کی تقریر کیسا اچھا سبق ہے ان لوگوں کے لئے جو ذاتی اغراض پر قوم کی بہبودی کو مقدم سمجھتے ہیں"۔

غلبہ کفر اور کفار پر خاطر خواہ ہوگیا۔ اگرچہ کافروں اور مشرکوں کو برا معلوم ہوا لیکن حق کے سامنے باطل جاتا رہا اور اسلام عرب کا مذہب ہوگیا؛

جس طرح آدم اللہ تعالیٰ کا خلیفہ زمین پر ہے اور آدم کی ذات میں صفات الٰہی کا جلوہ نظر آتا ہے اسی طرح نبیؐ کا خلیفہ ایک ایسا مسلمان ہونا چاہئے جسکی ذات میں اوصاف نبوی پائے جائیں۔ آدمؑ کو وہ رتبہ کبھی حاصل نہیں ہو سکتا جو اللہ تعالیٰ کے لئے مخصوص ہے اور خلفا کو رسول اللہ کا درجہ نہیں مل سکتا۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ خلیفۃ اللہ میں صفات الٰہی اور خلیفہ نبی میں اوصاف نبوی ہوں؛ اگر صرف تسبیح وحمد تقدیس مقصود ہوتی تو ملائک سے بڑھکر خلافت کا مستحق کون ہو سکتا تھا۔ اور اگرچہ وہ ان اوصاف میں ممتاز بھی ہیں مگر معلوم ہوتا ہے کہ خلافت کے واسطے حضرت انسان ہی کی ذات تھی؛

نہ صرف بہ حیثیت مذہب بلکہ ہر ایک پہلو سے خلافت کا مستحق اُسی شخص کو سمجھنا چاہئے جو اپنے زمانہ میں بہترین خلائق ہو۔ استخلاف یا وصیت یا شوریٰ استحقاق خلافت نہیں ہیں اور نہ ان سے ایسا حق ثابت ہوتا ہے۔ یہ انتخاب کے ایسے طریقے ہیں جنھیں ضرورتاً مسلمانوں کو استعمال کرنا پڑا۔ فی الحقیقت کوئی شخص خلافت کا اس واسطے مستحق نہیں ٹھہرتا کہ عام لوگوں نے اسکی خلافت پسند کی یا کسی خلیفہ نے وصیت کی کہ میرا جانشین فلاں شخص ہوگا یا چند آدمیوں نے مل کر ایک آدمی کو منتخب کر لیا خواہ وہ آدمی نہایت اعلیٰ پایہ کے ہوں اور انکی قدر و وقعت مسلمہ ہو۔ بلکہ یہ کلیہ اصول انتخاب بھی نہیں ہیں۔ انکا مدار صرف ضرورت وقت پر ہے اور چونکہ ضرورتیں بے شمار ہیں اس لئے ان میں بھی تغیر و تبدل ہو سکتا ہے اور ہونا چاہئے۔ استخلاف اور وصیت اور شوریٰ میں بھی طرز انتخاب کے لحاظ سے اختلاف موجود ہے اس اختلاف کی وجہ صرف ضرورت ہی تھی۔ فی الحقیقت استحقاق خلافت کو اس سے کچھ تعلق نہیں اور اس لئے ہم اس امر کے قایل نہیں کہ خلافت کا استحقاق یا خلیفہ کا انتخاب ان تینوں میں سے کسی ایک پر منحصر ہے۔ ہم یہ بھی تسلیم نہیں کرتے کہ یہی یا انمیں سے ایک طرز انتخاب احسن ہو۔ سب سے بہتر وہی طرز و طریقہ انتخاب اصولاً ہو سکتا ہے جو بہ لحاظ ضرورت اختیار کیا جائے؛

ہماری رائے میں خلفاء کے انتخاب کی بنیاد اون کے استحقاق پر تھی۔ اگرچہ یہ انتخاب مختلف طرز کا تھا اور ضرورتاً اختلاف واقع ہوا لیکن اس میں کچھ شک نہیں کہ وہ مستحق خلافت تھے۔ اور اپنے اپنے زمانہ میں بہ لحاظ اوصاف متذکرہ بالا اشرف اور سب سے بہتر تھے۔ صدیق اکبرؓ کا انتخاب اس لئے ہوا

کہ وہ سب سے بہتر شخص تھے۔ حضرت عمرؓ کا یہ کہنا کہ لوگوں نے ابوبکرؓ کو اس واسطے خلیفہ منتخب کیا کہ اسوقت ان سے بہتر کوئی دوسرا شخص نظر نہیں آتا تھا بالکل بجا ہے۔ ضرورت نہیں کہ ہم واقعات کو بالتفصیل بیان کریں۔ یہ دلیل کافی ہے کہ رسول اللہ کے بعد وہی شخص آنحضرتؐ کا نائب منتخب ہو سکتا تھا جو سب سے بہتر شخص تھا اور جس میں رسول کریم کے اوصاف حسنہ پائے جاتے تھے۔ اور بہ نسبت دیگر اشخاص کے بہتر پائے جاتے تھے۔ لوگ کبھی ابوبکرؓ کی خلافت پر متفق نہ ہوتے اگر وہ اس کے مستحق نہ ہوتے حسان بن ثابت نے چند شعروں میں اس امر کو بخوبی واضح کیا ہے کہ ابوبکر ہی سب سے زیادہ مستحق خلافت تھے؛

اذا تذکرت شجوا من اخی ثقۃ	جب تم اپنے کسی پرہیزگار بھائی کی مصیبت یاد کرو تو چاہئے۔ کہ
فاذکر اخاک ابابکر بما فعلا	ابوبکرؓ کے حالات پیش نظر رکھو؛
خیر البریۃ اتقاھا و اعدلھا	وہ بعد نبیؐ تمام مخلوق سے بہتر اور سب سے زیادہ پرہیزگار اور سب سے زیادہ
بعد النبی و اوفاھا بما حملا	عادل اور سب سے زیادہ اپنے فرائض کو پورا کرنے والے تھے؛
الثانی التالی المحمود مشھد	نبیؐ کے ہمراہ وہ دوسرے شخص تھے جن کا مشہد پسندیدہ تھا۔ اور سب سے
و اول الناس منھم صدق الرسلا	پہلے انہوں نے رسولؐ کی تصدیق کی؛

حضرت عمرؓ کا انتخاب صدیق اکبرؓ کی وصیت کے موافق ہوا۔ مگر صدیق اکبرؓ کی وصیت کی بناء اصحاب رسول اللہ کے مشورہ اور ان کی ذاتی رائے پر تھی؛ صدیق اکبرؓ نے جب اصحاب سے مشورہ کیا تو سب کی رائے یہی تھی کہ عمرؓ ہم میں افضل ہیں۔ ایک شخص نے کہا کہ آپ خدا کو کیا جواب دیں گے کہ عمرؓ جیسے سخت گیر آدمی کو ہم پر خلیفہ کئے جاتے ہیں جواب دیا کہ "انی استخلفت علیھم خیرا اھلک"۔ یعنی میں نے لوگوں پر سب سے بہتر آدمی کو خلیفہ مقرر کیا ہے۔ وصیت نامہ کے یہ فقرات کہ میں نے یہ وصیت دنیا فانی سے جاتے اور دنیا باقی میں داخل ہوتے وقت لکھائی ہے۔ زبردست دلیل صدیق اکبرؓ کی نیک نیتی کی ہے اور آپ کی دعا جو دم واپسین کی کہ "اللھم[۱] انی لم ارد بذلک الا صلاحھم وخفت علیھم الفتنۃ فعملت فیھم بما انت اعلم بہ واجتھدت لھم وایا تولیت علیھم خیرھم و انواھم علیھم واحرصھم علی ما ارشدھم الخ" حضرت عمرؓ کے استحقاق خلافت کی زبردست دلیلیں ہیں۔ آپ کی وفات

[۱] یا اللہ اس کام سے میرا مقصود صرف اصلاح ہے اور مجھے ڈر تھا کہ (اگر میں ایسی وصیت نہ کروں تو) وہ فتنہ میں مبتلا ہو جائینگے اس لئے میں نے یہ کام کیا اور تو خوب جانتا ہے (کہ نیک نیتی سے کیا) میں نے اس امر میں اپنی رای سے کام لیا ہے اور ان پر ایک ایسا شخص حاکم بنایا ہے جو ان میں سب سے بہتر سب سے قوی تر اور سب سے زیادہ نیکی کا حریص ہے الخ"

کا ماتم تمام دنیا اسلام نے کیا۔ کسی نے کیا اچھا کہا ہے:۔

لیبک علی الاسلام من کان باکیا — جو شخص رونے والا ہو اسلام پر رولے۔ کیونکہ قریب ہے کہ وہ حواس

فقد اوشکوا صرعی وما قدم العہد — باختہ ہو جائے اور ان کا عہد ختم ہو گیا ہے۔

وادبرت الدنیا وادبر خیرھا — دنیا الٹ گئی اسکا بہترین آدمی چل بسا۔ وہ شخص ملول ہوگا جو وعدوں

وقد ملھا من کان یوقن بالوعد — پر یقین کئے بیٹھا تھا۔

حضرت عثمانؓ کا انتخاب بذریعہ شوریٰ ہوا جس کا انعقاد حضرت عمرؓ کی وصیت کے مطابق ہوا۔ آپ نے چھ ایسے اشخاص کو مسلمانوں سے منتخب کیا جو مستحق خلافت تھے۔ اور فرمایا کہ "میں کسی شخص کو علیؓ۔ عثمانؓ۔ زبیرؓ۔ طلحہؓ۔ اور سعد بن ابی وقاصؓ اور عبدالرحمٰن بن عوفؓ سے زیادہ مستحق خلافت نہیں سمجھتا۔ میرا بیٹا (عبداللہؓ) ان کے پاس حاضر رہے گا۔ مگر خلافت سے اس کا کچھ تعلق نہ ہوگا اگر سعد کو خلافت ملے تو وہ اسکے قابل ہیں ورنہ جو شخص ان میں سے خلیفہ مقرر ہو وہ ان سے مدد لیتا رہے۔ میں نے سعد کو کسی خرابی یا خیانت کی وجہ سے معزول نہیں کیا تھا"۔

شوریٰ نے حضرت عثمانؓ کو منتخب کیا۔

حضرت عثمانؓ ایسی حالت میں شہید ہوئے کہ اپنے جانشین کے تقرر کی نسبت کوئی وصیت نہ کر سکے اور مسلمان خانہ جنگی میں مشغول ہو گئے۔ اس وقت حضرت علیؓ مسند خلافت پر بیٹھے اور لوگوں نے اور بالخصوص بنو ہاشم نے آپکے ہاتھ پر بیعت کی۔ طلحہؓ و زبیرؓ نے مخالفت کی۔ مگر بذاتہ دعویدار خلافت نہ تھے۔ امیر معاویہؓ اس وقت شام کے گورنر تھے۔ اور ابھی تک دعویٰ خلافت نہ کیا تھا۔ گذشتہ فصلوں میں ہم نے ان واقعات کا ذکر کیا ہے جو مسلمانوں میں خانہ جنگی کا باعث ہوئے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ عام مسلمانوں نے حضرت علیؓ کی خلافت کو قبول نہ کیا۔

یہ ایک ایسا زمانہ تھا جو مسلمانوں کے تنزل کے آغاز کا نشان ہے۔ انتخاب خلیفہ بحالت امن ہوتا ہے۔ اور یہ وقت ایسے انتخاب کے لئے کسی طرح موزون نہ تھا۔ خون عثمانؓ کا مطالبہ صرف بنو امیہ ہی نے نہ کیا بلکہ عام مسلمان اسکی تائید میں تھے۔ تاریخ اسلام میں یہ ایسا واقعہ ہے جس نے انقلاب عظیم پیدا کر دیا۔

حضرت عثمانؓ کی شہادت پر حسان بن ثابتؓ نے کہا:۔

من سرہ الموت صرفا لا مزاج لہ	جسکو خالص موت کے دیکھنے کی آرزو ہو جس میں کسی اور چیز کی
فلیات مادبۃ فی دار عثمانا	امیزش نہ ہو تو اسکو چاہیے کہ عثمانؓ کے گھر جائے۔
ضحوا باشمط عنوان السجود بہ	لوگوں نے ایسے شخص کو ذبح کر ڈالا جسکی پیشانی پر سجدے کے نشان تھے
یقطع اللیل تسبیحا و قرانا	اور وہ تمام رات تسبیح اور تلاوت میں بسر کرتا تھا۔
صبرا فدا لکم امی وما ولدت	اے مسلمانو صبر کرو تم پر میرے والدین اور میں فدا ہو جائیں
قد ینفع الصبر فی المکروہ احیانا	مصیبت کے وقت صبر اکثر نفع دیتا ہے۔
لتسمعن وشیکا فی دیارھم	تم ضرور ان کے شہروں میں تاخت و تاراج کی خبر سنو گے
اللہ اکبر یا ثارات عثمانا	اللہ اکبر عثمانؓ کا انتقام لیا جائے گا۔

اہل شام نے ان اشعار پر بہت کچھ طبع آزمائی کی ایک شعر یہ ہے :-

یا لیت شعری ولیت الطیر تخبرنی	کاش مجھے معلوم ہو جاتا اور کوئی پرندہ مجھے خبر پہنچاتا کہ علیؓ اور
ما کان بین علیؓ و ابن عفانا	عثمانؓ کے درمیان کیا واقعات پیش آئے۔

بہر حال جیسا کہ ہم بیان کر آئے ہیں خون عثمانؓ نے حضرت علیؓ کی خلافت کو چین لینے نہ دیا۔ اگر یہ واقعہ ظہور میں نہ آتا تو کچھ شک نہیں آپ سب سے زیادہ خلافت کے مستحق تھے۔ اور لوگ آپ کو منتخب کرتے۔ بعض مفسرین نے آیت" ولیمکنن لھم دینھم الذی ارتضیٰ لھم ولیبدلنھم من بعد خوفھم امنا الخ" سے یہ استدلال کیا ہے کہ حضرت علیؓ کا عہد اس قابل نہیں کہ اسے خلافت کہا جائے۔ کیونکہ یہ فتنہ و فساد کا زمانہ تھا اور مسلمان امن میں نہ تھے۔ یہ صریحاً غلط فہمی ہے۔ آیات محولہ پر غور کیا جائے تو ظاہر ہو جائے گا کہ اس وقت مسلمان عبادت امن اور چین سے نہیں کر سکتے تھے۔ ایسا امن اسی صورت میں میسر ہو سکتا تھا۔ جب کفار و مشرکین کا خوف نہ ہوتا۔ اور یہ خوف اس وقت تک زائل نہیں ہو سکتا تھا جبتک مسلمانوں کا غلبہ نہ ہوتا۔ جسے اصطلاح میں خلافت کہتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ استحکام اور قیام دین کے لیئے خلافت ضروری امر ہے۔ اور اسی لئے اس کا وعدہ کیا گیا تھا۔ اگر قیام و استحکام و اشاعت اسلام کے ذرائع میں سے خلافت نہ ہوتی تو اللہ تعالیٰ جو اس کا خود حافظ ہے وعدہ خلافت نہ فرماتا اور نہ اسکی ضرورت تھی۔ حضرت علیؓ کی خلافت میں اسلام کو کچھ نقصان نہیں پہنچا۔ اور عرب میں بلکہ اس کے ملحقہ ممالک میں اسلام قائم ہو چکا تھا۔ اور کسی شخص کو یہ شکایت نہ تھی کہ وہ فرائض مذہبی بحالت امن ادا نہیں کر سکتا

اسلام امن میں تھا۔ اور جہاں تک فرائض مذہبی کا تعلق ہے مسلمانوں کو مشرکین اور کفار کا کچھ خوف نہ تھا بلکہ کسی امر میں ان کا ڈر نہ تھا۔ مسلمانوں کا ان پر غلبہ تھا۔ ہماری رائے میں حضرت علیؓ کا عہد خلافت حقہ تھا۔

جو کچھ استدلال ہم نے مذکورہ بالا آیات قرآن سے کیا ہے وہ یہی ہے کہ خلافت تقویت اسلام کے لئے ضروری ہے اور اگرچہ ہر ایک مسلمان جو با ایمان اور صالح ہے اسکا مستحق ہے۔ مگر سب سے زیادہ اُسی مسلمان کا استحقاق ہے اور اسی مسلمان سے تائید اسلام ہو سکتی ہے جو سب سے بہتر ہو۔ قرآن شریف میں استحقاق خلافت صرف ایمان اور اعمال صالح پر موقوف ہیں۔ مگر یہ دونوں اصطلاحیں تشریح طلب ہیں۔

ماہیت "ایمان" میں فرق نہ سہی۔ مدارج اور مراتب میں تفاوت ضرور ہے۔ "اعمال صالح" اور "ایمان" کی تعریف قرآن شریف کی آیت "لیس البران تولوا وجوھکم قبل المشرق والمغرب ولکن البر من اٰمن باللہ والیوم الاخر والملئکۃ والنبیین واتی المال علی حبہ ذوی القربٰی والیتامٰی والمساکین وابن السبیل والسائلین وفی الرقاب" نے جامع و مانع کی ہے۔ کلام اللہ میں بیشمار آیات ان دو اصطلاحات کی تشریح میں موجود ہیں۔ نماز و روزہ کچھ شک نہیں کہ آثار ایمان ہیں اور اعمال صالح میں شمار ہوتے ہیں لیکن ان کا اثر ہر ایک شخص کی ذات تک محدود ہے۔ وہ نیکی جسے خیر دائم کہتے ہیں آیت متذکرہ بالا میں مفصل بیان کی گئی ہے۔ یہی اعمال تھے جو خلفاء راشدین کے کارناموں میں نظر آتے ہیں اور انہی کی وجہ سے ایک شخص ممتاز ہو سکتا ہے۔ اور یہی اعمال صلاحیت پیدا کرتے ہیں۔ ایمان اور عمل صالح لازم وملزوم ہیں۔ ایک شخص جو اللہ تعالیٰ کا منکر ہے اور یوم الآخر کا یقین نہیں رکھتا۔ ملائکہ اور نبیوں کی ضرورت تسلیم نہیں کریگا ایسے شخص کے لئے صرف دنیا ہی ایک ایسی جگہ ہے جہاں اُسکی زندگی کی ابتدا و انتہا ہوتی ہے اُسکی خواہشات مجبوراً اسے خودغرض بناتی ہیں اور اس لئے وہ کبھی دل سے وہ کام نہیں کریگا جو خودغرضی کے سخت مخالف ہیں اور جنہیں اعمال صالح کہتے ہیں۔ ہم ایمان اور اعمال صالح کے تعلقات پر فلسفیانہ بحث نہیں کرتے۔ ہمارا خیال ہے کہ صلاحیت اُسی عمل سے پیدا ہو سکتی ہے جو ایمان اور خلوص نیت کے ساتھ کیا جائے اور ہر ایک ایسے عمل کا اجر و ثواب بہ لحاظ ضرورت وقت کم و بیش ہے۔

ایک زمانہ تھا جب مکہ میں مسلمان کفار کے ہاتھوں سے تنگ آ گئے تھے۔ وہ امن کے ساتھ آزادانہ عبادت الٰہی سے معذور تھے۔ ان کی ہستی معرض ہلاکت میں تھی۔ اس وقت "ہجرت" ایک ایسا عمل تھا۔

جسکے برابر کوئی نیکی نہ تھی لیکن فتح مکہ کے بعد ہجرت کوئی نیک کام ہی نہ تھا جب صفوان بن امیہ نے اسلام قبول کیا اور مکہ میں مقیم رہتے تھے، ان سے کہا گیا کہ "جس شخص نے ہجرت نہیں کی وہ ہلاک ہو جائے گا اور اُس کا اسلام قبول ہی نہ ہوگا"۔ مدینہ میں ہجرت کر کے آئے۔ عباسؓ بن عبد المطلب آپ کے دوست تھے۔ رسُول اللہؐ کی خدمت میں ان کی کیفیت بیان کی۔ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ فتح مکہ کے بعد ہجرت ضروری نہیں،

ہجرت سے پیشتر مسلمانوں کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ ہجرت کے بعد مسلمانوں کی جمعیت ایک جگہ بالاستقلال قائم ہوگئی۔ اور اسی واقعہ نے مدینہ منوّرہ کو دار الخلافت بنا دیا اور اسلام اور مسلمانوں کا غلبہ تمام اقوام پر خاطر خواہ ہوگیا۔ اس سے بڑھ کر اور کیا نیکی ہو سکتی تھی۔ یہ ایک ایسا عمل تھا جس نے مسلمانوں اور کفار کو ایکدوسرے سے علیحدہ کر دیا۔ یہ ایک ایسی آزمایش تھی جو صداقت ایمان کا معیار تھی۔ باپ نے بیٹے کو اور بھائی نے بھائی کو اور تمام عزیزوں اور خویش واقارب اور دوستوں کو رسول مقبولؐ کی متابعت اور اسلام کی محبت میں چھوڑ دیا۔ حضرت اُسیدؓ مسلمان ہوئے تو مدینہ منوّرہ میں اقامت اختیار کی۔ آپکے باپ نے ایک منظوم خط بھیجا،

من راکب نحو المدینۃ سالما	کیا کوئی سوار ہے جو مدینہ کی طرف جائے،
حتیٰ یبلغ ما اقول الاصیدا	یہاں تک کہ میرا پیغام اصید کو پہونچاوے،
ان البنین شرادھم امثالھم	کہ وہ بیٹے بہت بُرے ہوتے ہیں جو باپ کی نافرمانی کریں،
من عق والدہ وبرالابعدا	اور ایک دور کے رشتہ دار سے میل پیدا کریں،
اترکت دین ابیک والشم العفیٰ	اے بیٹے کیا تو نے اپنے باپ کے عمدہ طریقوں کو چھوڑ دیا۔ وہ سب ہلاک ہوگئے اور کل سے تو نے محمدؐ کی پیروی کرلی،
اودوا وتابعت الغداۃ محمدا	
فلا امر یا نبی عققتنی	تو نے مجھے کبر سنی اور کمزوری کی حالت میں چھوڑ دیا،
وترکتنی شیخا کبیرا منفدا	اے میرے بیٹے تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا ہے،
اما النہار فدمع عینی ساکب	ان پر میری آنکھوں سے آنسو جاری رہتے ہیں۔
وابیت لیلی کالسلیم مسھدا	اور رات بھر مثل عقرب گزیدہ تڑپتا ہوں،

فلعل ربا قد خداك لدينه	شاید پروردگار نے تجھے اپنے دین کی ہدایت کی ہو۔
فاشکر ایادیه علی ان ترشدا	تو تو اسکا شکر کر کہ تو نے ہدایت پائی۔
واکتب الی بما اصبت من الهدیٰ	اور جو کچھ تجھے ہدایت حاصل ہوئی ہے اس سے مجھے بھی اطلاع دے
وبدینه لا تترکنی موحدا	اور انکے دین سے مجھے بھی خبردار کر مگر مجھے تنہا نہ چھوڑ۔
واعلم بانك ان قطعت قرابتی	اور سمجھ لے اگر تو میری قرابت کو قطع کر دے گا۔ اور مجھے چھوڑ
وعققتنی لم الف الا للعدیٰ	دے گا تو میں سفر اختیار کر لوں گا۔

حضرت اسیدؓ نے جواب لکھا کہ:۔

ان الذی سمك السماء بقدرة	بیشک جس نے اپنی قدرت سے آسمان کو بلند کیا۔
حتی علی فی ملکه فتوحدا	اور اپنی بادشاہت میں یکتا ہے۔
بعث الذی لا مثله فیما مضیٰ	اس نے ایک ایسے شخص کو نبی مبعوث کیا ہے جسکا نظیر اگلوں میں بھی نہیں
یدعو لرحمته النبی محمدا	وہ نبی محمد ہے جو اللہ کی رحمت کیطرف بلاتا ہے۔
ضخم الدسیعة کالغزالة وجه	وہ نہایت عالی حوصلہ ہیں اور صبح کیطرح انکا چہرہ چمکتا ہو وہ ایک بزرگ
قرما فاذر بالمکارم وانتدیٰ	ہیں جو پسندیدہ اخلاق سے قوی اور آراستہ ہیں۔
فدعا العباد لدینه فتتابعوا	انہوں نے اللہ کے بندوں کو دین کی طرف بلایا۔ اور طوعاً وکرہاً
طوعاً وکرهاً مقبلین علی الهدیٰ	سب ہدایت کی طرف آئے اور ان کی متابعت کی۔
وتخوفوا النار التی من اجلها	اس آگ سے ڈر گئے جس سے بدبخت نقصان والے
کان الشقی الخاسر اتلددا	مارے مارے بھٹکتے ہیں۔
واعلم بانك میت ومحاسب	اے باپ تو یقین کر لے کہ تو مرےگا اور تجھ سے حساب لیا جائے گا۔
فالی من هذی الضلالة والردیٰ	اس لئے تو مجھے اس گمراہی اور ہلاکت سے باز رکھ۔

یہی ہجرت تھی جو اصحاب رسول اللہ میں فضیلت کی وجہ سمجھی گئی تھی۔ اور استحقاق خلافت میں مہاجرین کا پایہ انصار سے بلند تھا۔ ہجرت کے علاوہ دیگر اعمال جسکی وجہ سے صحابہ کا مرتبہ اعلیٰ ہے اس آیت میں اس طرح مذکور ہیں:۔

محمد رسول الله، والذین معه اشداء علی الکفار رحماء بینهم تراهم رکعا سجدا

یبتغون فضلاً من الله و رضوانا سیماهم فی وجوههم من اثر السجود ذالك مثلهم فی التوراة۔ الخ"
رسول اللہ اور آپ کے اصحاب میں یہ اوصاف مشترک ہیں کہ آپس میں ایک دوسرے کے بھائی ہیں اور
رحم و مودت سے پیش آتے ہیں اور کفار کے لئے سخت ہیں جو اخوۃ کا لازمی نتیجہ ہے۔ اور نماز پڑھتے
ہیں ان کی پیشانیوں پر سجدہ کا اثر نمایاں ہے ان کے یہ اعمال ایسے ہیں جو منقطع نہ ہونگے بلکہ جس طرح
ایک کھیت پکتا ہے تو اس کا فائدہ کاشتکار بھی اُٹھاتا ہے اور دوسری مخلوق بھی منتفع ہوتی ہے۔ اور پھر
اس سے دوسرے کھیت میں بیج بویا جاتا ہے اور اسی طرح ترقی ہوگی۔ اسے خیر دائم کہتے ہیں۔
علاوہ ازیں اور بھی اوصاف ہیں جن کا ثبوت قرآن شریف اور کتب تواریخ میں موجود ہے۔ کہ کس
طرح اصحاب رسول اللہ نے اپنی ہستی کو رسول اللہ کی متابعت اور اسلام کی محبت میں فنا اور کس طرح عام ہمدردی
نے خود غرضی کو محو کر دیا تھا۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ اصحاب رسول اللہ میں وہ اوصاف موجود تھے جو آنحضرت
کی ذات میں تھے۔ اسکی شہادت قرآن شریف کی یہ آیت ہے کہ "لقد من الله علی المومنین اذ بعث فیهم
رسولا من انفسهم یتلو علیهم ایاته و یزکیهم و یعلمهم الکتب والحکمة" اور یہ اوصاف خلفا راشدین
میں بہ نسبت دیگر اصحاب بدرجہ اولیٰ موجود تھے۔ اور وہ ہر طرح نیابت یا خلافت کے مستحق تھے۔
آیت وعد الله الذین امنوا منکم الخ میں صریحاً ہر ایک مسلمان کا جو مومن اور صالح ہے حق خلافت
ثابت کر دیا ہے۔
یہ امر کہ بہترین خلائق ہی خلیفہ ہو سکتا ہے اس آیت میں مذکور نہیں۔ ہم نے واقعات کی بنا پر اور
ایک عام معقولی دلیل پر لکھ دیا ہے کہ استحقاق خلافت اوسی شخص کا سب سے زیادہ سمجھنا چاہئے جو سب سے
بہتر ہو۔ بات اصل میں یہ ہے کہ ایسا شخص جو مسلمان نہ ہو یا مومن نہ ہو یا باوجود ایمان صالح نہ ہو مستحق خلافت
نہیں ہو سکتا۔ لیکن یہ لازمی نتیجہ نہیں کہ ایک مسلمان جو مومن اور صالح ہے خلیفہ برحق اس لئے نہیں ہو سکتا
کہ وہ بہترین خلائق نہیں لیکن اس میں کچھ شک نہیں کہ ہر ایک زمانہ میں بہ لحاظ ضرورت وقت بہترین
خلائق کا انتخاب ہونا چاہئے۔ قرآن شریف میں "بہترین خلائق" کی نسبت فیصلہ کن آیات اس طرح ہیں:-
"الم تر الی الملاء من بنی اسرائیل من بعد موسی اذ قالوا لنبی لهم ابعث لنا ملکا نقاتل
فی سبیل الله۔ قال هل عسیتم ان کتب علیکم القتال الا تقاتلوا قالوا وما لنا الا نقاتل فی
سبیل الله وقد اخرجنا من دیارنا و ابنائنا۔ فلما کتب علیهم القتال تولوا الا قلیلاً منهم۔ والله علیم

بالظالمین، وقال لھم نبیھم ان اللہ قد بعث لکم طالوت ملکا، قالوا انی یکون لہ الملک علینا ونحن احق بالملک منہ ولم یؤت سعۃً من المال، قال ان اللہ اصطفٰہ علیکم وزادہ بسطۃً فی العلم والجسم، واللہ یؤتی ملکہ من یشاء واللہ واسع علیم ۲۲؎"

حضرت موسیٰ کی وفات کے بعد بنی اسرائیل نے ہر ایک دفعہ اس امر کی ضرورت محسوس کی کہ انہیں ایک ایسا شخص حاکم مقرر ہونا چاہئے جسکی بدولت وہ کفار اور مشرکین پر غالب آئیں۔ چنانچہ نبی وقت کے پاس جمع ہوکر استدعا کی کہ ہم پر ایک ملک مقرر کیا جائے جسکی ماتحت ہم کفار و مشرکین سے لڑیں۔ نبی چونکہ ان کی خصلت اور انسانی طبیعت سے خوب واقف تھا۔ جواب دیا کہ اب تو تم اس امر کی خواہش کرتے ہو لیکن جب اللہ تعالیٰ نے جہاد فی سبیل اللہ فرض کر دیا تو پھر جی چراؤ گے۔ بنی اسرائیل نے کہا کہ ہم نے شہر و دیار چھوڑا۔ اولاد کی جدائی گوارا کی، اب جہاد فی سبیل اللہ میں کیا امر مانع ہو سکتا ہے، الغرض اللہ تعالیٰ نے ان پر جہاد فرض کر دیا۔ اور نبی کی معرفت "طالوت" کو انکا بادشاہ منتخب فرمایا، لیکن بنی اسرائیل نے اس انتخاب پر یہ اعتراض کیا کہ طالوت سے زیادہ ہم حقدار ہیں اور وہ کچھ ایسا متموّل بھی نہیں ہے کہ اسکی امارت کو تسلیم کیا جائے۔ نبی نے جواب دیا کہ اللہ تعالیٰ نے اسے منتخب فرمایا ہے اور اسکی وجہ یہ ہے کہ "زادہ بسطۃً فی العلم والجسم" یعنی وہ امور سلطنت کو سب سے بہتر سمجھنے والا اور زور بازو میں بھی سب سے بڑھکر ہے۔

اگرچہ اس وقت بنی اسرائیل میں نبی موجود تھا اور نبی کو دیگر اشخاص پر ایک خاص امتیاز حاصل ہے وہ بہ لحاظ زہد، تقویٰ، عبادت الٰہی، وغیرہ سب سے افضل ہوتا ہے۔ اور اگرچہ بنی اسرائیل میں ایسے لوگ بھی موجود تھے، جو اپنے حسب و نسب پر بجا فخر کر سکتے تھے، انکی خاندانی شرافت و وجاہت مسلمہ تھی، اور بوجہ قرابت موسیٰ، ہارون، اور دیگر انبیا اپنے آپ کو حقدار سمجھتے تھے، اور اگرچہ ان میں ایسے اشخاص بھی تھے

حاشیہ نمبر ۲۲۔ سموئیل نبی کی کتاب کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ یہ زمانہ جب بنی اسرائیل سموئیل نبی کے پاس جمع ہوئے اور استدعا کی کہ ہمارے واسطے ایک بادشاہ منتخب کیا جائے مسیح سے قریباً ۱۰۹۵ برس قبل کا ہے۔ اس سے پیشتر اور حضرت موسیٰ کی وفات کے بعد بنی اسرائیل پر "قاضی" حکمران تھے جو احکام شرعی نافذ کرتے اور بوقت جنگ سپہ سالار ہوتے غرض ہر ایک کام سرانجام کرتے، جب قاضیوں کا دورہ ختم ہوا تو بادشاہت ہونے لگی، چنانچہ پہلا بادشاہ "طالوت" منتخب ہوا جسے بائبل میں "ساؤل" کہتے ہیں۔ آپ کے بعد حضرت داؤد اور ان کے بعد انکا بیٹا حضرت سلیمان تخت نشین ہوئے"۔

جو دنیاوی دولت و ثروت پر ناز کرتے تھے، ان کی خدمت میں صدہا غلام اور لونڈیاں تھیں، ان کے کھیتوں پر کام کرتے تھے۔ ان کی گاڑیاں بیل اور گھوڑوں کی طرح کھینچتے تھے، اور ان کے حضور دست بستہ مؤدب کھڑے رہتے تھے، یہ سب کچھ تھا لیکن نظر انتخاب ایک ایسے شخص پر پڑی جو بنی اسرائیل کے بارہ فرقوں میں سے سب سے چھوٹے فرقہ "بنیمین" کا ایک رکن تھا، اور اس فرقہ کے سب سے کمزور خاندان کا رکن تھا، طالوت نہ تو زہد و تقویٰ کے باعث نبی سے بڑھ کر ہو سکتا تھا۔ اور نہ خاندانی شرافت و وجاہت کے سبب ممتاز تھا، اور نہ مالدار تھا، البتہ اسکی ذات میں دو خوبیاں ایسی تھیں جنکی بدولت وہ اپنے زمانہ میں سب سے بہتر تھا وہ "علم اور جسم" میں سب سے بڑھ کر تھا، اور انتظام مملکت کے لئے انہی دو کی ضرورت ہے، یہ ایسی قابلیتیں ہیں جو خدا داد ہیں، اور اسی لئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ "واللہ یؤتی ملکہ من یشاء"

ہم نے "علم" کا ترجمہ "رموز مملکت کا فہم" کیا ہے، یعنی ایسا "علم" جس کا تعلق صرف مملکت سے ہے، اور "جسم" کا ترجمہ "زور بازو" نہایت موزون ہے، اور زور بازو سے مراد "قابلیت عمل" ہے، فی الحقیقت کسی شخص کا جسیم و لحیم ہونا اسکی ذات میں کوئی قابلیت پیدا نہیں کرتا، جسمانی طاقت ایک ایسی قابلیت ہے، جو ہمکو ایسے کاموں اور عملوں پر قادر کر دیتی ہے، جن کی خواہش ہمارا "علم" کرتا ہے۔ اور اس لئے "جسم" سے مراد "طاقت عمل" ہی ہو سکتی ہے، طالوت نہ صرف رموز مملکت پر ہی آگاہ تھا۔ بلکہ علم مملکت کے ساتھ اسکی ذات میں یہ قدرت بھی تھی کہ سلطنت کی خرابیوں کو رفع کر سکے، اور ہر ایک اصلاح کو عملاً رواج دینے پر قادر تھا، الغرض اسے علم مملکت بھی حاصل تھا۔ اور انتظام سلطنت بھی عملاً کر سکتا تھا، اور اس طرح "علم" اور "عمل" اسکی ذات میں جمع تھے،

زہد و تقویٰ، خاندانی شرافت، دولت و ثروت، اور دیگر وصف اضافی کسی شخص کو حکمرانی کے قابل نہیں بنا سکتے،

شخصی حکومت مذموم خیال کی جاتی ہے، یہ غلط فہمی ہے، اگر یہ حکومت مذموم ہوتی تو اللہ تعالیٰ اپنی برگزیدہ قوم بنی اسرائیل کے لئے کیوں ایک بادشاہ مطلق العنان کو منتخب فرماتا، بات اصل میں یہ ہے کہ حکومت انتظام دنیا کے لئے ضروری ہے، حکومت کی مختلف صورتیں ہیں اور ان میں سے ایک بھی مذموم نہیں، البتہ بتقاضائے حالات زمانہ ایک کو دوسرے پر ترجیح ہے، حکومت خواہ وہ

شخصی ہو یا جمہوری یا دستوری تقاضا کرتی ہے کہ عنان سلطنت ایسے زبردست ہاتھوں میں ہو
جسکے متحرک روشن دماغ، مدبر، منتظم، عادل، بہادر، حلیم الطبع، کریم النفس حسب ضرورت وقت ہوں
خواہ یہ افسر کوئی مطلق العنان بادشاہ ہو یا کسی جمہوری سلطنت کا پریزیڈنٹ ہو، یا کسی دیگر آئینی
حکومت کا کوئی اعلیٰ افسر ہو۔ یہ بالکل سچ ہے کہ۔

ہر کسے را بہر کارے ساختند

ایسے اشخاص جو ہمہ صفت موصوف ہوں، دنیا میں بمشکل سے ملتے ہیں، ایسے آدمی جن کی زمانہ کو
ضرورت محسوس ہو قدرت بوقت ضرورت پیدا کر دیتی ہے انکی ہستی کا ظہور موافق اسباب کے
جمع ہونے پر ہوتا ہے، اور ان سے کارہائے نمایاں ظاہر ہوتے ہیں ایسے لوگ جو خاص
خاص اوصاف سے متصف ہوں اور ان اوصاف میں فرداً فرداً ممتاز بھی ہوں بہت ہیں۔ اور
دنیا میں عام مل سکتے ہیں، مؤخر الذکر جمہوری یا کسی دیگر آئینی حکومت کے رکن ہوتے ہیں، اور اول الذکر
کا تقرر بہ حیثیت شاہ مطلق العنان دنیا کے لئے رحمت ہے۔ قانون قدرت یہی ہے کہ کثرت ہمیشہ وحدت
کے تابع رہے، اور اس لئے حکومت تقاضا کرتی ہے کہ ایک سب کا اعلیٰ افسر ہو۔ اپنے وجود پر غور
کرو، کائنات میں فکر کرو، کس طرح "علم" اور "قدرت" جسم میں کام کرتے ہیں اور کس لئے دماغ
کی حکومت دیگر اعضائے تسلیم کر لی ہے۔ اللہ تعالیٰ جسکی ذات تمام صفات کی جامع ہے کس طرح
عالموں پر حکومت کرتا ہے، اگر اس حکومت میں اسکے شریک اور خدا ہوتے تو تمام انتظام کائنات درہم
برہم ہو جاتا، اگر دنیا میں ایسے مطلق العنان بادشاہ ہر ایک زمانہ میں پیدا ہوتے جو "علم" اور "جسم"
میں یکتا ہوتے تو حکومت کبھی اپنی صورت کی تبدیلی پسند نہ کرتی اور کسی جمہوری یا آئینی سلطنت کی
ضرورت نہ ہوتی۔ مگر ایک کام جب ایک شخص سے نہیں چل سکتا تو وہ امداد کا طالب ہوتا ہے اور
دو یا دو سے زیادہ آدمی اس کام کو چلا سکتے ہیں، جمہوری سلطنت کے ارکان میں سے بعض "عقل"
اور بعض "ہمت" سے کام لیتے ہیں، اور "عقل و ہمت" دونوں ایک جسم سلطنت میں جمع ہو کر اپنے اپنے
فرائض ادا کرتے ہیں۔ اگر عقل ہو اور ہمت نہ ہو یا ہمت ہو اور عقل نہ ہو تو کام نہیں چل سکتا مطلق العنان
بادشاہ کی ذات عقل و ہمت کی جامع ہوتی ہے اس لئے وہ بذات واحد وہ کام کر سکتا ہے جو آئینی
حکومت کے ارکان بہیئت مجموعی کرتے ہیں، حکومت خواہ کوئی صورت اختیار کر لے بہر حال ایک واحد

شخص کی ذات دیگر اشخاص سے ممتاز نظر آئے گی، یہ ایک فطرتی تقاضا ہے جسکی تعمیل میں انسانی طبائع مجبور ہیں، اس لئے حکومت جو صورت فطرتاً اختیار کرتی ہے وہ صرف شخصی ہے۔ اور اس حیثیت سے احسن ہے،

ہم نے حکومت کی حسن صورت پر ہی نظر کی ہے، مگر اسکے قبیح خط وخال بھی ہیں، حکومت خواہ شخصی ہو یا آئینی اسی صورت میں اچھی ہے جب اس کا انتظام صاحب عقل وہمت، علم وعمل، ایمان، وصلاحیت کے ہاتھ میں ہو، لیکن ایسی صورت ہمیشہ قائم نہیں رہتی، شخصی حکومت بطور وراثت نسلاً بعد نسلاً ایک ہی خاندان کے اراکین میں منتقل ہوتی ہے، اور عموماً یہ لوگ صاحب عقل وہمت نہیں ہوتے۔ اگر لائق باپ کے بعد بیٹا قابل حکومت ہو اور بہترین خلائق ہو تو اسکی جانشینی پر کوئی اعتراض نہیں ہوسکتا، مگر عموماً ایسا ہوتا ہے کہ ایک دو پشتیں گذرنے پر عیاش، جاہل، ظالم شخص وارث تخت وتاج ہوتے ہیں، اس وقت انتظام مملکت درہم برہم ہوجاتا ہے، جس صورت میں ایک صحیح دماغ جسم پر حکومت نہیں کرتا، خواہشات نفسانی کا غلبہ قلب پر ہوتا ہے، اور ایسی بے اعتدالیاں ظہور میں آتی ہیں جن کا نتیجہ اظہر ہے، دیگر جمہوری اور آئینی حکومتوں کا بھی یہی حال ہے، جب لوگوں کی طبیعتیں عیش وعشرت کی طرف مایل ہوتی ہیں اور کارکنان سلطنت قدرتی خرابیوں سے چشم پوشی کرتے ہیں، اور اپنی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہونا چاہتے ہیں، خود غرضی، خود رائی، خود بینی، رشک وحسد، نفاق، بنیاد سلطنت متزلزل کردیتے ہیں، بات اصل میں یہ ہے کہ جب کوئی قوم میدان ترقی میں قدم رکھتی ہے تو اس قوم کے افراد میں ہر ایک خوبی جو غلبہ کا باعث ہو موجود ہوتی ہے۔ ان کے دلوں میں جوش شجاعت ان کے حوصلے بلند کرتا ہے، وہ محنتی اور جفاکش ہوتے ہیں۔ اور ان کی طاقت ہر ایک رکاوٹ کا جو اُن کی ترقی میں سد راہ ہو کامیابی کے ساتھ مقابلہ کرتی ہے لیکن جب یہ قوم منزل مقصود پر پہونچ جاتی ہے، تو تنزل اور بربادی کے آثار نمایاں ہوجاتے ہیں۔ اور کچھ عرصہ میں وہ تمام خوبیاں جو ابتدا میں موجود تھیں محو ہوجاتی ہیں، قانون قدرت یہ ہے کہ جب تک مطلوب غائب ہے طلب حاضر ہے، اور اگر مطلوب موجود ہو طلب مفقود ہوتی ہے، تشنہ لب پیاس بجھانے کے لئے پانی کی تلاش میں آوارہ وسرگردان پھرتا ہے، جب دوڑ دھوپ کے بعد پانی دستیاب ہوتا ہے تو آتش تشنگی کے ساتھ خواہش طلب بھی بجھ جاتی ہے، جب قومیں ترقی کے معراج پر جسکے مدارج بحالات وقت مختلف ہیں پہونچتی ہیں اور ان کا مقصود حاصل ہوجاتا ہے تو رفتہ رفتہ وہ طاقتیں

جو ابتدا میں گوہرِ مطلوب پر قبضہ حاصل کرنیکے لئے جد وجہد کرتی ہیں بیکار ہوجاتی ہیں اور وہ ابتدائی جوش اور عزم مفقود ہوجاتا ہے جو "طلب" کی وجہ سے پیدا ہوتا تھا، یہ وہ زمانہ ہے جب تمدن سامان عیش وعشرت کے ساتھ اسباب تنزل فراہم کرتا ہے اور قوم قعر پستی کی طرف گرتی ہے۔ ایسی حالت میں حکومت خواہ شخصی ہو یا آئینی ہر ایک صورت میں کمزور ہوتی ہے۔ اور یہ کمزوری جو اندرونی خرابیوں کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے بیرونی حملوں کے زور کے سامنے عمارت سلطنت کو خستہ وشکستہ کردیتی ہے جب وہ پرجوش طبیعتیں افسردہ ہوجاتی ہیں اور وہ ولولے اور عزم بالجزم مردہ ہوتے ہیں تو انتظام مملکت خواہ کسی ہاتھ میں ہو بدنظمی اور بدامنی کو رواج دیتا ہے۔ نہ تو جمہور کی طاقت اور نہ کسی شخص کی عقل و ہمت کام آتی ہے اور نہ قدرتی اثر مٹانے سے مٹ سکتے ہیں۔ تواریخ عالم کا مطالعہ کرو بیشمار واقعات ان امور کی تائید میں شاہد ہیں کہ ایک ہی قوم کی ابتدائی اور آخری حالتیں کیا کچھ تھیں ایک وقت شخصی اور پھر جمہوری غرض مختلف حکومتیں نظم ممالک کو قائم رکھنے کے لئے ظہور میں آئیں لیکن سلطنت بربادی سے نہ بچ سکی۔ آیات محولہ بالا پر غور کرو، حضرت موسیٰ کی وفات کے بعد بنی اسرائیل میں جمہوری سلطنت قائم ہوئی اور قاضیوں کا دور دورہ رہا، جب ان سے کام نہ چلا تو بنی اسرائیل کے سربرآوردہ ارکان نے شاہی کی ضرورت محسوس کی۔ اور اس کا اظہار حضرت سموئیل کی خدمت میں کیا، چونکہ زمانہ نے یہ ضرورت پیدا کی تھی۔ اور فطرتاً طبائع انسانی اس کا تقاضا کر رہی تھیں، اس لئے ان کی خواہشات کے مطابق شخصی حکومت جمہوری سلطنت کی جگہ قائم ہوگئی، اور اس تغیر وتبدل نے بنی اسرائیل میں بھی ایک نئی روح پھونک دی۔ اگر جمہوری سلطنت بہرحال بہتر ہوتی تو ایک مذموم یا اپنے سے بدتر صورت اختیار نہ کرتی لیکن جمہوری سلطنت کی خرابیاں جو قدرتاً پیدا ہوتی ہیں۔ اپنا کام کرچکی تھیں، جیسا کہ اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے:

"قال ھل عسیتم ان کتب علیکم القتال الا تقاتلوا قالوا وما لنا الا نقاتل فی سبیل اللہ وقد اخرجنا من دیارنا وابنائنا، فلما کتب علیھم القتال تولوا الا قلیلاً منھم۔ واللہ علیم بالظالمین"۔

بنی اسرائیل کا یہ دعویٰ کہ ہم وہی ہیں جو دنیا میں غلبہ حاصل کرنے کے لئے شہر و دیار کو چھوڑ چکے ہیں اور اپنے اہل وعیال کی فرقت گوارا کی ہے، اس ابتدائی جوش اور بلند حوصلگی کی بنا پر تھا جسکی بدولت

وہ نہ صرف قید غلامی سے آزاد ہوئے بلکہ دنیا کی تاریخ میں دیگر کارنامے نمایاں کئے، مگر موجودہ حالت میں وہ تمدن کے بعض مدارج طے کر چکے تھے۔ اور اب اس کے انتہائی درجہ پر جانا چاہتے تھے۔ یعنی ابھی تک ان میں ابتدائی خوبیوں کا احساس باقی تھا، ابتدا میں جوش شجاعت نے انہیں جہاد فی سبیل اللہ پر قدرتاً آمادہ کر دیا، وہ خوشی خوشی کفار اور مشرکین سے لڑتے رہے، مگر جب ان ملکوں میں جن میں وہ ابتداءً مسافر تھے مقیم ہو گئے۔ اور حضرت داؤدؑ نے بنی اسرائیل کی خواہشات کے مطابق سلطنت کو وسعت دی اور حضرت سلیمانؑ نے دنیاوی جاہ و حشمت اور دولت و ثروت سے نمود و شان کو ضرب المثل بنا دیا، اُس وقت قدرت کا یہ فیصلہ کہ "قال ھل عسیتم ان کتب علیکم القتال الا تقاتلوا" بالکل صحیح ثابت ہوا۔ اور آخر کار "تولوا الا قلیلا منھم" جسکی وجہ یہ ہے کہ "واللہ علیم بالظالمین" اس کا علم تو جمہوری سلطنت کی خرابیوں کے باعث پیشتر ہی ہو چکا تھا کہ بنی اسرائیل حد اعتدال سے تجاوز کر چکے ہیں؛ اور جو کچھ اس کے نتائج قدرتاً ہونگے۔ ان کے آثار نمایاں ہو چکے تھے، ابتدا میں بنی اسرائیل نے ترک وطن اختیار کیا، عزیزوں کی جدائی گوارا کی، وجہ یہ تھی کہ اس وقت ان کے پاس کچھ نہ تھا، قدرتاً ان کے دل میں امنگ پیدا ہوئی اور فطرتاً وہ مطلوب کی طلب میں گھر سے نکلے اور شہر و دیار کے ساتھ خویش و اقارب سے جدا ہوئے، لیکن جب منزل مقصود پر پہونچ گئے، جب ان کے پاس سب کچھ جسکی وہ آرزو کرتے تھے موجود ہو گیا، وہ عیش و عشرت میں پڑ گئے اور نتیجہ یہ ہوا کہ کاہل اور آرام طلب بن گئے، اور اب شہر و دیار و اقربا سے جدا ہونا شاق گذرا، آخر دوسری قومیں ان پر مسلط ہو گئیں۔

قیاس ہو سکتا ہے کہ جمہوری حکومت کی خرابیوں نے شخصی سلطنت کی صورت اختیار کی تھی یہ غلط فہمی ہے، ہمارے پاس ایسی مثالیں موجود ہیں جو اس قیاس کی تردید کرتی ہیں ابتدا میں شخصی سلطنت قائم ہوئی، اسکی خرابیوں کی اصلاح کے لئے جمہوری سلطنت میں بھی وہی خرابیاں پیدا ہو گئیں نتیجہ یہ ہے کہ کوئی حکومت خواہ اسکی صورت کچھ ہی کیوں نہ ہو خرابیوں سے محفوظ نہیں۔

اسلام نے دنیا کو ایک نئی طرز حکومت کی تعلیم دی جسے "خلافت" سے تعبیر کرتے ہیں، اسلام سے پیشتر دنیا کے مختلف مذاہب مختلف قوموں اور ملکوں میں محدود تھے، شریعت موسوی پر صرف بنی اسرائیل کا عمل تھا، اس قوم نے اپنے مذہب کی اشاعت کی طرف کبھی توجہ نہ کی اور نہ ان کا مذہب دوسری قوموں کے لئے تھا، حضرت عیسیٰؑ بنی اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے واسطے مبعوث ہوئے اور اپنے

شاگردوں اور حواریوں کو سامریوں اور دیگر غیر بنی اسرائیل کی بستیوں میں داخل ہونے سے منع کیا'
تمام عمر ان کے مخاطب صرف بنی اسرائیل ہی رہے'، اور آنحضرت نے کبھی رومیوں یا کسی غیر بنی اسرائیل
کو تعلیم نہیں دی'، اور نہ اپنا شاگرد بنایا۔ اسلام " کافتہ النّاس " کے واسطے تھا۔ کل مذاہب کے معتقدین کو
ابتدا ہی سے دعوت دی۔ اور دنیا کی ہر ایک قوم نے اسے قبول کیا'۔ بنی اسرائیل ہمیشہ غیر اقوام سے متنفر رہے
ہیں'، اور برہمنوں کی طرح اپنی ذات کو سب سے برتر اور خدا کو اپنا باپ اور اپنے آپ کو خدا کے بیٹے بلکہ
اکلوتے سمجھتے تھے'۔ اسلام نے ہر ایک مسلمان کے حقوق مساوی رکھے'، خواہ وہ کسی قوم سے ہو
اور کسی حیثیت کا ہو۔ " اسلام " اور " خلافت " کا تعلق بہت مضبوط ہے'۔ اسلام سے پیشتر جس طرح
مذاہب قوموں میں محدود تھے۔ اس طرح حکومت کے حقوق بھی انہی کی ذات کے لئے خاص تھے
لیکن اسلام جس طرح تمام قوموں کا مذہب ہے خلافت کا استحقاق بھی ہر ایک مسلمان قوم کو پہونچتا ہے'،
کیونکہ جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں تقویت دین'، اور اسکی حفاظت اور اشاعت اور مسلمانوں کے غلبہ کے لئے
خلافت کا وعدہ کیا گیا تھا'۔ خلافت کا تصوّر اسلام کی تصدیق کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ اگر خلافت ایک قوم
میں محدود ہوتی تو عربوں اور بالخصوص قریش کے زوال کے ساتھ اسلام کا بھی خاتمہ تھا'۔ کیونکہ قدرت
نے قوموں کا عروج و نزول لوح کائنات پر جلی حرفوں سے لکھدیا ہے'، عربی تمدّن کے اثر سے نہ بچ سکی'،
اور نہ اور کوئی قوم محفوظ ہے'، اور نہ ہو سکتی ہے'۔ وہ موضوع حدیثیں اور غلط روایتیں جو خلافت
کو قریش یا اہلبیت میں محدود کرتی ہیں اسی وقت تک قابل وقعت تھیں جب قریش حکومت کے
اہل تھے'، اسلئے جو کچھ وہ اپنی نسبت کہتے تھے بجا تھا'، جب اسلام سی عزیز چیز ہر ایک قوم کا حصّہ ہی
تو اسکی حفاظت۔ اشاعت'، تقویت کے ذرائع یعنی خلافت کے استعمال میں کس طرح بخل ہو سکتا تھا
اس لئے ہر ایک قوم خواہ وہ عربی ہوں یا عجمی'، ترک ہوں یا مغل'، افغان ہوں یا پارسی'، قبول اسلام
کے ساتھ خلافت کی بھی مستحق ہے'۔

" خلافت " نے حکومت کی خرابیوں کو اصولاً اور عملاً رفع کر دیا ہے'۔ خلیفہ خواہ کسی قوم سے
ہو اگر مسلمان'، مومن'، صالح ہے تو خلافت کا مستحق ہے'، شخصی اور جمہوری اور دیگر حکومتیں اس لئے قدرتاً
خرابی کو پرورش کرتی ہیں کہ صرف ایک ہی قوم میں محدود ہوتی ہیں اور یہ قوم ایک عرصہ بعد اُس بوسیدہ
شجر کی طرح بن جاتی ہے جسکی قسمت میں ایک دن آگ کا ایندھن بننا لکھا ہے'۔ لیکن خلافت نے حکومت

کو کسی ایک قوم میں محدود نہیں رکھا۔ اور اس لئے اسے زوال کا بھی اندیشہ نہیں۔

المختصر حکومت کی حسن صورت "خلافت" ہی ہو سکتی ہے۔ قوموں کا عروج و نزول تو تا قیامت ہوتا رہیگا! لیکن جب ہمارے حقوق اسلامی ممالک میں مساوی ہیں تو اگر بہ تقاضاء وقت بہترین خلائق برسر حکومت ہوں تو ہمیں کس بات کا غم ہو سکتا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا امیر معاویہؓ خلافت کے مستحق تھے اور انکا عہد خلافت کہا جا سکتا ہے۔ اصول حکومت اور بالخصوص خلافت جو کچھ ہم نے بیان کئے ہیں اور جن کے استدلال کی بنا قرآن شریف کی آیات ہیں۔ ان کو مد نظر رکھکر ضرورت نہیں کہ اس سوال کا جواب زیادہ غور و فکر کے بعد دیا جائے۔ ہم بلا تامل کہتے ہیں کہ وہ خلیفہ برحق تھے۔ اور ان کا عہد خلافت حقہ تھا۔ بلکہ ان کے جانشین بھی اس قابل تھے اور مستحق تھے کہ خلیفہ کہلائیں۔

مؤرخین نے بنو امیہ کی "خلافت" پر نہایت بیجا اعتراض کئے ہیں۔ جسکی وجہ یہ ہے کہ یا تو انہیں اہلبیت کی محبت کا دعوٰے ہے۔ اور جوش محبت میں جو کچھ لکھا وہ جھوٹی سچی روایتوں کی بنا پر اور اپنی طبیعت کے تقاضا سے مجبور ہو کر لکھا۔ یا "خلافت" کے معنی ہی نہیں سمجھے۔ مؤخر الذکر محققین میں سے ہمارے ہمعصر "جرجی زیدان" بھی ایک ہیں۔ جو مصر کے ایک عیسائی ہیں۔ اور "الہلال" کی اڈیٹری میں بہت کچھ شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ ایسے لوگوں سے توقع ہو سکتی ہے کہ کسی فریق کی بیجا اور متعصبانہ طرفداری نہ کریں۔ لیکن یہ بھی امید ہو سکتی ہے کہ خلافت کے معنی سمجھنے میں غلطی کریں۔ خود مسلمان مؤرخین ایسی غلطیوں سے محفوظ نہیں تو ایک عیسائی فاضل معذور ہے۔ فاضل مذکور نے اپنی کتاب "التاریخ التمدن الاسلامی" میں لکھا ہے کہ "ابو سفیان اور اسکی اولاد نے مجبوری کی حالت میں اس وقت اسلام قبول کیا جب انہیں اپنے مقاصد کی کامیابی کی کوئی امید نہ رہی۔ اور اس لئے معاویہ کو خلافت کی آرزو محض دنیاوی اغراض کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی"۔ اور ایک اور جگہ اسطرح لکھا ہے کہ "حکومت امیہ کے بانی معاویہ نے خلافت کی ہوس طمع آخرت یا دینی خلافت کے لئے نہیں کی تھی"۔

یہ اور اس قسم کے اعتراض جو ہماری رائے میں تعصب اور غلط فہمی پر مبنی ہیں بنو امیہ کی خلافت پر کم و بیش ہر ایک مؤرخ نے کئے ہیں۔ ہم نے خلافت اور اسکے اصولوں اور استحقاق کا مجمل ذکر کیا ہے اس لئے ضرورت نہیں کہ ان بیجا اعتراضوں کا مفصل جواب دیا جائے۔ ان لوگوں نے اسلام کا مطالعہ غور

وفکر سے نہیں کیا، اور نادانی سے سلمانوں کے دین اور دنیا میں فرق کرتے رہے ہیں۔ بات اصل میں یہ ہے کہ اسلام سے پیشتر دنیا کو ایسی کامل اور اکمل نعمت ہی نصیب نہیں ہوئی تھی، خود حضرت عیسیٰؑ نے گرفتاری کے وقت اعتراف کیا تھا کہ میری بادشاہت اس دنیا کی نہیں اور اس طرح مذہب کو بادشاہت سے علیحدہ کرلیا۔ اپنے شاگردوں کو تلوار چلانے سے منع کیا۔ لیکن جب معلوم کرلیا کہ محکومی اور ذلت کی حالت میں دین کو فروغ نہیں ہوسکتا۔ اور غلبہ دین کے لئے دنیاوی بادشاہت کی ضرورت کو محسوس کیا تو آئیندہ زمانہ میں ابن آدم کے جلال کی خبر دی جو ہزار فرشتوں کی فوج کے ساتھ آئیگا، اور تائید ایزدی اور غیبی امداد اسکی پشت پناہ ہوگی، پھر کسی کافر یا مشرک یا مردود کو نبی کے قتل کرنے کا حوصلہ نہ ہوگا، اور دین اور دیندار امن میں ہوں گے، بلکہ غالب آئیں گے، اسے ایک پیشگوئی سمجھو یا ضرورت زمانہ کا احساس

بہرحال جو کچھ روح اللہ نے فرمایا تھا وہ پورا ہوا اور چونکہ ان کی اپنی ذات دنیا کی بادشاہت کی خواہاں نہ تھی،

اور ان کی اپنی تعلیم دنیا کی بادشاہت کے متعلق نہ تھی، اس لئے عیسائیت کا اس میں کچھ حصہ نہیں لیکن

ویرید اللہ ان یحق الحق بکلمٰتہ ویقطع دابر الکٰفرین۔ لیحق الحق ویبطل الباطل ولو کرہ المجرمون اذ تستغیثون ربکم فاستجاب لکم انی ممدکم بالف من الملآئکۃ مردفین، وما جعلہ اللہ الا بشریٰ ولتطمئن بہ قلوبکم۔ اسلام کے متعلق تھا، اور اسی سورۃ "الانفال" کی دوسری آیت یہ ہے "واذکروا اذ انتم قلیل مستضعفون فی الارض تخافون ان یتخطفکم الناس فاٰوٰکم وایدکم بنصرہ ورزقکم من الطیبٰت لعلکم تشکرون"۔ ایک اور آیت اس طرح ہے :-

"وقاتلوھم حتیٰ لا تکون فتنۃ ویکون الدین کلہ للہ فان انتہوا فان اللہ بما یعملون بصیر، وان تولوا فاعلموا ان اللہ مولٰکم نعم المولیٰ ونعم النصیر" سورۃ "التوبہ" کو اگر "الانفال" کے ساتھ پڑھا جائے، جو فی الحقیقت ایک ہی سورۃ ہے تو واضح ہوجائیگا کہ کس طرح مسلمانوں نے خوف وخطر کی حالت میں شہر و دیار اور اہل وعیال کو چھوڑا، اور ان کی بادشاہت اس دنیا کی نہ ہوتی تو انکی تباہی میں کچھ شک نہ تھا، اللہ تعالیٰ کو یہ منظور تھا کہ باطل پر حق کا غلبہ ہو، اور مسلمان خوشی خوشی اور امن اور اطمینان سے عبادت الٰہی بجالائیں۔ اور کفر اور کفار کی بیخ کنی ہو، اس لئے "دنیا کی بادشاہت" کو دین کی بدولت عطا فرمایا، کفار اور مشرکین کو نبیوں کی معرفت بہت دفعہ موقع دیا گیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے احکام سنیں۔ مگر وہ نہ صرف کفر و شرک پر اڑے رہے، بلکہ نبیوں کو قتل کیا، اور طرح طرح کی تکلیفیں پہونچائیں، اس لئے

وہ اسباب جو انکے ظلم وستم کا ذریعہ تھے اِن سے چھینے گئے، اور یہ اس لئے کہ وہ دست تعدی دراز نہ کرسکیں۔ ان لوگوں نے محمد رسول اللہ کے ساتھ بھی یہی سلوک روا رکھا اور "واذ یمکر بك الذین کفروا لیثبتوك او یقتلوك او یخرجوك" ارادہ کرلیا کہ ہر ایک تدبیر اور حیلہ سے رسولِ خدا کو قید کرلیں یا قتل یا جلاوطن کردیں، مظلوم مسلمان ہجرت پر مجبور ہوئے، اور شہر و دیار اور خویش و اقارب کو چھوڑا لیکن اسپر بھی باز نہ آئے، اور کسی طرح پیچھا نہیں چھوڑتے تھے، آخر اسکا خمیازہ بھگتنا پڑا، مسلمانوں نے تقویت حاصل کی اور کفار و مشرکین پر غالب آئے اور "خلافت" قائم ہوگئی۔

ہم نے "خلافت" کو تقویت، اشاعت، حفاظت دین کے لئے ضروری قرار دیا ہے، اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ اسلام خلافت کے ذریعے سے شائع ہوا۔ دنیاوی بادشاہت کفار سے اس واسطے چھینی گئی کہ وہ اس ذریعے سے مسلمانوں کو نہ ستائیں، اور اسلام اور مسلمان بحالت محکومی ذلیل نہ ہوں، لیکن اسلام نے دنیاوی بادشاہت کو کبھی اپنی اشاعت کا ذریعہ نہیں بنایا، بلکہ ہر حالت میں "لا اکراہ فی الدین" کا واجب العمل حکم نافذ کیا، جب دنیاوی بادشاہت مسلمانوں کے قبضہ میں آگئی اور کفار کے ہاتھ کوتاہ ہوگئے تو وہ رکاوٹیں جو اسلام کی اشاعت میں وہ پیدا کرتے تھے دور ہوگئیں۔ اس وقت مسلمان دنیاوی بادشاہت کے ذریعہ ان سے وہی سلوک کرسکتے تھے جو اس سے پیشتر خود مسلمانوں کے ساتھ روا رکھا گیا تھا، مگر مسلمانوں نے ایسا نہیں کیا۔ کفار اور مشرکین کو موقع دیا گیا کہ امن کے ساتھ زندگی بسر کریں اور اپنی شرارت سے باز آئیں، لیکن ان کے سر پر تو شامت سوار تھی یہ کافر یہ شرک "الذین عاھدت منھم ثم ینقضون عھدھم فی کل مرۃ وھم لا یتقون" یہ لوگ امن کے ساتھ بود و باش رکھنا سیکھے ہی نہ تھے بہت دفعہ صلح و امن کا عہد باندھا اور ہر دفعہ توڑا، آخر ان لوگوں کو چار ماہ کی مہلت دی گئی اور کہا گیا "فسیحوا فی الارض اربعۃ اشھر واعلموا انکم غیر معجزی اللہ" اس کا اثر بھی سنگدلوں پر نہ ہوا، اس لئے "کیف وان یظھروا علیکم لا یرقبوا فیکم الا ولا ذمۃ" ایسے آدمی جو بحالت غلبہ مسلمانوں سے کوئی رعایت نہیں کرتے تھے۔ اور نہ حق قرابت کو تسلیم کرتے تھے اور عہد و پیمان کی ذمہ داریوں کی حرمت کو سمجھتے تھے، "لا یرقبون فی مؤمن الا ولا ذمۃ، واولئك ھم المعتدون" اور حد اعتدال سے تجاوز کرتے تھے۔ ایسے لوگوں کی سرکوبی فرض تھی، لیکن ان میں سے بعض آدمی ایسے بھی تھے جو اسلام کو قبول کرنے پر آمادگی ظاہر کرتے، "فان تابوا واقاموا الصلوۃ واتوا الزکوۃ فخلوا سبیلھم ان اللہ

غفور رحیم" اور "فان تابوا واقاموا الصلوٰۃ واٰتوا الزکوٰۃ فاخوانکم فی الدین" ایسے لوگوں کے واسطے راستے کھلے تھے۔ اور وہ دین میں مسلمانوں کے بھائی تھے۔ اور ان کے حقوق مساوی تھے۔ بعض ایسے لوگ بھی تھے جو بدعہدی کے بعد پھر صلح اور امن کے خواستگار ہوتے "وان جنحوا للسلم فاجنح لها وتوکل علی اللہ، انہ ھو السمیع العلیم۔ وان یریدوا ان یخدعوک فان اللہ حسبک اللہ، ھو الذی ایدک بنصرہ وبالمؤمنین" اگر وہ صلح پر مائل ہوں تو صلح منظور ہے خواہ یہ صلح از راہ فریب ہی کیوں نہ ہو۔ اگر پھر فریب کا ارادہ کریں تو آخر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اس سے پیشتر بھی غالب کیا۔ اور اب بھی وہی کارساز ہے۔ مگر وہ مشرک جو اپنے عہد پر قائم ہیں۔

"الا الذین عاھدتم من المشرکین ثم لم ینقصوکم شیئاً ولم یظاھروا علیکم احداً فاتموا الیھم عھدھم الی مدتھم، ان اللہ یحب المتقین" ایسے مشرکوں کے ساتھ عہد و پیمان کے موافق جس قدر مدت تک وہ اس عہد کو نبھا سکیں سلوک کرنا چاہئے۔ تقویٰ اسی کا نام ہے جو اللہ تعالیٰ کو پسندیدہ ہے اور "ان نکثوا ایمانھم من بعد عھدھم وطعنوا فی دینکم فقاتلوا ائمۃ الکفر، انھم لا ایمان لھم لعلھم ینتھون" یہ وہ لوگ ہیں قسمیں کھا کر عہد و پیمان باندھے اور پھر توڑ ڈالا۔ اور اسلام کو مورد طعن بنایا۔ ان لوگوں کی بدعہدی حد سے گذر گئی کئی بار قسمیں کھائیں، صلح اور امن کا عہد باندھا اور توڑا۔ ایسے لوگ تو فی الحقیقت کفر کے سرغنہ ہیں ان سے کبھی توقع نہیں ہوسکتی کہ امن سے زندگی بسر کریں گے اور دوسروں کو چین سے بیٹھنے دیں گے۔ قسمیں کھا کر بھی اپنی شرارت سے باز نہیں آتے۔ ان لوگوں کی قسموں کا کیا اعتبار ہے۔ ایسے لوگوں کا قلع قمع ہی دنیا میں امن قائم کرنے کے لئے بہتر ہے جس سے جہان پاک ہو۔ "الا تقاتلون قوماً نکثوا ایمانھم وھموا باخراج الرسول وھم بدءوکم اول مرۃ" اور مسلمان ایسی قوم سے کیوں نہ لڑتے جو ہر بار بدعہدی کرتے رہے رسول اللہ کو مکہ سے ہجرت پر مجبور کیا اور اب مدینہ سے خارج کرنے پر آمادہ تھے اور کسی طرح پیچھا ہی نہ چھوڑتے تھے۔ اور خود بانیٔ فساد تھے۔ ابتداءً شر بھی ان کی طرف سے ہوتا رہا۔

مذکورہ بالا آیات سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے ایک عرصہ تک کفار اور مشرکین کی سختیاں برداشت کیں۔ اور صبر کرتے رہے۔ لیکن جب ان کا ظلم حد سے بڑھ گیا اور وہ رسول کے قتل پر آمادہ ہوئے تو آپ نے مجبوراً ہجرت کی اور مسلمان بھی آوارہ خانماں ہوئے۔ کفار نے اس پر بھی اکتفا نہ کی بلکہ کسی طرح

اپنی شرارتوں سے باز نہ آئے۔ اِدھر مسلمانوں کی جمعیت بھی بڑھ گئی اور تقویت پیدا ہو گئی۔ اور کفار کو رفتہ رفتہ مغلوب کر لیا۔ مگر اس غلبہ سے وہ فائدہ نہ اٹھایا جو کفار نے اُٹھایا تھا۔ انہیں موقع دیا گیا کہ صلح اور امن سے رہیں، مگر کفار نے ہمیشہ نقض عہد کیا۔

بیشک خلافت نے ان تلواروں پر قبضہ کر لیا جو اس سے پیشتر کفار کے ہاتھ میں تھیں، لیکن ان تلواروں کو کبھی کفار کے برخلاف اس طرح استعمال نہیں کیا۔ جس طرح وہ کرتے تھے۔ اس سے صرف ان کا زور توڑنا مقصود تھا۔ تاکہ آیندہ وہ اس ذریعے سے مسلمانوں کو نہ ستائیں۔ خلافت نے ان تمام رکاوٹوں کو اسلام کے راستہ سے ہٹا دیا جو کفار نے اپنے غلبہ کے باعث پیدا کی تھیں۔ مگر اسلام نے اپنی حقانیت کے ذریعہ لوگوں کے دلوں میں گھر کیا۔ کبھی کسی کافر کو بزور شمشیر مسلمان نہیں کیا گیا۔ البتہ کافروں کی شمشیروں کو اس واسطے اپنے قبضہ میں کیا کہ وہ کسی مسلمان پر استعمال نہ کر سکیں، اور کوئی مسلمان ان کی شمشیر سے خوف زدہ نہ ہو، اور ان کی طرف سے مطمئن ہو کر توحید کا اقرار کرے۔

مسلمانوں کو اہل کتاب سے بہت ہمدردی رہی۔ رومیوں نے پارسیوں سے شکست کھائی تو مسلمان غمگین نظر آتے تھے، اور کفار خوش تھے۔ اس لئے توقع تو یہ تھی کہ اہل کتاب کو بھی مسلمانوں سے ہمدردی ہونی چاہئے۔ کیونکہ دونوں میں اس قدر بُعد نہ تھا جس قدر کفار اور اہل اسلام میں تھا، بلکہ اہل کتاب اور مسلمان اکثر حالات میں مذہبًا ہمخیال تھے، مگر معاملہ برعکس تھا۔ اہل کتاب نے منافقانہ کارروائی کو جاری رکھا اور اکثر کفار کو مسلمانوں کے برخلاف امداد دیتے رہے۔ آخر مسلمانوں کو ان لوگوں سے بھی لڑنا پڑا، مگر باوجود غلبہ اہل کتاب کے ساتھ خاص خاص رعائتیں بمقابلہ کفار و مشرکین ملحوظ رکھیں۔ یہ رعایت اس آیت سے واضح ہوتی ہے:-

"قاتلوا الذین لا یومنون باللہ ولا بالیوم الاخر ولا یحرمون ما حرم اللہ و رسولہ ولا یدینون دین الحق من الذین اوتوا الکتب حتی یعطوا الجزیۃ عن ید وھم صاغرون"۔

اہل کتاب سے صرف جزیہ لیا گیا۔ اور یہ بھی اس لئے کہ اس سے بطور کنٹنجنٹ مسلمانوں کی ایک فوج ان کے سر پر رہے تاکہ انہیں کسی شرارت کا موقع نہ ملے۔ اگر ان کے دشمن ان پر حملہ آور ہوں تو مسلمان ان کی حفاظت کریں، اور وہ مسلمانوں کے دشمنوں سے براہ راست کسی قسم کا تعلق نہ رکھ سکیں۔ کفار سے یہ رعایت نہ تھی۔ کفار اگر بحالت امن رہیں تو مسلمانوں کی رعیت رہتے۔ لیکن اہل کتاب کی ریاست و حکومت صرف

جزیہ کی ادائیگی پر بحال رکھی گئی۔

لفظ "جزیہ" خواہ "جزا" سے مشتق ہو یا "گزیت" سے مسلمانوں نے اسے رومیوں سے سیکھا ہو یا اہل فارس سے، یہ قدیم الایام سے رائج ہو یا اسلام کی محدثات سے ہو، ہم ان امور پر بحث نہیں کرتے۔ مگر مولانا شبلی نعمانی اور جرجی زیدان سے اس امر میں متفق الرائے نہیں کہ "جزیہ کل غیر مسلم لوگوں سے وصول کیا جاتا تھا۔"

مسلمانوں کا طریق عمل مختلف زمانوں میں خواہ کچھ ہی رہا ہو اسمیں شک نہیں کہ یہ رعایت اسلام نے خاص اہل کتاب کو دی تھی۔ اسلام نے تو کفر کی جڑ ہی کاٹ دی۔ اس کے بعد دنیا میں کبھی کفر کا غلبہ نہیں ہوا۔ کفار کی حکومت حرف غلط کی طرح مٹ گئی۔ "ویرید اللہ ان یحق الحق بکلمٰتہ ویقطع دابر الکٰفرین۔" (الانفال)

ہم نے خلافت کے اصول استحقاق، ضرورت، حکومت وغیرہ کا تذکرہ کر دیا ہے تاکہ ظاہر ہو جائے کہ مسلمانوں کی دنیاوی بادشاہت کیا ہے۔"

فصل پنجم

دار الخلافت

رسول اللہ کی بعثت اور اس سے پیشتر "مکہ" عرب کی پولیٹکل طاقت کا مرکز تھا۔ ہم بیان کر آئے ہیں کعبۃ اللہ جس کا بنیادی پتھر حضرت ابراہیم نے اپنے ہاتھ سے رکھا تھا اس وقت عربوں کے اقتدار اور اعزاز کا باعث تھا۔ اور اسے برقرار رکھنے کے لئے اہل قریش نے وہ اسباب فراہم کر رکھے تھے جو ضرورتاً محسوس ہوئے۔ بنو امیہ اور بنو ہاشم کے ابتدائی حالات میں ان اسباب کا تذکرہ کیا گیا ہے لیکن فی الحقیقت جسے تمدن کہتے ہیں اس سے اہل عرب نا آشنا تھے۔ اس وقت تک عربوں نے اسکے ابتدائی مراحل بھی طے نہ کئے تھے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ یمن میں عربوں نے تمدن میں نمایاں ترقی کی تھی لیکن اس وقت وہ تقویم پارینہ تھی۔ سرزمین حجاز میں جہاں مکہ واقعہ تک ابھی تک

خانہ بدوش بدو اپنے مال مویشی کے ساتھ چراگاہوں یا قدرتی چشموں کی تلاش میں پھرتے نظر آتے تھے۔ اگرچہ انسان مدنی الطبع ہے اور قدرتاً اسے متمدن ہونا چاہئے۔ مگر اس قوم نے بیشمار صدیاں اسی خانہ بدوشی کی حالت میں بسر کیں۔ حجاز ایک ایسا قطعۂ ملک تھا جسکا تعلق متمدن دنیا سے قدرت کے زبردست ہاتھوں نے قطع کر دیا تھا۔ اس لئے نہ تو اہل حجاز اور نہ بیرونی متمدن دنیا نے ایک عرصہ تک ایک دوسرے کی خبر لی۔ بنی اسرائیل جو بیت المقدس کی بربادی کے بعد اور رومی حکام کے ظلم و ستم سے تنگ آ کر حجاز کے خشک صحراؤں میں پناہ گزین ہوئے۔ آخر مکہ و مدینہ اور طائف میں آباد ہو گئے بنو اسمٰعیل کو ان سے خاص تعلق تھا۔ اس لئے رفتہ رفتہ ان کی طبیعتیں بھی عربی وحشت سے مانوس ہوتی گئیں۔ ایام جاہلیت اور بعثت کے وقت ان کے متعدد قبائل مذکورہ بالا شہروں میں آباد تھے۔ لیکن ان کے تمدن نے عربوں پر کچھ نمایاں اثر نہ کیا۔

ایام جاہلیت میں اہل عرب میں اسی تمدن کے آثار پائے جاتے ہیں جو ہر ایک قوم کے تمدن کے ابتدائی مرحلے ہیں۔ مختلف قبایل کے سردار خود مختار بادشاہ تھے۔ اور ہر ایک مہم کا سرانجام انکی ذات سے وابستہ تھا۔ مگر ایسا سردار وہی شخص ہو سکتا تھا جو اپنے قبیلہ میں ذاتی اوصاف کے باعث ممتاز ہو۔ بسا اوقات ان قبائل میں خانہ جنگی کی آگ برسوں مشتعل رہتی اور بعض اوقات یہ قبیلے متفقہ طاقت کے ساتھ غیر حملہ آور کا مقابلہ کرتے۔ یہ امور ایسے تھے جو ان کے آیندہ تمدن میں کام آئے۔

عرب جس سے ہماری مراد سرزمین حجاز ہے ایک عرصہ سے اس عظیم الشان تمدن کے لئے تیار ہو رہا تھا جسنے دنیا میں انقلاب پیدا کر دیا۔ مکہ انکی پولیٹکل اور مذہبی طاقت کا مرکز تھا اور اس جگہ اہل قریش سب قبایل کا سردار تھا۔ محمد مصطفٰے بھی اسی قبیلہ میں پیدا ہوئے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ شمع اسلام کے سامنے تاریکی جہالت کافور ہو رہی تھی۔

بعثت اور تبلیغ کے ایک عرصہ تک مکہ اسی طرح عرب کی طاقتوں کا سرچشمہ رہا لیکن جب رفتہ رفتہ اسلام نے فروغ پایا تو مسلمانوں کے لئے مکہ میں آزادانہ اور امن کے ساتھ زندگی بسر کرنا بشکل ہو گیا اور کفار مکہ رسول اللہ کے قتل کا مصمم ارادہ کر چکے تھے۔ اور اس سازش میں ہر ایک قبیلہ کے ایک ایک آدمی نے اس لئے حصہ لیا تھا کہ بنو ہاشم کسی ایک قبیلہ سے انتقام نہ لے سکیں اس حالت میں رسول اللہ نے مدینہ کی طرف ہجرت کی۔ دشمن نقش قدم پر آ رہا تھا۔ اور آپ ایک غار میں چھپے بیٹھے تھے۔ یار غار

صدیق اکبرؓ ساتھ تھا۔ کہا کہ ہم دو ہیں اور دشمن بے شمار ہیں۔ "ثانی اثنین اذ ھما فی الغار اذ یقول لصاحبہ لا تحزن ان اللہ معنا"۔

ہجرت سے پیشتر اہل مدینہ سے عہد و پیمان ہو چکا تھا اور بہ شب جمعہ آنحضرتؐ نے مکہ کو الوداع کہا، یہ ہجرت کا پہلا سال ۱۵ جولائی ۶۲۲ء کے مطابق ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ ایک واقعہ جو بظاہر قابل التفات نہیں ہوتا عظیم الشان نتائج پیدا کرتا ہے۔ ہجرت کا پہلا سال اہل اسلام کی قومیت کا بنیادی پتھر سمجھنا چاہئے، بروز جمعہ آنحضرتؐ یثرب میں داخل ہوئے۔ یثرب مکہ کی طرح "وادی غیر ذی زرع" نہ تھا۔ اس کے مضافات میں کھلے میدان اور سرسبز چراگاہیں تھیں لیکن اسکی حیثیت ایک آباد گاؤں سے بڑھ کر نہ تھی۔ آنحضرتؐ ایک اونٹنی پر سوار تھے۔ ہر ایک شخص استدعا کرتا تھا کہ مہمانی کا فخر نصیب ہو۔ مگر آنحضرتؐ نے فرمایا کہ جس گھر کے سامنے اونٹنی خود بخود بیٹھ جائیگی اُسی جگہ میرا قیام ہوگا۔ یہ دولت سرمدی ابو ایوب رضؓ انصاری کے حصہ میں آئی۔

تھوڑے عرصہ میں یثرب مدینۃ النبی بن گیا۔ اور مدینۃ النبی تمام عرب اور بعد ازاں عراق۔ ایران اور شام اور مصر کا دار الخلافت ہو گیا۔ اگرچہ مدینہ مسلمانوں کی پولیٹکل طاقت کا مرکز تھا اور مکہ سے اس طاقت کا انتقال ہو گیا لیکن مذہبی طاقت کا مرکز مکہ ہی رہا۔ جہاں مکہ مبارک کعبۃ اللہ کی عمارت قدیم الایام سے موجود ہے اور جسکی طرف رسول اللہ اور آپکے صحاب کا رُخ بوقت عبادت رہتا تھا۔

فتح مکہ کے بعد ہجرت کا اختتام ہو گیا۔ رسول اللہ نے مدینہ منورہ میں ہی مستقل رہائش اختیار کی اور اسی جگہ وفات کے بعد مدفون ہوئے۔ صدیق اکبر۔ فاروق اعظم۔ اور ذوالنورین نے مدینۃ النبی کو دار الخلافت برقرار رکھا۔ لیکن مؤخر الذکر خلیفہ کی شہادت کے بعد حضرت علیؓ نے کوفہ کو مقر خلافت قرار دیا۔ کوفہ کی بنا ۱۶ھ میں حضرت عمرؓ کی خلافت میں ڈالی گئی تھی۔ فتح عراق اور تسخیر ایران کے بعد سعد بن وقاص نے مدائن دار السلطنت کسریٰ میں رہائش اختیار کی، اور کسریٰ کی کوشک سفید کو "دار الامارۃ" بنا دیا۔ عربی سپاہ کا ایرانی پایہ تخت میں قیام کرنا فاروق اعظم کو ناگوار گذرا۔ دور اندیش مدبر کو معلوم تھا کہ ایرانی تمدن کا اثر عربوں پر ضرور ہوگا اور بہت جلد آرام طلب ہو جائینگے۔ آب و ہوا کی ناموافقت بھی ایک بہانہ تھا۔ ریگستان عرب کے باشندے ایسے شہروں میں طاقت و توانائی اور قدرتی ولولے برقرار نہ رکھ سکتے تھے۔ تھوڑے دنوں میں ان کا رنگ روپ متغیر ہو گیا حضرت عمرؓ نے

سعد کو لکھا کہ چھاؤنی کے لئے کوئی ایسی جگہ تلاش کرو جو دریا کے کنارہ اور خشکی سے متصل ہو یعنی مقر خلافت
کے درمیان کوئی دریا یا پل حائل نہ ہو۔ سلیمان بن ربیعۃ الباہلی اور حذیفہ بن محصن نے دریاء فرات کے
کنارہ پر وہ قطعہ زمین انتخاب کیا جو حیرہ اور فرات کے مابین واقع ہے۔

ابتداء میں کوفہ میں صرف بانسوں کی جھونپڑیاں بنائی گئیں جسکے چاروں طرف عربی سپاہ کے
خیمے ایستادہ نظر آتے تھے۔ حضرت عمرؓ خشت خام یا پختہ عمارتوں کی اجازت نہ دیتے تھے۔ اُن کے
تاکیدی احکام کا مضمون یہی تھا کہ پختہ اور بلند عمارتیں عیش پسند طبائع کی اختراع ہے۔ اور آرام طلبی
اور کاہلی کے سامان ہیں جو جہاد فی سبیل اللہ کے لئے سخت رکاوٹیں ہیں۔ خبردار رومیوں اور ایرانیوں
کی طرح تن آسانی اور دولت فراہم کرنے میں نہ پڑنا۔ ہر وقت سفر کے لئے تیار رہو۔ کاشتکاری سے
باز آؤ وغیرہ وغیرہ۔ ایک دفعہ ان پھوس کی جھونپڑیوں میں آگ لگ گئی تو خشت خام کی عمارتوں کی اجازت
مجبوراً دیدی۔ مگر اسپر بھی شرائط کی قید لگادی کہ بلند نہ ہوں اور کوئی شخص تین کمروں سے زیادہ نہ بنائے۔

یہ زمانہ گذر گیا۔ مسلمانوں نے تھوڑے عرصہ میں متمدن دنیا کو مسخر کرلیا اور یہ ناممکن تھا کہ ان کی
طبائع پر اس کا اثر نہ ہو۔ حضرت عثمانؓ کی خلافت میں کوفہ ایک بارونق شہر بنگیا اور چونکہ ایک سرسبز
ملک میں واقع تھا اس لئے اسکی آبادی میں روزافزوں ترقی ہوتی گئی۔ بلحاظ تمدن مدینہ کو مکہ پر اور
کوفہ کو مدینہ پر ترجیح ہے۔ ممکن ہے کہ حضرت علیؓ کو انتقال دارالخلافت کے وقت یہی امور مدنظر ہوں۔ مگر
واقعات شاہد ہیں کہ اہل عرب پر جن سے ہماری مراد اہل حجاز ہیں خلیفہ چہارم کو اعتماد نہ تھا۔ اور ان
لوگوں میں آپ کو بھی ہر دلعزیزی حاصل نہ تھی۔ کوفہ کو اس لئے انتخاب کیا گیا کہ نئی آبادی میں ہواخواہ
جمع ہوکر خلافت کو تقویت دیں گے۔ اور اہل کوفہ قدرتاً انتقال خلافت پر حضرت علیؓ کی امداد کریں گے ہجرت
اور انتقال خلافت میں مشابہت ہے۔ مگر دونوں کا نتیجہ مختلف ہے۔ اور اختلاف کے وجوہات سے ثابت ہوتا ہے
کہ حضرت علیؓ ایسے جانثاروں کی جماعت بہم نہ کرسکے جو مدینہ میں آنحضرتؐ کے وقت جمع ہوگئے تھے۔
اور نیز یہ وقت انتقال دارالخلافت کے لئے موزون نہ تھا۔ مگر حضرت علیؓ مجبور تھے۔ مدینہ اور کوفہ ایک دوسرے
کے حریف شہر بن گئے اور حضرت علیؓ اور اہل حجاز میں بُعد بڑھتا گیا۔ اس کا فائدہ دمشق کو ہوا۔

اگر کوفہ مستقل مقر خلافت بن جاتا اور حضرت علیؓ کو اپنے ارادوں میں کامیابی حاصل ہوتی تو کچھ
شک نہیں کہ کوفہ عراق۔ ایران۔ شام پر حکومت کرنیکے لئے نہایت موزون جگہ تھی۔

عراق میں خوارج کی آبادی کا بہت بڑا حصہ تھا، حجاز میں عربی خودسر تھے، اس لئے حضرت علیؓ کے لئے انتقال دارالخلافت کچھ مفید ثابت نہ ہوا،

دمشق ایک متمدن شہر تھا۔ اور امیر معاویہؓ بیس سال سے بحیثیت عامل اس جگہ کام کر رہے تھے، بنوامیہ ان کی پشت پناہ تھے، اور اسمیں کچھ شک نہیں کہ وہ بذاتہ حکومت کے قابل تھے، ہمیں یقین ہے کہ حضرت علیؓ کا مرتبہ بہ نسبت امیر معاویہؓ بہت بلند ہے۔ اور انکی موجودگی میں امیر معاویہؓ دنیا اسلام میں بہتر آدمی نہ تھے، لیکن ہر دو اصحاب کے خصائل میں ایسی باتیں پائی جاتی ہیں جن کا موازنہ کرنے سے پلہ امیر معاویہؓ کا بھاری رہتا ہے، اس زمانہ کے تواریخی واقعات پر غور کرنے سے ایک محقق اس زمانہ کی خصوصیات اور ضروریات کو سمجھ سکتا ہے، اس لئے ان پر طویل بحث کی ضرورت نہیں، حضرت عثمانؓ کی شہادت اور اسکے نتائج پر ہم مفصل بحث کر چکے ہیں۔ ان واقعات کو مد نظر رکھ کر حضرت علیؓ اور امیر معاویہؓ کو حریفانہ کارنامہ پر غور کرنا چاہئیے، پھر اس سوال کا جواب کہ کوفہ کس لئے مدینہ کی جگہ دارالخلافت قرار دیا گیا؟ آسان ہو جائیگا اور یہ امر کہ حضرت علیؓ کو عربیوں پر اعتماد نہ تھا یا دوسرے لفظوں میں عربی آپکے حامی نہ تھے واضح ہو جاتا ہے۔ ان سب حالات پر غور کرنے سے ان وجوہات کا پتہ ملتا ہے جن پر حضرت علیؓ کی ناکامیابی کا انحصار ہے، صاحب "ناسخ التواریخ" جو اہلبیت کی محبت کا دم بھرتا ہے اور بزمرہ شیعان علیؓ ہے۔ لکھتا ہے کہ "وہ چار آدمیوں کو عقلائے عرب سے شمار کیا گیا ہے، یعنی معاویہؓ بن ابی سفیان و عمروؓ بن العاص و مغیرہؓ بن شعبہ اور زیاد جب حضرت علی علیہ السلام مسند خلافت پر بیٹھے۔ مغیرہ نے کہا۔ امیر المومنین ایک نصیحت کرتا ہوں، فرمایا، کہو۔ کہا۔ امارت کوفہ طلحہؓ بن عبداللہ اور بصرہ زبیرؓ بن العوام کو دو۔ اور حکومت شام پر معاویہ کو بحال رکھو، جب استقلال خاطر خواہ ہوگا۔ اس وقت جس طرح تغیر و تبدل کرو گے خلل واقع نہ ہوگا بات یہ ہے کہ مغیرہ کی نظر نظم مملکت و سلطنت پر تھی اور دقائق شریعت سے غافل تھا۔ اور حضرت علی علیہ السلام دقیقہ حکومت معاویہ اور شام حرام می دانست"

اور معصوم کبھی محرمات کا مرتکب نہیں ہوتا۔ اگرچہ ان کا نتیجہ منافع کثیرہ دنیا و آخرت ہی کیوں نہ ہو۔ بالجملہ علی علیہ السلام نے مغیرہ کی نصیحت قبول نہ کی۔ دوسرے دن پھر حاضر خدمت ہو کر کہا،

"امیر المؤمنین کل جو کچھ عرض کیا تھا اسپر میں نے خود غور کیا تو معلوم ہوا کہ آپ کی رائے صائب ہے اور میرا اندیشہ خطا پر تھا۔ اتنا کہکر چلا گیا اور یہ اشعار کہے :-

"نصحت علیاً فی ابن ھندٍ نصیحۃً ‌‌ ‌ ‌ فرد فلا یسمع لھا الدھر ثانیہ
وقلت لہ ارسل الیہ بعھدہٖ ‌ ‌ ‌ ‌ علی الشام حتی یستقر معاویہ
ویعلم اھل الشام ان قد ملکتہ ‌ ‌ ‌ ‌ قام ابن ھند عند ذالک ھاویہ
وتحکم فیہ ما نرید فان حکم ‌ ‌ ‌ ‌ مذاھبہ فارفق بہ وابن راھیہ
فلم یقبل النصح الذی جئتہ بہ ‌ ‌ ‌ ‌ وکانت لہ تلک النصیحۃ کافیہ

امیر معاویہؓ تو خود عقلائے عرب میں شمار ہوتا ہے۔ مگر دیگر عقلائے وقت بھی اسی کے حامی تھے؛ جہاں اس قدر عقول متفقہ طاقت کے ساتھ کام کر رہی ہوں قیاس ہو سکتا ہے کہ ان کی مخالفت میں کیا کچھ کامیابی ہو سکتی ہے؛ تالیف قلوب[۲۳] سنت نبوی ہے۔ کاش حضرت علیؓ اسے ترک نہ کرتے۔ مغیرہؓ بن شعبہ کی نصیحت بقول صاحب ناسخ التواریخ نظم مملکت و سلطنت پر تھی۔ ہم کہتے ہیں کہ وہ تالیف قلوب کی تعلیم کر رہا تھا۔ وقائق شریعت سے نہ وہ غافل تھا اور نہ اسکی نصیحت مخالف شریعت تھی؛ طلحہؓ و زبیرؓ ایسے آدمی تھے جو بذاتہ مستحق خلافت تھے۔ کوفہ اور بصرہ کی امارت کونسی بڑی بات تھی۔ اگر امیر معاویہؓ کو حکومت شام پر بحال رکھتے تو وہ خلافت کے ماتحت کام کرتا اور یہی سمجھا جاتا کہ مملکت حضرت علیؓ کی ہے؛

حاشیہ نمبر ۲۳ - تالیف قلوب۔ محبت؛ خلق؛ تواضع؛ حلم؛ اور فیاضی سے ہوا کرتی ہے۔ یہ ایسے اوصاف ہیں کہ جس وجود میں پائے جائیں؛ وہ بذاتہ نیک ہو؛ تقاضائے وقت اور مصلحت ملکی کے لحاظ سے اگر ان اوصاف کو کام میں لایا جائے تو اسے ظاہرداری اور منافقانہ کارروائی سمجھا گیا ہے؛ ہماری رائے میں ایسی ظاہرداری کی حقیقت ایک نہ ایک دن کھل جاتی ہے؛ اور اس سے تالیف قلوب نہیں ہو سکتی رسول اللہؐ نے تالیف قلوب اپنی ذاتی خوبیوں کے اثر سے کی تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو شخص ایک دفعہ اسلام لایا وہ منحرف نہ ہو سکا۔ اور آپ کے اوصاف جمیلہ اور خصائل حسنہ نے اسے ایسا گرویدہ کیا کہ پسینہ کی جگہ خون بہانے کو تیار ہو گیا۔ یہی وجہ ہے کہ آنحضرتؐ کے اصحاب کی نظیر کسی دوسرے پیغمبر کے حواریوں یا پیروؤں میں نہیں ملتی؛ اور یہی باعث اسلام کی تقویت کا ہے۔ تالیف قلوب اسی کا نام ہے کہ بیگانہ شود حلقہ بگوش۔ امیر معاویہؓ نے جس طرح تالیف قلوب کی وہ اسی قبیل سے ہے۔ ان کا باپ اور دوسرے بھائی بند خود مولفۃ القلوب میں سے تھے۔ اور وہ بھی پیغمبرؐ کے خلق عظیم سے متاثر ہو چکے تھے۔ یہ ناممکن تھا کہ ان کے قلب پر اون اوصاف کا عکس نہ پڑتا جو رحمۃ اللعالمین کے وجود میں بدرجہ کمال پائے جاتے تھے؛

امیر معاویہ ایک مدبر اور قابل حکمران تھا۔ بیس سال تک شام میں عامل دمشق رہا۔ اس عرصہ میں تجربہ نے اِن سب باتوں کی تعلیم دی جو حکومت کے لیئے لازمی ہیں۔ طبری لکھتا ہے کہ ایک دفعہ عمروؓ بن العاصؓ عماید مصر سے کہا کہ میں نے معاویہؓ سے قوی تر اور آہستہ تر کوئی آدمی نہیں دیکھا۔

ایک دفعہ وہ بالش پر تکیہ لگائے بیٹھا تھا اور میں بھی سامنے بیٹھا ہوا تھا کہ پرچہ لگا کہ قیصر ایک لشکر جرّار کے ساتھ سرحد شام پر حملہ آور ہونا چاہتا ہے۔ نامہ پڑھ کر میری طرف پھینکدیا۔ میں خاموش رہا کہ دیکھئے کیا کہتا ہے۔ اتنے میں ایک اور نامہ آیا کہ نائل بن قیس مہتر خارج نے ایک جمعیت بہم پہونچا کر ارض فلسطین کا رخ کیا ہے۔ اسی طرح نامہ پڑھکر میری طرف پھینکدیا اور چپکا ہو رہا۔ ایک اور نامہ اس مضمون کا آیا کہ خوارج موصل کے نزدیک ایک شہر کا زندان توڑ کر نکل گئے ہیں۔ یہ نامہ بھی مجھے پڑھنے کو لئے دیا۔ کچھ عرصہ بعد ایک اور نامہ آیا کہ علیؓ ابن ابی طالب بیشمار سپاہ کے ساتھ شام پر فوجکشی کرنا چاہتے ہیں۔ میں حیران تھا کہ چاروں طرف سے متوحش خبریں آرہی ہیں اور معاویہ اسی طرح تکیہ لگائے خاموش بیٹھا تھا اسکے چہرہ پر کسی قسم کے آثار ملال وحزن وتفکر نہ پائے جاتے تھے۔ میں نے اس کیفیت کا اظہار کیا تو کہا "اے عبداللہ یہ معمولی باتیں ہیں۔ قیصر کے ہمراہ خواہ کتنی ہی فوج کیوں نہ ہو وہ شام پر حملہ کی جرأت نہیں کر سکتا۔ اور باآسانی صلح پر مائل ہو جائیگا۔ نائل بن قیس دین کے لئے جنگ نہیں کرتا اسی شہر کی خواہش رکھتا ہے جو اسکے قبضہ میں ہے۔ خوارج میرے زندان سے نکل گئے تو خدا تعالیٰ کی زندان سے کہاں جاسکتے ہیں۔ البتہ علیؓ کے متعلق مناسب تدبیر کرنی چاہئے کیونکہ مجھے اس سے خون عثمانؓ کا مطالبہ کرنا ہے۔ اِس کے بعد تکیہ لگا کر سیدھا بیٹھ گیا۔ اور مذکورہ بالا مہمات کے متعلق نہائیت عمدہ تدبیریں بتائیں، جن سے ان سب کا سرانجام خاطر خواہ ہو گیا۔ اس کے برخلاف جو کچھ تدبیر انتظام مملکت کے لئے حضرت علیؓ نے کی الٹی پڑی۔ ان کے اور امیر معاویہؓ کے مشیروں میں اتنا ہی فرق ہے جو حضرت علیؓ اور امیر معاویہ کی رائے میں تھا۔

تالیف قلوب جو نص قرآنی سے ثابت ہے اور سنت نبوی تھی حضرت علیؓ سے نہ ہو سکی۔ اس کے

قرآن شریف کی یہ آیت کہ "یا ایھا الذین امنوا اتقوا اللہ حق تقاتہ ولا تموتن الا وانتم مسلمون واعتصموا بحبل اللہ جمیعا ولا تفرقوا واذکروا نعمت اللہ علیکم اذ کنتم اعداء فالف بین قلوبکم فاصبحتم بنعمتہ اخوانا"، اخوۃ، قومیت، اور تالیف قلوب کا بیّن ثبوت ہے۔ +

برخلاف آپ کا حریف ان باتوں سے خوب واقف تھا جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت علیؓ کے اصحاب میں سے ایک کثیر تعداد تو "خوارج" کے نام سے موسوم ہوئی اور جو باقی رہے ان میں سے کچھ تو امیر معاویہ سے آملے اور بعض دونوں سے علیحدہ رہے لیکن امیر معاویہ کی جماعت سے کوئی شخص منحرف نہ ہوا۔ علامہ ابن خلدون کی تو یہ رائے ہے کہ امیر معاویہ کی ریاست و حکومت کو یوماً فیوماً اس لئے استقلال ہوتا گیا کہ وہ ایسا فیاض شخص تھا کہ اُس زمانہ میں اُس کا نظیر نہ تھا۔ رؤساء عرب اور سرداران مصر کے ساتھ کریمانہ سلوک کرتا۔ اونکی سخت اور نا ملایم باتوں کی برداشت کرتا۔ ان کے ساتھ اخلاق سے پیش آتا۔ یہاں تک کہ اس کے تحمل اور بردباری کی کوئی حد نہ تھی۔ یہی سبب تھا کہ ان کی حکومت و ریاست کو کسی قسم کی لغزش نہ ہوئی۔ ایک دن عدیؓ بن حاتم[۲۴] امیر معاویہؓ کی صحبت میں بیٹھے ہوئے تھے۔ امیر معاویہؓ نے

حاشیہ نمبر ۲۴۔ عدی بن حاتم بن عبداللہ بن سعد بن حشرج بن امراء القیس بن عدی بن اخزم بن ابی اخزم بن ربیعہ بن جرول بن ثعل ابن عمرو بن غوث بن طے طائی ہیں۔ ان کے والد حاتم کی بخشش ضرب المثل ہے اور نوشیرواں کے عدل سے کم مشہور نہیں۔ انکی ہمشیرہ سفانہ بنت حاتم باعث اسلام ہوئی۔ جب رسول اللہ کا انتقال ہوا تو عدی صدیق اکبرؓ کے پاس رات کے وقت اپنی قوم کی زکوٰۃ لیکر آئے تھے۔ اور اس وقت جب اکثر قبایل نے زکواۃ ادا کرنے سے انکار کیا عدی ثابت قدم رہے۔ اور انکی قوم بھی ثابت قدم رہی۔ عدی اپنی قوم میں ہمیشہ معزز اور قابل تعظیم سمجھے جاتے تھے۔ دیگر قبایل کے لوگ بھی ان کی عزت اور ادب کیا کرتے۔ جب فاروق اعظمؓ کا زمانہ آیا تو عدی حضرت عمرؓ کو ملنے گئے۔ بوقت ملاقات کچھ بے التفاتی محسوس کی کہا۔ "امیر المومنین کیا آپ مجھے پہچانتے ہیں؟" فاروق اعظمؓ نے کہا۔ "ہاں خدا کی قسم پہچانتا ہوں۔ تمکو اللہ نے حسن معرفت کے ساتھ مشرف کیا۔ میں تمکو پہچانتا ہوں۔ واللہ تم اس وقت اسلام لائے جب لوگوں نے کفر کیا۔ تم نے اس وقت اقرار کیا۔ جب لوگوں نے انکار کیا۔ اور جب لوگوں نے بدعہدی کی تم نے وفا کی۔ تم آگے ہوئے جب لوگ پیچھے ہٹے میں تمکو پہچانتا ہوں۔" عدی نے کہا۔ "کافی ہے مجھکو اے امیر المومنین مجھکو کافی ہے۔" عدی فتح عراق اور واقعات قادسیہ۔ مہران اور جسر میں ابو عبیدہؓ سپہ سالار افواج اسلام کے ساتھ شریک تھے اور خالدؓ بن ولید کے ہمراہ بھی اکثر فتوحات میں شامل ہوئے۔ عدی کی فیاضی کی روایتیں مشہور ہیں۔ حضرت عثمانؓ سے منحرف تھے جب حضرت عثمان غنیؓ کی شہادت ہوئی تو کہا۔ "عثمانؓ کے قتل کے عوض ایک بکری کا بچہ بھی نہ مارا جائیگا۔" واقعہ جمل میں ان کی ایک آنکھ پھوٹ گئی اور ان کا ایک بیٹا محمد بھی کام آیا۔ اور دوسرا بیٹا خارجیوں کے مقابلہ میں مارا گیا۔

ازراہ مذاق امیرالمومنین علیؑ کی مصاحبت کی چٹکی لی۔ عدی بھڑک اُٹھا اور کہا "واللہ وہ دل جو تمہاری عداوت کا جوش رکھتے تھے ابھی تک ہمارے پہلو میں ہیں اور وہ تلواریں جن سے ہم تم سے لڑے ابھی تک ہمارے قبضہ میں ہیں۔ اگر تم ایک بالشت بھی بدعہدی سے ہماری طرف بڑھو گے تو ہم بُرائی سے تمہاری طرف پانچ ہاتھ بڑھیں گے۔ ہم موت کو ترجیح دیتے ہیں بہ نسبت اس کے کہ علیؑ ابن ابی طالب کے حق میں کوئی ناملایم کلمہ سنیں۔ اے معاویہ تلوار کا جواب تلوار ہے اور

"بشر کا دل جہاں میں آئینہ ہے دوسرے دل کا
ملینگے ہم اُسی دل سے کہ جو جس دل سے ملتا ہے"

امیر معاویہؓ نے حاضرین سے مخاطب ہوکر کہا کہ "یہ باتیں نہایت صحیح ہیں ان کو لکھ لو" پھر عدی کی طرف متوجہ ہوئے اور نہایت نرمی اور ملاطفت سے گفتگو کرتے رہے۔

علامہ جلال الدین سیوطی نے بھی ایک روایت اسی قسم کی جاریہ بن قدامہ کے متعلق لکھی ہے کہ ایک روز امیر معاویہؓ نے اُسے کہا کہ تم طرفداران علیؑ میں سے تھے اتنا نہ سمجھا کہ خانہ جنگی کی آگ تمام عرب کو جلا کر راکھ کردے گی۔ جاریہ نے ایسا دنداں شکن جواب دیا کہ امیر معاویہؓ نے کہا "تجھ پر حیف ہے کہ تو اپنے خاندان پر بھی بھاری تھا تب ہی تو تیرا نام انہوں نے جاریہ (لونڈی) رکھ دیا" جاریہ نے کہا کہ اپنے خاندان پر

ابو طریف نے کہا کہ "عثمانؓ کی شہادت میں بکری کا بچہ مارا گیا" جواب دیا "ہاں خدا کی قسم فَدَیْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِیْمٍ (ہم نے بڑی قربانی کو فدیہ دیا) جنگ صفین میں حضرت علیؑ کا ساتھ دیا۔ اور جبتک خلافت چہارم کا خاتمہ نہ ہوا۔ امیر معاویہؓ کے مقابلہ پر تُلے رہے۔ اور کوفہ میں رہائش رکھتے تھے۔ زیاد گورنر کوفہ تھا اور ابھی تک انتظام مملکت خاطرخواہ نہ ہوا تھا۔ عدی کے چچازاد بھائی عبداللہ بن خلیفۃ الطائی ایک شورش کے سرغنہ تھے۔ زیاد نے انکی گرفتاری کا حکم دیا تو عدی نے پناہ دی۔ زیاد نے انکو گرفتار کیا اور کہا کہ "اپنے بھائی کو میرے حوالے کردو تو بہتر ہے" جواب دیا کہ "تیرا مدعا یہ ہے کہ میں اسے تیرے حوالہ کردوں کہ تو اسے قتل کرے۔ واللہ اگر وہ میرے قدموں کے پیچھے ہوتا تو میں اس کو ہرگز نہ اٹھاتا" زیاد نے عدی کو قید خانہ میں بھیجدیا۔ اس سے عوام الناس میں سخت ناراضی پیدا ہوئی اور آپسمیں صلاح و مشورہ کرکے زیاد کے پاس آئے اور کہا "بڑے غضب کی بات ہے کہ تو یہ فعل اصحاب رسول اللہ اور سردار قبیلہ طے سے کرتا ہے" زیاد نے مصلحتاً چھوڑ دیا۔ اسکے بعد عدی امیر معاویہؓ سے ملے اس جگہ آئے تو امیر معاویہؓ بہت عزت اور احترام سے پیش آئے چند روز میں دوست بن گئے۔

تو ہی بھاری ہوگا کہ تیرا نام معاویہ رکھدیا۔ اور تو تو ایک طرف امیہ تصغیر ہے امۃ (لونڈی) کی۔ خبردار! جنگ صفین کا واقعہ یاد کرو کیا ہماری تلواروں کی باڑھ تجھے بھول گئی ہے"۔ امیر معاویہؓ نے کہا، "کیا تو مجھے دھمکاتا ہے"۔ جاریہ[۲۵] نے کہا "اتنا سمجھ لے کہ تو نے ہمیں بزور شمشیر زیر نہیں کیا۔ بلکہ ہم نے تجھے ملک بذریعہ عہد کے دیا ہے۔ اگر تو ایفا کریگا تو ہم بھی وفا کریں گے۔ اگر خلاف ورزی کرے گا تو یاد رکھ کہ ہمارے مددگار ایسے لوگ ہیں جنکی زرہیں نہایت مضبوط ہیں اور ان کی زبانیں لوہے کی ہیں۔ اگر تو نے عہد شکنی کی تو ہم بھی تجھے بغاوت کا مزہ چکھاویں گے"۔ امیر معاویہؓ نے ہنستے ہوئے کہا کہ "خدا کرے تیرے جیسے آدمی دنیا سے ناپید ہی ہو جائیں"۔

اس سے بڑھکر امیر معاویہؓ کی ہردلعزیزی کا کیا ثبوت ہوگا کہ خود علیؓ کے بھائی عقیل[۲۶]رضؓ بن ابی طالب امیر معاویہؓ سے آملے۔ دونوں ایسے دوست تھے کہ انکی گفتگو میں بے تکلفی کا مزہ آتا ہے۔ ایک روز امیر معاویہؓ

حاشیہ نمبر ۲۵۔ جاریہ ابن قدامہ طرفداران حضرت علیؓ سے تھے۔ امیر معاویہ نے عبداللہ بن حضرمی کو بصرہ پر قبضہ کرنے کے لئے بھیجا۔ اس وقت زیاد حضرت علیؓ کیطرف سے عامل بصرہ تھا۔ کمک طلب کی حضرت علیؓ نے اعینؓ ابن ضبیعہ بن ناجیہ کو کچھ سپاہ کے ساتھ بھیجا۔ اعین حضرت علیؓ کے جان نثاروں میں سے تھے۔ جنگ جمل میں اسی نے اُس اونٹ کے پیر کاٹے تھے جسپر عائشہ صدیقہؓ سوار تھیں۔ اس وقت عبداللہ بن حضرمی سے مقابلہ ہوا تو کس مپرسی کی حالت میں مارا گیا۔ حضرت علیؓ نے جاریہ بن قدامہ کو روانہ کیا۔ جاریہ نے عبداللہ کو ایک مکان میں محصور کرکے آگ لگادی اور اس طرح زندہ ہی جلوادیا۔ اور اسکی جماعت کو متفرق کردیا۔ یہ وقعہ ۳۸ھ کا ہے۔ جاریہ ہمیشہ حضرت علیؓ کے ہمرکاب رہے اور آپکے دشمنوں کا مقابلہ کیا۔ آخر سال جماعت میں امیر معاویہ کے ہاتھ پر بیعت کی"۔

حاشیہ نمبر ۲۶۔ عقیل ابن ابی طالب قریشی ہاشمی ہیں۔ رسول اللہ کے چچازاد اور علیؓ اور جعفرؓ کے علاتی بھائی تھے۔ دونوں بھائیوں سے بڑے تھے۔ رسول اللہ فرمایا کرتے کہ "تمکو بسبب دو محبتوں کے زیادہ محبوب رکھتا ہوں۔ ایک حب قرابت کی وجہ سے اور دوسرے یہ کہ تم سے اپنے چچا کی محبت کا میں زیادہ عالم ہوں"۔ غزوہ بدر میں مشرکین کے ساتھ تھے۔ اسی روز گرفتار ہوئے۔ مال کچھ پاس نہ تھا۔ ان کے چچا عباسؓ نے فدیہ دیا۔ واقعہ حدیبیہ سے پہلے مسلمان ہوئے۔ قریش کے نسب اور وقائع سے بخوبی واقف تھے یہ ان چار شخصوں میں سے تھے جنکو لوگ اپنا حکم بناتے۔ اور تو قریش کے محاسن بیان کیا کرتے اور عقیلؓ

کے پاس گئے۔ امیر نے دیکھکر حاضرین سے کہا کہ "یہ عقیلؓ ہیں ان کے چچا ابولہب تھے" حضرت عقیلؓ نے کہا "یہ معاویہ ہیں ان کی خالہ حمالۃ الحطب تھی"

امیر معاویہؓ کا حلم ضرب المثل تھا۔ حجرؓ بن عدی امیر معاویہؓ کے حکم سے قتل کیا گیا جسکا افسوس کل دنیائے اسلام کو ہوا۔ ام المؤمنین عایشہ صدیقہؓ نے امیر معاویہؓ سے کہا "این حلمك عن حجر" امیر معاویہؓ نے جواب دیا "لم یحضرنی رشید" مالک بن ہبیرہ مقتول کے دوست تھے۔ انکی سفارش نامنظور ہوئی تو اپنی قوم کو جمع کیا اور حجر کے چھڑانے کے لئے روانہ ہوئے۔ اثناء راہ میں ایک شخص نے کہا کہ "وہ تو فرش خاک پر موت کی گہری نیند میں ہے۔ اب سب کوششیں بے فایدہ ہیں" مجبورًا واپس ہوا۔ امیر معاویہؓ کو اطلاع ہوئی تو کہا "یہ ایک جوش تھا جو اس کے دلمیں بھرا ہوا تھا۔ مجھے امید ہے کہ اب وہ فرو ہو رہا ہوگا" پھر ایک ہزار درہم مالک کے پاس بھیجے اور یہ کہلا بھیجا کہ میں نے تمہاری سفارش اس وقت اس وجہ سے منظور نہ کی کہ خوف تھا کہ از سر نو آتش جنگ مشتعل نہ ہو جائے اور یہ امر مسلمانوں کے حق میں قتل حجر سے اہم تر تھا۔

ان کے معائب بکتے تھے۔ اس لئے لوگ ان کی برائیاں بیان کرتے جو فی الحقیقت ان میں نہ تھیں۔ ایک دفعہ مقروض ہو گئے تو حضرت علیؓ کے پاس آئے۔ کہا چالیس ہزار قرض ہے ادا کر دیجئے۔ حضرت علیؓ نے کہا کہ اتنا تو میرے پاس نہیں، لیکن تم صبر کرو مجھکو جو چار ہزار وظیفہ ملتا ہے وہ ملجائے تو نذر ہے" عقیلؓ نے کہا کہ "تم بیت المال کے مالک ہو اور مجھکو اپنے وظیفہ کی بابت تاخیر میں ڈالتے ہو" حضرت علیؓ نے کہا کہ "یہ تو مسلمانوں کی امانت ہے" کہا پھر امیر معاویہؓ کے پاس جانے کی اجازت دو" غرض اجازت لیکر امیر معاویہؓ کے پاس آئے۔ قرضہ بھی ادا کر دیا اور وظیفہ بھی مقرر ہو گیا۔ ایک روز امیر معاویہؓ نے کہا کہ "اگر ابو یزید (عقیل) مجھے اپنے بھائی سے بہتر نہ جانتے تو میرے پاس نہ رہتے" عقیلؓ نے کہا "میرا بھائی دین میں تم سے بہتر ہے اور تم دنیا میں میرے واسطے بہتر ہو۔ دنیا تو تمہارے ذریعہ سے بہتر ہو گئی۔ اور امید ہے کہ اللہ تعالیٰ "خاتمہ بھی بخیر کریگا"

کچھ شک نہیں کہ حضرت علیؓ کا مرتبہ بہ لحاظ دین بڑھا ہوا ہے۔ حضرت علیؓ نے خلافت کو بھی صدیق اکبرؓ اور عمر فاروقؓ کے اصولوں پر چلایا اور کبھی ذاتی تصرف کو جائز نہ سمجھا۔ امیر معاویہؓ نے شخصی حکومت کو قایم کیا۔ اگرچہ اس سے خلافت کے معنوں میں فرق نہیں آتا۔ لیکن جو کچھ فرق دونوں اصولوں میں ہے وہی دونوں شخصوں کے مرتبہ میں

کوفہ ایک ایسی جگہ تھی جو حضرت علیؓ نے بجائے مدینہ دار الخلافت کے لئے انتخاب کی تھی۔ اس جگہ ہوا خواہان حضرت علیؓ کا ہجوم تھا۔ اس شہر کا انتظام کچھ آسان کام نہ تھا۔ معاویہؓ نے اسکی حکومت زیاد کو دی۔ زیاد وہ شخص تھا جسے حضرت علیؓ نے فارس کا والی مقرر کیا تھا اور کچھ شک نہیں کہ بقول علامہ ابن خلدون اس نے نہایت مستعدی سے اس کا انتظام کیا تھا۔ اور حضرت علیؓ نے اسکی نسبت یہ کہا تھا کہ ابوسفیانؓ میں خیانت نفس اور جہالت تھی جسکی میراث زیاد کو نہیں ملی اور وہ ہر طرح سزاوار حکومت ایران ہے۔ جب خانہ جنگی کی آگ فرو ہوگئی اور حضرت علیؓ شہید ہو گئے تو امیر معاویہؓ نے زیاد کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ اور پھر کوفہ کی حکومت تفویض کی۔ آہن با آہن کوفتن کا معاملہ ہوا۔

زیاد نے نہایت قابلیت مگر سختی سے کوفہ کا انتظام کیا۔ بعض لوگوں کے قتل کا حکم صادر کیا۔ وہ دمشق میں امیر معاویہؓ کے پاس پہونچے۔ معذرت کی۔ معاف کر دیا۔ زیاد نے لکھا کہ "امیر المومنین انتظام مملکت اس طرح نہیں چلیگا۔ جس شورہ پشت کو میں قتل کرنا چاہتا ہوں آپ اُسے امان دیتے ہیں" جواب میں لکھا کہ "درشتی و نرمی بہم در بہ است۔ اگر دونوں طرف سے سختی ہو تو امن قایم نہیں رہ سکتا"

امیر معاویہؓ نے حلم اور تواضع اور خلق اور فیاضی سے لوگوں کے دلوں میں گھر کر لیا تھا۔ عقلائے زمانہ اسکے دست و بازو تھے۔ اور بذاتہ وہ ہر ایک پہلو سے قابل حکمران تھا۔ یہ اوصاف ہیں جو امیر معاویہؓ کی ریاست اور حکومت کے استقلال کا باعث ہوئے ہے۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ جو اوصاف حمیدہ حضرت علیؓ کی ذات ستودہ صفات میں موجود تھے وہ امیر معاویہؓ میں نسبتاً کم تھے لیکن ضرورت وقت کو مؤخر الذکر ہی بہتر سمجھا اور اسی لئے زمانہ نے اسکی موافقت کی۔ اس سوال کا جواب کہ امیر معاویہؓ مستحق خلافت تھے۔ ہم اثبات میں دے چکے ہیں۔ صاحب ناسخ التواریخ کا یہ فقرہ کہ "علی علیہ السلام وقیقہ حکومت معاویہ را در شام حرام می دانست" مذہبی تعصب کی بیّن دلیل ہے۔ اور مورخانہ تحقیق سے ساقط ہے۔ معلوم نہیں کہ حضرت حسنؓ نے بلکہ کل بنو ہاشم اور دیگر مسلمانوں نے بالاتفاق کیوں بیعت کی اور اس لئے اس سال کا نام سال "جماعت" رکھا۔ حضرت حسینؓ نے تو اس بیعت اور اطاعت

سمجھنا چاہئے۔ شخصی حکومت سے انتخابی حکومت بہتر ہے۔ اور اسی لئے ہماری رائے میں حضرت علیؓ امیر معاویہؓ سے بہتر تھے۔ اگرچہ وہ بالاتفاق منتخب نہیں ہوئے لیکن آپ نے اپنے رویّہ سے ثابت کر دیا۔ کہ وہ مسلمانوں کے امانت دار ہیں اور خلافت کے ہر طرح قابل ہیں" +

کا مزید ثبوت یہ ویا کہ ... ... جبتک امیر معاویہؓ زندہ رہا کبھی دعوئے خلافت نہ کیا"۔

کوفہ بہت تھوڑا عرصہ دار الخلافت رہا۔ حضرت علیؓ کی شہادت پر دمشق بالاستقلال پایہ خلافت بن گیا۔ مکہ، مدینہ، کوفہ، اور دمشق، ایسے اسلامی شہر ہیں جنکی حکومت متمدن دنیا پر ایک عرصہ تک رہی اور اس لئے جو کچھ وقعت بلحاظ تمدن ان شہروں کو حاصل ہوئی قابل ذکر ہے۔ ان میں سے دمشق کے حالات ہم لکھ رہے ہیں۔ دیگر شہروں کی نسبت ہماری یہ رائے ہے کہ مکہ و مدینہ ایسی مناسب جگہ پر واقع نہیں تھے کہ کچھ عرصہ بعد وہ متمدن دنیا کے پایہ تخت برقرار رہ سکتے۔ مکہ تو ابتدا سے اس واسطے دار الخلافت منتخب نہ ہوا کہ رسول اللہ نے یثرب کو مدینۃ النبی بنا دیا۔ بات اصل میں یہ ہے کہ آنحضرت مکہ معظمہ کی حرمت کو قایم رکھنا چاہتے تھے۔ اگر مکہ میں بالاستقلال رہایش رکھتے اور ان کے بعد مکہ دار الخلافت ہوتا تو کچھ شک نہیں کہ حرمت کعبۃ اللہ میں فرق آجاتا۔

عبد اللہ بن زبیرؓ نے غلطی سے اسے مقر خلافت بنانا چاہا۔ اس عرصہ میں جو کچھ حرم میں خونریزی ہوئی اور کعبۃ اللہ کی حرمت کا پاس نہ کیا گیا تواریخی واقعات سے ثابت ہے۔ کعبۃ اللہ کی حرمت اسی میں ہے کہ روند خلق بدیدارش از بسے فرسنگ اور حج کا ثواب حاصل کرتے ہیں اور فی الحقیقت تا قیامت مسلمانوں کی مذہبی طاقت کا مرکز ہے۔ اگر کعبۃ اللہ کی حرمت میں کسی قسم کا فرق آوے تو ضعف اسلام کی دلیل ہے۔ کعبۃ اللہ کی وقعت دار الخلافت سے بہت بڑھی ہوئی ہے۔

مدینۃ النبی جیسا کہ ہم نے لکھا ہے کچھ عرصہ بعد متمدن دنیا کا پایہ خلافت نہیں رہ سکتا تھا حضرت عمرؓ کو بصرہ اور کوفہ اور فسطاط مصر یعنی عربی فوجی چھاونی قایم کرنیکے وقت اسی مشکل کا سامنا تھا۔ انکا یہ حکم کہ مقر خلافت کے درمیان کوئی دریا یا پل حایل نہ ہو اور خلیفہ وقت جب چاہے اونٹ پر سوار ہوکر سیدھا آسکے اسی وقت کا اظہار کرتا ہے۔ اگر دار الخلافت کسی دریا، یا سمندر کے کنارہ پر ہوتا تو بلحاظ تمدن اعلیٰ پایہ کا ہوتا۔ کوفہ میں یہ خوبیاں تھیں، مگر دمشق کے سامنے اسے عروج حاصل نہ ہوا"۔

باب (۲) دوم

فصل اول

عمال خلافت

امیر معاویہ ۴۱ھ میں بالاتفاق اہل اسلام اور بالاستقلال بلا شرکت غیری دنیائے اسلام پر خلیفہ تسلیم کیا گیا۔ اس لئے اس سال کا نام "سال جماعت" رکھا گیا۔ اس وقت ایک طرف ترکستان تک اور دوسری طرف شمالی افریقہ کی بعض ریاستوں تک فتوحات اسلامی کا سلسلہ پہونچ چکا تھا۔ اگر خانہ جنگی مسلمانوں کو اس طرف مصروف نہ رکھتی تو انکی طبعی بہادری کے جوہر غیر اقوام کے مقابلہ میں مفید مطلب نتیجہ پیدا کرتے۔ یہی مسلمان سپاہی اس وقت بھی موجود تھے جنہوں نے حیرت انگیز سرعت کے ساتھ ایران اور شام اور مصر پر قبضہ کر لیا۔ قیصر اور کسریٰ کی عالیشان سلطنتوں کی بنیادیں ہلا دیں۔ اور بقول گبن زیادہ تر حیرت کی یہ بات ہے کہ ان ممالک پر انکا قبضہ بالاستقلال ہو گیا۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ یہ ممالک اب تک مسلمانوں کے قبضہ میں ہیں۔ اگر یہ فہمند اور دلاور قوم اپنی ہمتوں کو "واعتصموا بحبل اللہ جمیعا ولا تفرقوا" کی عامل بناتی۔ تو جو کچھ ہماری خواہش ہے پوری ہوتی۔ ایشیائے کوچک میں ابھی تک رومی حکومت تھی۔ کوہ لبنان اسلامی اور عیسائی سلطنتوں میں حد فاصل تھا۔ اس پر آشوب زمانہ میں جسکا تذکرہ ہم کر چکے ہیں مسلمانوں کو رومی حملوں کی مدافعت کا بھی خیال تھا۔ اس لئے وقتاً فوقتاً چھوٹی چھوٹی لڑائیوں سے خانہ جنگی کا زمانہ ختم کر دیا۔ پیشتر اسکے کہ ہم ان واقعات کو مفصل بیان کریں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ عمال خلافت کا بالاختصار تذکرہ کریں۔

مصر بقول گبن سب سے پہلا امیر عمرو بن العاص فاتح مصر کا ہے۔ اس مدبر، بہادر، فہمند شخص کا نام مشاہیر اسلام میں شمار ہوتا ہے۔ اور اس کے کارنامے زیادہ تر "القاہرہ" سے متعلق ہیں (جو اس سلسلہ میں تیسری جلد ہے) عمرو کو مصر کے حالات سے بخوبی واقفیت تھی۔ ایام جاہلیت میں اس طرف تجارتی قافلوں کے ساتھ بہت دفعہ سفر کیا۔ فاروق اعظم کے عہد خلافت میں

مصر کو سات ماہ کے عرصہ میں مسخر کرلیا۔ اور اسلام میں پہلا شخص ہے جو حکومت مصر پر ممتاز ہوا۔ اس شخص کی سوانح عمری اسلام کی حقانیت کے دلایل ہیں۔ ابتدا میں اسلام اور مسلمانوں کا سخت دشمن تھا یوں تو عرب شاعری کی زاد بوم ہے اور اس کا ہر ایک بچہ شاعر ہے لیکن عمرو بن العاص کا مرتبہ اس حیثیت سے بھی کم نہیں ہے۔ اسکی آتش بیانی عرب میں زبان زد خلایق تھی۔ اسکی تحریر اور تقریر فصاحت و بلاغت مجسم تھی۔ اسکی تلوار جو فرزدق شاعر کی سیف زبان سے مشابہ تھی ارض فلسطین اور شام میں جوہر دکھا چکی تھی۔ مصر کو جس آسانی اور سرعت کے ساتھ فتح کیا وہ اسکی ذاتی قابلیت کا بیّن ثبوت ہے۔ خلیفہ دوم کے عہد میں عامل مصر رہا۔ اور اس ملک کا انتظام نہایت خوش اسلوبی سے کیا۔ ایک دفعہ مدینہ منورہ میں سخت قحط پڑا حضرت عمرؓ نے عمرو بن العاص کو لکھا کہ :-

"من عبد الله امیر المومنین الی العاصی سلام اما بعد فلعمری یا عمرو ما تبالی اذا شبعت انت ومن معک ان اهلک انا ومن معی فیا غوثاه ثم یا غوثاه"۔ (عبد اللہ امیر المومنین کی طرف سے عاصی کو بعد سلام واضح ہو کہ مجھے قسم ہے اپنی زندگی کی اے عمرو کہ تو اور تیرے ساتھی تو شکم سیر ہوں اور میں اور میرے ساتھی جو تیرے اہل ہیں بھوکے رہیں، فریاد، فریاد۔) عمرو بن العاص نے جواب میں لکھا کہ :- "بعبد الله امیر المومنین من عبد الله عمرو بن العاص۔ اما بعد فیا لبیک ثم یا لبیک قد بعثت الیک بعیر اولها عندک واخرها عندی والسلام"۔ (عبد اللہ عمرو بن العاص کیجانب سے عبد اللہ امیر المومنین کی طرف، ہم نے تیری فریاد سنی اور تیری طرف ایک قافلہ اونٹوں کا بھیجا ہے جس کا ایک سرا تیرے پاس ہے اور دوسرا ہمارے پاس۔ والسلام) مصر کی خوشحالی کا اندازہ اسی واقعہ سے ہوسکتا ہے ؛

عمرو بن العاص نے دریائے نیل کے کنارہ پر فسطاط[۲۷] کی بنا ڈالی۔ خلیفہ سوم کے عہد میں حکومت مصر سے معزول کیا گیا۔ اور اسکی جگہ عبد اللہ بن سعد مقرر ہوا۔ امیر معاویہؓ کے عہد میں پھر عمرو بن العاصؓ عامل مصر مقرر ہوا۔ اور اسی جگہ وفات پائی"۔

حاشیہ نمبر ۲۷۔ فسطاط ملک مصر میں مسلمانوں کا سب سے پہلا شہر یہی ہے جسکو ۱۸ھ میں عمرو بن العاص نے تعمیر کیا۔ موجودہ زمانہ میں اس کا موقع شہر قاہرہ اور مصر کہنہ کے مابین تصور کرنا چاہیے۔ اسکے باقیماندہ نشانات ابتک آج "جامع عمرو" اور "مقطم" تک قاہرہ کے گرد کھنڈر اور ویرانے ہیں۔ یہ مقام جس وقت

امیر معاویہ کی کامیابی کی وجہ ایک عمرو بن العاص بھی تھا جسکا شمار چار عقلائے عرب میں سے ہوتا ہے، جنگ صفین میں امیر معاویہ کے ہمرکاب تھا۔ اور حکمین میں سے ایک تھا؛ صاحب ناسخ التواریخ نے جس کا شیوہ طعنہ زنی ہے اور جو اصحاب رسول اللہ میں معائب بے دریغ بیان کرتا ہے عمرو بن العاص کے نسب پر سخت حملہ کیا ہے۔ جو مؤرخانہ تحقیقات سے بہت بعید ہے۔ لکھتا ہے کہ:-

اہل عرب قلعہ بابل کی فتح کے لئے آئے تھے، اس وقت انکا فوجی کیمپ تھا۔ قلعہ بابل ان دنوں مصر کہنہ میں "زیر النصاری" یا "دیر مارجرجس" کے نام سے مشہور ہے۔ اہل عرب نے اس قلعہ کو فتح کر لینے کے بعد اسکندریہ پر فوجکشی کی تو عمرو بن العاص نے حکم دیا کہ میرا خیمہ وہاں سے اکھاڑ اجائے۔ لیکن جس وقت لوگوں نے خیمہ گرانا چاہا تو اس میں ایک کبوتر کا آشیانہ نظر آیا کبوتر نے انڈے دیکر بچے نکال لئے تھے۔ عمرو بن العاص کو اطلاع ہوئی تو کہا "لقد تحرم بنا بمحترم" (یہ خیمہ بوجہ ایک محترم کے حرام ہوگیا) اور حکم دیا کہ خیمہ بدستور استادہ رہنے دیا جائے اور جو قبطی لوگ وہاں رہتے تھے انہیں ان جانوروں کی حفاظت کا حکم دیکر خود معہ اپنی سپاہ کے اسکندریہ کی جانب کوچ کر دیا جب وہ اسکندریہ کی فتح سے فارغ ہوئے تو خلیفہ عمر بن الخطاب کو مدینہ میں اس فتح کی اطلاع دی اور اس جگہ فوجی چھاونی کے متعلق استصواب کیا۔ فاروق اعظم نے جواب میں لکھا کہ "لا تجعلوا بینی وبینکم ماءً متی ما اردت ارکب الیکم راحلتی حتی اقدم علیکم قدمت" عمرو بن عاص ناچار اسکندریہ سے اس جگہ آئے جہاں ان کا خیمہ تھا، سپاہ نے اس خیمہ کو اپنا فوجی مرکز قرار دیکر اس کا نام فسطاط رکھدیا بعد ازیں عربی قبائل نے سپاہیوں کی رہایش کے واسطے مکانات تعمیر کرنے لگے؛

عمرو بن العاص نے چار معزز شخصوں معاویہ بن خدیج التجیبی و شریک بن سمی الغطیفی و عمرو بن قحزم الخولانی و جبریل بن یاسر المغافر کو فسطاط کی حدود مقرر کرنے پر مامور کیا۔ ہر ایک قبیلہ یہی چاہتا تھا کہ اپنے واسطے عمدہ اور مناسب موقعہ پر ٹکڑہ اراضی انتخاب کرے، اس لئے عمرو بن العاص نے ان معززین کو اس خدمت پر مامور کیا، ان لوگوں نے شہر کو محلوں میں تقسیم کیا اور ہر ایک محلہ کا نام "خطط" رکھا، اور ان "خطط" کا نام ہر ایک قبیلہ کے نام پر مشہور ہوا جو اس جگہ آباد ہوا، مثلاً ایک "خطہ مہرہ" تھا جسکی نسبت مہرہ بن حیدان بن عمرو بن الحاف بن قضاعہ بن مالک بن حمیر سے تھی۔ اسی طرح ایک "خطہ تجیب" تھا، اس جگہ وہ جماعت آباد تھی جو تجیب کے ہمراہ تھی، یہ تجیب پسر عدی بن اشرس بن شبیب بن السکین بن الاشرس بن کندہ ہے؛ ایک اور "خط بنی لخم" کے نام سے موسوم تھا۔ دوسرا

"گویند مردی را ہزار درہم عطا کرد ندکہ وقتی کہ عمرو بن العاص بر منبر باشد از وے سوال کند کہ مادر تو کیست؟ چوں از وے سوال کرد گفت نام مادر من سلمٰی و لقب او نابغہ است دختر حرملہ از بنی عنزہ جمی از عرب او را اسیر گرفتند و در بازار عکاظ فروختند۔ نخست فاکہ بن مغیرہ او را بخرید۔ انگاہ عبداللہ بن جذعان و از عبداللہ پدر من عاص بن وایل او را بخرید و من از و متولد شدم انگاہ با سایل گفت اگر عطائے با تو کردہ اند

خطہ بنی ربہ"۔ تھا۔ ایک "خطہ لعنیف" تھا۔ اسکی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ عمرو بن العاص نے اسکندریہ سے عمرو بن الحمالۃ الازدی کو لشکر جمع کرنے کے لئے اس طرف روانہ کیا۔ جب اس موضع میں آیا تو اژدحام قبایل کو دیکھا کہ سیلاب عظیم کی طرح امڈے چلے آرہے ہیں۔ کہا "خدا کی قسم۔ مینے کبھی ایسا اژدحام نہیں دیکھا کہ اپنی کثرت سے افق کا راستہ مسدود کیا ہو۔ یہ آیت تمہارے مصداق حال ہے کہ۔ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ جِئْنَا بِكُمْ لَفِيْفًا"۔ اس لئے اس خطہ کا نام "لفیف" ہوا۔ ایک اور خطہ ظاہر تھا جسکی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اسکندریہ سوم مراجعت کے بعد جماعت عتقا کا جھگڑا دیگر قبایل سے تعین خطہ پر ہو گیا۔ معاویہ بن حدیج حاکم خطط نے کہا "یومئذٍ اری لکم ان تظہروا علی اہل ہٰذہ القبایل"۔ ایک "خط رایت" تھا۔ عمرو بن العاص نے ایک جماعت قریش و انصار و خزاعہ و اسلم اور بنی کنانہ وغیرہ قبائل سے اس جگہ آباد کی۔ ہر ایک قبیلہ یہی چاہتا تھا کہ اس خطہ کا نام ان کے قبیلہ پر رہے۔ عمرو بن العاص نے ان سب کے لئے ایک جھنڈا کھڑا کر دیا۔ اس لئے اس کا نام "خطہ رایت" ہوا۔ ایک "خطہ غافق"۔ بن حارث بن علی بن غربان بن عبداللہ بن الازد تھا۔ ایک اور "خطہ صدق" تھا۔ صدق لقب مالک بن سہل بن عمرو بن قیس کا ہے۔ جو بنی حمیر سے تھا۔ ایک خطہ عمرو بن مالک بن یزید بن عریب تھا۔ ایک اور خطہ فارسین کا تھا جو شام سے مصر میں عمرو بن العاص کے ہمراہ آئے تھے۔ ایک "خطہ مذحج" یعنی مالک بن مرۃ بن اود بن یزید بن کہلان کا تھا۔ ایک "خطہ عطصین" بن سواد دوسرا "خطہ وغلان" بن قرق بن ناجیہ بن مراد، اور ایک اور "خطہ یحصب" بن مالک بن اسلم بن زید بن غوث۔ ایک "خطہ رعین" بن زید بن سہل۔ ایک "خطہ ذوالکلاع" بن شرحبیل بن سعد بن حمیر۔ ایک خطہ معافر بن یعفر بن مرۃ بن اود۔ ایک "خطہ سبا"۔ اور ایک "خطہ رحبۃ" بن زرعۃ بن کعب ایک "خطہ سلف" بن سعد، اور ایک "خطہ قبض" بن مرثد تھا۔ ایک خطہ کو "خطہ حمراوات الثلاث" کہتے تھے یہ تین خطط کا مجموعہ تھا یعنی خطہ روبیل، خطہ قواوینہ، خطہ ازرق۔ یہ لوگ عجم اور شام اور قیسارہ سے عمرو بن العاص کے ہمراہ آئے تھے۔ اور جنگ یرموک سے پیشتر مسلمان ہوئے تھے۔ ان تینوں حمراوات کو حمراء اولیٰ و حمراء وسطیٰ

کہ این سوال از من کنی خدمت خود بپای بروی، بر و عطائی خود را ماخوذ دار۔ واین سخن ازبہر آن گفت کہ سخت صعب میمنود کہ کس از وے چنیں سوال کند چہ مادر او زانیہ بود۔ زمخشری کہ از بزرگان علمائے عامہ است در کتاب ربیع الابرار میگوید۔ نابغہ کنیزک مردی بود از قبیلہ غنزہ او را اسیر کردند و عبد اللہ بن جدعان او را بخرید و آزاد کرد۔ چہ بسیار زناکار بود۔ پس ابولہب بن عبد المطلب وامیہ بن خلف الجمحی وہشام بن المغیرہ المخزومی و ابوسفیان بن حرب و عاص بن وائل در طہر واحد با او زنا کردند و بعمر آبستن شد۔ آنگاہ کہ بار بگذاشت۔ این جماعت او را فرزند خود پنداشتند و دعوی دار بودند در پایان کار گفتند۔ ہر کرا نابغہ ختیار کند پدر او باشد۔ نابغہ عاص بن وائل را اختیار کرد۔ با او گفتند فرزند تو با ابوسفیان بن حرب شبیہ تر است و نسب او شریف تر چرا عاص بن وائل را برگزیدی۔ گفت۔ ابوسفیان مرد بخیل است و عاص بن وائل نفقہ نیکو تر دہد۔ از اینجاست کہ ابوسفیان بن حارث بن عبد المطلب در حق عمرو این شعر گفت :-

”عمرا اقصوی“ بھی کہتے تھے۔“

رفتہ رفتہ فسطاط کی آبادی بڑھتی گئی اور حکومت اور دولت اور ثروت کے ساتھ ساتھ اس شہر کی عمارات اور وسعت اور آبادی میں بھی نمایاں ترقی ہوتی ہوگئی۔ یہاں تک کہ اکثر حالات میں بصرہ اور کوفہ پر فائق ہو گیا۔ شہر فسطاط کا طول ساحل نیل پر تین میلوں تک پہونچ گیا تھا۔ مورخین عرب نے جو کچھ اس شہر کی نسبت لکھا ہے وہ تو ہم ”قاہرہ“ میں لکھیں گے۔ صرف عمارات کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ایک وقت اسمیں چھتیس ہزار ۳۶۰۰۰ مساجد اور آٹھ ہزار سڑکیں اور مختلف راستے اور گیارہ سو ستر حمام تھے۔ شعراء نے اس شہر کی خوبیوں پر لطیف شعر کہے ہیں۔ شریف العقیلی کہتا ہے :-

أحنّ الى فسطاط شوقاً واننی — میں فسطاط کا اس قدر شایق کہ اسکے لئے دست بدعا ہوں کہ

لادعولها ان لا یحل بها القطر — ملک اوس سے علیحدہ نہ ہو۔

وہل فی الحیا من حاجۃ لجنابہا — کیا اسکی جناب میں کسی حیا کی حاجت ہے جبکہ تمام ملک میں

وفی کل قطر من جوانبها نهر — اسکے جوانب میں نہریں ہیں۔

تبدت عروساً والمقطم تاجها — وہ ایک عروس زیبا کی صورت میں جلوہ گر ہے جسکا تاج ”مقطم“ ہے

ومن نیلها عقد کما انتظم الدر — اور دریائے ”نیل“ اسکے گلے میں خوشنما موتیوں کا ہار ہے۔

فسطاط کی عالیشان عمارتوں میں ”دار عبد العزیز“ ایک مشہور قصر تھا جسکی عظمت اور شان اور اسکے مکینوں کے تمول کو

ابوك ابوسفیان شك لو بدت — لفا فيك منه بينات الدلائل
فقاخربه اما فخرت ولا تكن — تفاخر بالعاص الهجين ابن وائل
وان التي في ذاك يا عمرو حكمت — فقالت رجاء عند ذلك لنائل
من العاص عمرو تخبر الناس كلها — تجمعت الاقوام عند المحافل

با این نژاد و نسب عجب نباشد اگر دشمن ترین خلق بود بارسول خدا و بعد از پیغمبر با علی مرتضی چون اسلام قوت یافت کار بر او تنگ شد مسلمانی گرفت "

یہ جاہلیت کی باتیں ہیں، ہماری رائے میں متعہ کی تاریخ کا پتہ ایسی مثالوں سے بآسانی ملسکتا ہے عمرو بن العاص نے اسلام کی ایسی خدمات کی ہیں کہ وہ بقول رسول اللہ سچا مسلمان تھا، اور اس کے مفتوحہ ممالک آجتک مسلمانوں کے قبضہ میں ہیں، اور اسکی یادگار قاہرہ کی مشہور عظیم الشان مسجد جامع عمرو اب تک موجود ہے۔

افریقہ اس وقت سے فسطاط تمام شمالی افریقہ کی چھاونی تھی۔ عامل مصر ہی کے ہاتھوں میں ان ممالک کا انتظام تھا، اور ماتحت افسروں کا عزل ونصب بھی وہی کیا کرتا تھا۔ عربی مورخین نے مصر کے علاوہ تمام شمالی افریقہ کو "افریقیہ" سے تعبیر کیا ہے۔ اور اسے ایک علیحدہ "ولایت" قرار دیکر عامل مصر کے ماتحت سمجھا ہے جس وقت عمرو بن العاص بالاستقلال عامل مصر مقرر ہوا۔ تو اس نے فتح افریقہ کا مصمم ارادہ کر لیا۔ اس سے پیشتر عبداللہ بن سعد نے ذوالنورین کے عہد میں پیشقدمی کی تھی، عمرو بن العاص

ملک میں ضرب المثل ہونیکا فخر حاصل تھا۔ یہ ایوان بالکل دریائے نیل کے کنارہ پر تھا۔ اسکی وسعت اور مکینوں کی کثرت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ صرف پانی کا خرچ چار سو پکھال روزانہ تھا، دریائے نیل سے پانی بھرنیکے لئے سولہ ہزار چرخیاں ایسے طاقوں میں لگی ہوئی تھیں جن کا رخ دریائے نیل کی جانب تھا اور ان پر ڈول اور رسیاں لپٹی رہتی تھیں جن سے ہر وقت بآسانی پانی بھرا جا سکتا تھا۔ ایک شخص جو تیسری صدی ہجری بعہد خمارویہ فسطاط میں آیا تھا۔ اس نے بیان کیا ہے کہ "میں نے فسطاط میں ایک خدمتگار کی تلاش کی مگر کوئی ایسا شخص نہ ملا جو بیکار ہو اور میرے کام آسکے، باعث دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ اس جگہ ہر ایک خدمتگار کے بھی دو دو تین تین پیشدست ہوتے ہیں۔ فسطاط کی ثروت کا قیاس اس امر سے ہو سکتا ہے کہ ان لوگوں کے خدمتگار آجکل کے آقاؤں پر تفوق رکھتے تھے،

نے عقبہ بن عامر بن عبد قیس کو افریقہ کا والی مقرر کیا، عقبہ بذاتہ ایک پرجوش سپاہی تھا۔ عمرو بن العاص کا خالہ زاد بھائی تھا، شمالی افریقہ بالخصوص "کارتھیج" یونانی شہنشاہ قسطنطنیہ کے مظالم اور آئے دن کے ٹیکس سے نالاں و سرگرداں تھا اور اس مصیبت سے نجات حاصل کرنے کے لیے خود ان لوگوں نے مسلمانوں کو مدعو کیا تھا، اور جب مسلمانوں نے تیس ہزار رومیوں کو شکست فاش دیکر اس ملک کے باشندوں کو ظالموں کے پنجہ سے رہائی دی تو اکثر اشخاص نے بہ طیب خاطر اسلام قبول کر لیا۔ اس وقت تک بربری ریاستوں میں اشاعت اسلام شروع ہو گئی تھی لیکن عقبہ نے اس جگہ فوجی چھاونی نہ ڈالی۔ اور واپس لوٹ آیا، اس جگہ پھر بغاوت ہوئی، تو عقبہ نے دوبارہ فوجکشی کی اور چند شہروں کو بزور شمشیر فتح کیا، اور پھر لوٹ آیا۔ اہل افریقہ کا یہ حال ہو گیا کہ اسلامی سپاہ کی موجودگی میں اظہار اطاعت کرتے اور بعد ازاں بغاوت پھیلاتے، سنہ ۵۰ھ میں امیر معاویہ نے عقبہ کے ہمراہ دس ہزار شامی دلاوروں کی جمعیت کر دی، اس کے ساتھ مسلمانان بربر بھی شامل ہو گئے۔ اس خوفناک طاقت کے ساتھ عقبہ نے افریقہ میں نئے فتوحات کا سلسلہ شروع کر دیا، اور نہایت جرأت سے صحراؤں اور ریگستانوں کو طے کرتا ہوا، بحر اوقیانوس کے کناروں تک پہونچ گیا، سمندر کے پانیوں نے اسکی پیشقدمی کو روک دیا۔ اس پرجوش بہادر سپاہی نے اپنا گھوڑا لہروں میں ڈال کر آسمان کی طرف نگاہ کی۔ اور کہا "یا اللہ! اگر یہ سمندر میرے راستہ میں حائل نہ ہوتا تو میں اعلائے کلمۃ الحق کے لئے بڑھتا چلا جاتا۔ اور مغرب کی نامعلوم ریاستوں میں تیری توحید کی منادی کرتا اور ان مشرکوں کی سرکوبی کرتا جو تیری عبادت میں شریک پیدا کرتے ہیں"۔

عقبہ نے ان فتوحات کے بعد آیندہ بغاوتوں اور شورشوں کو فرو کرنے کے لئے ارادہ کر لیا کہ اسجگہ ایک مستقل فوجی چھاونی کی بنا ڈالے، چنانچہ "قیرواں" [۴۸] تعمیر ہوا، یہ جگہ بالکل ویرانہ تھی۔ اور حشرات الارض

حاشیہ نمبر ۴۸ - ابن اثیر، یاقوت، اور دیگر مورخین نے لکھا ہے کہ قیرواں کی اصل فارسی لفظ "کاروان" ہے۔ اہل عرب اس لفظ سے واقف تھے چنانچہ امراء القیس عرب کا مشہور شاعر کہتا ہے،

وغارۃ ذات قیروان   کان اسرابھا الرّعال

اس جگہ عقبہ نے اسّی اصحاب رسول اللہ کو جمع کیا۔ اور فوج سے علیحدہ جنگل میں کھڑے ہو کر باواز بلند کہا، ایتھا الحشرات والسباع نحن اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فارحلوا عنا فانا نازلون فمن

کی نشیمن تھی۔ کہتے ہیں کہ جب اس جگہ زمین کو صاف کر رہے تھے تو کسی قدیمی شہر کے آثار بھی پائے گئے تھے۔ مگر اس وقت یہ قطعہ زمین بالکل غیر آباد تھا۔ عقبہ نے تین ہزار قدم طولاً اور چھ سو عرضاً اس کے حدود مقرر کئے۔ اور ایک دیوار بھی کھینچدی۔ پانچ سال کے عرصہ میں اس جگہ آبادی میں بہت کچھ ترقی ہوگئی۔ عقبہ نے اس جگہ ایک جامع مسجد بھی تعمیر کروائی۔ اور سپاہ کی رہایش کے لئے مکانات تعمیر کروائے اور ہر ہر قبیلہ کے لئے علیحدہ علیحدہ محلے تقسیم کئے۔

عمرو بن العاص کی وفات پر امیر معاویہ نے مسلمہ بن مخلد انصاری کو مصر کا عامل مقرر کیا۔ مسلمہ نے اپنے ایک غلام ابوالمہاجر نامی کو افریقیہ کا والی مقرر کرکے عقبہ کو معزول کر دیا۔ ابوالمہاجر نے عقبہ کی معزولی کو بہت بری طرح ظاہر کیا۔ اس لئے دمشق میں آکر ابوالمہاجر کی شکایت کی۔ امیر معاویہ نے معذرت کے ساتھ وعدہ بحالی کیا۔ اگرچہ امیر معاویہ کے عہد خلافت میں ایفا وعدہ نہ ہوسکا۔ لیکن یزید نے عقبہ کو ولایت افریقیہ پر بحال کر دیا۔

کوفہ ۲۹

مغیرہ بن شعبہ مشاہیر اسلام سے ہے۔ جابرؓ کا قول تھا کہ "حضرت عمرؓ سے بڑھکر قرآن و فقہ کا عالم، اور طلحہؓ بن عبید اللہ سے بڑھکر فیاض، اور معاویہؓ سے بڑھکر حلیم و عقیل، اور عمرو بن العاص سے بڑھکر خالص دوست، میں نے نہیں دیکھا۔ اور مغیرہؓ بن شعبہ کا یہ حال ہے کہ اگر کسی شہر کے آٹھ دروازہ ہوں اور یہ کہا جائے کہ ان دروازوں سے کوئی شخص بغیر کسی تدبیر کے نہیں گذر سکتا تو مغیرہ آٹھوں دروازوں سے گذر سکتا ہے۔

وجدناہ بعد ذالک قتلناہ"۔ یعنی حشرات الارض اور جنگلی حیوانوں کو مخاطب کرکے کہا کہ ہم رسول اللہ کے اصحاب ہیں، اس جگہ ہمارا ارادہ قیام کا ہے۔ اگر اسکے بعد تم اس جگہ ٹھہرے تو قتل کئے جاؤ گے۔ لوگوں نے دیکھا کہ چرندے اور درندے اور سانپ اور بچھو وغیرہ عالم سراسیمگی میں دوڑ رہے ہیں۔ اور اپنے بچوں کو لئے ہوئے ایک طرف جاتے ہیں۔ اسکے بعد یہ جنگل بالکل خالی ہوگیا اور کوئی سانپ یا درموذی جانور اس جگہ دکھائی نہ دیتا تھا۔

حاشیہ نمبر ۲۹ - ۵۷ھ میں امیر معاویہ نے عبدالرحمن ابن ام الحکم کو کوفہ کا عامل مقرر کیا۔ عبدالرحمن کی والدہ امیر معاویہ کی بہن تھی۔ کوفہ کا انتظام ان سے نہ ہو سکا۔ کچھ بے اعتدالیاں کیں۔ عبداللہ بن ہمام سلولی نے چند اشعار نظم کئے اور لکھکر جامع مسجد میں ڈالدیئے۔

الا ابلغ معاویۃ بن صخر	خبردار! معاویہ بن صخر کو یہ پیغام پہنچادو
فقد خرب سواد فلا سوادا	کہ سواد کوفہ ویران ہوگیا ہے ایسا آباد نہ ہوگا۔

اس وقت عرب میں چار شخص عاقل مشہور تھے، ان میں سے مغیرہ کا تیسرا نمبر ہے کیسی ہی سخت مصیبت کیوں نہ ہو مغیرہ بن شعبہ نے کبھی پرواہ نہیں کی، اس کے اوسان کبھی خطا نہیں ہوئے۔ اور اس کے دفع کرنے کی تدبیر فوراً سوجھ جاتی،

مغیرہ صائب رائے اور فصیح تھا اور حقانیت اسلام سے بھی بخوبی آگاہ تھا۔ اس لئے عموماً مسلمانوں کی طرف سے سفارت کا کام انجام دیتا۔ فردوسی نے تواریخی واقعات میں شاعرانہ تصرف کے ساتھ ایرانی نمود و شان کا مقابلہ عربی سادگی اور جرات و دلیری، مغیرہ بن شعبہ کی سفارت اور حاضر جوابی کے پیرایہ میں ذیل کے اشعار میں کیا ہے، اس وقت عربی اور ایرانی سپاہ ایک دوسری کے بالمقابل پڑی تھی، ایرانی سپہ سالار رستم بن فرخ زاد نے عربی سپہ سالار سعد بن وقاص کو نامہ لکھا۔ سعد نے مغیرہ بن شعبہ کو جواب نامہ کے ساتھ روانہ کیا:۔

فرستادۂ سعد وقاص رفت	بہ نزدیک رستم خرامید تفت
مغیرہ شعبہ برفت از گوان	کہ آید بر رستم پہلوان
از ایرانیاں نامداری ز راہ	بیامد بر پہلوان سپاہ
کہ آمد فرستادۂ پیر سست	نہ اسپ و سلیح و نہ جامہ درست
یکے تیغ باریک در گردنش	پدید آمدہ چاک پیراہنش

اری العمال اقساء علینا	ہم تمہارے عاملوں کو دیکھتے ہیں کہ ہمارے لئے قسائی بنے ہوئے
بعاجل نفعھم ظلموا العبادا	ہیں۔ اپنے دنیاوی نفع کے لئے لوگوں پر ظلم کرتے ہیں،
فھل لک ان تدارک مالدینا	کیا تم اس کا تدارک کر سکتے ہو
وتدفع عن رعیتک الفسادا	اور اپنی رعیت سے یہ فساد دور کر سکتے ہو،
وتعزل تابعا ابدا ھواہ	اور ایسے شخص کو معزول کر سکتے ہو جو ہمیشہ خواہشات نفسانی کی پیروی
یخرب من بلادتہ البلادا	کرتا ہے۔ اور شہروں کو اپنی کج رائی سے ویران کرتا ہے،
اذا ما قلت اقصر عن ھواہ	جب اسے کہا جائے کہ اپنی خواہشات کو کم کر،
تمادی فی ضلالتہ وزادا	تو اس کی گمراہی اور بڑھ جاتی ہے،

یہ اشعار امیر معاویہ کے پاس بھی پہونچے، عبدالرحمن کو معزول کر دیا، *

چو رستم بگفتار او بنگرید | زدیبا سر پرده بر کشید
ز زربفت چینی کشیدند نخ | سپاه اندر آمد چو مور و ملخ
نہادند زریں یکے زیرگاہ | نشست از برش پہلوان سپاہ
نشستند پیشش صد و شصت مرد | سواران و شیران روز نبرد
ابا افسر و جامہائے بنقش | بپائے اندرون کردہ زرینہ کفش
ہمان طوق داران ابا گوشوار | سراپردہ آراستہ شاہوار
مغیرہ بیبالائے پردہ سرائے | بیآمد بران جامہ ننہاد پائے
ہمی رفت بر خاک و کس راندید | سو پہلوان و سران ننگرید
بدو گفت رستم کہ جان شاد دار | بدانش روان و تن آباد دار
مغیرہ بدو گفت اے نیکنام | اگر دیں پذیری علیک السلام

فاروق اعظمؓ کے عہد خلافت میں مغیرہ دو برس یا کم و بیش بصرہ کا عامل رہا۔ فتوحات شام میں بھی حصہ لیا۔ اور بطور ایلچی ہرقل کے پاس بھی گیا تھا۔ کچھ عرصہ کوفہ کا عامل رہا۔ حضرت عثمانؓ نے مسند خلافت پر بیٹھتے ہی اسے معزول کر کے سعد بن ابی وقاص فاتح ایران کو عامل مقرر کیا۔ اس کے بعد مغیرہ نے کوفہ میں بالاستقلال رہائش اختیار کی۔ امیر معاویہ کے عہد میں کوفہ کا عامل مقرر ہوا۔ اس وقت تک ہر ایک عامل ہی امارت اور امامت اور قضا کے سب کام سرانجام دیا کرتا۔ لیکن اب ایک ہی شخص کو بہ تن واحد ان سب کاموں کا کرنا دشوار ہو گیا۔ اس لئے امیر معاویہ نے مغیرہ کو امامت اور امارت خاصہ پر متعین کیا اور شریح کو عہدہ قضا پر مامور کیا۔ صیغہ مال کا انتظام بھی علیحدہ کر دیا۔ مغیرہ ۵۱ھ تک کوفہ کا عامل رہا۔ اس عرصہ میں کسی قسم کی شورش یا فساد نہ ہوا۔ آخری ایام میں حجر بن عدی سے بگاڑ ہو گیا مغیرہ نے حجر اور اس کے رفقا کا روزینہ بند کر دیا۔ ایک دفعہ مغیرہ بر سر منبر خطبہ پڑھ رہا تھا۔ حجر نے قطع کلام کرتے ہوئے نہایت جرأت اور بیباکی سے کہا "اے شخص ہمارے روزینہ دیدے تو نے اسے کیوں روک رکھا ہے۔ اس سے تجھکو کچھ فائدہ نہ ہوگا"۔ بیان کیا جاتا ہے کہ مغیرہ۔ امیر المومنین علیؓ پر تعریض کرتا تھا۔ اہل کوفہ خصوصاً حجر اور اس کے رفقا اس لئے اسکے مخالف ہو گئے اور اکثر تو تو اور میں میں تک نوبت پہنچ جاتی۔ اور بسا اوقات حجر نہایت سختی اور گستاخی سے پیش آتا۔ مغیرہ طرح دیتا رہا

مصاحبوں میں سے ایک شخص نے مغیرہ کو کہا کہ "اگر چندے یہی حال رہا کہ حجر سخت کلامی اور بیباکی سے تمہیں ذلیل کرتا رہا اور تم طبعی حلم کی وجہ سے برداشت کرتے رہے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ رعب امارت لوگوں کے دلوں سے اُٹھ جائے گا، اور امیر معاویہ تمہیں حکومت کے قابل نہ سمجھکر معزول کر دیں گے" مغیرہ نے جواب دیا کہ میرا زمانہ وفات قریب آگیا ہے۔ میں کسی کو قتل نہیں کرونگا۔ اگر حجر کی یہی عادت رہی تو جو شخص میرے بعد آئیگا حجر سے سمجھ لیگا۔ اس واقعہ کے کچھ عرصہ بعد مغیرہ بن شعبہ کا انتقال بعارضہ طاعون ہوگیا، امیر معاویہ نے اس صوبہ کا الحاق امارت بصرہ سے کر دیا۔ چونکہ دونوں صوبے عراق میں واقع تھے اِس لئے کوفہ اور بصرہ کو امارت عراق کہتے تھے۔ جب دونوں کا الحاق ہوگیا تو امارت عراقین کہنے لگے، اور سب سے پیشتر زیاد عامل عراقین ہوا۔

بصرہ

جس وقت قادسیہ کے میدان میں عجمی طاقت کا شیرازہ بکھر گیا، اور عرب ان ممالک پر قابض ہو گئے۔ عمرؓ نے خیال کیا کہ مبادا یزدجرد عمان اور ہندوستان سے لشکر فراہم کرے اور مقابلہ کے لئے آمادہ ہو اِس لئے پیش دستی کر کے عتبہ بن غزوان المازنی کو کچھ فوج کے ساتھ عراق کی طرف روانہ کیا۔ اور حکم دیا کہ کسی ایسی جگہ چھاونی ڈالو جو عمان اور ہندوستان اور ایران کے تعلقات قطع کر دیے اور اسلامی مقبوضات کی حفاظت بھی کرے، عتبہ بن غزوان حسب الحکم خلیفہ "ایلہ" کی طرف آیا۔ اہلِ "ایلہ" نے چار ہزار کی جمعیت سے مقابلہ کیا لیکن شکست کھائی، آخر انہیں معلوم ہوا کہ عتبہ کا ارادہ جنگ وجدل کا نہیں ہے۔ عتبہ نے بھی انہیں سمجھایا کہ ہم صرف اس جگہ اپنی چھاونی قائم کرینگے اور تمھیں کسی قسم کا آزار نہ ہوگا بشرطیکہ تم بغاوت نہ کرو۔ اہل ایلہ نے آخر کار صلح اور پھر اسلام قبول کر لیا،

دریا دجلہ کے کنارہ یہ زمین جہاں عتبہؓ نے بصرہ کا بنیادی پتھر رکھا "سنگ سفید" سے بھری ہوئی تھی۔ اِس لئے اہل عرب نے اس جگہ کا نام بصرہ رکھا۔ عتبہ نے اس جگہ فوجی چھاونی قائم کی اور زمین کو خطوں میں تقسیم کیا، اور جامع مسجد تعمیر کی۔ اِس مسجد کی تعمیر محجن بن ادرع کے سپرد تھی۔ ابتدا میں یہ مسجد سادگی کا نمونہ تھی رفتہ رفتہ تمدن کا اثر اس پر بھی ہوا۔ عتبہ کچھ عرصہ اس جگہ رہے۔ بعد ازاں حج کے لئے واپس ہوئے۔ مجاشع بن مسعود کو اپنا نائب مقرر کیا اور مغیرہ بن شعبہ کو امامت پر مامور کیا،

عتبہ ایک پرہیزگار سیدھے سادھے مسلمان تھے۔ جب مکہ سے مراجعت کر کے مدینہ میں حضرت عمرؓ سے ملاقات کی تو امارت بصرہ سے استعفا پیش کیا۔ حضرت عمرؓ ایسے شخص کو جس نے اسوقت

اسلام قبول کیا تھا جب مسلمانوں کی تعداد صرف چھ تھی، جس نے حبشہ اور مدینہ کی طرف ہجرت کی
اور اکثر غزوات میں شریک ہوئے۔ کب چھوڑتے تھے۔ اس لئے استعفا نامنظور ہوا۔ مجبورًا
بصرہ کا عزم کیا لیکن دعا کی "اللّٰھُمَّ لَا تَرُدَّنِی اِلَیْھَا"۔ جس وقت مقام "زبدہ" میں پہونچے
اونٹ سے گر پڑے۔ سخت چوٹ آئی اور اسی صدمہ سے جان بحق تسلیم کی۔ یہ واقعہ ۱۷ھ کا ہے۔

عتبہ کے بعد مغیرہ بن شعبہ امارت بصرہ پر مامور ہوئے دو سال تک عامل بصرہ رہا۔ اس عرصہ
میں بصرہ کی آبادی اور وسعت بہت بڑھ گئی۔ مغیرہ کے بعد ابو موسیٰ اشعری عامل بصرہ ہوا۔ خلافت
عثمانؓ میں عبداللہ[۳۰] بن عامر ۱۹ھ میں ابو موسیٰ کے بعد عامل بصرہ مقرر ہوئے۔ اس وقت اسکی
عمر پچیس[۲۵] سال تھی۔ حضرت علیؓ کی خلافت میں زیاد بصرہ کا عامل ہوا۔ امیر معاویہ کے عہد میں بسر بن
ارطاۃ امارت بصرہ پر متمکن ہوا۔ بسر نے اس جگہ نہایت سختی کی۔ اس لئے متواتر شکایتیں ہوئیں۔

حاشیہ نمبر ۳۰۔ عبداللہ بن عامر بن کریز حضرت عثمانؓ کے بیٹے تھے۔ حضرت عثمانؓ کی والدہ
کا نام اروٰی بنت کریز تھا۔ اور اروٰی اور عامر بن کریز کی والدہ ام حکیم بیضا بنت عبدالمطلب ہیں جو
رسول اللہ کی پھوپھی تھی۔ عبداللہ کی ولادت رسول اللہؐ کے زمانہ میں ہوئی۔ بچپن میں آپ کے پاس
لائے تو دیکھکر فرمایا کہ "یہ لڑکا ہمارے مشابہ ہے"۔ پچیس برس کی عمر میں بصرہ کی امارت تفویض ہوئی۔ جوانی
کا عالم۔ اور سپاہیانہ جوش۔ اور شوق جہاد نے ایک دم بصرہ میں چین سے بیٹھنے نہ دیا۔ فتح خراسان کی تکمیل
کی۔ اور تمام فارس کو عرضًا اور طولًا پامال کرتا ہوا سجستان، کرمان، اور زابلستان کو فتح کیا۔ اور اسلامی فتوحات
کی حدود کو ہندوستان سے ملا دیا۔ ان فتوحات کے شکرانہ میں نیشاپور سے عمرہ اور حج کا احرام باندھا۔ عبداللہ
بہادر، فیاض، شریف آدمی تھا۔ سب سے پہلے مقام عرفہ میں حوض بنوائے اور اس جگہ نہر لایا۔ شہادت عثمانؓ
کے بعد اہل جمل سے ملحق ہو گئے۔ اور انہیں ہر طرح امداد دی۔ شکست کے بعد دمشق چلا گیا۔ ۵۸ھ میں انتقال ہو گیا
زیاد نے ذیل کے اشعار اسکی وفات پر کہے:۔

اَخٌ لَکَ لَاتَرَاہُ اللّٰہُ ھَرَّالا ۔۔۔ علی العِلّاتِ فیاضًا جوادًا
اَخٌ لَکَ ماموَدَّتُه بِمَذْقٍ ۔۔۔ اذا ما عادَ فقرُ اخیہ عادا
سالناہ الجمیل فما تلکّیٰ ۔۔۔ واعطیٰ فوقَ منیتنا وزادا
واحسنَ ثم احسنَ ثمّ عُدنا ۔۔۔ واحسن ثم عدتُ لهٗ فعادا
مراراً ما رجعتُ الیه الا ۔۔۔ تبسم ضاحكاً وثنی الوِسادا

امیر معاویہ نے "بسر" کو معزول کر کے عتبہ بن ابی سفیان کو مامور کرنے کا قصد کیا، عبد اللہ بن عامر نے
حاضر ہو کر کہا کہ "امیر المومنین بصرہ میں کچھ لوگوں کے پاس میرا مال ہے اگر آپ مجھے وہاں مامور
نہ فرمائینگے تو سب امانتیں تلف ہو جائیگی"۔ امیر معاویہ نے بصرہ کی امارت دیدی اور اس کے ساتھ
خراسان اور سجستان کی ولایت بھی بصرہ سے ملحق کر دی۔ سنہ ۴۱ھ میں عبد اللہ بصرہ میں دوبارہ
بطور عامل آیا۔ اور اپنی طرف سے قیس بن الہشیم السلمی کو خراسان کا والی مقرر کیا، مگر قیس سے کچھ کام نہ چلا
اور اہل بلخ وغیرہ کی بغاوتوں کو فرو نہ کر سکا۔ اس لئے عبد اللہ نے اسے معزول کر کے کوڑے لگوائے
اور عبد اللہ بن حازم کو خراسان کی طرف روانہ کیا۔ اس نے باغیوں کی خوب خبر لی، اور تھوڑے
عرصہ میں امن قایم کر دیا۔ سنہ ۴۳ھ میں عبد اللہ نے اپنی طرف سے عبد الرحمن بن سمرہ کو سجستان کا والی
مقرر کیا، اور ہدایت کی کہ جہاد کا سلسلہ شروع کر دو۔ عبد الرحمن جسکے ہمراہ اس وقت اشراف قریش کی
بھی ایک کثیر جماعت تھی۔ اکثر شہروں کو فتح کرتا ہوا کابل تک جا پہونچا۔ شہر کی دیواریں نہایت مضبوط
تھیں اور اہل شہر بھی ایک جنگجو قوم تھی، اس لئے محاصرہ میں کئی مہینے صرف ہوئے۔ منجنیق سے برابر
سنگ باری ہوتی رہی اور متعدد لڑائیاں ہوئیں۔ آخر شہر پناہ کی فصیل کا ایک حصہ ٹوٹ گیا۔ محصورین
نے کوشش کی کہ اسے مرمت کر دیں مگر عباد بن الحصین نے جو عبد الرحمن کے ہمراہ ایک فوجی افسر تھا
ان کی تمام کوششیں بیکار کر دیں، علی الصباح اہل کابل نے شہر سے نکل کر مقابلہ کیا۔ مگر پہلے ہی حملہ
میں پسپا ہو گئے، اور مسلمانوں نے شہر پر بزور شمشیر قبضہ کر لیا، بعد ازاں فتوحات کا سلسلہ غزنی تک پہنچا دیا
انکی عدم موجودگی میں اہل کابل نے بغاوت کی۔ اس لئے واپس لوٹے اور کابل کو دوبارہ بجبر و قہر مسخر
کیا۔ عبد اللہ ابن عامر نے سرحد ہند کو ایک علیحدہ ولایت قرار دیکر عبد اللہ بن سوار عبدی کو اس جگہ
والی مقرر کیا، اس لئے سرحد کا انتظام خاطر خواہ ہو گیا،

سنہ ۴۴ھ میں اہل بصرہ نے شورش کی، زیاد نے عبد اللہ بن عامر کو یہ مشورہ دیا کہ نرمی اور حلم سے
کام نہیں چلیگا، تلوار سے ان شورہ پشتوں کی خبر لو، عبد اللہ نے کہا کہ "میں اپنے نفس کو خراب
کر کے لوگوں کی اصلاح نہ کروں گا"۔ دمشق میں بھی ان واقعات کی اطلاع ہوئی، جواب طلب ہوا۔ تو
ایک وفد امیر معاویہ کی خدمت میں بھیجا، اتفاق سے ایک وفد کوفہ سے بھی آ رہا تھا۔ دونوں ایک وقت
امیر معاویہ کے پاس حاضر ہوئے، وفد کوفہ سے عراق اور بالخصوص بصرہ کا حال دریافت کیا گیا۔ تو عبد اللہ

بن ابی اوفی یشکری نے کہا کہ "امیر المومنین بصرہ کو کمینوں نے کھالیا۔ اور ان کی روز افزوں طاقت نے عامل بصرہ کو کمزور کر دیا ہے"۔ عبداللہ بن عامر میں یہ قوت ہی نہیں کہ انکی اصلاح کر سکے"۔ امیر معاویہ نے کہا "تعجب ہے کہ تم یہ باتیں اہل بصرہ کے روبرو کہہ رہے ہو"۔ ابن الکوا یعنی عبداللہ بن ابی اوفی نے کہا کہ "بیشک جو کچھ میں کہتا ہوں صحیح و درست ہے"۔

اس واقعہ کے بعد امیر معاویہ نے عبداللہ ابن عامر کو دمشق میں طلب کیا۔ حاضر ہوئے تو امیر معاویہ نے کہا "ان دو باتوں میں سے ایک اختیار کر لو۔ امارت بصرہ پر بہاؤ تو میں تم سے حساب کتاب لوں۔ یا اس عہدہ سے دست کش ہو جاؤ اور میں تمہارا کچھ اور بندوبست کر دوں"۔ عبداللہ نے آخری امر اختیار کیا۔

عبداللہ بن عامر کے بعد حرث بن عبداللہ عامل بصرہ مقرر ہوا۔ ۴۵ھ میں حرث کی جگہ زیاد امارت بصرہ پر مامور ہوا۔"

زیاد کا نام اُن دانشوران عرب میں شمار ہوتا ہے، جو امیر معاویہ کے دست و بازو تھے۔ اسکی پیدایش کے واقعات رسومات جاہلیت کو واضح طور پر بیان کرتی ہیں جس سے نسبت کی تاریخ کا پتہ باسانی مل سکتا ہے۔ ۱ھ میں متولد ہوا۔ فاروق اعظمؓ کے زمانہ میں ابوموسیٰ عامل بصرہ تھا۔ زیاد اسکا میر منشی مقرر ہوا۔ رفتہ رفتہ انتظام مملکت یمن میں حصہ لیا۔ اور نہایت کفایت شعاری اور امانت اور دیانت سے کام کیا۔ اور واپس آکر ان خدمات کو نہایت فصاحت اور بلاغت سے بیان کیا۔ عمرو بن العاص نے سنکر کہا " اما واللہ لو کان ھذا الغلام قرشیاً لساق العرب بعصاہ "۔ (اگر خدا کی قسم اس لڑکے کا نسب قرشی ہوتا تو تمام عرب کو ایک لکڑی سے ہانکتا)۔ ابوسفیان نے کہا " واللہ انی لاعرف الذی وضعہ فی رحم امہ "۔ (خدا کی قسم میں اس شخص کو جانتا ہوں جس کے سبب سے یہ پیدا ہوا ہے)۔ حضرت علیؓ نے کہا "وہ کون ہے؟" جواب دیا۔ "میں ہوں"۔ فرمایا "خاموش"۔ ابوسفیان نے کہا۔

" اما واللہ لولا خوف شخص ۔۔۔ یرانی یا علی من الاعادی
لاظہر سرہ صخر بن حرب ۔۔۔ ان ترین للمقالۃ من زیاد
وقد طالت مجاملتی ثقیفا ۔۔۔ وترکی فیھم ثمر الفواد "

حضرت علیؓ کے عہد خلافت میں زیاد فارس کا والی مقرر ہوا۔ چونکہ ہوا خواہان علیؓ سے تھا۔

امیر معاویہ نے اسے ایک خط لکھا کہ اگر تم میرا ساتھ نہ دو گے تو ابو سفیان کے نسب سے انکار کر دیا جائیگا
زیاد نے مطلق پروا نہ کی۔ اور فارس کا انتظام نہایت مستعدی اور خداداد قابلیت سے کیا۔ حضرت علیؓ
بہت خوش ہوئے اور اسے فارس کی ولایت کے ساتھ بصرہ کا عامل مقرر کر دیا۔ حضرت علیؓ شہید ہو گئے
تو زیاد نے دیکھا کہ کوفہ ایک ایسی جگہ ہے جہاں پناہ مل سکتی ہے۔ اس لئے بصرہ کو چھوڑ کر کوفہ میں
رہائش اختیار کی۔ مگر چند روز میں مغیرہ بن شعبہ عامل کوفہ کی وساطت سے امیر معاویہ کے ساتھ صلح ہو گئی
اور امیر نے بصرہ کا عامل مقرر کر دیا۔ اس جگہ زیاد نے ایک خطبہ دیا جو بوجہ فصاحت و بلاغت مشہور ہے
اس وقت بصرہ کی عمارت میں خراسان و فارس وغیرہ شامل تھے اور ان ممالک میں والیوں کا عزل
ونصب عامل بصرہ ہی کیا کرتا تھا۔ چنانچہ زیاد نے خراسان کو چار صوبوں میں تقسیم کیا۔ اور اسی طرح
دیگر ممالک کی تقسیم کی اور لائق اشخاص کو والی مقرر کیا۔ اور سرحد ہندوستان پر لشکر روانہ کیا۔ زیاد
نے حسن خوبی اور خوش اسلوبی سے ان وسیع ممالک کا انتظام کیا۔ مورخین بالاتفاق تعریف کرتے
ہیں۔ بصرہ میں ابتدا میں بہت سختی کی۔ لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ بفکری اور بے پروائی سے
کھلے دروازے سونے لگے اور جہاں کہیں کسی شخص کی کوئی چیز گر جاتی سوائے مالک کے کسی کا حوصلہ
نہ تھا کہ اسے اٹھاتا۔ اس سختی کے ساتھ داد و دہش اور فراخ حوصلگی سے بھی کام لیتا۔ حسن خدمات
کا یہ صلہ ملا کہ امیر معاویہ نے کوفہ کی امارت بھی زیاد کے ہاتھ میں دیدی۔ یہ پہلا شخص ہے جو عامل
عراقین ہوا۔ کوفہ کا انتظام کچھ آسان کام نہ تھا۔ اس لئے زیاد کو بہت مشکلات پیش آئیں۔ اہل کوفہ
اس قدر گستاخ اور شورہ پشت تھے کہ معمولی باتوں پر بھڑک اٹھتے۔ اور شورش کی خوفناک صورت
اختیار کر لیتے۔ مغیرہ بن شعبہ تو ان کے ہاتھ سے نہایت تنگ آ گیا تھا۔ آخر اسکی پیش گوئی حجر
بن عدی کی نسبت پوری ہوئی۔ ایک دن زیاد خطبہ میں امیر المومنین عثمانؓ کی تعریف کر رہا تھا
اور آپ کے قاتلوں کو برا کہا۔ حجر نے عادتاً نہایت بیباکی اور گستاخی سے تردید کی۔ زیاد اس وقت
مصلحتاً خاموش ہو رہا۔ اس کے بعد معلوم ہوا کہ لوگ حجر کے پاس جمع ہوتے اور امیر معاویہ پر علانیہ
لعن کرتے ہیں۔ زیاد نے حجر اور اس کے رفقا کو گرفتار کر کے دمشق بھیجدیا اور امیر معاویہ کو لکھدیا کہ
اگر حجر زندہ رہا تو آپ کی حکومت قائم نہیں رہ سکتی۔ چنانچہ اس امر کی شہادت کہ حجر نے امیر المومنین معاویہ
کو گالیاں دیں۔ اور لوگوں کو ان کے برخلاف بغاوت کے لئے ابھارا۔ اور یہ زعم کیا کہ آل ابیطالب

مستحق خلافت ہیں۔ اور شہر کوفہ میں بلوہ کیا، حجر کے برخلاف گذری۔ حجر بمعہ تیرہ رفقا امیر معاویہ کے حضور پیش ہوا۔

امیر معاویہ کی خواہش تھی کہ اگر کوئی صورت نکل آئے تو حجر اور اُس کے رفقا کو چھوڑ دوں۔ چنانچہ آٹھ آدمی تو صرف جریر بن عبداللہ البجلی اور دیگر مقتدر اشخاص کی سفارش پر رہا ہو گئے، حجر اور پانچ دیگر باقیماندہ قیدیوں سے کہا گیا کہ اگر آل ابیطالب سے بیزاری ظاہر کرو تو رہا کر دیا جائیگا، مگر ان لوگوں نے انکار کر دیا۔ اور آخر قتل کیئے گئے۔

حجر کے قتل کا افسوس تمام دنیائے اسلام کو ہوا۔ ام المومنین عائشہؓ کو جب اُنکی گرفتاری کا حال معلوم ہوا تو عبدالرحمٰن بن الحرث کو امیر معاویہ کے پاس بغرض سفارش روانہ کیا لیکن عبدالرحمٰن اس وقت پہنچا جب حجر کا کام تمام ہو چکا تھا۔ عبدالرحمٰن نے امیر معاویہ سے کہا "کیوں معاویہ حجر کے قتل کے وقت تمہارا حلم کہاں غائب ہو گیا تھا"۔ جواب دیا کہ "جہاں تمہاری جیسے قوم کے حلیم غائب ہو گئے تھے۔ بات یہ ہے کہ مجھکو اس امر پر ابن سمیہ (زیاد) نے آمادہ کیا تھا اس وجہ سے میں اس فعل کا مرتکب ہوا"۔ ربیع بن زیاد الحارثیؓ اس وقت والی خراسان تھا، جس وقت حجر کے قتل کی خبر سنی، سخت صدمہ ہوا۔ یہ دعا "اللھم ان کان للربیع عندک خیر فاقبضہ الیک وعجل" منہ میں تھی کہ جان بحق تسلیم کی۔

زیاد نے عراق اور گرد و نواح کا انتظام خاطر خواہ کر دیا۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ اس نے وقتاً فوقتاً اس درجہ سختی سے کام لیا کہ لوگوں کے دلوں میں خوف کے ساتھ نفرت بھی پیدا ہو گئی لیکن اسکا نتیجہ حکومت کے لئے بہت اچھا ہوا۔ شورش اور فساد قطعاً بند ہو گیا۔ اور اسکے ساتھ امن قائم ہو گیا۔ اگر حالات وقت اسکا تقاضا نہ کرتے تو زیاد کی قابلیت اور دانشوری سے امید تھی کہ وہ سختی کو کبھی پسند نہ کرتا۔ مگر مجبوراً اس نے ایسا کیا۔ اور جو کچھ اسکا نتیجہ ہوا۔ وہ بھی ناگزیر تھا۔

جب عراق کا بندوبست حسب دلخواہ کر چکا، تو امیر معاویہ کو لکھا "انی قد اخذت العراق بیمینی وبقیت شمالی فارغۃ لہ یاباً بالحجاز"۔ یعنی عراق کا بندوبست تو میرے بائیں ہاتھ کا کام تھا۔ داہنا ہاتھ فارغ رہا۔ ضبط حجاز کا سزاوار ہے، اہل حجاز کانپ اُٹھے اور عبداللہ بن عمر بن الخطاب کو اطلاع دی کہ زیاد عراق کے بعد حجاز کا حاکم ہوا چاہتا ہے، کہا "خدا کرے اس کا داہنا ہاتھ بیکار

ہی رہے۔" اللھم اکفنا شر زیاد" ۵۳ھ ماہ رمضان میں داہیں ہاتھ کی انگلی پر ایک دانہ نکل آیا۔ اس کا زہر پھیلتا گیا، شدت تکلیف سے بیقرار ہو گیا۔ احباب نے ہاتھ کٹوانے کی صلاح دی، قاضی شریح نے کہا "تیرا رزق معین ہے، اور موت کا دن مقرر ہے، اگر تیری زندگی نے کچھ دن لگا رکھے ہیں تو اللہ تعالیٰ کے حضور کس منہ سے کٹے ہوئے ہاتھ کے ساتھ جائیگا۔ اور جب اس کے متعلق سوال ہوگا تو یہ جواب دیگا کہ یا اللہ میں نے ہاتھ اسلئے کٹوایا کہ تیری قضا سے بھاگتا تھا اور تجھ سے ملنے سے نفرت تھی"۔ شریح کی بات اثر کر گئی، مگر جانبر نہ ہو سکا۔ اور اپنے بعد کوفہ پر عبد اللہ بن خالد بن اسید کو، اور بصرہ پر عبد اللہ بن عمر بن غیلان کو جانشین کر گیا، لیکن اول الذکر کو امیر معاویہ نے معزول کر کے ضحاک بن قیس کو عامل کوفہ مقرر کیا۔ زیاد کوفہ کے قریب مقام "ثویہ" میں مدفون ہوا۔

زیاد کے دو بیٹے تھے، عباد اور عبید اللہ، آخر الذکر بعد وفات زیاد امیر معاویہ کے پاس حاضر ہوا۔ اور استدعا حکومت بصرہ کی، امیر معاویہ نے کہا کہ "اگر تیرا باپ تجھے اپنا جانشین کر جاتا تو مجھے بھی کچھ عذر نہ تھا۔ تجھے بحال رکھتا"، عرض کی کہ "امیر المومنین آپ یہ نہ کہیں مبادا آپکے بعد کوئی یہ کہے کہ اگر تیرا باپ اور چچا (امیر معاویہ) تجھے بصرہ پر مامور کرتے تو میں بھی بحال رکھتا"، امیر معاویہ ہنس پڑے اور خراسان کا والی مقرر کر دیا، عبید اللہ کی عمر اس وقت پچیس سال تھی، ۵۴ھ میں بخارا کی پہاڑیوں میں ترکوں سے لڑائی ہوئی، عبید اللہ بذاتہ لڑ رہا تھا، ایک ہاتھ میں نیزہ تھا اور دوسرے ہاتھ میں پھریرہ لڑتے لڑتے لوگوں کی نظروں سے غائب ہو جاتا۔ پھر یکایک اپنے پھریرہ کو بلند کرتا جس سے خون ٹپکتا تھا، یہ لڑائی خراسان کے مشہور محاربات میں شمار ہوتی ہے۔ عبید اللہ دو سال تک خراسان کا والی رہا، اور اس نو عمری میں ایسا انتظام کیا کہ امیر معاویہ نے بصرہ کی حکومت بھی سپرد کر دی، یزید کے عہد میں عبید اللہ عامل عراق تھا۔ امام حسین رضی اللہ عنہ کے خون کا داغ اسکی تمام قابلیتوں کے دامن پر ایسا رہ گیا ہے کہ مٹانے سے نہیں مٹ سکتا، مختار نے امام صاحب کے خون کا بدلہ لینے کے لئے خروج کیا تو عبید اللہ مارا گیا۔ اور اس کا سر دار الامارۃ کوفہ میں مختار کے سامنے پیش ہوا۔

• اگرچہ بنو امیہ کے زمانہ میں بیسیوں عامل مختلف ممالک کے نظم و نسق پر مامور ہوئے جنکے نام اور کارنامے ہر ایک مورخ نے لکھے ہیں، لیکن ان میں سے حجاج بن یوسف، مہلب بن ابی صفرہ، بہت مشہور ہیں،

ابتدا میں حجاج طائف میں معلم تھا۔ اسکا اصلی نام کلیب اور باپ کا نام یوسف تھا۔ ایک شاعر کہتا ہے :۔

فماذاعسی الحجاج یبلغ جھدہ اذا نحن جاوزنا حفیر زیاد

فلولا بنو مروان کان ابن یوسف کما کان عبداًمن عبید ایاد

زمان ھوالعبد المقر بذلہ براوح عبیان القری ویغادی

اِسکے بعد حجاج روح بن زنباع وزیر عبدالملک کی خدمت میں گیا۔ ایک دن عبدالملک نے روح بن زنباع کے پاس لشکریوں کی شکایت کی کہ کوچ کے وقت کوچ نہیں کرتے اور وقت پر منزل پر نہیں پہونچتے۔ روح بن زنباع نے کہا "امیرالمؤمنین میری پولیس میں ایک ایسا شخص ہے کہ اگر آپ اسے اس کام پر مامور فرمائیں تو خاطر خواہ انتظام کردیگا" عبدالملک نے نام دریافت کیا تو کہا "حجاج" عبدالملک نے حجاج کو اس خدمت پر مامور کیا۔ ایک دن دیکھا کہ فوج کو کوچ کا حکم ہو چکا ہے لیکن روح بن زنباع کے آدمی ابھی تک دسترخوان بچھائے ہوئے نہایت بےفکری سے کھانا کھاتے ہیں۔ حجاج نے پوچھا کہ سب لوگ سفر کی تیاری میں مصروف ہیں۔ اور تم ابھی تک اکل وشرب کی فکر میں ہو" ان لوگوں نے گستاخانہ جواب دیا۔ حجاج نے اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا کہ "ذرا انکی شوریدہ سری کا علاج کردو" حجاج کے آدمیوں نے ان کی خوب خبر لی۔ روح بن زنباع کو اس واقعہ کی اطلاع ہوئی تو سخت غضب میں آگیا۔ اور عبدالملک کے پاس شکایت کی۔ حجاج طلب ہوا تو پوچھا کہ تو نے روح بن زنباع کے آدمیوں کو کیوں پیٹا۔ اور ان کے خیمہ وخرگاہ کس لئے جلائے؟" جواب دیا کہ "امیرالمؤمنین یہ کام تو آپ ہی کا ہے۔ بھلا مجھ غریب میں اتنی جرأت کہاں تھی کہ وزیر ممالک کے آدمیوں پر ہاتھ اٹھاتا۔ یہ آپ کا ہی ہاتھ تھا۔ آپ پر یہ امر نہایت آسان ہے کہ روح بن زنباع کو ایک خیمہ کے عوض دو خیمے عنایت فرمائیں اور ایک غلام کے عوض دو غلام بخش دیں۔ مگر آپکے احکام کی تعمیل سے اگر کوئی شخص انحراف کرے تو سخت دشوار ہے" عبدالملک خوش ہوگیا اور روح بن زنباع چپکا ہو رہا۔ حجاج نے اپنی انتظامی قابلیت کا اظہار اس طرح پہلی دفعہ کیا۔

اہل عراق کی خودسری اور آئے دن کی بغاوتوں نے عبدالملک کو پریشان کر رکھا تھا۔

حجاز میں عبداللہ بن زبیر کے خروج کے باعث ڈر تھا کہ بنوامیہ کی حکومت کا خاتمہ نہ ہو جائے۔ عبدالملک نے اس مہم کے لئے حجاج کو منتخب کیا۔ حجاج نے خونریزی کے موقع پر خونریزی اور آشتی کے موقعہ پر نرمی سے کام لیا۔ جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ عبداللہ بن زبیر کے اکثر ہواخواہ حجاج سے آملے، جن میں ان کے دو لڑکے حمزہ اور حبیب بھی تھے۔ عبداللہ بن زبیر لڑتے ہوئے کام آئے۔ اور حجاج کی قابلیت کا سکہ بیٹھ گیا۔ ۷۵ھ میں عبدالملک نے حجاج کو عراق کا عامل مقرر کر دیا۔ ماہ رمضان میں کوفہ میں آیا۔ مسجد میں منبر پر چڑھ کر خطبہ دینے لگا۔ لوگوں نے اسکی بیعزتی کا ارادہ کر لیا۔ عمیر بن جنابی ہاتھ میں کنکر لئے بیٹھا تھا اور کہتا تھا کہ اسپر اور اسکے بھیجنے والے پر لعنت ہو۔ دیکھو تو میں اسکی اسی جگہ درگت بناتا ہوں۔ ایک رفیق نے کہا کہ جلدی نہ کرو۔ پہلے اسکی تقریر تو سنیں کیا کہتا ہے۔" حجاج نے تقریر شروع کی۔

"انا ابن جلا وطلاع الثنایا   متی اضع العمامۃ تعرفونی

صلیب العود من سلفی نزار   کنغل السیف وضاح الجبین

اخو خمسین مجتمع اشدی   وبجدنی مداورۃ الشئون

اسکے بعد کہا کہ "اے اہل کوفہ میں تم سے اکثر آدمیوں کے جسم پر سر نہیں دیکھتا۔ مہلب اسوقت جنگ خوارج ازارقہ میں مصروف تھا اور اہل کوفہ امداد سے جی چراتے تھے۔ حجاج نے کہا کہ "آج کی رات جو شخص مہلب کے لشکر کے سوا کسی اور جگہ قیام کریگا اللہ تعالیٰ اس سے بری الذمہ ہے۔" حجاج تقریر کرتا تھا اور حاضرین کے دلوں پر یہ اثر ہو رہا تھا کہ عمیر کے ہاتھ سے کنکر گرتے جاتے تھے، اور انسے مطلق خبر نہ تھی۔ خطبے کے بعد لوگ مہلب کے لشکر کی طرف دوڑے۔ اسی طرح ایک خطبہ بصرہ میں دیا۔ حجاج نرا باتونی نہ تھا۔ بلکہ جو کہتا اس کا عملی ثبوت بھی دیتا۔ چند روز میں شورہ پشتوں کی جماعت کو خاک وخون میں ملا دیا۔

۸۲ھ میں عبدالرحمن ابن اشعث نے بغاوت کی۔ چند لڑائیوں کے بعد ہزیمت خوردہ خراسان کا راستہ لیا۔ اور ہرات کے قریب قیام کیا۔ یزید بن مہلب بن ابی صفرہ اس جگہ کا والی تھا۔ اس سے مقابلہ ہوا۔ چند سر برآوردہ اشخاص اسیر ہوئے۔ انہیں حجاج کے پاس بھیجدیا۔ ان میں سے ایک فیروز بن حصین تھا۔ حجاج نے پوچھا کہ "تجھے ان لوگوں کے ساتھ خروج کرنے کی کیا ضرورت تھی۔

کیونکہ تیرا اور ان کا کوئی باہمی رشتہ نہ تھا۔ جواب دیا کہ "یہ ایک عام فتنہ تھا۔ جس میں میں بھی مبتلا ہوگیا۔ حجاج نے کہا کہ "مجھے اپنے مال و اسباب کی فہرست لکھ کر دو" فیروز نے بیس لاکھ درہم کا حساب لکھ کر دیا اور کہا "اب تو میری جان بخشی ہوگئی؟" حجاج نے کہا کہ "نہیں پہلے اپنا مال حوالہ کر دو۔ بعد ازاں تجھے قتل کر دونگا" اتنا کہہ کر قید خانہ میں بھیجدیا۔ فیروز کو یقین ہوگیا کہ حجاج زندہ نہیں چھوڑے گا۔ اس لئے داروغہ جیل کو کہا کہ "مجھے باہر نکالو تاکہ میں اپنی امانتیں لوگوں سے واپس لے لوں۔ ورنہ میرے بعد کوئی کچھ نہ دے گا" داروغہ جیل نے باہر نکالا تو آواز بلند کہا کہ "جسکے پاس میری امانت ہو یا جس کے پاس میرا قرض ہو تو میں اسکو ہبہ کرتا ہوں"۔ حجاج نے بھی سمجھ لیا کہ اب اس سے کچھ وصول نہ ہوگا۔ قتل کا حکم دیا جسکی تعمیل کی گئی۔ حجاج نے بعض معزز اسیروں کو ملامت کے بعد معذرت کرنے کو کہا۔ انکار پر قتل کر دیا۔ بلقام بن نعیم کو کہا کہ ابن اشعث تو ملک گیری کی ہوس میں باغی ہوا۔ تجھے کس امر کی خواہش تھی؟ جواب دیا کہ "تیری جگہ عراق کی حکومت کی" اسے بھی قتل کیا۔ اعشیٰ ہمدان کی باری آئی تو کہا کہ "اس قصیدہ کو دوبارہ پڑھو جس میں عبدالرحمن اور اس کے رفقا کو میرے برخلاف جنگ کی ترغیب دی تھی۔ اعشیٰ ہمدان نے کہا اسمیں یہ مضمون نہ تھا۔ اور بہ تبدیل قافیہ شعر پڑھنے لگا جب یہ مصرع پڑھا "بخ بخ للوالد و للمولود" حجاج نے کہا "خدا کی قسم آج کے بعد تو کسی کو ملامت نہ کریگا" اور قتل کا حکم دیا۔ شعبی گرفتار ہو کر پیش ہوئے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ "خدا کی قسم میں جھوٹ نہ بولوں گا۔ ہم نے تمہارے برخلاف لڑائی میں کوشش کی۔ نہ تو ہم زبردست فاجر تھے اور نہ متقی اور نیک تھے۔ اللہ تعالیٰ نے تمکو ہم پر غلبہ دیا اگر سزا دو گے تو ہماری خطا کی وجہ سے اور اگر معاف کرو گے تو اپنے حلم و کرم کے باعث۔ اور تم حق بجانب ہو" حجاج نے کہا کہ "واللہ یہ شخص مجھے اس سے زیادہ محبوب ہے جو کہتا ہے کہ میں اس معرکہ میں نہ تھا۔ اور نہ میں نے یہ فعل کیا۔ حالانکہ اس کی تلوار سے ہمارا خون ٹپکتا ہے"۔ اس کے بعد شعبی کو رہا کر دیا گیا۔ اسی طرح ایک اور قیدی کے قتل کا حکم دیا تو اس نے کہا کہ "میں انصاف کا خواہاں ہوں" حجاج نے پوچھا کہ "کس طرح؟" کہا کہ ایک دفعہ عبدالرحمن تمہارے برخلاف تقریر کر رہا تھا۔ اور نا ملائم الفاظ استعمال کرتا تھا۔ میں نے اسے منع کیا" حجاج نے کہا کوئی شہادت موجود ہے۔ ایک اور قیدی کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ "یہ اس وقت موجود تھا" اس قیدی نے تائید و تصدیق کی۔ تو

حجاج نے اسے کہا کہ تو نے کس لئے اسے منع نہ کیا؟ جواب دیا کہ "کیوں منع کرتا تو میرا دشمن تھا۔"
حجاج نے دونوں کا قصور معاف کر دیا۔ پہلے کا اس لئے کہ احسان کا بدلہ احسان ہے اور دوسرے
کا اس لئے کہ بے خوف و خطر سچ کہا۔
حجاج کے ظلم و ستم کے افسانہ بہت مشہور ہیں، لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اس زمانہ
میں اسکی اشد ضرورت تھی۔ ۹۳ھ میں عمر بن عبد العزیز مدینہ پر عامل تھے، اور ولید خلیفہ تھا۔ حجاج
کے جور و ستم کی شکایت ولید کو لکھی۔ ادھر حجاج نے بھی ایک عرضداشت ولید کی خدمت میں ارسال
کی کہ اکثر شورہ پشت اور منافق عراق سے جلا وطن ہو کر مدینہ منورہ میں جاتے ہیں، اور عمر بن عبد العزیز
ان کی گرفتاری سے مانع آتے ہیں۔ اس کا نتیجہ حکومت کے حق میں اچھا نہ ہوگا۔ ولید نے عمر بن
عبد العزیز کو ولایت حجاز سے معزول کر دیا۔ سعید بن جبیر صحابہ رسول اکرمؐ کی یادگار تھے عبد الرحمن
بن اشعث کا ساتھ دیا۔ عبد الرحمن شکست کھا کر بھاگا تو سعید بن جبیرؓ بھی بھاگتے ہوئے مکہ میں مقیم
ہوئے۔ اور بہت عرصہ اس جگہ پوشیدہ رہے۔ ۹۵ھ میں گرفتار ہو کر حجاج کے سامنے آئے۔ حجاج نے
اپنے احسان جتاتے ہوئے پوچھا کہ "کس لئے میری مخالفت کی" جواب دیا کہ "میں انسان ہوں اور انسان
سے غلطی بھی سرزد ہو جاتی ہے" حجاج کو یہ معقول جواب پسند آیا لیکن پھر باتوں باتوں میں سعید نے
کہا کہ عبد الرحمن کی بیعت میرے گلے میں تھی، اس لئے اسے چھوڑ نہیں سکتا تھا۔ حجاج نے غضبناک ہو کر
کہا کہ "میں نے مکہ میں عبد الملک کی تجھ سے بیعت لی، اور اسکی تجدید کوفہ میں کی۔ تو نے امیر المومنین کی
دو بیعتیں فسخ کیں، اور کمینہ شخص کی ایک بیعت کا حق ادا کیا۔ میں تجھے ضرور قتل کرونگا"۔ سعید نے
کہا۔ "آج میں سعید اسم بامسمّٰی ثابت ہوا، میری والدہ نے میرا نام صحیح رکھا تھا" حجاج نے قتل کر دیا
تو لاشہ ایک طرف تڑپ رہا تھا اور سر سے کلمہ شہادت کا پہلا حصہ "لا اِلٰہ اِلّا اللہ" کی آواز آئی۔
کہتے ہیں کہ حجاج اس وقت مخبوط الحواس ہو گیا، اور بار بار "قیود قیود" کہتا تھا لوگوں نے یہ
سمجھ کے اسکا مقصود سعید بن جبیر کی قیود ہے سعید کا پاؤں پکڑ کے نصف ساق سے کاٹ ڈالا۔
اس واقعہ کے بعد حجاج جب سوتا تھا تو سعید بن جبیر کو خواب میں دیکھتا کہ اس کا دامن پکڑ کر کہتے ہیں کہ
"یا عدو اللہ فیما قتلتنی" کہ اے دشمن خدا تو نے مجھے کس لئے قتل کیا، حجاج چونک کر اٹھتا اور
کہتا "مالی و سعید بن جبیر" آخر ماہ شوال ۹۵ھ میں مر گیا۔ فرزدق نے مرثیہ لکھا مدعا یہ

تھا کہ ولید بن عبد الملک خوش ہو جائے؛

لیبک علی الاسلام من کان باکیا — علی اللہ من مستوحش اللیل خائف

وارملتہ لما اتاما نعیسہ — فجادت لہ لما بوا کفات الذوارف

وقالت لعبد یھا انیخا فعجلا — فقد مات راعی ذودنا بالتنائف

فلیت الاکف الدافنات ابن یوسف — یقطعن اذ یحثش فوق السقائف

فماذ رقت عینانی بعد محمد — علی مثلنا الا نفوس الحلائف

ولید مر گیا تو سلیمان اس کا جانشین ہوا؛ حجاج نے آل مہلب سے بہت بدسلوکی کی تھی؛ ان میں سے یزید بن مہلب اس وقت عراق کا عامل مقرر ہوا تو حجاج کی اولاد کو قتل کیا؛ ان لوگوں کی فرزدق نے ہجو لکھی؛ ابن عباس نے پوچھا کہ حجاج کی تعریف اسکی زندگی میں کرتے تھے وہ مر گیا تو اب ہجو کرتے ہو؛ کہا جبتک وہ زندہ رہا اللہ تعالیٰ نے اُسے اعلیٰ مرتبہ دیا؛ ہم بھی مدح کرتے رہے اب مر گیا تو عذاب میں گرفتار ہے؛ ہم بھی مذمت کرتے ہیں؛ شاعر تو تلامیذ الرحمٰن ہوتے ہیں؛ عمر بن عبد العزیز کو حجاج کے مرنے کی اطلاع ہوئی تو سجدہ شکر ادا کیا اور کہا کہ "دنیا آج ظلم سے پاک ہوئی ہے۔"

۸۳ھ میں حجاج نے شہر واسط کی بنیاد ڈالی؛ حجاج انقلاب پسند عراقیوں سے تنگ آگیا تھا اس نے معلوم کر لیا کہ کوفہ میں دار الامارۃ کی موجودگی لوگوں کے دلوں پر حکومت کا رعب اور دبدبہ کو کم کرتی ہے؛ اگرچہ اس نے بیشمار لوگوں کو قتل کیا لیکن شورش کا خاطر خواہ انسداد نہ ہوا۔ اس لئے اس نے ارادہ کر لیا کہ دار الامارۃ ایسی جگہ قائم کیا جائے جو عراق کے مختلف شہروں سے مساوی فاصلہ پر واقع ہو اور اسکی آبادی میں باغی عنصر موجود نہ ہو؛ چنانچہ "واسط" کو منتخب کیا گیا؛ اسکی وجہ تسمیہ غالباً یہی ہے کہ کوفہ؛ بصرہ، مداین؛ اہواز کے وسط میں واقع ہے؛ ان میں سے ہر ایک شہر کا فاصلہ واسط تک چالیس فرسخ ہے؛ یہ شہر دریاء دجلہ کے کنارہ پر آباد کیا گیا؛ حجاج نے اس جگہ سرکاری دفاتر کو منتقل کیا؛ اور ایک جامع مسجد تعمیر کی؛ حجاج کی نگاہ خراسان پر بھی تھی؛ اور اسکے انتظام کے بعد ہندوستان کو بھی فتح کرنا چاہتا تھا؛ چنانچہ محمد بن قاسم اور امیر مہلب نے متواتر حملے کئے؛

اگر حجاج کے دامن پر صحابۂ کرام کے خون کا داغ نہ ہوتا تو کچھ شک نہیں کہ وہ نہایت منتظم؛ مدبر؛ بہادر سپاہی؛ اور لائق افسر تھا؛ بنو امیہ کی حکومت کا خاتمہ معاویہ بن یزید کے بعد ہو گیا ہوتا۔ اگر

حجاج نہ ہوتا"

ابن خلکان نے مہلب اور آل مہلب کا تذکرہ لکھا ہے۔ ابتدا میں عبداللہ بن زبیر کی ہوا خواہوں میں تھا۔ اس کے بعد بنوامیہ کے زیر سایہ اپنی اعلیٰ قابلیت کا اظہار کرتا رہا۔ خوارج کی سرکوبی کے لئے یہ شخص دنیا میں پیدا ہوا تھا۔ ہندوستان پر اس کے حملے مشہور ہیں۔ ایک عرصہ تک خراسان کا عامل رہا۔ مرو الروذ کے ایک قریہ زاغول نامی میں وفات پائی، اور اسی جگہ مدفون ہوا۔ یہ واقعہ ۸۲ھ کا ہے۔

محمد بن قاسم، موسیٰ بن نصیر، طارق، قتیبہ بن مسلم کی فتوحات کے تذکرے کے لئے ایک دفتر کی ضرورت ہے"۔

خلفا بنوامیہ

"اگرچہ ہم اس ناگوار بحث کو جو مسلمانوں میں تفرقہ پردازی کی باعث ہے، چھیڑنا نہیں چاہتے تھے لیکن ہم اپنے مضمون کو ادھورا بھی نہیں چھوڑ سکتے تھے کہ خلافت اور اس کے مذہبی اور سیاسی تعلقات پر بحث کرتے ہوئے۔ ہم اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ ہر ایک مسلمان خواہ وہ کسی قوم یا ملک کا باشندہ ہو اگر مومن اور صالح ہے تو خلافت کا مستحق ہے۔ اور فی الحقیقت خلافت سے مسلمانوں کی ایک ایسی حیثیت دیگر اقوام میں مراد ہے جو با امن زندگی بسر کرنے کا موجب اور فرائض دین بلا خوف و خطر ادا کرنے کا باعث ہے۔ اور یہ حیثیت بہ سبب خلافت ہر ایک مسلمان کو حاصل ہے۔ کیونکہ اسلام کفر کا استیصال خاطر خواہ کر چکا ہے۔ اور کفر اس قابل ہی نہیں رہا کہ اشاعت اسلام کا مزاحم ہو۔ اسلام سے پیشتر دنیا کو یہ امن جو اسلام کی تعلیم ہے کبھی نصیب نہیں ہوا۔ خلافت میں دنیاوی حکومت کا جزو صرف کفار کے دست تعدی کو تاہ کرنے کا ذریعہ ہے۔ نہ کہ اشاعت اسلام کا باعث، یا ملک کا آلہ۔ خلافت امن کا فروہ سناتی ہے۔ اسلام تو خونریزی سے سخت متنفر ہے۔ ہمارا دعویٰ بادلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ خلافت خلیفہ کی صلاحیت اور ایمان کی بیّن شہادت ہے۔ اور اس لئے خلفاء بنوامیہ اور ان کے جانشین مومن اور صالح مسلمان ہیں۔ مسلمانوں کا خلیفہ فاسق و فاجر نہیں ہو سکتا۔ اور کسی کافر کو استحقاق خلافت نہیں ہو سکتا۔ خلفاء بنوامیہ بلا استثنا خلفاء کی اس با عظمت اور طویل فہرست میں شامل ہیں

جسکی ابتدا صدیق اکبرؓ کے مبارک نام سے ہوتی ہے۔

خلفاء بنوامیہ کی بدنامی کا موجب وہی جھوٹی روایتیں اور موضوع حدیثیں ہیں جن میں پولیٹیکل
اغراض مخفی تھے۔ اور موجودہ زمانہ میں ان سے تعصب مذہبی ظاہر ہے۔ بنوامیہ بنوہاشم کے حریف
تھے۔ ایام جاہلیت سے ہر دو فریق ایک دوسرے کے مدمقابل تھے۔ بنوہاشم کی عزت رسول خدا کی
ذات نے بڑھادی۔ اگرچہ زمانہ نبوی میں اس امر کا خیال کسی فرد بشر کو نہ تھا۔ مگر آیندہ زمانہ کے مسلمان محبت
اہلبیت کا دم رسولؐ خدا کے تعلقات کی وجہ سے بھرتے ہیں۔ اور اس لئے بنوہاشم کے حریف
مورد طعن ہوگئے۔ مگر یہ تواریخی ثبوت نظر انداز کرنے کے قابل نہیں کہ سوائے حضرت علیؓ امام حسنؓ
اور امین ابن ہارون الرشید کوئی ہاشمی خلیفہ ہاشمیہ کے بطن کا تخت خلافت پر نہیں بیٹھا۔ اگر امام حسنؓ
اور امین کی چندروزہ حکومت کا خیال نہ کیا جائے تو صرف حضرت علیؓ ہی ایک خالص ہاشمی خلیفہ ہوجاتے
ہیں۔ مگر آپ کا پرآشوب زمانہ اس امر کی مزید تائید کرتا ہے کہ اسلام نے ذاتوں کا امتیاز اور قومی افتخار
اور نسبی اعزاز کی بیخکنی کردی تھی۔ اور خود بنوامیہ کی کامیابی اور بنوہاشم کی شکست ظاہر کرتی ہے۔ کہ
حضرت محمدؐ کسی کے سرپرست یا مورث نہ تھے۔ "بلکہ رسول اللہ خاتم النبیین تھے" اور ان کے باعث کسی
قبیلہ کو کوئی خاندانی وجاہت کبھی حاصل نہیں ہوئی اور نہ آپ کی ذات بابرکات اور تعلیم اسلام کا یہ
منشا تھا۔ ہمارے ایک فاضل ہمعصر کا خیال "آنحضرتؐ کے وجود مبارک کے باعث بنوہاشم کا پلہ ان کے
حریف بنوامیہ کے اعزاز میں بھاری ہوگیا" موجودہ زمانہ کی کورکورانہ تقلید کا نتیجہ ہے۔ اس زمانہ کے
موحدین کا یہ فاسد عقیدہ نہ تھا۔

بنوامیہ کی رسوائی کا باعث یہ بھی ہے کہ ان کے جانشین بنوعباس ہوئے۔ ان کے نقیبوں نے
دل کھول کر خلفاء امیہ کی خدمت کی۔ کیونکہ اس کے بغیر بنوعباس کو کامیابی نہ ہوتی۔ لوگوں کو اچھی
طرح بنوامیہ سے بدظن کیا گیا۔ کچھ تو ان کے آخری تاجداروں کے مظالم جنمیں دو پیمانہ آب اور ایک
چمچہ دوغ تھا۔ اور اکثر موضوع حدیثوں کے ذریعہ جو فضیلت کا تذکرہ کرتی ہیں۔ لوگوں کو بنوہاشم کی طرف
متوجہ کیا گیا۔ یہ پولیٹیکل چالیں تھیں۔ لیکن یہ زمانہ ایسا تھا کہ جب تک ان پر مذہبی رنگ نہ ہوتا۔ عوام
کالانعام کی خوش اعتقادی پر مؤثر نہ ہوتیں۔ جب بیرونی اور اندرونی خرخشوں سے سلطنت کو امن ملتا ہی
تو تمدن کی ترقی کے ساتھ طبایع کا قدرتاً تقاضا عیش وعشرت ہی ہوتا ہے۔ اگر بنوامیہ اور انکے جانشین

خلفاء عباسیہ وغیرہ کا مقابلہ کیا جائے، تو موخر الذکر زیادہ قابل ملامت ثابت ہوں گے، جن کے عیش و عشرت کا مختصر حال ہم نے "بغداد" کے صفحات پر لکھدیا ہے، لیکن طرفداران بنو ہاشم نے اپنے حریف قبیلہ کو ہر ایک برائی سے متہم کیا، اور خلفاء بنو امیہ کی عیاشی، اور فسق و فجور کی ایسی خوفناک تصویر کھینچی کہ لوگ بنو امیہ ہی بیزار ہو گئے، جھوٹی روایتیں صحیح تواریخی واقعات میں ملائی گئیں، اور ان روایتوں کا کذب عموماً تاریخی واقعات کی صحت نے پوشیدہ رکھا، بلکہ ان کی صداقت پر مُہر لگادی، امیر معاویہ کے زمانہ میں ۲۲ھ سے ۵۱ھ تک رومیوں سے برابر چھیڑ چھاڑ رہی، اور عرب اور شام اور مصر سے مختلف سپہ سالاروں کے ماتحت وقتاً فوقتاً مسلمان بلاد نصاریٰ پر حملے کرتے رہے، ۵۰ھ میں امیر معاویہ نے ایک لشکر جرار قسطنطنیہ پر حملہ آور ہونے کے لئے روانہ کیا، اس کے سپہ سالار سفیان بن عوف تھے، اس مہم میں ابن عباس، ابن عامر، ابن زبیر، اور ابو ایوب انصاری بھی تھے، مسلمانوں کو اکثر مصائب کا سامنا ہوا، موسم اور آب و ہوا کی ناموافقت، سامان رسد کی کمی سے بہت نقصان ہوا، بیان کیا جاتا ہے کہ اس وقت جب مسلمان ان مصائب کا مقابلہ کر رہے تھے، یزید بن معاویہ "دیر مران" میں عیش و عشرت میں مشغول تھا، اور ان تکالیف کا حال سُنکر کہتا تھا۔

ما ان ابالی بما لاقت جموعھم	مجھے (مجاہدین اسلام کی تکالیف کی) کچھ پرواہ نہیں کہ کیا کچھ مقام
بالفرقدونة من حمی ومن شوم	فرقدونہ انکے لشکر کو سختی اور بدبختی پیش آئی جبکہ میں نے مقام
اذا اتکأت علی الانماط مرتفعا	مرتفع پر مختلف رنگوں کے قالینوں پر تکیہ لگایا ہوا ہے یعنی دیر مران میں
بدیر مروان عندی ام کلثوم	اور میرے پاس (میری بیوی) ام کلثوم ہے۔

مسلمانوں کی عام مصیبت کے ساتھ یہ عیش و عشرت کی روایت دل پر ایک خاص نفرت انگیز ناگوار اثر پیدا کرتی ہے اور سچ تو یہ ہے کہ اگر اس تواریخی واقعہ کے ساتھ اسکی آمیزش نہ ہوتی تو دیر مران میں قالین کے فرش پر اپنی زوجہ کو پہلو میں لئے ہوئے بیٹھنا کوئی بڑی بات نہ تھی، لیکن موجودہ صورت میں یہ بات پیدا کی گئی ہے کہ مسلمانوں کی مصیبت پر جبکہ ہر ایک شخص اظہار تاسف کر رہا تھا یزید ایک گونہ خوشی منا رہا تھا، یہ غلط ہے، یزید اس مہم میں شامل ہوا، وہ ایک دلاور سپاہی تھا، اور عرب کا بہادر نوجوان تھا، قسطنطنیہ کی دیواروں کے نیچے طرفین کے سپاہی داد مردانگی دے رہے تھے، عبد العزیز بن زرارة الکلابی یہ شعر پڑھتے ہوئے آگے بڑھے:۔

قد عشت فی الدھر اطوارا علی طرق | شتی فصادفت منھا اللین والبشعا
کلا یئوت فلا النعماء تبطرنی | ولا تخشعت من لاوائھا جزعا
لا یملاء الامر صدری قبل موقعہ | ولا اضیق بہ ذرعا اذا وقعا

امیر معاویہ کو انکی شہادت کی اطلاع ہوئی تو ان کے باپ کو کہا "واللہ ھلک فتی العرب" پوچھا میرا بیٹا یا تیرا بیٹا، جواب دیا کہ تیرا بیٹا، اللہ اسکو اجر دے، کہا،

فان یکن الموت اودی بہ | واصبح منخ الکلابی کسیرا
فکل فتی شارب کاسہ | فاما صغیرا واما کبیرا

ابو ایوب انصاری بھی اسی جگہ شہید ہوئے، اور اسجگہ مدفون ہوئے، بدر او راحد اور دیگر لڑائیوں میں رسولؐ کے ہمراہ تھے، جنگ صفین میں حضرت علیؓ کا ساتھ دیا، انکی قبر پر سلمان فاتحہ خوانی کے لئے جایا کرتے، ایک دفعہ قسطنطین نے کہا کہ مسلمانوں کو یہ قبر جاسوسی کا بہانہ ہاتھ آیا ہوا ہے، میں اس کو اکھڑوا دوں گا، یزید اس وقت بر سر حکومت تھا، کہا کہ قسطنطین بیوقوف ہے اسکو معلوم نہیں کہ شام میں بیشمار بزرگان نصارٰی کی قبریں ہیں، میں سب کو اکھڑوا دونگا، بنوامیہ کے بعد یہ قبر کس پرسی کی حالت میں پڑی رہی، اور کچھ عرصہ بعد اس کے ظاہری آثار مٹ گئے، جس وقت سلطان محمد ثانی نے قسطنطنیہ کو فتح کیا، تو شمس الدین ایک صوفی بزرگ نے اس کا پتہ دیا، اور اس جگہ آثار مل گئے، اسپر اب ایک عالیشان عمارت ہے اور سلطان روم کی تخت نشینی کی پہلی رسم اسی جگہ ادا ہوتی ہے،

ولید بن یزید ۱۲۵ھ میں ہشام بن عبدالملک کے بعد تخت خلافت پر متمکن ہوا، اکثر افعال ناپسندیدہ اور حرکات ناشائستہ اسکی طرف منسوب کئے جاتے ہیں، اس کے فسق و فجور اور خصایل ذمیمہ اور عادات رذیلہ کا تذکرہ کم و بیش ہر ایک مؤرخ نے کیا ہے۔ مگر بعض محققین نے اس سے انکار بھی کیا ہے۔ کیونکہ اس کے دشمن بہت تھے۔ اور بوجہ عداوت اسے بدنام کرنے کے لئے جھوٹی روایتیں اختراع کیں، کہتے ہیں کہ ولید نے ایک دفعہ قرآن شریف کھولا تو آیہ "وخاب کل جبار عنید" پر نظر پڑی جھلا اٹھا، اور چاک کر دیا، اور کہا،

تھددنی بجبار عنید | تو مجھے "جبار عنید" سے ڈراتا ہے،
فھا انا ذالک جبار عنید | فی زمانہ میں جبار عنید ہوں،

اذا ما جئت ربک یوم حشر — بروز قیامت اپنے رب کے پاس جاکر
فقل یارب مزقنی الولید — کہہ دینا کہ مجھے ولید نے پھاڑا ہو۔

ایک دفعہ خلیفہ مہدی عباسی کے دربار میں ولید کا ذکر آگیا۔ مہدی نے کہا کہ "وہ تو زندیق تھا۔" ابن علانہ فقیہ نے عرض کیا کہ "امیر المومنین اللہ تعالیٰ بہت بڑا عادل ہے اور وہ کبھی کسی زندیق کو خلافت نبوت اور امت مرحومہ کی حکومت عطا نہ فرمائے گا۔ مجھ سے ایک شخص نے جو ولید کا ندیم اور ہم پیالہ و ہم نوالہ تھا بیان کیا ہے کہ جب نماز کا وقت آجاتا تو ولید شاہانہ لباس اتار کر سفید صاف ستھرے کپڑے پہنتا نہایت اچھی طرح سے وضو کرتا۔ اور نماز خضوع و خشوع سے ادا کرتا۔ کیا ایک زندیق سے یہ امید ہوسکتی ہے؟" مہدی نے کہا "اے ابن علانہ اللہ تعالیٰ تجھے جزائے خیر دے۔ اصل بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ ولید کے دشمنوں نے اسپر یہ بہتان باندھے ہیں۔ اس کے اپنے قریبی رشتہ داروں نے اسے بدنام کیا۔ بغاوت کی۔ قتل کیا۔ ولید نے اپنے چچازاد بھائی سلیمان بن ہشام کو گرفتار کرکے درے لگوائے۔ اور سر اور داڑھی منڈوا کے جلاوطن کردیا۔ یزید بن ہشام کو قید میں رکھا۔ آخر ان لوگوں نے باہمی سازش سے اور ولید کو طرح طرح کی برائیوں سے متہم کیا۔ ان کی خوش قسمتی سے ایسے اسباب بھی جمع ہوگئے جنکی وجہ سے وہ اپنے ارادوں میں کامیاب ہوئے۔ بغاوت کی۔ اور ولید کو قتل کیا۔ ایک دفعہ عمر بن یزید کا لڑکا یعنی ولید کے برادر زادہ کا پسر ہارون الرشید کے پاس تنگدستی کی حالت میں آیا۔ رشید نے حسب نسب پوچھا۔ تو جواب دیا کہ قریشی ہوں۔ پوچھا کہ مفصل بتاؤ کہ کس قبیلے سے ہو۔ ابن عمر نے کچھ جواب نہ دیا۔ ہارون الرشید نے کہا کہ جواب دو۔ میں تمکو امن دیتا ہوں خواہ تم مروان ہی کیوں نہ ہو۔ کہا کہ میں عمر بن یزید کا بیٹا ہوں۔ رشید نے کہا کہ اللہ تعالیٰ ولید پر رحم کرے اور یزید ناقص پر لعنت۔ کیونکہ اس نے ایک ایسے خلیفہ کو قتل کیا جسپر امت مرحومہ کا اتفاق ہوچکا تھا۔ اس کے بعد ابن عمر کی حاجت پوری کردی۔

ہم یقین نہیں کرسکتے کہ خلفاء بنو امیہ جو رسول اللہ کے اصحاب اور تابعین تھے ایسے افعال کے مرتکب ہوئے جو انکی بدنامی کا موجب ہیں۔ ابھی تک نبوت کا ادب تازہ تھا۔ اور ممکن نہیں کہ اس زمانہ میں انمیں وہ برائیاں موجود ہوں جو عام مسلمانوں میں بھی نہ تھیں۔ جنگ صفین، یزید کی ولیعہدی، اور شہادت امام حسین رض ایسے واقعات ہیں جنکا تعلق امیر معاویہ اور انکے جانشین کے عہد حکومت سے ہے۔ اور بنو امیہ کی بدنامی کے وجوہات ہیں۔ جنگ صفین کے اسباب اور واقعات اور نتائج پر ہم مفصل بحث کرچکے ہیں اعادہ کی ضرورت

نہیں، یزید کی ولی عہدی کے متعلق مختلف روایتیں ہیں، خواہ شفقت پدری، یا مسلمانوں میں خانہ جنگی کا خوف، یا یزید کی ذاتی قابلیت، یا کوئی اور خیال اس کا محرک ہوا ہو بحث طلب امور نہیں ہیں، اگرچہ ہماری اپنی رائے یہ ہو کہ ان میں سے ہر ایک امر کم و بیش امیر معاویہ کے پیش نظر تھا، اور اس لئے ہر ایک مؤرخ نے ان کا تذکرہ کیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیوں امیر معاویہ نے اُس طرز انتخاب سے انحراف کیا جو اُن سے پیشتر خلفاء کا دستور العمل تھا، اس سوال کا جواب بھی ہم دیکھ چکے ہیں، کہ اس سے پہلے انتخاب کا طریقہ بہ لحاظ ضرورت وقت مختلف رہا ہے، اور شوریٰ یا استخلاف یا وصیت میں طریقہ انتخاب مختلف ہے، اور بہ لحاظ واقعات اور ضرورت وقت اختلاف ہوتا رہا ہے اور ہوگا، اور صرف ضرورت وقت پر ہی انتخاب کے طریقہ کا انحصار ہے اس لئے کسی خاص طریقہ انتخاب کو احسن نہیں کہا جا سکتا، بلکہ ہر ایک انتخاب جو بہ تقاضائے ضرورت وقت عمل میں لایا جائے اپنے اپنے موقع اور محل پر صحیح ہے، اس لئے اگر امیر معاویہ نے اس "انتخاب" سے انحراف کیا جس میں پیشتر ہی اختلاف موجود تھا تو کوئی قباحت نہیں کیونکہ ضرورت وقت اسی انتخاب کی مقتضی تھی۔

"خلافت" کے ضمن میں اس اعتراض کا جواب بھی دیا گیا ہے کہ شخصی حکومت خلافت کے وسیع دائرہ سے باہر نہیں، اگر یزید کی ولیعہدی نے خلافت کو موروثی بنا دیا تو کیا برا کیا؟ اگر خلافت اس طرز حکایت کو تسلیم نہیں کرتی تو اسکے لازمی نتیجہ سے انکار نہیں ہو سکتا کہ خلافت امیر معاویہ سے پیشتر منقطع ہو چکی تھی، اور امیر معاویہ کے بعد آج تک کبھی قائم نہیں ہوئی، کیونکہ بنو عباس اور بنو فاطمہ اور تمام اسلامی خاندان جو وقتاً فوقتاً برسر حکومت ہوئے شخصی حکمران اور موروثی حکومت کے بانی تھے، اس لئے اگر بنو امیہ میں سے کوئی تاجدار خلیفہ کہلانے کا مستحق نہیں تو آج تک کوئی اسلامی خاندان ایسا نہیں گذرا جو اس معزز خطاب کے قابل سمجھا جائے۔

آیہ "وعد الذین امنوا الخ" میں یہ الفاظ کہ "کما استخلف الذین من قبلھم" صریحاً شخصی اور موروثی حکومت کو بھی وعدہ خداوندی میں شامل کرتے ہیں۔ کیونکہ تاریخ اور مقدس کتب شاہد ہیں کہ مسلمانوں سے پیشتر یہ طرز حکومت بھی مروج تھی، اور حضرت داؤدؑ کے بعد حضرت سلیمانؑ اور ان کی اولاد نے مدت تک موروثی حکومت کو قائم رکھا۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ولیعہدی یزید کے متعلقہ واقعات کو بالاختصار لکھکر مذکورہ بالا امور کی تشریح

کردی جائے۔ اس وقت حسینؓ ابن علیؓ اور عبداللہ بن عمرؓ اور عبداللہ بن زبیرؓ ہی ایسے لوگ تھے جو مدعی خلافت ہو سکتے تھے۔ ان میں سے حسینؓ ابن علیؓ اور عبداللہ بن زبیرؓ دونوں ہاشمی تھے۔ اور دونوں نے خلافت کے لئے بہت کوشش کی، مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ امیر معاویہ نے دوراندیشی سے سمجھ لیا تھا کہ اب وہ زمانہ نہیں رہا، کہ لوگ ابتدائی طرز انتخاب کو عمل میں لائینگے۔ وہ واقعات جو ان کے اور حضرت علیؓ کے مابین ظہور میں آئے، اور اس زمانہ کی عام حالت سے صحیح صحیح اندازہ ہو سکتا تھا کہ اگر بنو ہاشم کو حصول خلافت کا موقع مل گیا، تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا! بنو امیہ کیا بہ لحاظ نفوس اور کیا بہ لحاظ اقتدار غرض ہر ایک پہلو سے اس وقت زبردست فریق تھا۔ ان کی خواہشات کو نظر انداز کرنا مصلحت ملکی کے صریحاً مخالف تھا! ہم قیاسی باتوں سے نتائج اخذ کرنا پسند نہیں کرتے واقعات جو تھوڑے ہی عرصہ بعد پیش آئے ان خیالات کی تائید کرتے ہیں جو اس وقت امیر معاویہ کے دماغ میں تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ امیر معاویہ نے اس معاملہ میں جلدی نہیں کی اور خوب سمجھ سوچ کر اس امر پر جرأت کی۔

اس وقت جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں یہی آدمی تھے، جو مدعی خلافت ہو سکتے تھے۔ چالیس سال کے عرصہ میں اجل اصحاب رسول اللہ اور سرداران و بزرگان قریش جو خلافت کے قابل سمجھے جا سکتے تھے یکے بعد دیگرے اس دار فانی سے رحلت فرما چکے تھے۔ اور اس وقت پرانی یادگاروں میں سے کوئی ایسا شخص نظر نہ آتا تھا جو اس بار گراں کا متحمل ہو سکے۔ واقعات کی صورت کچھ ایسی تھی کہ امیر معاویہ کو اپنے بعد اختلاف امت مرحومہ اور اس کے مضر نتایج کا خوف تھا عمال خلافت کو نامے لکھے اور مشورہ طلب کیا۔ ان ناموں کا مضمون یہ تھا کہ "میرا سن زیادہ ہو گیا ہے، میری ہڈیاں کمزور ہو گئی ہیں، مجھے اندیشہ ہے کہ میرے بعد امت محمدیہ میں اختلاف پڑ جائیگا، اس وجہ سے میں چاہتا ہوں کہ کسی کو اپنا ولیعہد بنالوں، لیکن بغیر مشورہ تمہارے اور ان لوگوں کے جو تمہارے پاس ہیں اس کام کو نہیں کر سکتا"! جواب یہی ملا کہ امیر المومنین خود ہی کسی کو منتخب فرمائیں"! اس پر یزید کو ولیعہد سلطنت اور اسکی بیعت کا اعلان کیا گیا، تمام لوگوں نے سوائے چند گنتی کے آدمیوں کے بیعت کر لی۔ عمرو بن حزام نے امیر معاویہ کو مخاطب کر کے کہا کہ "تم امت محمدیہ میں اپنے بیٹے کو خلیفہ بناتے ہو کیا اور کوئی شخص اس کا بہتر مستحق نہیں ہے"، کہا کہ "میں آپ کی رائے کا مشکور ہوں مگر بات یہ ہے کہ اس وقت صرف لڑکے ہی لڑکے رہ گئے ہیں، اور میرا بیٹا ان میں زیادہ لائق ہے" مدینہ میں امیر معاویہ نے لوگوں کو جمع کیا اور خطبہ

میں کہاکہ کوئی شخص یزید سے زیادہ مستحق خلافت نہیں ہے، عقل و فضل میں یہ سب سے افضل ہے، میرا خیال یہ ہے کہ کوئی شخص ان امور میں اسکو نہیں پہونچ سکتا" سوائے خاموشی کسی نے کچھ جواب نہ دیا، غرض سوائے مذکورہ بالا تین بزرگوں کے سب نے یزید کی بیعت کرلی، اہل شام نے امیر معاویہ کے سامنے کہاکہ اگر یہ لوگ بیعت نہ کرینگے توہم ان کی گردنیں اڑادیں گے، کہاکہ قریش کی شان میں میں ایسے الفاظ سُننا پسند نہیں کرتا، اور تمھارے مُنہ سے تو ایسے کلمے زیادہ مکروہ ہیں، اگرچہ امیر معاویہ نے بہت کوشش کی کہ ابن زبیرؓ، ابن علیؓ اور ابن عمرؓ بیعت یزید پر رضامند ہوجائیں مگر وہ ٹلتے ہی رہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عبداللہ بن زبیر کا اثر ان لوگوں کے دلوں پر اپنا کام کر رہا تھا، اِس لئے امیر معاویہ نے ایک دفعہ ابن زبیرؓ کو مکار لومڑی سے تشبیہہ دی، عبداللہ بن عمرؓ کی نسبت امیر معاویہ کی یہ رائے تھی کہ عبادت الٰہی کے سوائے انکا کوئی اور کام ہی نہیں، اور حسین ابن علیؓ کی نسبت یہ خیال تھاکہ صاف دل اور سادی طبیعت کے آدمی ہیں مگر اہل عراق ان کو خروج پر ضرور آمادہ کریں گے، بعض مؤرخین نے انہیں عبدالرحمٰن بن ابوبکرؓ کو بھی شامل کیا ہے مگر صحیح یہ ہے کہ انکا انتقال ۵۳ھ میں ہوچکا تھا، اور بیعت یزید کا واقعہ اس کے بعد ظہور میں آیا،

اِن واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر عبداللہ بن زبیرؓ جو "خروج" کا ارادہ پیشتر ہی سے کرچکے تھے، مانع نہ آتے توغالباً عبداللہ بن عمرؓ اور حسین بن علیؓ بیعت سے انکار نہ کرتے، مگر ان کے انکار کا اثر عوام الناس کی بیعت پر بہت کم ہوا، اور بالآخر انہیں بھی ناکامیابی ہوئی، کیونکہ امت مرحومہ کا اتفاق انکی رائے کے برخلاف ہوچکا تھا، سنہ ۶۰ھ میں امیر معاویہ نے ایک خطبہ میں کہاکہ "میری مثال ایک پکے ہوئے کھیت کی مانند ہے، تمپر میری امارت اس درجہ طول پکڑ گئی ہے کہ تم مجھ سے اور میں تم سے تھک گیا ہوں، میرے جانشین مجھ سے بہتر ثابت نہ ہوں گے، کسی کا مقولہ ہے کہ "من احب لقاء الله احب الله لقاءه"؛ جو شخص اللہ تعالیٰ کو ملنا چاہتا ہے اللہ تعالیٰ بھی اسکو ملنا چاہتا ہے، اے خدا میں تجھسے ملنا چاہتا ہوں، توبھی مجھے مل، اور مجھے مبارک کر" اس خطبہ کے بعد چند روز ہی زندہ رہے"

امیر معاویہ کے بعد یزید تخت خلافت پر بیٹھا اور بیعت کی تجدید کی گئی، عبداللہ بن عمرؓ اور عبداللہ بن عباسؓ اور عبداللہ بن زبیرؓ اور حسین ابن علیؓ چاروں بزرگ ایک جگہ جمع ہوئے اور آپسمیں مشورہ کیا، عبداللہ بن عمرؓ نے کہاکہ "لا تفرقا جماعة المسلمين"، حسین بن علیؓ اور عبداللہ بن زبیر تو مکہ معظمہ کی طرف روانہ ہوگئے

اور عبداللہ بن عمرؓ اور عبداللہ بن عباسؓ نے بیعت عامہ کے بعد بیعت کرلی،

امیر معاویہ کو معلوم تھا کہ اگر اپنے جانشین کا فیصلہ اپنی زندگی میں نہ کیا، تو امت مرحومہ میں اختلاف کے باعث خانہ جنگی کا آغاز ہو جائیگا، اور دوراندیشی سے یہ بھی سمجھ لیا تھا کہ اس وقت بنو امیہ کسی اور قبیلہ کے رکن کی حکومت تسلیم نہیں کرینگے، جس وقت عبداللہ بن زبیرؓ نے امیر کو مخاطب کر کے کہا کہ رسول اللہؐ نے کسی شخص کو اپنے بعد خلیفہ نامزد نہیں کیا، اور لوگوں کا اجماع اور اتفاق صدیق اکبرؓ کی بیعت پر ہوگیا اور مشورہ دیا کہ آپ بھی سنت رسول اللہؐ پر عمل کریں، جواب دیا کہ "تم میں کوئی شخص ابوبکر جیسا نہیں اور مجھے اختلاف امت کا اندیشہ ہے" یہ نہایت معقول جواب تھا، حضرت صدیق اکبرؓ نے اپنے بعد فاروق اعظمؓ کے حق میں وصیت کی، اور فرمایا تھا کہ اگر اختلاف امت کا اندیشہ نہ ہوتا تو سنت رسول اللہؐ پر عمل کرتے، معلوم ہوتا ہے کہ رسول خدا کے بعد صدیق اکبرؓ تھے اور آپکے بعد کوئی ایسا شخص نہ تھا جو آپکے رتبہ کا ہوتا، اور دنیاء اسلام اسکی بیعت پر متفق ہو جاتی، عبداللہ بن زبیرؓ نے کہا سچ کہتے ہو ہم میں کوئی شخص صدیق اکبرؓ جیسا نہیں ہے، اچھا آپ بھی وہی طریقہ اختیار کریں جو صدیق اکبرؓ نے کیا یعنی ایک ایسے شخص کے حق میں وصیت کی جو آپسے نسباً بعید تھا، جواب دیا کہ تم میں کوئی شخص عمرؓ جیسا نہیں، کہا عمر بن الخطابؓ کی تقلید کرو، اُنہوں نے اپنے بعد چھ آدمیوں کو اہل شوریٰ مقرر کر کے انتخاب خلیفہ کا اختیار دیا، ان میں نہ ان کا لڑکا تھا اور نہ کوئی رشتہ دار تھا"

ہم بیان کر چکے ہیں کہ امیر معاویہ نے گذشتہ طریقہ انتخاب پر عمل نہیں کیا اور نہ وہ اس کے پابند تھے، قیاس ہو سکتا ہے کہ اگر وہ ایسا کرتے تو کیا نتیجہ ہوتا، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، اور معاویہ بن یزید بن معاویہؓ کی مثالوں سے یہ امر واضح ہو جائے گا، ذی النورین کو اپنے جانشین کے تقرر یا اسکے متعلق کسی رائے کے ظاہر کرنے کا موقع نہیں ملا، حضرت علیؓ سے دریافت کیا گیا تھا کہ حضرت حسنؓ کے حق میں وصیت کر جائیں، فرمایا کہ اگر لوگ انہیں قبول کریں تو بہتر ورنہ جس شخص کو چاہو منتخب کرلو" معاویہ بن یزید نے صرف تین ماہ اور بعض اقوال کے مطابق چالیس دن حکومت کی، اکیس برس کی عمر میں انتقال کیا، لوگوں کو جمع کر کے خطبہ میں کہا کہ "اے لوگو میں تم پر حکومت کرنے سے معذور ہوں" اس لئے میں عمر بن الخطابؓ کی تقلید کرتا ہوں، عمرؓ نے چھ آدمیوں کو ارباب شوریٰ مقرر کر کے انتخاب خلیفہ کا اختیار دیدیا، لیکن مجھے ایسے چھ آدمی اب نظر نہیں آتے، اسلئے میں تمہیں ارباب شوریٰ مقرر

کرتا ہوں، جس کو مناسب سمجھو خلافت کے لئے منتخب کرو۔"

حضرت علیؓ کے بعد اہل عراق نے امام حسنؓ کو منتخب کیا، مگر آپ نے ان کی بیعت پر اعتماد نہ کیا اور خلع خلافت کے بعد امیر معاویہ کی بیعت پسند کی، معاویہ بن یزید نے خلافت کا معاملہ شوریٰ کے ہاتھ دیدیا۔ اسوقت عبداللہ بن زبیرؓ حجاز اور عراق پر قابض ہو چکا تھا، لیکن شام اور مصر بنو امیہ کا طرفدار تھا، اور مروان کو ہاتھ پر بیعت کر لی، مرج راہط میں مروانیوں اور ضحاک بن قیس طرفدار عبداللہ بن زبیرؓ کے درمیان بیس روز تک ہنگامہ کارزار گرم رہا، آخر محرم ۶۵ھ میں مروان کامیاب ہوا، لیکن چند روز میں سلطنت میں ایسی خرابیاں پیدا ہو گئیں کہ اگر عبدالملک سا منتظم آدمی اور حجاج جیسا جابر شخص برسر حکومت نہ ہوتے تو شام عراق پر، حجاز مصر پر اور خراسان سب پر حملہ آور ہوتا، اور اس بدنظمی اور بدامنی کا نتیجہ مسلمانوں اور اسلام کے حق میں سخت مضر ہوتا، خراسان میں عبداللہ بن حازم نے خود مختارانہ حکومت کی بنیاد ڈالنے کی کوشش کی، کوفہ میں مختار ثقفی نے ہنگامہ برپا کیا، سلمان بن صرد نے اہل عراق کو ابھارا کہ خون حسینؓ کا معاوضہ لینے کا وقت یہی ہے، نافع بن ازرق امیر خوارج نے سر اٹھایا، چند سال تک ہنگامہ قیامت برپا رہا، اور آخر بنو امیہ ہی کامیاب ہوئے، مگر صرف معاویہ بن یزید کی ایک غلطی کا خمیازہ دنیائے اسلام کو بھگتنا پڑا، اور ہزارہا مسلمانوں کا خون پانی کی طرح بہ گیا۔

صرف عبداللہ بن زبیرؓ اور حسینؓ آخر دم تک بیعت یزید سے انکار کرتے رہے، ان میں سے ابن زبیرؓ نے نیک نیتی سے یا حکمت عملی سے اس وقت تک دعویٰ خلافت نہیں کیا، جبتک واقعات کربلا نے ان کے لئے میدان صاف نہ کر دیا، اہل کوفہ نے حسینؓ کو متواتر خط لکھے کہ آپ اس جگہ تشریف لائیں ہم نے نعمان کے ہاتھ پر یزید کے لئے بیعت نہیں کی ہے، اگر آپ تشریف لائیں تو ہم اسکو اس جگہ سے نکال دیں گے۔" آپ نے مسلم بن عقیلؓ کو کوفہ کی طرف روانہ کیا، کہ اصل حالات معلوم کر کے اطلاع دے، مسلمؓ نے لکھا کہ اس وقت تک اٹھارہ ہزار آدمی میرے ہاتھ پر آپ کے لئے بیعت کر چکے ہیں، اور روزانہ تعداد میں ترقی ہوتی جاتی، آپ فوراً تشریف لائیں" اگرچہ ابن عباسؓ، ابن عمرؓ، ابن زبیرؓ اور دیگر خیرخواہوں نے سمجھایا مگر حسینؓ نے نہ مانا اور کوفہ کی طرف روانہ ہو گئے، راستہ میں کربلا کا واقعہ پیش آیا جس پر بیشمار مرثیہ لکھے گئے ہیں"

اگرچہ حسینؓ کی ذات میں ایک بہادر سپاہی کے جوہر موجود تھے، لیکن واقعات کے رو سے تسلیم کرنا

پڑتا ہے، کہ پولیٹیکل معاملات میں بہت کم دخل تھا، اور اس لئے اہل کوفہ کی باتوں میں آگئے، اپنی اور حریف کی طاقت کا صرف اہل کوفہ کی لاف زنی پر غلط اندازہ کیا، حضرت علیؓ اور حسنؓ کے ہمراہ بیشمار فوج تھی اور یہی اہل کوفہ اس کا جزو اعظم تھا مگر کامیابی نہ ہوئی، حسنؓ نے دور اندیشی سے نتائج پر نظر کی اور دعوے خلافت سے دست بردار ہو گئے، معلوم ہوتا ہے کہ دعوی محبت اہلبیت صرف منہ کی باتیں تھیں۔ درحقیقت اہل کوفہ انقلاب پسند جماعت تھی، اور اس لئے ایک نہ ایک مدعی خلافت کو خروج پر آمادہ کرتے رہے، نہ خود چین سے بیٹھتے تھے اور نہ کسی کو چین لینے دیا، تعجب ہے کہ حسینؓ نے کسطرح ان لوگوں پر اعتماد کیا، اس بدعہد اور پیمان شکن جماعت میں سے ایک شخص نے بھی وقت پر ساتھ نہ دیا، بلکہ میدان کربلا میں جب امام حسینؓ نے ان لوگوں کو نام لیکر مخاطب کیا جنہوں نے متواتر خطوط لکھے تھے تو صاف منکر ہو گئے، کہ ہم نے کوئی خط نہیں لکھا، ان لوگوں کی لاف زنی، بزدلی اور بے وفائی کا حال حضرت حسنؓ ہی اچھی طرح جانتے تھے، مگر حضرت حسینؓ ان کے چکمے میں آ گئے، اور یزید کے دامن پر خون شہادت کا داغ رہ گیا۔

یزید خاموشی سے حسینؓ کو خروج کرتا ہوا نہیں دیکھ سکتا تھا، یہ امید ہو سکتی تھی کہ اگر حسینؓ انکار بیعت پر اکتفا کرتے، تو امیر معاویہ کی طرح یزید بھی طرح دیتا، موجودہ حالت میں واقعات کی صورت مختلف تھی، اور یزید بد نظمی اور بدامنی کا انسداد کرنے پر مجبور تھا، فی زمانہ وہ جس لعنت اور ملامت کا مستحق سمجھا جاتا ہے، اس سے بچنے کی صرف یہی ایک صورت تھی کہ خلافت سے دست بردار ہو جاتا۔

حسینؓ کو ایک فریق بغاوت کا مجرم ٹھہراتا ہے، بظاہر صورت تو یہی کچھ ہے کہ آپ نے ایک ایسے حکمران کے برخلاف جسکی بیعت پر کل مسلمانوں کا اتفاق ہو چکا تھا، اسی حکمران کے دائرہ حکومت میں فساد برپا کیا، لیکن ہم واقعات سے ایسا نتیجہ اخذ نہیں کر سکتے، حسینؓ کو کوفیوں نے متواتر خط لکھے اور یقین دلایا کہ ابھی تک کسی شخص نے یزید کی بیعت نہیں کی، اور بیعت کرنا بھی نہیں چاہتے، حسینؓ نے سمجھ لیا تھا، کہ کوفہ پر بغیر خونریزی کے قبضہ ہو جائیگا، اگر ایسی صورت ہوتی تو بغاوت کے اصلی معنوں کا اطلاق اسپر نہ ہوتا کیونکہ یزید کی عملداری سے کوفہ باہر تھا، اس لئے یہ کہنا چاہیئے کہ حسینؓ ہجرت کے ارادہ سے کوفہ کیطرف آئے، حجاز اس وقت یزید کی بیعت کر چکا تھا، اگر حسینؓ بغاوت کرتے تو مکہ یا مدینہ میں کرتے، مگر آپ نے کوفہ کو اس لئے منتخب کیا کہ انکو یقین تھا کہ اہل کوفہ بیعت یزید سے انکار کر چکے ہیں، بہر حال وہ بغاوت کے مرتکب نہیں ہوئے کیونکہ واقعہ کربلا نے اس حد تک نوبت پہونچنے کا موقع نہیں دیا، لیکن اس سے

انکار نہیں ہو سکتا کہ مخالف فریق کو آپ کی نقل و حرکت سے صرف بغاوت کا ہی خیال ہو سکتا تھا۔"

بنوامیہ کی بدنامی کے اسباب پر مختصر بحث کرنے کے بعد مناسب تھا کہ ہم اُن واقعات کو بھی لکھتے جن سے ان کے زمانہ کو خاص امتیاز حاصل ہے یا بالفاظ دیگر اُن اوصاف کو بیان کرتے جو انکی ذات میں موجود تھے، لیکن ہمارا منشا نہیں کہ واقعات کو جو طبری، ابن اثیر، ابن خلدون اور دیگر مورخین کی ضخیم جلدوں میں مفصل بیان کئے گئے نقل کرکے کتاب کا حجم بڑھائیں، اس لئے ہم صرف نتائج پر اکتفا کرتے ہیں جو ان واقعات سے اخذ ہو سکتے ہیں۔

"خلافت بنوامیہ خالص عربی حکومت تھی، ان لوگوں نے اگرچہ شام، مصر اور عراق کے سرسبز شہروں میں رہائش اختیار کر لی تھی، اور جنت دنیا دمشق میں دارالخلافت قایم کیا تھا، لیکن عرب کے ریگستانوں اور صحرائی زندگی کو کبھی فراموش نہیں کیا، خلفا اور اشراف بنوامیہ اپنے لڑکوں کو ان ریگستانوں میں اس غرض سے بھیجدیا کرتے تھے کہ مبادا شامیوں اور غیر عربی اقوام کا اختلاط اصلی عربی زبان اور بدوی لب و لہجہ نہ بگاڑ دے، اور محکوم نسلوں سے میل ملاقات کا اثر بادیہ نشینوں کی فطری آزادی، اور بہادری کے جوہر پر نہ پڑے، میسون بنت مجدل بن انیف کلبیہ یزید کی والدہ کا نام ہے، قصر خضرا واقع دمشق میں آسایش کے سب سامان موجود تھے، لیکن وہ ہمیشہ عرب کی گرم ہواؤں کو یاد کرکے آہ سرد بھرتی، قدرتی چشموں کے کنارے کھجوروں کے جھنڈ الغوطہ کے باغات سے زیادہ دلکش تھے، آخر اپنے بیٹے یزید کو ہمراہ لیکر حجاز میں چلی آئی، عبدالملک اپنے بیٹے ولید کو صرف اس واسطے خلافت سے محروم رکھنے کا ارادہ کرتا تھا کہ وہ صحیح اور فصیح عربی نہ بول سکتا تھا، امیر معاویہ کو تو اہل حجاز سے اس قدر ہمدردی تھی کہ ان کے وظائف مقرر کر دیئے تھے، اور ان کے نا ملایم کلمات سن کر بھی خاموش رہتے، یہی باعث تھا کہ عرب ہمیشہ ان کی خلافت کا پشت پناہ رہا، اور بنو عباس اور بنو فاطمہ کو فی الحقیقت عربیوں سے کچھ ہمدردی نہ تھی، انکی نگاہ ہمیشہ عراق اور خراسان پر رہی، نہ عربیوں کو ان پر اور نہ ان کو عربیوں پر اعتماد تھا، اس لئے ابتدا میں جبکہ غیر اقوام حکومت کی نااہل تھیں، بنو ہاشم کو کامیابی نہیں ہوئی، لیکن آخر میں انہی نو مسلم خراسانیوں کی امداد سے عباسی غالب آئے، اس وقت عربی حکومت کا خاتمہ ہو گیا اور بنوامیہ کی خلافت کے ساتھ عربی اقتدار بھی خاک میں مل گیا، برامکہ کی وزارت، اور دیالمہ اور سلجوقیہ کی سلطنت قایم ہو گئی۔"

خلیفہ مہدی کے عہد خلافت میں داؤد بن یعقوب مدار المہام تھا، اس وقت اہل عرب کو معلوم ہوا کہ

ان کا اقتدار بنوامیہ کے ساتھ معدوم ہوچکا ہے، بشار بن مروان نے ایک دفعہ داؤد کی ہجو میں کہا:-

بنی امیہ ھبوا طال نومکم ۔ بنو امیہ تم بہت سو چکے اب خواب غفلت سے اٹھو، کیونکہ

ان الخلیفۃ یعقوب بن داؤد ۔ ان دنوں یعقوب بن داؤد خلیفہ ہے۔

ضاعت خلافتکم یاقوم فالتمسوا ۔ اے قوم عرب تمہاری خلافت ضائع ہوچکی اگر تمکو خدا کی خلافت

خلافۃ اللہ بین الناي والعود ۔ کی جستجو ہو تو اسے بانسری اور عود میں ڈھونڈو۔

بنوامیہ کی عظیم الشان فتوحات کا نظیر ان کے جانشین خلفا میں نہیں ملتا، ولید بن عبدالملک کے عہد میں ایک طرف دریائے سندھ اور دوسری جانب فرانس تک اس باعظمت حکومت کے حدود پھیلے ہوئے تھے، موسی بن نصیر، طارق، اور امیر مہلب اور محمد بن قاسم اور قتیبہ بن مسلم نے فتوحات کے سلسلہ میں بعد المشرقین کو ملادیا، اس کے ساتھ اگر خوارج کی بغاوتوں اور مدعیان خلافت کے خروج پر جن کے فرو کرنے میں عبید اللہ ابن زیاد اور حجاج بن یوسف کا ظلم ضرب المثل ہوگیا، غور کیا جائے تو بنوامیہ کی فتوحات کی وقعت اور بھی بڑھ جاتی ہے، ایک ہی وقت میں وہ اندرونی خرخشوں کے مٹانے اور حدود سلطنت کو بڑھانے میں مصروف تھے، بنوامیہ کے لئے یہ قابل فخر امر ہے کہ بزور شمشیر ملکوں کو فتح کیا، اور اپنے بعد مسلمانوں کے حوالے کیا، تو میت کبھی محکوم نہیں ہوتی، زبردست طاقت کچھ عرصہ کے واسطے اسے مغلوب کرسکتی ہے مگر بنوامیہ کی فتوحات کا یہ بھی خاصہ ہے کہ اس نے مفتوحہ ممالک کو دار الاسلام بنادیا، بنوامیہ کے جانشین اس تعریف کے مستحق نہیں، ان کی فتوحات کبھی ان حدود کو نہیں پہونچی جو بنوامیہ نے قائم کی تھیں، ان کی کوششیں شام سے بنوامیہ کی بیخ کنی کے بعد مسلمانوں ہی سے لڑنے مرنے میں صرف ہوئیں، مورخین نے بنوامیہ کے عہد میں سرحدی انتظام اور غیر اقوام سے لڑائیوں کا خصوصیت سے ذکر کیا ہے اس دور میں ان امور کی طرف سے غفلت نہایت قابل ملامت بات تھی، بحری لڑائیوں کی طرح سب سے پہلے امیر معاویہ نے ڈالی، اور جنگی بیڑہ کے ذریعہ بحیرہ روم میں بنوامیہ نے کئی جزیرے مسخر کئے۔

بنوامیہ نے اشاعت اسلام میں سعی بلیغ کی، اور یہ ایسا احسان ہے جسکے بار سے موجودہ زمانہ کے مسلمان سبکدوش نہیں ہوسکتے، شام، مصر، خراسان، افغانستان میں اسلام اسی دور میں پھیلا، اور یہی وجہ ہے کہ یہ ممالک اب تک مسلمانوں کے قبضہ میں ہیں، بنوامیہ کا احسان تمام دنیا پر ہے، جس کے اہل یوروپ بھی معترف اور مداح ہیں، علوم و فنون کو نہایت فیاضی سے غیر اقوام میں رواج دیا، اور سچ تو یہ ہے

کہ یورپ کو جہالت کی تاریکی سے انہی لوگوں نے نکالا۔ اس کا تذکرہ ہم شجرِ بنو امیہ کی اس شاخ کے ساتھ کریں گے جس کا سایہ "اندلس" پر تھا۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ خلفاء بنو امیہ کا مقابلہ خلفاء راشدین سے نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنے جانشینوں سے ہر ایک حیثیت سے ممتاز اور بہتر تھے۔ کیا یہ فخر کافی نہیں کہ ان میں اصحابِ رسول اللہ اور تابعین تھے۔ ان کے زہد و اتقا کی بیشمار مثالیں ہیں۔ اور انصاف پسند طبائع کے لئے غور و فکر کرنے کے لائق ہیں۔ عباسیہ کی عیاشی اور فاطمیہ کے تعصب سے ان کے کارنامے معرا ہیں۔ انہیں میں ایک عمر بن عبد العزیز ایک ایسا صالح اور عادل خلیفہ ہوا ہے جس کا شمار خلفاء راشدین میں ہوتا ہے۔ اور جس کا نظیر کسی خاندان میں نہیں ملتا۔

بنو امیہ کی بدنامی کے وجوہات پر ہم نے مختصر بحث کی ہے۔ آخر میں ہم ان کے زوال کے اسباب پر بھی غور کرتے ہیں۔ ان میں سے مدعیان خلافت اور خوارج کے خروج، اور عمر بن عبد العزیز کا عہد قابلِ ذکر ہیں۔

ہم بیان کر آئے ہیں معاویہ بن یزید نے خلافت کو کسی جانشین کی سرپرستی میں نہیں چھوڑا۔ مکہ معظمہ میں عبد اللہ بن زبیرؓ نے دعویٰ خلافت کیا اور حجاز اور عراق سے تائید ہوئی۔ اس وقت مروان والیٔ مدینہ تھا۔ ابن زبیرؓ کی بیعت کا ارادہ کیا۔ لیکن افواہاً سنا کہ ابن زبیرؓ نے حکم دیا ہے کہ بنو امیہ کو تہ تیغ بے دریغ کیا جائے۔ اس لئے سیدھا شام کا راستہ لیا۔ عبید اللہ بن زیاد کوفہ سے بھاگ کر مروان سے آملا۔ اس وقت دمشق میں دو فریق تھے۔ ایک تو مروان اور دوسرا ابن زبیر کا طرفدار تھا۔ ضحاک بن قیس نے اہل دمشق سے اس امر کی بیعت لی تھی کہ جبتک لوگوں کا اتفاق کسی امر پر نہ ہوگا، اس وقت تک میں تمہاری امارت کروں گا اور در پردہ ضحاک عبد اللہ بن زبیرؓ کے ہوا خواہوں میں سے تھا۔ لیکن مروان اور اس کے رفقا جو اس وقت مقام جابیہ میں پڑے ہوئے تھے۔ بے صبری سے ضحاک بن قیس کے فیصلہ کے منتظر تھے۔ آخر ان کو معلوم ہو گیا کہ ضحاک ابن زبیر کا ہوا خواہ ہے۔ اس لئے ان لوگوں نے بھی اپنا کام شروع کر دیا۔ کل بنو امیہ، کلب، غسان، سکاسک، اور طے نے مروان کی امارت کو تسلیم کر لیا۔ اس وقت ضحاک بن قیس مرج راہط میں ایک ہزار سواروں کے ساتھ پڑا ہوا تھا۔ مروان پانچ ہزار کی جمعیت کے ساتھ اس طرف آیا۔ رفتہ رفتہ طرفین کی جمعیت کو تقویت ہوتی گئی۔ اور آخر میں ضحاک بن قیس کا پلہ بھاری ہو گیا۔ مروان کے لشکر کی تعداد صرف تیرہ ہزار تھی۔ جس میں اکثر پیادہ تھے۔ اور ضحاک کے ہمراہ ساٹھ ہزار آدمی تھے۔ جنمیں سے اکثر سوار تھے۔

بیس دن روز تک ہنگامہ کارزار گرم رہا۔ یزید بن ابی انیس غسانی نے ضحاک کے عامل کو دمشق سے نکال دیا۔ اور مروان نے ضحاک کو مرج راہط میں شکست دی، اور دمشق پر قابض ہوگیا۔ تھوڑے عرصہ میں مصر بھی ابن زبیرؓ کے قبضہ سے نکل گیا۔ اس وقت بنو امیہ مصر اور شام پر قابض تھے۔ اور عبداللہ بن زبیرؓ حجاز اور عراق پر حکمران تھا۔ عراق پر اسکا بھائی مصعب ابن زبیر عامل تھا۔ مصعب عراق سے شام کی طرف ضحاک بن قیس کی کمک کے لیئے بڑھا، مگر اس سے پیشتر واقعہ مرج راہط ضحاک کا فیصلہ کر چکا تھا۔ عمرو بن سعید بن العاصی دمشق سے اسکے استقبال کے لئے نکلا۔ مصعب شکست خوردہ واپس ہوا۔ ۶۵ھ میں مروان کا انتقال ہوگیا۔ اور عبدالملک سریر خلافت پر بیٹھا۔ حجاج بن یوسف عبداللہ بن زبیر کے اور عبدالملک بذات خود مصعب کے مقابلہ کے لیئے نکلے۔

اہل عراق میں سے اکثر سر برآوردہ اشخاص در پردہ عبدالملک کے حامی تھے۔ عبدالملک نے مصعب کو لکھا کہ باہمی خانہ جنگی اور مسلمانوں کی خونریزی سے کچھ فائدہ نہیں۔ آؤ امر خلافت کو شوریٰ کے سپرد کریں۔ مصعب نے جواب دیا کہ ہمارے مابین کوئی چیز سوائے تلوار کے فیصلہ نہیں کر سکتی۔ آخر تلوار ہی نے فیصلہ کیا۔ عین میدان جنگ میں بعض عراقی افسر جو در پردہ عبدالملک سے ملے ہوئے تھے کھسک گئے۔ ابن خلدون نے آخری نظارہ اس طرح کھینچا ہے کہ "اس وقت تن تنہا مصعب اور اسکے معدودے چند رفیق رہ گئے، باقی کل اہل عراق دور سے کھڑے تماشا دیکھ رہے تھے، محمد بن مروان عبدالملک کے بھائی نے مصعب کے قریب پہونچکر باآواز بلند کہا۔ میں تمہارا چچازاد بھائی محمد بن مروان ہوں، تم امیر المؤمنین کی امان قبول کر لو۔" مصعب نے اس سے انکار کیا۔ اسپر محمد بن مروان نے اہل عراق کی سازش کا حال تبلایا۔ مصعب نے اسپر بھی توجہ نہ کی۔ پھر محمد بن مروان نے اس کے لڑکے عیسی سے پکار کر کہا "تمکو اور تمہارے باپ کو امان دی جاتی ہے۔" عیسے بن مصعب نے اپنے باپ کو کہا، مصعب نے جواب دیا کہ "میرا خیال ہے کہ اہل شام تمہارے ساتھ ایفاء وعدہ کریں گے، بہتر ہو کہ تم امان حاصل کر لو۔" عیسے نے کہا میں یہ گوارا نہیں کر سکتا۔ کل قریش کی عورتیں کہینگی کہ اپنے بچانے کی غرض سے میں آپ سے علیحدہ ہوگیا۔" مصعب نے کہا کہ اپنے چچا کے پاس مکہ کو چلے جاؤ، اور ان کو اہل عراق کی سازش اور بیوفائی کا حال بتانا، مجھے میرے حال پر چھوڑ جاؤ، میں اپنے آپ کو مقتول سمجھتا ہوں۔" عیسے نے کہا کہ میں آپ کو چھوڑ نہیں سکتا، بہتر ہو کہ آپ بصرہ کی طرف چلیں، یا مکہ میں چچا کے پاس تشریف لے جائیں، مصعب نے آہ سرد کھینچکر کہا کہ "میدان جنگ سے بھاگنا عار ہے، اچھا تم آگے بڑھو۔ میں تمہاری امداد پر ہوں۔" عیسیٰ بن مصعب نے شامیوں پر حملہ کیا

اور کام آئے۔ عبدالملک نے پھر ایک دفعہ منت سے امان قبول کرنے کے لئے کہا، مگر مصعب انکار کرتے رہے، آخر نہایت مردانگی سے لڑتے ہوئے جان دی۔ عبدالملک دارالامارۃ کوفہ میں داخل ہوا اور مصعب کا سر پیش کیا گیا، ایک شخص نے حاضرین میں سے کہا "امیرالمومنین! یہ قصر نہایت منحوس ہے میں نے اسی قصر میں حسینؓ کا سر عبیداللہ بن زیاد کے سامنے دیکھا، پھر عبیداللہ بن زیاد کا سر مختار بن عبید کے سامنے دیکھا پھر مختار کا سر مصعب بن زبیر کے سامنے دیکھا، اور آج مصعب کا سر آپ کے سامنے دیکھتا ہوں، خدا خیر کرے"۔ عبدالملک کے دل پر ان عجیب واقعات کا بڑا اثر ہوا، اور قصر کو چھوڑ دیا، اور مصعب کے سر کو دمشق کیطرف بغرض تشہیر روانہ کر دیا۔

حجاج بن یوسف نے کوہ ابوقیس پر منجنیق نصب کیئے اور عبداللہ بن زبیر کا محاصرہ نہایت سختی سے کیا، مفصل واقعات ہر ایک مورخ نے لکھے ہیں، آخر وقت میں آپکے دو لڑکے حمزہ اور حبیب بھی دشمن سے آملے، ان کا بھائی عمرو بن زبیر پہلے ہی سخت مخالف تھا، غرض یہ حالت تھی کہ عبداللہ بن زبیر اپنی ماں اسماء بنت ابوبکرؓ خلیفہ اول سے رخصت ہوئے اور کفن باندھکر دشمن کی صفوں میں گھس گئے، اور کام آئے، ابن زبیر قریش میں مشہور شہسوار تھے، اور فصاحت کا یہ عالم تھا کہ جہاں خطبہ دیتے در و دیوار بول اٹھتے۔ ان کے زہد اور تقوٰے کی یہ حالت تھی کہ کعبہ پر منجنیق پتھر برسا رہے تھے اور آپ عبادت میں مشغول تھے، غالباً کعبہ کی بے حرمتی میں بنوامیہ کے مظالم کو رنگ دیا گیا ہے۔

واقعات کربلا کے بعد اہل عراق کی انقلاب پسند طبیعت میں ایک دفعہ پھر جوش پیدا ہوا، ایک دوسرے کو ملامت کرتے تھے کہ کیوں امام حسینؓ کا ساتھ نہ دیا، ان لوگوں کا سردار سلیمان بن جرد تھا، پہلے تو میدان کربلا میں گئے، اور اس جگہ گزشتہ افعال پر نادم ہو کر زار زار روتے رہے، بعدازاں یہ جماعت تائب ربیع الثانی ۶۵ھ میں عین الوردہ کی طرف بڑھی، کسی شخص نے کہا کہ حسینؓ کے قاتل تو سب کوفہ میں موجود ہیں شام میں جاکر کیا کرینگے"، سلیمان نے کہا کہ یہ لوگ تو کرایہ کے ٹٹو تھے، اصل قاتل تو فاسق ابن فاسق عبیداللہ بن زیاد ہے اسے قتل کرنا چاہیئے، اس وقت سلیمان بن جرد اور مسیب بن نجبہ اور عبداللہ بن سعد اور عبداللہ بن وال اور رفا بن شداد پانچ شخص قصاص حسینؓ پر تلے ہوئے تھے اور ان کا دلی جوش دوسرے اشخاص پر اثر ڈال رہا تھا عین الوردہ کے غربی جانب ڈیرے ڈال لئے، عبیداللہ بن زیاد نے حصین بن نمیر کو مقابلہ کے لئے بھیجا، جماعت تائب بیس ہزار کے قریب تھی حصین بارہ ہزار کے ساتھ مقابلہ میں آیا، چند روز میدان کارزار گرم رہا،

اس عرصہ میں شامیوں کی تعداد بڑھتی گئی، آخر ایک روز زور شور کی لڑائی ہوئی کہ غروب آفتاب کے بعد رفاد بن شداد نے تابئین کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ کل افسر کام آئے، اور گنتی کے سپاہی باقی رہ گئے ہیں، مجبوراً میدان جنگ چھوڑ کر کوفہ کا راستہ لیا، اور چند دنوں بعد اس ہزیمت خوردہ چھوٹی سی جماعت کا شیرازہ بکھر گیا، اور ہر ایک شخص نے اپنے اپنے گھر کی راہ لی، یہ واقعہ ۶۵ھ کا ہے اس وقت تک مروان زندہ تھا، بماہ رمضان اس کا انتقال ہوگیا،

مختار ثقفی محمد بن علی المعروف ابن حنفیہ کا نقیب تھا، محمد بن علی نے اس شخص کو خون حسینؓ کا قصاص لینے پر مامور کیا تھا، اس وقت قاتلان حسینؓ کے برخلاف عراق میں آواز بلند ہو رہی تھی، مختار کے پاس کافی جمعیت ہوگئی، اور آخر کوفہ پر قابض ہوگیا، کوفہ اس وقت عجب مصیبت میں گرفتار تھا، لوگ بے سروسامانی کی حالت میں بھاگ رہے تھے اور مختار کے سپاہی ان لوگوں کو چن چن کر قتل کرتے تھے، اور لاشوں کو آگ میں جلاتے کتوں اور مردار خوار جانوروں کے آگے ڈالتے، انہیں شمر ذی الجوشن عمرو بن سعد بھی تھے، ۶۶ھ میں مختار کوفہ کی مہم اور خونریزی سے فارغ ہوا تو عبیداللہ بن زیاد کی فکر دامنگیر ہوئی، اور ایک مہم ابراہیم بن اشتر کی سرکردگی میں روانہ کی گئی، ایک کرسی جس پر طلائی ملمع تھا اس فوج کے درمیان تھی، بنی اسرائیل کے تابوت سکینہ کی طرح لوگ نہایت عزت اور احترام سے اٹھائے ہوئے تھے، کہتے ہیں کہ یہ کرسی علی ابن ابیطالبؓ کی تھی، سرزمین موصل پر ایک نہر کے کنارہ عبیداللہ بن زیاد سے مقابلہ ہوگیا، شامیوں کے نامی سردار اس جنگ میں کام آئے، عبیداللہ بن زیاد کا سر مختار کے سامنے کوفہ میں پیش ہوا، مختار کی اولوالعزمی کی کوئی انتہا نہ رہی، قتل و غارت کا بازار عام گرم ہوگیا، لوگ اس قدر تنگ آگئے کہ عبیداللہ بن زبیر کے پاس فریاد کی، آپ نے مصعب اپنے بھائی کو سرکوبی کے لئے روانہ کیا، مختار دارالامارۃ کوفہ میں محصور ہوگیا، اور اسی جگہ قتل کیا گیا،

مذکورہ بالا واقعات سے واضح ہوتا ہے کہ یزید کی وفات کے بعد ملکہ اسکی زندگی کے آخری ایام سے لیکر ۷۳ھ تک ملک میں عام بدنظمی کا رواج تھا، جس کا خاتمہ عبدالملک کے پرزور ہاتھوں نے کیا،

خوارج کی ابتدا اور ان کے خروج کی مختصر تاریخ ہم لکھ چکے ہیں یہ فرقہ بنو ہاشم کا بھی ویسا ہی دشمن تھا، جیسا بنو امیہ کا، امیر معاویہ اور آپکے جانشینوں کے عہد میں وقتاً فوقتاً یہ لوگ سر اٹھاتے کچھ عرصہ ادھر ادھر ملک میں لوٹ مار کرتے، جب ان کے مقابلہ میں کوئی نامی افسر آتا تو جی توڑ کر لڑتے، میدان جنگ سے بھاگنا

عار سمجھتے، یہاں تک کہ سب کام آتے، مگر تھوڑے عرصہ میں ان کی تعداد پھر ہزاروں تک پہنچ جاتی، اور پھر وہی ہنگامہ برپا کرتے، عبدالملک کے عہد تک خوارج باہمی اختلاف سے بچے رہے، لیکن اس وقت ان کے چار فرقے ہو گئے۔ انمیں سے ایک ازارقہ کہلاتا ہے، یہ لوگ نافع بن ازرق حنفی کے معتقد تھے، ان کا یہ اعتقاد تھا کہ سوائے ہمارے کل مسلمان کافر ہیں اور اس لیے ان کو قتل کرنا اور انکے مال و اسباب کو لوٹنا جائز تھا، اور اس کا عملی ثبوت بھی ان لوگوں نے خاطر خواہ دیا۔ دوسرا فرقہ "نجدیہ" ہے جو نجد بن عامر بن عبداللہ بن سیار بن مفرح حنفی کیطرف منسوب کیا جاتا ہے۔ یہ شخص پہلے نافع بن ازرق کے رفقا میں سے تھا، لیکن بعد میں ابن ازرق کے عقاید سے مخالفت کی اور یمامہ کی طرف چلا گیا، اور تھوڑے عرصہ میں اسکے ہمرکاب ہزارہا آدمی ہو گئے، تیسرا فرقہ ریاضیہ تھا جو عبداللہ بن ریاض مری کے پیرو تھے، ان کا یہ عقیدہ تھا کہ عام مسلمان جو غیر خوارج ہیں منافق ہیں، اور ان کے ساتھ رشتہ عقد و مناکحت جائز ہے اور ان کی وراثت حرام نہیں ہے، چوتھا فرقہ "صفریہ" ہے جو ابن صفار کی طرف منسوب ہے، مگر بعض موخین نے ان کی وجہ تسمیہ یہ لکھی ہے کہ کثرت عبادت سے ان کے چہرہ کا رنگ زرد پڑ گیا تھا، پھر فریق ریاضیہ کا اکثر عقاید میں ہم خیال تھا، مگر کسی قدر نرمی اور آشتی پسند تھا، ان لوگوں کے اعمال پر ان کے عقاید کا بہت اثر تھا، ایک دفعہ نجدہ نے بحرین پر قابض ہو کر مکہ میں غلہ اور جنس کی آمد بند کر دی، ابن عباسؓ نے لکھا کہ رسول اللہ کے زمانہ میں جب ثمامہ بن اثال مسلمان ہوا تو مکہ میں رسد و غلہ کی آمد روک دی، رسول اللہ نے تحریر فرمایا کہ اہل مکہ سے رسد کو نہ روکو، چنانچہ ثمامہ نے اسکی تعمیل کر دی، حالانکہ اہل مکہ اس وقت کفر و شرک میں مبتلا تھے، نہایت افسوس ہے کہ تم نے بھی رسد و غلہ کو روک دیا، حالانکہ ہم لوگ مسلمان ہیں" نجدہ سخت نادم ہوا اور غلہ کی ممانعت کا حکم منسوخ کر دیا، حجاج اور مہلب ان لوگوں کے سرکوب تھے، اور سچ تو یہ ہے کہ مہلب کی تمام عمر خوارج کے مقابلہ میں بسر ہوئی، خوارج بھی اپنی بات کے ایسے پکے تھے کہ قتل ہوئے، مگر اپنے عقاید سے باز نہ آتے، حجاج کی تیغ ستم نے ہزارہا کو قتل کیا، مگر چند دن کے بعد ان کا شمار پھر ابتدائی تعداد تک پہونچ جاتا، بنو امیہ کے زوال کا باعث تو خوارج تھے ہی مگر عبداللہ بن زبیرؓ کی امارت کو کمزور کرنے میں انکا حصہ دیگر اسباب سے کم نہیں، افسوس ہے کہ ان لوگوں نے زہد خشک کو اس انتہا تک پہونچا دیا تھا، کہ مسلمان انکی موجودگی میں زندگی امن سے بسر نہیں کر سکتے تھے، اگر ان کے زہد و تقوی کا اثر ان کی طبائع پر ایسی حد تک ہوتا کہ وعظ و نصیحت سے لوگوں کو راہ ہدایت کی طرف لاتے

تو غالباً وہ ہمدردی جو اکثر اشخاص کو ان کے ساتھ تھی زیادہ مفید ثابت ہوتی۔ ضحاک، شبیب، ابوحمزہ نے بنو امیہ کے صد سالہ عہد کو بغاوتوں میں ختم کر دیا۔

• ۷۶ھ میں صالح بن مسرح تمیمی نے شبیب کے ساتھ خروج کیا۔ صالح اسم بامسمّٰی تھا۔ فرقہ صفریہ کے عقائد کا پابند اور عابد اور زاہد تھا۔ سرزمین موصل اور جزیرہ میں اکثر مقیم رہتا۔ اس کے شاگرد بھی کثرت سے تھے۔ جن کو یہ قرآن اور فقہ کی تعلیم دیتا تھا۔ اور کبھی کبھی کوفہ میں اپنے احباب اور شاگردوں سے ملنے کو آجاتا تھا۔ وہ لوگ اسکی ضروریات مہیا کر دیا کرتے۔ حجاج صالح کو قتل کرنا چاہتا تھا۔ مگر پیشتر اسکے کہ حجاج اپنے ارادہ میں کامیاب ہو۔ صالح نے علم بغاوت بلند کیا۔ موصل کے قریب ایک خونریز لڑائی کے بعد صالح مارا گیا۔ خوارج ایک قلعہ میں پناہ گزین ہوئے۔ اور شبیب ان کا سردار مقرر ہوا۔ شبیب کی پیدائش کے متعلق یہ روایت ہے سنہ ۲۵ھ میں حضرت عثمانؓ نے شام میں ایک لشکر قیصر کے مقابلہ میں روانہ کیا۔ اس میں یزید بن نعیم بھی تھا۔ غنیمت میں ایک یونانی نوجوان عورت ہاتھ آئی۔ یزید اسے اپنے ہمراہ لایا اور آخر آزاد کر کے نکاح کر لیا۔ شبیب اس کے بطن سے دسویں ذوالحج کو پیدا ہوا۔ اسکی والدہ نے خواب میں دیکھا کہ ایک شعلہ اسکے سامنے زمین سے اٹھا اور آسمان تک بلند ہو کر شش جہت میں پھیل گیا۔ بعد ازاں آگ کا ایک انگارا زمین کی طرف آیا اور دریا میں گر کر بجھ گیا۔ اس خواب کی تعبیر شبیب کے کارناموں اور انجام سے واضح طور پر بیان ہوتی ہے۔ قلعہ میں محصور تھا۔ اور دشمنوں نے رات کے وقت لکڑیوں کا انبار لگا کر چاروں طرف سے آگ لگا دی۔ شبیب اپنے ہمراہیوں کو لئے ہوئے نکلا۔ گھوڑوں کے زین پوش کو پانی میں بھگو کر بھڑکتی ہوئی آگ پر ڈالتے ہوئے دشمن پر شبخون مارا اور فتح کے بعد کوفہ کا رخ کیا۔ حجاج اس وقت بصرہ میں تھا، جب اُسکو پرچہ لگا تو دو منزلہ کرتا ہوا کوفہ کی طرف آیا۔ لیکن اس سے پیشتر شبیب قابض ہو چکا تھا۔ اس وقت اس کے ہمراہ جمعیت بہت کم تھی۔ اس لئے کوفہ میں قیام کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ شبیب کی شہ زوری میں اس قدر مبالغہ کیا گیا ہے کہ چلتے چلتے دارالامارۃ کے بڑے دروازہ کو ایک ہی ضرب گرز سے توڑ دیا۔ حجاج نے اس کے تعاقب میں یکے بعد دیگرے کئی نامی افسر روانہ کئے۔ شبیب نے ان سب کو شکست فاش دی۔ حجاج نے تنگ آ کر عبدالملک کو لکھا کہ عراقی کرایہ کے ٹٹو ہیں۔ خوارج کے مقابلہ میں ٹھہر نہیں سکتے۔ مناسب یہ ہے کہ اہل شام سے ہماری امداد فرمائیں۔ عبدالملک نے سفیان بن ابرد کے ماتحت ایک لشکر جرار روانہ کر دیا۔ حجاج کوفیوں سے ایسا جلا ہوا تھا کہ سب کو ایک جگہ جمع کر کے تقریر کی کہ "اے اہل کوفہ

جو شخص تمھارے بل پر عزت و غلبہ کا خواہاں ہوتا ہے اللہ تعالیٰ اسکو کبھی سرخرو نہیں کریگا۔ اور خدا اسکی امداد نہ کرے گا۔ جو تمھاری مدد کا طالب ہو۔ مجھے تمھاری کچھ احتیاج نہیں۔ جہاں تمھارے سینگ سمائیں جاؤ۔ اور اپنی منحوس صورت مجھے نہ دکھاؤ۔ حیرہ میں یہود و نصاریٰ کے ساتھ رہایش اختیار کرو۔ مسلمانوں کی ہمسایگی تمھاری بزدلی بے ایمانی کی مقتضی نہیں۔"

شبیب کی زوجہ غزالہ نے نذر مانی تھی کہ کوفہ کی جامع مسجد میں دو رکعت نماز میں سورہ بقر و آل عمران پڑھونگی۔ اس نذر کو پورا کرنے کے لئے شبیب رات کے وقت معہ غزالہ کوفہ کی طرف آیا۔ اس وقت حجاج اس جگہ بیشمار فوج کے ساتھ پڑا تھا۔ مگر شبیب کوفہ میں داخل ہوگیا اور غزالہ نے اپنی نذر پوری کی۔ اور سلامت اپنے لشکر میں چلا آیا۔ حجاج کو اس واقعہ کی اطلاع ہوئی تو سخت برافروختہ ہوا۔ اور بذات خود شبیب کے تعاقب میں چلا۔ سبخہ پر لڑائی ہوئی۔ اس جنگ میں شبیب کی عورت غزالہ لڑتے ہوئے کام آئی۔ اسکی لاش دشمنوں کے ہاتھ پڑی۔ لیکن شبیب نے لڑتے ہوئے چھین لی۔"

آخری لڑائی اہواز پر شامی لشکر اور شبیب کے درمیان ہوئی۔ شبیب نے پل کے ذریعہ دجلہ کو عبور کیا۔ ادہر متواتر بیس نہایت سخت حملے کئے۔ لیکن شامی لشکر اپنی جگہ سے نہ ہٹا۔ شامیوں کے حملے کے سامنے خوارج ٹھہر نہ سکے۔ اور پل کے ذریعہ دوسرے کنارے پر آگئے۔

شبیب میدان جنگ میں کھڑا تھا۔ اس وقت صرف سو آدمی اس کے گرد حلقہ باندھے ہوئے تھے۔ شامیوں کی طرف تیر بارش کی طرح برس رہے تھے۔ شبیب نے اپنے ہمراہیوں کو مراجعت کا اشارہ کیا۔ بذات خود عقب میں رہا۔ تمام سپاہی پل سے عبور کر گئے۔ شبیب ابھی تک پل کے دوسری طرف سوار تھا۔ پل پر آہستہ آہستہ آرہا تھا کہ گھوڑے کے قدم کے نیچے ایک پتھر آگیا۔ گھوڑا بدک کر کشتی کے کنارہ پر جا پہونچا۔ شبیب سنبھل نہ سکا۔ پانی میں آرہا۔ پہلے غوطہ کے بعد سطح پر آیا تو کہا۔ "کان امر اللہ مفعولا"۔ دوسرا غوطہ کھایا۔ پھر ابھرا تو کہا۔ "ذالک تقدیر العزیز العلیم"۔ تیسرے غوطہ کے بعد خاتمہ ہوگیا۔"

ابو حمزہ کا اصلی نام مختار بن عوف تھا۔ بصرہ کا رہنے والا تھا۔ خوارج ریاضیہ کے عقاید کا پابند تھا۔ ہر سال موسم حج میں مکہ معظمہ میں آتا اور لوگوں کو مروان کے برخلاف ابھارتا۔ ۱۲۹ھ میں عبد اللہ بن یحییٰ طالب الحق سردار حضر موت اس کا معتقد ہوگیا۔ دوسرے سال ابو حمزہ سات سو کی جمعیت سے اس جگہ آیا۔ اس وقت عامل حجاز عبد الواحد بن سلیمان بن عبد الملک تھا۔ اس نے تا انقضاء ایام حج اور واپسی حجاج تک مصالحت کی درخواست

کی۔ اور اس امر کے تصفیہ کے لئے عبید اللہ بن حسن بن حسنؓ، محمد بن عبد اللہ بن عمر بن عثمانؓ، عبد الرحمن بن قاسم بن محمد بن ابو بکرؓ، عبید اللہ بن عمر بن حفص بن عاصم بن عمر بن خطابؓ۔ اور ربیعہ بن ابی عبد الرحمن کو بمعہ دیگر بزرگوں کے بھیجا۔ ابو حمزہ علوی اور عثمانی بزرگوں کے نام سے ناک بھوں چڑھانے لگا۔ لیکن صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ کی اولاد کو دیکھ کر خوش ہو گیا۔ اور کہا کہ ہم تمہارے ہی اجداد کی نیک سیرت کو شہرت دیتے ہیں۔ اور انہیں کے اقتدا کے خیال سے خروج کیا ہے۔ عبید اللہ بن حسنؓ نے کہا کہ ہم اس غرض سے تمہارے پاس نہیں آئے کہ ہمارے آبا و اجداد کی باہمی تفضیل بیان کرو بلکہ ہم امیر کی طرف سے سفیر ہو کر آئے ہیں۔ آخر صلح ہو گئی۔ مگر عبد الواحد اس عہد و پیمان کو وفا نہ کر سکا۔ ابو حمزہ بے تکلف اہل مدینہ کے لشکر میں آیا۔ مگر ان لوگوں کو در پردہ خوارج پر حملہ کی ترغیب دی گئی تھی۔ ابو حمزہ نے یہ حال معلوم کر کے کہا کہ اے اہل مدینہ تم ہم سے جنگ نہ کرو۔ ہم اپنے دشمن سے سمجھ لینگے۔ مگر اہل مدینہ نے کچھ نہ سنا۔ اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک خونریز لڑائی میں سات سو آدمی قبیلہ قریش کے مارے گئے۔ عبد الواحد شام کی طرف چلا گیا۔ اور ۱۵ ار ماہ صفر ۱۳۰ھ میں ابو حمزہ مدینہ میں داخل ہوا۔ اس جگہ ایک تقریر کی جسکو صاحب عقد الفرید نے نقل کیا ہے۔ اہل مدینہ کو مخاطب کر کے کہا کہ "ہم تمہیں تقویٰ اور کتاب اور سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر طاعت و عمل کی وصیت کرتے ہیں۔" اس کے بعد اہل مدینہ کو ملامت کرتے ہوئے کہا کہ "اولکم خیر اول و آخرکم شر آخر۔" اور گزشتہ اور موجودہ حالت کا مقابلہ کرتے ہوئے کہا "تمہارے اجداد اہل الیقین اور اہل المعرفۃ بالدین والبصائر النافذہ والقلوب الواہنۃ۔" اور تم اہل الضلالۃ والجہالۃ ہو۔" اس کے بعد تمام خلفا کو ایک ایک کر کے شمار کیا اور ان کے عیوب بیان کئے مگر ابو بکرؓ اور عمرؓ کی تعریف میں رطب اللسان رہا۔ اس کی جادو بیانی کا یہ اثر تھا کہ جس شخص نے اسکی تقریر سنی کہتا تھا کہ "من زنا فھو کافر و من سرق فھو کافر" (جس شخص نے زنا کیا وہ کافر ہے جس نے چوری کی وہ کافر ہے)۔

خوارج کی بغاوتوں نے شجرۂ بنو امیہ کی جڑ کھوکھلی کر دی۔ عمر بن عبد العزیز کے عہد خلافت نے اس کو بیخ و بن سے اکھیڑ دیا۔ اگرچہ آپکے زمانہ میں بغاوتوں کی طرف سے امن تھا۔ لیکن آپ کا طریق عمل وہ کام کر رہا تھا جو شاید اتنی بغاوتوں سے بہت مدت بعد ہوتا۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ عمر بن عبد العزیز ہر ایک تعریف کے مستحق ہیں۔ ان کا شمار خلفاء راشدین میں ہونا چاہئے۔ لیکن اس امر سے انکار نہیں ہو سکتا کہ آپ نے بنو امیہ کی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ یہ زمانہ آپ کی خلافت کا مقتضی نہیں تھا۔ بنو امیہ بنو ہاشم کو اور بنو ہاشم بنو امیہ کے

حق میں کلمات ناملائم کہتے تھے۔ عمر بن عبد العزیز نے عنان خلافت ہاتھ میں لیکر پہلا کام یہ کیا کہ اس کی ممانعت کر دی۔ بنو ہاشم کی رعایت کرتے اور نہایت عزت و احترام سے پیش آتے۔ اگر آپ کا نظیر بنو ہاشم میں ہوتا تو غالباً خانہ جنگی کا خاتمہ ہو جاتا اور حکومت پھر خلافت راشدہ کے اصولوں پر قائم ہو جاتی۔ یہ تو نہ ہوا۔ مگر اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ بنو عباس کو بھی دعویٰ خلافت کے اٹھانے کا موقعہ مل گیا۔ اور بنو ہاشم نے آپ کی رعایتوں کا فائدہ خاطر خواہ اٹھایا۔ محمد بن علیؓ بن عبد اللہ بن عباسؓ نے اپنے دعاۃ کو ممالک اسلامیہ میں پھیلا دیا اور خفیہ کارروائی میں مصروف ہو گئے۔ اس وقت آئندہ بغداد کی عظیم الشان حکومت کی بنیاد پڑ گئی۔ آپ کے جانشینوں میں سے ہشام بن عبد الملک کے عہد میں اور زید بن علی بن الحسین کی شہادت نے ۱۲۳ھ میں بنو ہاشم میں ایک جوش پیدا کر دیا۔ بنو عباس نے چار دفعہ خروج کیا۔ ولید بن یزید بن عبد الملک کے زمانہ میں یحییٰ بن زید شہید نے خروج کیا۔ اور قتل کئے گئے۔ علویوں اور فاطمیوں کے خون کا قصاص بنو عباس کے خروج کا بہانہ تھا۔ یزید ناقص کے عہد میں حمص اور فلسطین میں بغاوت ہوئی۔ اہل یمامہ اور عامل خلافت کے درمیان جنگ ہوا۔ اہل خراسان کے اختلاف نے بدامنی کو رواج دیا۔ بنی عباس نے مناسب موقع دیکھ کر علم بغاوت بلند کیا۔ یزید ناقص کہا کرتا کہ

انا ابن کسریٰ وابی مروان وقیصر جدی وجدی خاقان۔

(میں کسریٰ کا نواسا اور مروان کا بیٹا ہوں۔ میرا نانا قیصر روم اور خاقان ہے)۔

والدہ کا نام شاہ فرند تھا۔ فیروز بن یزدجرد بن شہریار بن کسریٰ کی لڑکی تھی۔ فیروز کی ماں شہرویہ بن کسریٰ کی بیٹی تھی۔ اور شہرویہ کی ماں خاقان بادشاہ ترک کی بیٹی تھی۔ اور فیروز کی نانی قیصر روم کی بیٹی تھی۔ ان تعلقات نے عربی حمیت اور شجاعت کو بھی معدوم کر دیا۔ یزید کی وفات پر ابراہیم بن الولید بن عبد الملک اور مروان بن محمد بن مروان نے ایک دوسرے کے برخلاف فوج کشی کی۔ دار عبد العزیز بن حجاج بن عبد الملک ابراہیم نے خلع خلافت کیا۔ اور مروان تخت خلافت پر بیٹھا۔ اسکے زمانہ میں عام بغاوتوں نے بنو امیہ کی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ ابو مسلم خراسانی نے دعاۃ عباسیہ کو دولت عباسیہ کی دعوت کے واسطے چاروں طرف پھیلا دیا۔ ابو مسلم ابراہیم امام کے لئے لوگوں سے بیعت لیتا تھا۔ مگر ابراہیم مروان کے زندان میں ہی مر گئے۔ اور اپنے بعد اپنے بھائی ابو العباس عبد اللہ کو جانشین کر گئے۔ مروان کو ایک دم ان بغاوتوں سے فرصت ملی تھی جو ملک کے ہر ایک حصہ میں برپا ہو رہی تھیں۔ دعاۃ بنو عباس لوگوں کو

کو اُبھار رہے تھے۔ ان سے کئی ایک دفعہ جنگ ہوا، آخری لڑائی بمقام زاب ۱۳۲ھ میں ہوئی، اس وقت عباسیہ فوج کا سپہ سالار عبداللہ بن علی تھا، مروان شکست کھا کر موصل میں آیا، لیکن زمانہ بدل چکا تھا اہل موصل نے شہر میں داخل ہونے نہ دیا، عبداللہ بن علی اس کے تعاقب میں چلا آرہا تھا، مروان نے حمص کا رخ کیا، اہل حمص نے بھی مقابلہ کیا۔ اس لئے دمشق میں آیا۔ چچا کے بیٹے ولید بن معاویہ بن مروان بن حکم کو مخالفین سے لڑنے کی ہدایت کر کے فلسطین کا راستہ لیا، عبداللہ بن علی دمشق میں آیا، اور فوجوں کو چاروں طرف پھیلا دیا، آپ باب شرقی پر، اور صالح بن علی باب جابیہ پر ابو عون باب کیسان پر۔ بسام بن ابراہیم باب صغیر پر، حمید بن قحطبہ باب توما پر، اور عبدالصمد بن یحییٰ بن صفوان اور عباس بن یزید باب الفرادیس پر محاصرہ ڈالے ہوئے تھے، چند روز کے محاصرہ کے بعد رمضان ۱۳۲ھ میں دمشق سخر ہوگیا۔ قتل عام کا بازار گرم ہوگیا، دمشق کی گلیوں سے خون کی ندیاں بہنے لگیں، ولید بن معاویہ اس ہنگامہ میں مارا گیا، مروان اِدھر اُدھر بھاگ کر جان بچاتا تھا۔ آخر وہ بھی بمقام بوصیر مارا گیا، اس وقت یہ کیفیت تھی کہ بنو امیہ میں سے جہاں کہیں جو شخص ملا قتل کیا گیا، صرف ایک شخص عبدالرحمٰن بھاگ کر مصر میں آیا، اور یہاں سے ہسپانیہ میں پہونچا اور خاندان امیہ کی بنیاد از سرِ نو ڈالی۔ کہتے ہیں کہ بنو امیہ کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر قتل کیا گیا، بچوں اور بوڑھوں کو بھی نہ چھوڑا، بنو امیہ کے خلفاء کی قبریں اکھڑوا دیں ان کے مکانات کو خاک کے برابر کر دیا۔ آخر امن کا اعلان کیا گیا،

ایک دن ابوالعباس جو سفاح کے مہیب نام سے مشہور ہے ہشام بن عبدالملک سے باتیں کر رہا تھا کہ سدیف بن میمون آنکلا، سفاح کے پاس ہشام کو دیکھ جل گیا۔ کہا:-

قد اتاك الوفود من عبد شمس	تمھارے پاس بنو عبد شمس کے مہمان آئے ہیں
مستعدین یوجفون المطایا	تیار ہو کر اپنی سواریوں کو تکلیف دیتے ہوئے،
عنوۃ ایها الخلیفه لا عن	اے خلیفہ وہ دو کھ سے آئے ہیں طاعت کے خیال سے
طاعة بل تخوفوا المشرفیا	نہیں آئے، بلکہ تلوار کے خوف سے،
لا یغرنك ما ترئ من رجال	تم ان لوگوں کو دیکھ کر نازاں نہ ہونا، ان کے پہلوں
ان بلین الضلوع داء دویا	میں تمھاری طرف سے غبار باطنی بھرا ہوا
	ہے،

فضع السیف وارفع السوط حتی	پس انکو تلوار کی گھاٹ اتار دو اور چشم نمائی کا خیال چھوڑ دو تاآنکہ
لا تری فوق ظهرها الو یا	ان سواریوں کی پشت پر کوئی بنوامیہ نظر نہ آئے؛

سلمان نے کہا، کیوں چچا تم نے تو میرے قتل کا سامان مہیا کر دیا، سفاح نے اشارہ کیا اور سلمان قتل کیا گیا؛

عبد اللہ بن علی نہر ابی فطرس کے کنارے نوے[۹۰] اشراف بنوامیہ کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا، دعوت کے بہانہ ان لوگوں کو بلایا گیا تھا۔ اتنے میں شبل بن عبد اللہ آگیا کہا۔

اصبح الملك فی ثبات الاساس	جو امر وہ بنو عباس کی بدولت تم بالاستقلال
بالبهالیل من بنی العباس	بادشاہ ہو گئے؛
طلبوا وترهاشم فلقوها	ایک زمانہ گذرنے اور خوف کے بعد بنو ہاشم کا بدلہ
بعد میل من الزمان وباس	طلب کیا اور بدلہ لیا؛
لا تقلین عبد شمس عثارا	تم ہرگز عبد شمس سے انتقام لینے میں درگذر نہ کرنا ان کے
فاقطعن کل اقلة وغراس	ہر ایک درخت کو کاٹ ڈالو؛
فلقا اظهر التودد منها	ہمکو انہی ہاشمیوں سے علی الاعلان دوستی ہے اور انہی
وبها منکم کحز المواسی	کے قتل کیوجہ سے تمہاری حجامت ہو گئی؛
فلقد غاضنی وغاض سوائی	بیشک صرف مجھے ہی نہیں بلکہ اور لوگوں کو بھی غصہ پیدا
قربهم من منابر وکراسی	ہوا ہے! اسلئے کہ بنوامیہ اب بھی ممبر اور کرسیوں کے قریب ہیں؛
انزلوها بحیث انزلها الله	ان لوگوں کو اسی مقام اسفل میں رکھو اور دیکھو جہاں اللہ نے
بدار الهوان والاتعاس	ان کو بدبختی کے مکان میں رکھا ہے؛
واذکروا مصرع الحسین وزیدًا	حسینؓ اور زید کے قتل کا واقعہ یاد کرو اور اس مقتول کو
وقتیلا بجانب المهراس	جو مہراس میں مارا گیا؛
والقتیل الذی بحران اضحی	اور اس مقتول کو یاد کرو جو حران میں قتل ہوا جس کی
مجمل الطیر جولة فی الکناس	لاش پر پرند اس طرح آتے تھے جیسا کہ اپنے گھونسلے
	کو جاتے ہیں؛

بنو امیہ کو وہیں مار مار کر فرش کر دیا اور ان کی لاشوں پر دستر خوان بچھا کر کھانا کھایا۔

"حروبُ الصلیبیہ"

بیت المقدس کی تعمیر حضرت سلیمانؑ کے عہد میں سات سال کے عرصہ میں ہوئی۔ یہ مقدس مقام یہود و نصاریٰ اور کچھ عرصہ کے لئے اہل اسلام کا قبلہ رہا۔ اگرچہ مسلمان اب بھی اسے بیت المقدس ہی سمجھتے ہیں۔ لیکن حق تو یہ ہے کہ "مکہ مبارکہ" جو دنیا میں سب سے پہلا گھر عبادت الٰہی کے لئے تعمیر ہوا مسلمانوں کی نگاہ میں زیادہ قابل عزت ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر ایک جگہ حاضر و ناظر ہے۔ اور "فاینما تولوا فثم وجہ اللہ" وہ نہ تو بیت المقدس میں محدود ہے اور نہ مسجد الحرام میں۔ "قل للہ المشرق والمغرب یھدی من یشاء الی صراط المستقیم وکذالک جعلناکم امۃ وسطا لتکونوا شھداء علی الناس ویکون الرسول علیکم شھیدا۔ وجعلنا القبلۃ التی کنت علیھا الا لنعلم من یتبع الرسول من ینقلب علی عقبیہ" مشرق یا مغرب میں کچھ خصوصیت نہیں۔ سب سمتیں اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں۔ مسلمانوں کا بیت المقدس سے روگردانی کرنا اور کعبۃ اللہ کی طرف رخ کرنا اس وجہ سے نہ تھا کہ اول الذکر میں وہ بات نہیں جو موخر الذکر میں ہے۔ مدعا تو یہ ہے کہ مسلمانوں کو ایک قوم بنایا جائے اور ان لوگوں اور مسلمانوں میں امتیاز پیدا ہو جائے جو رسول مقبول کی مخالفت اور متابعت کرتے ہیں۔ بیت المقدس اگر مسلمانوں کا قبلہ ہوتا تو یہ امتیاز جو مسلمانوں کو آج حاصل ہے کبھی نہ ہوتا۔ اور آئے دن کے جھگڑوں اور فسادوں سے کبھی نجات نہ ملتی۔ یہودیوں اور عیسائیوں میں جو دلی عناد قائم ہے اور ایک عرصہ سے ہزارہا بندگان خدا کا خون پانی کی طرح بہ رہا ہے۔ اسکی وجہ یہی ہے کہ بیت المقدس دونوں کا مشترکہ گھر ہے۔ اگر عیسائی ابتدا سے یہودیوں سے علیحدہ ہو جاتے اور "لکم دینکم ولی دین" پر عمل کرتے تو دونوں قوموں میں امن قائم رہتا۔

شہر قدس "ہیکل" نے مقدس بنا دیا۔ یہ وہ عالیشان عمارت ہے جس کا بنیادی پتھر حضرت داؤدؑ اور جسکی تعمیر و تکمیل حضرت سلیمانؑ نے کی۔ اس عمارت میں بالخصوص وہ حصہ مقدس ہے جسے صخرہ کہتے ہیں اور جاب مسجد عمرؓ کے گنبد کے نیچے ہے۔ بیت المقدس ایک پہاڑی پر واقع ہے اس ہیکل سلیمانی کا سب سے بلند حصہ اس پہاڑی کا ایک ٹکڑا جو قدرتاً باہر کی طرف نکلا ہوا ہے۔ اور بظاہر سرسری نگاہ میں

ایک بے جوڑ پہاڑی حصہ معلوم ہوتا ہے، لیکن فی الحقیقت یہی بنیادی پتھر اس تمام مقدس عمارت کی تعمیر کا باعث ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں جب ہیکل کی تعمیر کے لئے اس پہاڑی جگہ کو ہموار کیا گیا، تو ارادتاً اس حصہ کو قدرتی حالت میں چھوڑ دیا گیا، اسکی صورت قریباً نصف دائرہ کی ہے، مشرقی طرف ڈھلوان اور مغربی جانب سیدھا ہے اس کا عرض زیادہ سے زیادہ پچاس فٹ اور طول ساٹھ فٹ ہے اور سب سے بلند حصہ ملحقہ فرش سے چار فٹ ساڑھے نو انچ بلند ہے، ہیکل کی عمارت کے لئے پہاڑی سطح کو مشرق اور مغرب کی اطراف پر ہموار کیا گیا، مغربی طرف تو عموداً کاٹی گئی ہے اور اس کے جنوبی زاویہ پر ایک مربع شکل کا گوشہ ہے۔ مشرقی طرف نصف دائرہ میں کاٹی گئی ہے۔ بہیئت مجموعی یہ مقدس "الصخرہ" ابھی تک ابتدائی قدرتی حالت میں ہے صرف صنعت نے اس میں کچھ تغیر پیدا کر دیا ہے ان تمام روایتوں اور حکایتوں کو جو خوش اعتقادی نے "قبۃ الصخرہ" کے متعلق اختراع کی ہیں، اگر نظر انداز بھی کر دیا جائے، تو اسکی وضع اور موقع اور محل اور دیگر امور سے یقینی نتیجہ یہی اخذ ہو سکتا ہے کہ یہ وہی مقام ہے جو حضرت داؤدؑ نے "سوختنی قربانی کے مذبح" کے لئے جس کا تذکرہ التواریخ باب ۲۱ و ۲۲ میں کیا گیا ہے، اس پہاڑی پر منتخب کی۔ اور یہی بنی اسرائیل کی عبادت گاہ تھی، یہی وہ جگہ ہے جہاں یہوواہ کی عظمت و جلال کا اظہار ہوتا، حضرت سلیمانؑ کے عہد میں بھی اسی جگہ سوختنی قربانی کا مذبح تھا۔ اور تمام ہیکل میں سب سے زیادہ مقدس حصہ عمارت یہی مذبح تھا، شریعت موسوی کے مطابق "مذبح" ناتراشیدہ پتھروں سے بنایا جاتا تھا اور یہ پتھر قدرتی سطح زمین پر رکھے جاتے، "تالمود" میں جو کچھ تذکرہ "مذبح اعظم" کا ہے وہ بھی مذکورہ بالا بیان کا موید ہے،

"سر جے۔ ڈبلیو۔ ڈاؤسن" نے اس پر مفصل بحث کی ہے اور اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ یہ جگہ جہاں اب مسجد عمرؓ موجود ہے "حرم" کا احاطہ ہے اور اس مسجد کا گنبد جو شہر میں ہر ایک عمارت سے بلند ہے اور جسکی شان اور وقار اور عربی صنعت نے دنیا کے سیاحوں کو جنکی نگاہ اس پر پڑی، حیران کر دیا ہے "قبۃ الصخرہ" ہے، یعنی وہ جگہ جہاں حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ اللہ تعالیٰ کے حضور سوختنی قربانی چڑھایا کرتے تھے، اب اہل اسلام کی عبادت گاہ ہے جہاں وہ اللہ عزوجل کی حمد کرتے ہیں،

بیت المقدس میں جو اہل کتاب کی مقدس جگہ ہے ایسے بیشمار مقامات ہیں جو نہ صرف مذہبی حیثیت سے مقدس ہیں بلکہ بہ لحاظ تاریخی مقامات ہمیشہ زیارت گاہ رہیں گے، ان میں سے وہ مقامات بھی ہیں جن کی نسبت کہا جاتا ہے کہ مسیح اس جگہ مصلوب یا مدفون ہوئے، لیکن اس میں کچھ شک نہیں کہ یہ

مقامات ان واقعات کے فرضی منتظر ہیں۔ نئے عہد نامہ میں ان مقامات کے موقع ومحل اور دیگر امور کا تذکرہ ان مقامات کے بالکل مخالف ہے۔ اکثر لوگوں نے اگرچہ وہ محققین کہلاتے تھے مذہبی تعصب یا غلط فہمی سے ان مقامات کو مسیح کا مدفن وغیرہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن موجودہ زمانہ کے دلیر محققین نے تحقیق کا حق ادا کیا ہے اور اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ یہ مقامات صلیب اور مدفن کے فرضی مناظر ہیں۔ ان میں سے "سر جے۔ ڈبلیو ڈوسن" جو "جیالوجی" کے مسلم الثبوت اُستاد ہیں اور جن کے نام کے ساتھ تمام عالمانہ اور اعزازی ڈگریاں ہیں۔ اپنی کتاب "سریا اینڈ پیلسٹائن" میں لکھتے ہیں:

"مجھے معلوم ہے کہ کئی ایک موجودہ زمانہ کے مشہور اہل الرائے نے ان مقامات کی صحت کی تصدیق کی ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ انہوں نے شہر مقدس کی شمالی دیوار کے حدود جو مسیح کے زمانہ میں تھے، قائم کرنے میں غلطی کی ہے۔ اور اس زمانہ کی آبادی کی شہر کے لحاظ سے حدود کا دائرہ بہت تنگ کر دیا ہے۔ پرانی دیوار جو جانب شمال ہے اور آثار قدیمہ جو موجودہ زمانہ میں دستیاب ہوئے ہیں بروئے شہادتیں اس امر کی ہیں کہ مقام مدفن شہر کے اندر تھا۔ اگرچہ بعض محققین نے "چرچ" کے زیرین حصہ میں بعض پرانی قبریں پائی ہیں۔ مگر ان کی وضع ہی صاف کہے دیتی ہے کہ مسیح کے زمانہ سے بہت مختلف ہیں اور اس زمانہ سے بہت پیشتر کی ہیں۔ شہر کی شمالی دیوار کا موقع سوائے شمال مغربی زاویہ و رباب دمشق کے درمیان کسی اور جگہ ہو نہیں سکتا۔ یہ بھی یقینی امر ہے کہ موجودہ شہر کے باہر جانب شمال بہت سی عمارتیں تھیں جن کے گرد "ہیرود اگرپا" نے مسیح کی وفات سے گیارہ سال بعد ایک دیوار بنائی۔ اس شہادت سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ مدفن مسیح شہر کے اندر تھا۔ علاوہ ازیں اور بھی شہادتیں موجود ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ ایسی قبریں جو "چرچ" کے زیرین حصہ میں پائی گئی ہیں مسیح کی پیدائش سے پیشتر بھی شہر میں موجود تھیں۔ بظاہر مصنفان اناجیل اربعہ کا منشا نہ تھا کہ ان مقدس مقامات کے حدود کو اس وضاحت سے تحریر کریں کہ آئندہ نسلوں کے کام آئے۔ جو کچھ پہلے چار انجیلوں اور ملحقہ خطوط میں ان کا تذکرہ کیا گیا ہے ان میں ان کا حال اشارتاً مندرج ہے مگر ان مقامات کا صحیح صحیح پتہ بتلانے کے لئے کافی ہے۔ ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ جگہ جہاں مسیح کو صلیب دی گئی شہر سے باہر مگر شہر کے قریب تھی۔ اور اس سڑک یا سڑکوں کے نزدیک تھی جو شہر سے قصبہ کو جاتی تھیں۔ اور اس لئے یہ مقام کسی خاص دروازہ شہر کے قریب تھا۔ اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ جگہ ملحقہ زمین سے بلند تھی اگرچہ کوہ زیتون یا دیگر پہاڑیوں کی طرح نہ تھی۔ اور یہ کہ اس کے

نزدیک باغات اور مقبرے بھی تھے؛ اور شہر کی شمالی طرف اس سے بہت قریب تھی؛ جہاں گورنر کا محل اور رومی سپاہیوں کی بارکیں تھیں؛ ان تمام شہادتوں پر غور کرنے سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ وہ مقام جہاں مسیح کو صلیب پر لٹکایا گیا، موجودہ مقام نہیں ہو سکتا؛ موجودہ باب دمشق جس کا پرانا نام "نابلس" اور اس کے بعد "باب سینٹ سٹیفن" تھا وہ دروازہ ہے جس سے سڑک شہر سے نکل کر قصبہ کو جاتی تھی اس جگہ کا نام نئے عہدنامہ میں "گلگوتھا" یعنی کھوپری کی جگہ ہے۔ اس کا یونانی ترجمہ "کیرینیین" اور لاطینی زبان میں "کلوری" ہے۔ صحیح لفظ "گلگوتھ" یعنی کھوپری ہے۔ جو صرف مقدس توما نے تحریر کیا ہے؛ باقی مقدس سوانح نگار "گلگوتھا" ہی لکھتے ہیں اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ اس جگہ کھوپریاں پڑی ہوئی تھیں؛ کیونکہ یہ صرف غلط ہی نہیں بلکہ موسوی شریعت کے سخت مخالف ہے؛ بات اصل میں یہ ہے کہ یہ جگہ گرد و نواح کی زمین سے کچھ ابھری ہوئی ہے یعنی ایک پختہ ٹیبہ ہے؛ اور صورت بالکل ایک کھوپری کے مشابہ ہے؛ ذیل کی شکل جو "سر جے۔ ڈبلیو ڈاوسن نے موقع پر کھینچی اس دعویٰ کو واضح کر دیگی"۔

کھوپڑی (لوقا باب ۲۳ - آیت ۳۳)
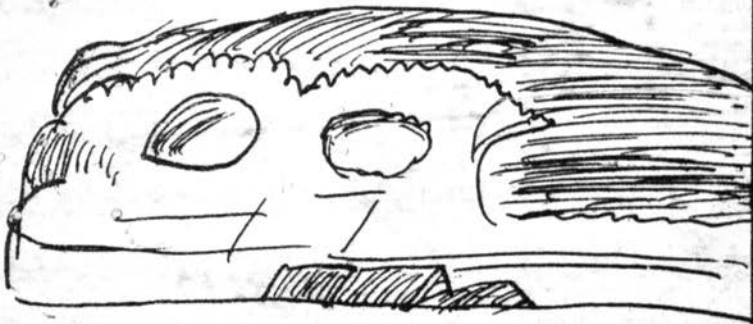
یہ ٹیبہ اب بھی موجود ہے؛ اور مقدس سوانح نگاروں کی تحریر کے بالکل مطابق ہے؛ یعنی شہر کی شمالی دیوار سے باہر مگر اسکے نزدیک کوئی ایک سو گز کے فاصلہ پر واقع ہے؛ اس ٹیبہ کی شکل جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے بالکل ایک کھوپری کے مشابہ ہے؛ جسکا کچھ حصہ زمین میں دبا ہوا اور کچھ باہر نکلا ہوا ہو؛ اور دو آنکھوں کے حلقے بھی موجود ہیں؛ مشابہت اس قدر صاف ہے کہ ہر ایک شخص ایک ہی نظر میں اسے "گلگتھ" ہی کہے گا؛ یہودی روایتوں سے واضح ہوتا ہے کہ یہ جگہ مجرموں کو صلیب دینے کے لئے مخصوص

تھی اور غالباً سٹیفن بھی اسی جگہ سنگسار ہوا۔ یہ جگہ شہر کے باہر اور شہر کے قریب اُن پرانی سڑکوں کے درمیان واقع ہے جو باب دمشق اور باب ہیرودوس سے نکلتی ہیں اور رومی گورنر کے محل سے بھی دور نہیں اور باغات اور مقابر بھی اِس کے متصل ہیں۔ "ڈاڈسن" پہلا شخص نہیں جو اس جگہ کو حقیقی مقام صلیب بتاتا ہے۔ بلکہ دیگر محققین بھی گذرے ہیں جن کی یہی رائے ہے۔ ان میں سے ڈاکٹر "فشر ہاڈ" اور "ودن ڈبی ولوٹی" اور "اولتھینبرس" اور "ردبن سن" کا بالخصوص ڈاڈسن بھی ذکر کرتا ہے۔ "ڈاڈسن کا بیان ہے کہ "میں اکثر اس جگہ جاتا اور ہر دفعہ میرا یقین پختہ ہوتا گیا۔ کہ یہی مقام ہے جہاں سب سے بڑا تواریخی واقعہ یعنی خداوند یسوع مسیح کا مصلوب ہونا وقوع میں آیا۔ اور وہ جگہ جہاں لاکھوں جاہل مگر خوش اعتقاد زائرین جمع ہوتے ہیں ایک فرضی مقدس مقام ہے۔ جسے جھوٹی روایتوں مذموم رسوم اور جاہلانہ خوش اعتقادی نے متبرک بنا رکھا ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ جب تک چالاک پادری مسیح کے نام پر تجارت کرتے ہیں اصلی مقام صلیب کا پتہ عوام الناس کو نہ لگنے دیں گے"۔

دوسرا مقام مدفن ہے جہاں مسیح کچھ عرصہ رہے۔ اور پھر حواریوں سے ملاقات کی۔ اور بعدازاں آسمان کی طرف اُٹھائے گئے۔ "ڈاڈسن" تحریر کرتا ہے کہ "جب موقع صلیب معلوم ہوگیا تو مدفن کا پتہ لگانا کچھ مشکل بات نہیں۔ مقدس یوحنا لکھتے ہیں کہ اس جگہ ایک باغ اور باغ میں ایک قبر تھی جو یوسف "ارمیتیہ" نے اپنے لئے بنوائی تھی۔ اب بھی اس ٹیلہ کے دامن میں باغیچہ موجود ہے اور اس کے کناروں پر قبریں بھی ہیں۔ ان میں سے ایک جو "گلگوتھہ" کے مغربی جانب اور ایک باغیچہ کے کنارہ پر موجود ہے وہی قبر ہے جو مدفن مقدس کہلانے کی مستحق ہے۔ جیسا کہ نئے عہدنامہ میں مذکور ہے۔ یہ قبر چھوٹی سی تھی۔ اور اس میں ایک ہی کمرہ تھا۔ اور اس کے دروازہ پر جھک کر لاش نظر آسکتی تھی۔ اور دروازہ پر ایک لڑھکانے والا پتھر بھی موجود تھا۔ جس سے قبر کا منہ بند ہوسکتا تھا۔ اور کھل بھی سکتا تھا۔ یہ قبر اور پتھر اب بھی موجود ہے۔" ذیل کی شکل جو "ڈاڈسن" نے موقع پر کھینچکر اپنی کتاب "مصر اور شام" میں دی ہے بخوبی ثابت کردیگی کہ یہ مقام اصلی مدفن ہے۔

مدفن یسوع مسیح اور لڑکھڑے والا پتھر (مرقس باب ۱۵-آیت ۴۶)
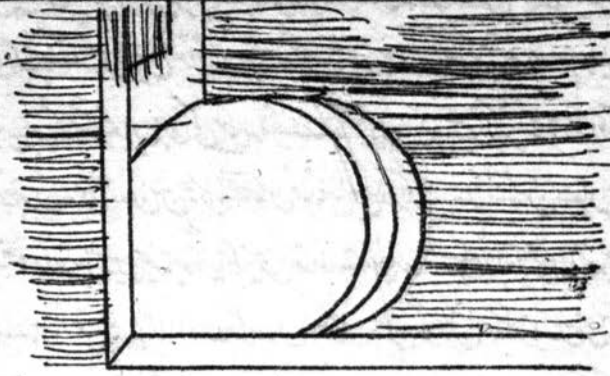
اور یہی مقام ہے جو بالکل نئے عہد نامہ کی تحریروں کے مطابق ہے۔ مگر بقول "ڈوسن" موجودہ زمانہ کے عیسائیوں کی توجہ اصلی قبر کی طرف معطوف کرنا فضول ہے۔ کیونکہ فرضی مقبرہ خوش اعتقاد زائرین کی تسلی کے لئے کافی ہے"۔

یہ وہ مقام ہیں جن کی زیارت کے لئے عیسائی دنیا ہمیشہ اُمڈی چلی آتی ہے۔ یہ مقدس مقام جہاں مسیح نے جسمانی تکالیف برداشت کیں اور کل دنیا کے گناہوں کا بوجھ اپنے سر لیا۔ اس وقت مسلمانوں کے قبضہ میں تھا۔ اس سے پیشتر رومی عیسائی اس جگہ اور کل شام پر حکمران تھے اور یہودیوں کو بالکل بیدخل کر رکھا تھا۔ ۶۳۷ء میں اہل اسلام نے بیت المقدس کا محاصرہ کیا۔ فاروق اعظمؓ بنفس نفیس اس جگہ مدینہ منورہ سے تشریف لائے۔ اور یہ شہر بغیر خونریزی کے فتح ہوگیا۔ آپ نے اس جگہ عیسائیوں سے صلح اور امن کا عہد باندھا۔ مسلمانوں نے اس عہد نامہ کو ہمیشہ وقعت کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ جسکے عیسائی مؤرخ بھی معترف ہیں۔ جبتک اہل عرب کا دور دورہ رہا عیسائیوں کو بیت المقدس کی فتح کا خیال پیدا نہیں ہوا۔ قسطنطین کو گذشتہ مقبوضات کے حاصل کرنے کی ہوس خلفاء بغداد اور مصر کے زمانہ میں دامنگیر رہی مگر مذہبی لڑائیوں کا شوق نہ تھا جو عیسوی شریعت کے رو سے ناجائز ہیں۔ اور سچ تو یہ ہے کہ کسی عیسائی تاجدار کو یورپ میں کبھی اس قسم کا مذہبی جنون نہیں ہوا جو بالآخر ایک فرانسیسی مجذوب "پیٹر" نامی کی بڑ نے عام اہل یورپ میں پیدا کر دیا۔ یہ شخص نہایت بدوضع، پست قامت، اور بدصورت تھا۔ ابتدا میں رہبانیت کا شوق چرایا تو اس بے حمیت نے جورو اور بچوں کو سختی میں چھوڑ کر ترک دنیا کیا۔ اس نامعقول زندگی سے تنگ

اگر پھر دنیا کی ہوا کھانے کی سوجھی"، اور آخر بیت المقدس میں آیا۔ اس وقت عیسائی دنیا میں مسلمانوں کے مفروضہ مظالم کی روایتیں عام مشہور تھیں۔ ان میں سے ایک یہ تھی کہ غیر ممالک کے زائرین بیت المقدس سے ایک ٹکس وصول کیا جاتا اور جو شخص ادا نہ کرتا یا ادا کرنے کے قابل نہ ہوتا اس سے سخت بدسلوکی ہوتی۔ عیسائی مورخین نے تسلیم کیا ہے کہ ٹکس ایک خفیف رقم تھی جو ہر ایک شخص بآسانی ادا کرسکتا تھا مگر عیسائی زائرین گھر سے بیک بینی و دو گوش چل پڑتے اور عموماً زادراہ تو درکنار بدن کے کپڑے بھی کافی تعداد میں ساتھ نہ لیتے۔ توہم پرست عیسائیوں کا خیال تھا کہ مقدس مقامات کی زیارت کے شوق میں جس قدر تکالیف کا سامنا ہو اسی قدر زیادہ ثواب ہے، آخر وہ مقامات بھی تو مسیح کی تکالیف جسمانی کی یادگار تھے۔ اس بے سرو سامانی کی حالت میں یورپ کے مختلف شہروں اور بیت المقدس کے درمیان زائرین کا تانتا لگا رہتا۔ نہ صرف اسلامی حکومت بلکہ آسٹریا اور قسطنطنیہ کے تاجداروں نے بھی ان پرجوش قلاش زائرین کی گداگری اور بعض اوقات جرائم کا انسداد کرنا چاہا، جسکی وجہ سے اسلامی حکومت زیادہ بدنام ہوئی، کیونکہ آسٹریا اور قسطنطنیہ تو صرف ان کے گذرگاہ تھے، لیکن بیت المقدس ایک ایسی جگہ تھی جہاں اور جسکے گرد و نواح میں مختلف مقامات مسیح کے قدموں نے متبرک بنا دیئے تھے۔ وہ اس جگہ مہینوں بلکہ برسوں رہتے، اور اسی جگہ موت کا انتظار کرتے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ اگر اس جگہ کی مٹی نصیب ہو تو سیدھا بہشت کو جائیں گے۔ یہاں تک کہ وہ کرتہ یا کپڑا جو یروشلم میں داخلہ کے وقت ان کے بدن پر ہوتا، اگر کفن کی جگہ کام آتا تو آسمانی بادشاہت کے حصول کا یقینی ذریعہ تھا۔ حضرت "پیٹر" تو ابتدا ہی سے ادھار کھائے بیٹھے تھے، اگر ان کے ساتھ کسی قسم کا اچھا سلوک نہ ہوا ہو جیسے انہوں نے اہل اسلام کا ظلم ظاہر کیا۔ تو کچھ تعجب کی بات نہیں۔ یہ شخص پہلے یروشلم کے بطریق سے ملا، اور کہا کہ "ستم ہے کہ وہ پہاڑی جہاں خداوند مسیح مصلوب ہوئے اور وہ غار جہاں وہ مدفون ہوئے اور وہ لکڑی کی صلیب جسپر خداوند آٹھ پہر لٹکتے رہے، بیدینوں کے قبضہ میں ہو، اور تم دیکھتے ہو اور کچھ کام نہیں کرتے" بطریک رونے لگا اور جواب دیا، کہ "افسوس قیصر قسطنطنیہ کمزور ہے اور کچھ نہیں کرسکتا" پیٹر نے کہا کہ "میں یورپ کی تمام جنگجو قوموں کو اس کام پر جو قیصر سے نہیں ہوسکتا آمادہ کروں گا" پیٹر بیت المقدس سے واپس لوٹا، اور سب سے پہلے پوپ "اربن ثانی" کی خدمت میں شرف قدمبوسی حاصل کیا، گبن لکھتا ہے کہ پوپ نے اسے رسول کے مرتبہ پر پہنچا دیا، اور اسکی عظیم الشان تجاویز کی تعریف کی، اور ایک عام مجلس میں تائید کا وعدہ کیا،

اور تمام یورپ کو مفروضہ مظالم کی اطلاع دینے پر پیٹر کو مامور کیا۔ گدھے پر سوار ہوکر پیٹر یورپ کے تمام مشہور شہروں میں پھرتا رہا۔ اور اس طرح ایک سرے سے دوسرے سرے تک آگ لگادی۔ گرجوں، بازاروں، گلیوں میں جہاں کہیں اسے موقع ملتا وہ بیت المقدس کے عیسائیوں اور زائرین کی مصیبتوں کا اس طرح تذکرہ کرتا کہ سننے والے بے اختیار روتے۔ رنج و غصہ ان کے دلوں میں جوش مارتا۔ اگرچہ پیٹر محض جاہل ناخواندہ آدمی تھا۔ لیکن فصاحت و بلاغت کی تاثیر کا کام سرد آہوں، اشکبار آنکھوں، اور چیخنے اور چلانے سے لیتا۔ اور دلایل اور براہان کی جگہ خداوند یسوع مسیح اور ان کی والدہ محترمہ، رسولوں اور فرشتوں کو یاد کرتا۔ جنہیں وہ اکثر خواب یا رویا میں دیکھتا تھا۔ اور بالمشافہ گفتگو کرتا تھا۔ اور سچ تو یہ ہے جو کچھ کامیابی اسے اس فصاحت سے حاصل ہوئی اسپر ایک نہایت بلیغ مقرر بھی رشک کرتا۔ اس نے سامعین کے دلوں کو جوش سے بھردیا۔ اور عیسائی دنیا نہایت بے صبری سے پوپ کے فتوی کا انتظار کرتی تھی۔"

آخر پوپ کا فتوی صادر ہوا۔ پلیسنشیا اور کلرمونٹ میں دو دفعہ عظیم الشان جلسے ہوئے۔ اس وقت یورپ کے تاجداروں کے پاس رعیت ہی سپاہ تھی۔ اور مستقل فوج کا کچھ انتظام نہ تھا۔ اور چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے نواب خود مختار بادشاہ تھے۔ جو عموماً اپنی اوقات باہمی جنگ و جدل میں بسر کرتے۔ پوپ کے فتوی نے باہمی جنگ وجدل حرام قرار دیا۔ کیونکہ ڈر یہ لگا ہوا تھا کہ کسی نواب یا جاگیردار کی عدم موجودگی میں کوئی ہمسایہ دشمن اسکی جائداد پر قابض نہ ہو جائے۔ لوگوں کو اس مقدس جنگ پر برانگیختہ کرنے کے لئے انوکھی تجویزیں اختراع کی گئیں۔ دنیا داروں کو یہ حکم دیا گیا کہ اس جنگ میں شامل ہونے سے وہ درجہ حاصل ہوگا جو رہبان تمام عمر مجاہدہ اور ترک دنیا سے حاصل نہیں کرسکتے۔ اگر کوئی قیدی خواہ وہ کسی جرم کا مرتکب ہوا ہو۔ اس مقدس جنگ میں شریک ہونا چاہیے تو فوراً رہا کر دیا جاتا۔ مقروض سرخ صلیب کا نشان سینہ پر لگاتا تو فوراً قرضہ کے بارگراں سے سبکدوش سمجھا جاتا۔ مصیبت زدہ رہبانوں کو دنیا کی ہوا کھانے کا اس کے سوائے اور کوئی ذریعہ ہی نہ تھا۔ الغرض ہر ایک امر خواہ وہ مذہبًا یا اخلاقًا کیسا ہی ممنوع یا مذموم ہو صلیب کی خاطر جائز قرار دیا گیا۔ اور مقدس پوپ کا فتوی جو اس وقت صحیفہ آسمانی خیال کیا جاتا تھا۔ ان تمام خرابیوں کا باعث تھا جنہیں گبن اور دیگر یورپی مؤرخ بالتفصیل بیان کرتے ہیں۔ پوپ کی صدا پر ہزارہا بدمعاش، عیاش، اوباش، قلاش، تصفیہ قلب کے لئے اور لوٹ مار کی طمع سے اس جنگ میں شریک ہوئے۔ ہر ایک طرف سے یہی صدا آتی تھی کہ "خدا کی یہی مرضی ہے کہ بیت المقدس کو بیدینوں سے

واپس لیا جائے۔" چونکہ یہ جنگ صرف "صلیب" کے لئے ہوئے۔ اس لئے اسے "کروسیڈ" یعنی "حروب الصلیبیہ" کہتے ہیں۔

یورپ کے آٹھ شہزادے اس مقدس جنگ میں شریک ہوئے۔ انمیں سے صرف ایک "گوڈفری" کے ہمرکاب دس ہزار سوار اور اسی ہزار پیادہ فوج تھی۔ ان کے علاوہ یورپ کے مختلف شہروں سے دو لاکھ زن و مرد صرف مذہبی جوش میں "پیٹر" کے علم کے نیچے جمع ہوئے۔ اس غیر آئینی فوج کا سپہ سالار خود "پیٹر" اور ایک اور شخص "والٹر قلاش" ہی تھا۔ مختلف راستوں سے قسطنطنیہ پر سب کا اجتماع قرار پا چکا تھا۔ "پیٹر" اس طوفان بے تمیزی کے ساتھ سب سے پہلے روانہ ہوا۔ راستہ میں فاحشہ عورتیں اور بدمعاش مرد جو اس فوج میں کثرت سے موجود تھے۔ ہر ایک قسم کی بدکاری کو رواج دیتے گئے۔ سب سے پہلے بیچارے یہودیوں کے جان و مال پر ہاتھ صاف کیا۔ بیت المقدس تو صرف یسوع کی جسمانی تکالیف کا گھر تھا۔ لیکن جن لوگوں کے ہاتھ سے مسیح کو یہ تمام تکلیفیں پہونچیں وہ بھی تو آخر اسی سلوک کے سزاوار تھے۔

یہ طوفان لڑتے مرتے ابنائے بالفورس کو عبور کر گیا۔ اور اہل اسلام کے حدود میں داخل ہوا۔ اس وقت سلجوقی سلطان قلیج ارسلان بن سلیمان بن قطلمش، قونیہ میں پیٹر کا انتظار کر رہا تھا۔ نہایت گرمجوشی سے استقبال کے لئے بڑھا۔ پیٹر بے غیرت تو پہلے ہی کھسک گیا تھا۔ والٹر قلاش، بمعہ دیگر مجاہدین صلیب مقابلہ میں آیا۔ جو کچھ ان لوگوں کا حشر میدان جنگ میں ہوا اسکی دلخراش داستان ہڈیوں کے ڈھیروں اور کاسہ ہائے سر نے اُن شہزادوں کو سنائی۔ جو اس جگہ ان کے نقش قدم پر آئے۔ اس وقت ان یورپی شہزادوں کی متفقہ طاقت ساٹھ لاکھ سوار و پیادہ کی تھی۔ اگرچہ ان کا مقابلہ مختلف مقامات پر نہایت سختی سے کیا گیا۔ جسمیں لاکھوں کام آئے۔ مگر بالآخر یہ سیل عظیم یروشلم کی طرف بڑھتا چلا گیا۔

انطاکیہ سخت محاصرہ کے بعد مسخر ہو گیا۔ اس جگہ پادری صاحبان نے وہ شگوفے کھلائے جنکا تذکرہ لطف سے خالی نہیں۔ ایک پادری پطرس نامی نے یہ مشہور کیا کہ حضرت اندریاس مجھے خواب میں اس طرح بشارت دے گئے ہیں۔ کہ مقدس پطرس حواری مسیح کے چرچ میں اوس بھالے کا پھل موجود ہے۔ جس سے خداوند یسوع کی پسلیاں جب وہ صلیب پر آویزاں تھا۔ رومی سپاہی نے چھیدی تھیں۔ اس چرچ میں تلاش سے یہ مقدس آلہ دستیاب ہوگا۔ مجاہدین صلیب کو چاہئے کہ اسے نہایت عزت

اور احترام سے اُٹھائے ہوئے حملہ کریں، شہر مسخر ہو جائیگا" اس بھالے کی تلاش میں بارہ فٹ تک زمین کھودی گئی، لیکن کچھ نہ ملا، آخر پادری صاحب یعنی خود پطرس جس نے اس خواب کو بعبہ تعبیر بیان کیا تھا، رات کی تاریکی میں اس گھڑے میں اُترے اور ایک عربی بھالے کا پھل زربفت اور حریر میں لپٹا ہوا نکال لائے، پطرس کا رتبہ پطرس اعظم کے برابر ہو گیا، مگر دنیا میں حاسد بھی موجود ہیں، ایک اور پادری صاحب یہ کیفیت دیکھکر جھلا اُٹھے اور کہا کہ پطرس جھوٹا ہے، اور بھالا آپ ہی کہیں سے لایا اور آپ ہی برآمد کر دیا، پطرس کو لوگوں نے کہا کہ صداقت کا معیار اور تو کچھ نہیں، جلتی آگ سے ایک دفعہ گذر جاؤ تو دشمن کا مُنہ کالا ہو، بیچارہ بادل نخواستہ بھڑکتی آگ سے گذرا، اور زندہ نکل آیا، لوگوں نے سر پر اُٹھالیا۔ مگر افسوس ہے کہ اس سرخروئی سے کچھ حاصل نہ ہوا، آگ اُسکے تن بدن میں اپنا اثر کر چکی تھی، دوسرے دن مر گیا،

عیسائیوں نے بیت المقدس کو بجبر و قہر فتح کر لیا، اور شہر میں داخل ہو کر جو کچھ ظلم و ستم برپا کیا، وہ یورپ اور ایشیا کے مؤرخین نے خون کے حرفوں سے لکھا ہے، یسوع یروشلم کی بربادی پر پیش از وقت رویا، مگر مظلوم یہودیوں اور مسلمانوں کی تباہی پر اس وقت عیسائی ہنس رہے تھے، بیگناہ عورتوں اور بچوں اور بوڑھوں کی لاشیں یروشلم میں بے گور و کفن پڑی تھیں، بچوں کو ماؤں کی چھاتیوں سے جدا کیا جاتا اور نہایت سنگدلی سے زمین پر پٹک کر کچل دیتے۔ اس تباہی اور بربادی کا اندازہ صرف اسی سے ہو سکتا ہے کہ ایک یورپی مؤرخ لکھتا ہے کہ مسجد عمرؓ کے قریب عیسائی سواروں کے گھوڑے خونین گھٹنوں تک ڈوبے ہوئے تھے، اس خوفناک نظارہ کو دیکھتا ہوا "گوڈفرے" حضرت مسیح کے فرضی مقبرے میں ننگے پاؤں اور ننگے سر داخل ہوا۔ اور یروشلم کا حاکم منتخب کیا گیا، اور اس طرح اول جنگ صلیب کا خاتمہ ہوا،

دورِ آخر

"اتابک"

اِس وقت اسلامی دنیا خانہ جنگیوں میں مصروف تھی۔ خلیفہ "المقتدی بامر اللہ" کی حکومت بغداد کی چار دیواری میں محدود تھی۔ اور حق تو یہ ہے کہ صرف برائے نام خلیفہ تھا۔ ایک عرصہ سے غیر اقوام کا غلبہ اسلامی ممالک پر ہو رہا تھا۔ اس وقت سلجوقیوں کا دور دورہ تھا۔ ان میں سے ملک شاہ اس خاندان کا بے نظیر سلطان گذرا ہے۔ خلیفہ المقتدی کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ مصر میں حشاشین کی روز افزوں طاقت نے تمام دنیا اسلام کو پریشان کر رکھا تھا۔

۴۸۴ھ / ۱۰۹۲ء میں حسن ابن صباح کے ایک فدائی نے ملک شاہ کو زہر دیکر مار دیا۔ خلیفہ نے "برکیارق" ابن ملک شاہ کو سلطان تسلیم کر لیا۔ اور رکن الدولہ کا خطاب دیا۔

اِس وقت عیسائیوں نے بیت المقدس کو فتح کر لیا۔ مسلمان متفقہ طاقت سے ان کا مقابلہ کس طرح کر سکتے تھے۔ جبکہ اندرونی خرخشوں سے انہیں نجات نہیں مل سکتی تھی۔ خلیفہ کو بغداد میں اطلاع ہوئی۔ کہ ستر ہزار ناکردہ گناہ مسلمانوں کو قتل کیا گیا جن میں اکثر علما اور عابد اور زاہد تھے۔ اکثر زیارت گاہوں کو مسمار کر دیا۔ اور یہودیوں کو ایک کنیسہ میں جمع کر کے آگ لگا دی۔ لوگ شام سے بھاگ کر بغداد میں آتے تھے اور ایسی قسم کی متوحش خبریں سناتے تھے۔ شعراء نے اس دلخراش واقعہ پر مرثیے اور شہر آشوب لکھے۔ اور مسلمانوں کو اُبھارا۔ خلیفہ نے ایک قاصد سلطان برکیارق رکن الدولہ والدین کے پاس اس غرض سے روانہ کیا کہ مسلمانوں کو عیسائیوں کے پنجہ ظلم سے نجات دلوائے۔ مگر برکیارق اپنے مخمصوں میں پھنسا ہوا تھا۔ اس کا بھائی محمد بن ملک شاہ اس کے مقابلہ پر اڑا ہوا تھا اور آخر کار غالب آیا۔ خلیفہ نے محمد کو غیاث الدنیا والدین کا خطاب عطا فرمایا۔ مگر بعد میں دونوں میں صلح ہو گئی۔

عسقلان پر مسلمانوں اور عیسائیوں کا ایک دفعہ پھر مقابلہ ہوا۔ مگر عیسائیوں کو فتح کامل حاصل ہو گئی۔ اور اسی واقعہ پر اول حرب صلیبیہ کا خاتمہ ہو گیا۔

۴۸۷ھ / ۱۰۹۵ء میں خلیفہ المقتدی کی وفات پر المستظہر باللہ تختِ خلافت پر متمکن ہوا۔ برکیارق کی وفات پر اس کا خورد سال بیٹا جلال الدولہ چند روزہ سلطان رہا۔ اس پر اسکے چچا محمد نے فوج کشی کی اور غالب آیا۔

اور اس کے بعد اسکا بیٹا محمود سلطان ہوا، غرض سلجوقی سلطنت کا شیرازہ خانہ جنگی سے ایسا بکھرا کہ ان صوبوں کے حاکم جن کا لقب "اتابک" تھا خودمختار بن بیٹھے، غالبًا سب سے پہلے اتابک کا لقب وزیر نظام الملک کو ملک شاہ سلجوقی نے عطا کیا، دستور یہ تھا کہ سلجوقی شہزادے مختلف صوبوں کے حاکموں کے پاس تربیت و تعلیم کے واسطے بھیجے جاتے اور بحیثیت اتالیق اتابک کہلاتے تھے، ان میں سے ایک شخص عماد الدین زنگی ابن اقسنقر تھا، سلطان محمود بن محمد بن ملک شاہ سلجوقی نے اسے ولایت عراق کا شحنہ مقرر کیا، سنہ ۵۲۱ھ میں عزّ الدین حاکم موصل کا انتقال ہوگیا تو عماد الدین کو موصل کی حکومت کے ساتھ منصب امارت بھی مل گیا، تھوڑے عرصہ میں اس اقبالمند شخص کو اور بھی ترقی کا موقع مل گیا،

سنہ ۵۲۱ھ میں مجاہدین صلیب نے حلب کا محاصرہ کیا، اگرچہ اہل حلب نے نہایت مردانگی سے مقابلہ کیا، مگر فی الحقیقت مایوس ہو چکے تھے کہ عماد الدین زنگی موصل سے انکی امداد کو پہونچ گیا۔ اور عیسائیوں نے محاصرہ اٹھا دیا، اور شام کے اکثر شہر یکے بعد دیگرے زنگی کے قبضہ میں آگئے، مجاہدین صلیب سے تین دفعہ خونریز لڑائیاں ہوئیں اور زنگی کا رعب عیسائیوں کے دلوں پر بیٹھ گیا، عماد الدین کی خواہش تھی کہ دمشق ہاتھ میں آجائے۔ تاکہ عیسائیوں کو بیت المقدس سے باسانی بیدخل کیا جائے، اس لئے سنہ ۵۳۴ھ ربیع الاوّل میں "البقاع" واقع دمشق میں اُترا۔ اور والی دمشق جمال الدین محمد کو کہلا بھیجا کہ دمشق میرے حوالہ کردو اور اسکے عوض میں شام کا کوئی شہر لے لو، جمال الدین نے انکار کیا، بمقام "داریا" فریقین میں سخت لڑائی ہوئی، جمال الدین پسپا ہوکر دمشق میں پناہ گزین ہوا۔ عماد الدین نے بذریعہ قاصد کہلا بھیجا کہ اگر دمشق کے عوض بعلبک، حمص، وغیرہ شہر پسند کرو تو اب بھی صلح ہو سکتی ہے، جمال الدین نے دوبارہ انکار کیا مگر ماہ شعبان میں اس کا انتقال ہوگیا، اور اسکی جگہ اس کا بیٹا مجیر الدین آبق والی دمشق ہوا، عماد الدین کا ڈر لگا ہوا تھا، عیسائیوں سے امداد طلب کی، مجاہدین صلیب مسلمانوں کی خانہ جنگیوں سے فائدہ اٹھانا چاہتے، "بانیاس" کا محاصرہ کیا، بانیاس پر زنگی کا اس سے پیشتر قبضہ ہو چکا تھا، ماہ رمضان میں حوران کی طرف آیا اور گرد و نواح سے فوج جمع کر کے صلیبیوں پر چڑھائی کی، عیسائیوں نے بانیاس کو خالی کر دیا،

سنہ ۵۴۱ھ میں زنگی نے قلعہ جعبر کا محاصرہ کیا ہوا تھا اسکے چند غلاموں نے متفق ہو کر غازی عماد الدین زنگی کو شہید کر دیا، اسکی شجاعت کا سکہ مخالفین کے دلوں پر بیٹھا ہوا تھا، حسن سیرت کو حسن صورت نے دوبالا کر دیا تھا، اہل عرب اسے اتابک شہید کے نام سے یاد کرتے ہیں، رقہ میں دفن کیا گیا، الحکیم ابی الحکم المغربی نے

مرثیہ لکھا چند شعر یہ ہیں:-

عین لا تد خبری المدافع وابکی   واستھلی دمعًا علی فقد زنگی

لم یھب شخصہ الروی بعد ان کا   نت لہ ھیبۃ علی کل ترکی

خیر ملک ذی ھیبۃ وبھاء   وعظیم بین الانام بزرک

یھب المال والجیاد لمن یمسمہ   مادحًا بغیر تلکی

ای فتک جری لہ فی الاعادی   بعد ما استفتح الرھاای فتک

بعد ما خادان تدین لہ الرو   م ویحوی البلاد من غیر شک -

عماد الدین کے بعد سیف الدین غازی، نور الدین محمود، قطب الدین مودود، اور امیر نصرۃ الدین امیر امیران لایق باپ کے بیٹے تھے، ان میں سے نور الدین محمود کو خلیفہ بغداد المقتفی باللہ نے عماد الدین کا جانشین تسلیم کرکے ملک العادل خطاب عطا فرمایا،

عماد الدین زنگی اور نور الدین کے متواتر کامیاب حملوں سے متواتر شکستوں کے بعد عیسائیوں نے محسوس کیا، کہ بیت المقدس پر پھر مسلمانوں کا قبضہ ہو جائے گا، اس لئے اہل یورپ سے امداد طلب کی، سنہ ۵۴۱ھ ۱۱۴۶ء میں پھر ایک دفعہ یورپ میں طوفان بے تمیزی برپا ہوا۔ اور دوسرے صلیبی جنگ کا آغاز ہوا، بقول گبن پہلے صلیبی جنگ میں عمایدین یورپ نے ہی حصہ لیا، اور اگرچہ ان کے ہمرکاب تجربہ کار سپاہی بھی تھے، لیکن زیادہ تر تعداد عام یورپ کے باشندوں کی تھی، دوسری صلیبی لڑائی خاص وقعت رکھتی ہے، کونراڈ اور لوئیس شاہ فرانس ساٹھ ہزار سوار ایک لاکھ دس ہزار پیادہ فوج کے ساتھ اس مقدس جنگ میں شامل ہوئے، عمایدین جرمنی اور فرانس شہنشاہ اور شاہ کی موجودگی کو محسوس کر رہے تھے، اِسکے علاوہ اگر دیگر امراء یورپ اور انکی متفقہ طاقت کو شمار کیا جائے تو کل چار لاکھ آدمی اس جنگ کے لئے یورپ سے نکلے یہ ایسا جرار لشکر تھا کہ اس سے ایشیا فتح ہو سکتا تھا، نور الدین محمود کو یکہ و تنہا اس کا مقابلہ کرنا پڑا،

سب سے پیشتر نور الدین نے گھر کی خبر لی، شام کے مختلف شہروں میں خود مختار امراء حکومت کرتے تھے، اور اس طرح اسلامی طاقت کا شیرازہ بکھرا ہوا تھا، نور الدین نے ایک ایک کرکے بہت شہر فتح کر لئے سنہ ۵۴۳ھ ۱۱۴۹ء مجاہدین صلیب نے دمشق کا محاصرہ کیا، اہل دمشق لڑنے کے لئے باہر نکلے، ان لوگوں میں حجۃ الدین ابو الحجاج یوسف بن دوناس المغربی الفندلاوی ایک بہت بوڑھا شخص تھا، تمام عمر زہد اور عبادت میں گذری،

معین الدین آنسز وزیر مجیر الدین آبق نے دیکھ کر کہا کہ "آپ معذور ہیں، ہم دشمنان دین کے لئے کافی ہیں۔ آپ شہر میں واپس جائیں"۔ جواب دیا کہ مینے اپنی جان ومال کو جنت کے عوض بیع کر دیا ہے"۔ اس بزرگ کے ساتھ ایک اور متقی زاہد عبد الرحمن الحلحول تھا، عیسائیوں کی صفوں میں لڑتے ہوئے کام آئے، مسلمان پسپا ہو کر شہر میں داخل ہوئے اور کونراڈ "پیش قدمی کر کے "میدان الاخضر" میں اترا۔ اہل شہر زندگی سے مایوس ہو چکے تھے، معین الدین نے سیف الدین ابن عماد الدین زنگی سے امداد مانگی، نور الدین بمعہ اپنے برادر سیف الدین فوج لیکر حمص میں اترا۔ عیسائیوں کے دلوں میں کچھ ایسا خوف چھا گیا کہ دمشق کا محاصرہ اٹھا دیا۔ اگرچہ اس وقت دمشق صلیبیوں کی دستبرد سے بچ گیا، لیکن اکثر علماء اور علماء اور زاہد اور مشہور شہسوار کام آئے، ان میں سے نور الدین کے امیر حاجب صلاح الدین کا بھائی نور الدولہ بھی شہید ہوا، ۵۴۴ھ میں معین الدین آنسز نے انتقال کیا، حق تو یہ ہے کہ اس مدبر اور منتظم شخص کی بدولت دمشق زنگی اور نور الدین اور مجاہدین صلیب کے ہاتھوں سے بچ رہا۔ اب اہل یورپ نے دمشق میں مداخلت شروع کر دی، نور الدین محمود کو بخوبی علم تھا کہ دمشق شام کی کلید ہے، اگر یہ ہاتھ سے گیا تو شام پر اہل یورپ کا قبضہ خاطر خواہ ہو جائے گا، عمایدین دمشق کے ساتھ خفیہ خط وکتابت جاری رکھی۔

محرم ۵۴۹ھ میں نور الدین نے اپنے وزیر اسد الدین شیرکوہ کو دمشق کی طرف روانہ کیا، شیرکوہ نے القصب واقع المرج میں خیمہ ایستادہ کئے، اس کے بعد نور الدین بھی آپہنچا اور "دومہ" کے قریب عیون الفاسریا پر اترا، اہل دمشق اور نور الدین کی فوجوں میں جنگ زرگری چند دن تک قائم رہا۔ آخر ایک دن اہل شہر نے باب توما کھول دیا۔ اور نور الدین شہر میں داخل ہو گیا، مجیر الدین قلعہ میں پناہ گزین ہوا، اور عیسائیوں کو اپنی امداد کے لئے بلایا، مگر ان کے آنے سے پیشتر نور الدین کا قبضہ دمشق پر خاطر خواہ ہو چکا تھا، مجاہدین صلیب اس جگہ آئے۔ اور اپنا سا منہ لیکر واپس ہوئے۔ دمشق سلطنت نوریہ کا صدر مقام ہو گیا،

۵۵۲ھ میں شام میں زلزلے اس کثرت سے آئے۔ کہ اکثر مکان، اور قلعے منہدم ہو گئے، اس کے ساتھ اہل یورپ نے حمص اور حماہ میں غارت گری کا بازار گرم کر رکھا تھا، نصرۃ الدین امیر امیران، اور اسد الدین شیرکوہ نے متواتر شکستوں کے بعد ان شہروں سے اہل یورپ کو نکال دیا، ۵۵۹ھ میں مجاہدین صلیب اور عساکر نوریہ کے درمیان قلعہ حارم جو انطاکیہ کے قریب حلب کے غرب میں واقع ہے اور قلعہ بانیاس پر سخت

خونریز لڑائیاں ہوئیں اس وقت ملک العادل نورالدین نے ہر طرف سے فوجیں جمع کر رکھی تھیں۔ قطب الدین مودود موصل سے۔ اور فخر الدین قرا ارسلان حصن سے اور نجم الدین ایوب ماردین سے مجاہدین اسلام کے ساتھ ایک جگہ جمع ہو گئے۔ عیسائیوں کے ہاتھ سے یہ مضبوط قلعے اور دیگر شہر یکے بعد دیگرے نکل گئے۔ اہل یورپ شام کی فتح سے مایوس ہو کر مصر کی طرف متوجہ ہو گئے۔ فاطمیہ اسمٰعیلیہ کا آخری تاجدار عاضد لدین اللہ نے تنگ آ کر نورالدین سے امداد مانگی۔ اسد الدین شیرکوہ اور اسکا برادر زادہ صلاح الدین یوسف ابن نجم الدین ایوب تین دفعہ مصر میں عساکر نوریہ کے ساتھ داخل ہوئے۔ اسکا نتیجہ یہہ ہوا کہ مجاہدین صلیبی یورپ اور یروشلم کی طرف شکست خوردہ بھاگ گئے۔ اور اسد الدین شیرکوہ کے بعد امیر صلاح الدین یوسف اس جگہ فاطمی خلیفہ کے وزیر مقرر ہوئے اور ملک الناصر خطاب عطا ہوا۔

۵۶۵ھ میں شام اور فلسطین میں اس قیامت کا زلزلہ آیا کہ اس سے پیشتر اسکی مثال موجود نہ تھی کئی شہر برباد ہو گئے۔ ادھر نورالدین اور ادھر اہل یورپ کو ایک دوسرے کے حملے کا خوف تھا۔ اس لئے ان شہروں کی دیواروں اور قلعوں کو از سر نو تعمیر کرنے میں مصروف ہو گئے۔

۵۶۶ھ میں صلاح الدین نے ارض فلسطین پر حملہ کیا۔ اور عیسائیوں کو متواتر شکستوں کے بعد کئی ایک شہروں سے نکال دیا۔ دوسرے سال مصر میں عاضد لدین اللہ نے انتقال کیا۔ خلفاء مصر کا تو خاتمہ ہو گیا۔ اور المستضی بامر اللہ عباسی خلیفہ بغداد کا نام مصر میں خطبوں میں داخل ہو گیا۔

۵۶۹ھ میں ملک العادل محمود اتابک نورالدین عارضہ خناق میں مبتلا ہوا۔ اطبا نے بہت علاج کیا۔ کچھ فائدہ نہ ہوا۔ ۱۱ شوال ۵۶۹ھ میں دمشق میں انتقال کر گیا۔ اور اسی جگہ مدفون ہوا۔ دنیائے اسلام پر اس مجاہد، دلاور، عادل، کریم النفس، متقی سلطان کے بہت احسان ہیں، جنکا تذکرہ اس مختصر کتاب میں نہیں ہو سکتا۔ العماد کہتا ہے:۔

لفقد الملک العادل، یبکی الملک والعدل، وقد اظلمت الآفاق، لا الشمس ولا الظل، ولما غاب نور الدین، عنا اظلم الحفل، وزال الخصب والخیر، وزاد الشر والمحل، وماتت البأس والجود، وعاش الیأس والبخل، وعز النقص طاهان، اهل الفضل والفضل، وھل ینفق ذو العلم، اذا ما نفق الجھل، وما کان لنور الدین، تولا نجدہ مثل۔

نورالدین کے بعد اس کا بیٹا ملک الصالح اسمٰعیل دمشق میں سلطان تسلیم کیا گیا۔ صلاح الدین یوسف

کو نورالدین کی وفات کی اطلاع دی۔ اور اہل صلیب کے برخلاف مساعدت اور معاونت کا خواستگار ہوا صلاح الدین نے تعزیت نامہ لکھا اور خطبوں میں ملک الصالح کا نام پڑھا گیا، اس وقت خلیفہ بغداد برائے نام اسلامی دنیا پر حکمران تھا، اور ملک الصالح اسمعیل سرپرست خلافت اور ملک الناصر صلاح الدین یوسف مصر میں ملک الصالح کا نائب السلطنت تھا، ۵۷۰ھ میں صلاح الدین نے شام اور مصر کو ایک خودمختار حکومت بنا دیا، اور دمشق میں آکر "دار العقیقی" میں جسمیں اسکا والد نجم الدین ایوب رہتا تھا اُترا۔

مجاہدین صلیب نے پہلے حملہ کے وقت بیت المقدس میں بیگناہ سلمانوں کے خون کی ندیاں بہادی تھیں، یہ واقعہ ابھی تک عام سلمانوں کی یاد میں تازہ تھا، صلاح الدین نے قسم کھائی تھی کہ اگر اللہ تعالیٰ بیت المقدس پر مجھے قابض کرے تو میں مظلوم سلمانوں کا بدلہ ظالموں سے خاطر خواہ لونگا" اس وقت وہ شام اور مصر کا خودمختار سلطان تھا، ملک الناصر کی فتوحات اور غلبہ سے مجاہدین صلیب غافل نہ تھے، یورپ میں ان کے قاصد اپنا کام کر رہے تھے، اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ تیسری دفعہ اہل یورپ نے بیت المقدس کی حفاظت اور تمام ممالک اسلام کی فتح پر کمر باندھی، اور تیسرے حملہ کا آغاز ۱۱۸۹ء میں ہوا، تاجداران یورپ میں سے فریڈرک اول شہنشاہ جرمنی اور آسٹریا اور رچرڈ شیر دل اس میں شامل ہوئے۔

سلطان صلاح الدین نے دمشق میں صدر مقام قائم کر کے اول شام کے شہروں سے اہل یورپ کو خارج کیا، بعد ازاں ارض فلسطین کی طرف بڑھا، ماہ رجب ۵۸۳ھ میں بیت المقدس کو محصور کیا، اس محاصرہ اور لڑائیوں کا تذکرہ فضول ہے، سلطان نے اسی مہینے میں اس کو مسخر کر لیا، یہ عجب بات ہے کہ بماہ صفر ۵۷۹ھ میں سلطان نے حلب کو سخر کیا تو ایک شاعر نے مدحیہ قصیدہ میں یہ شعر پڑھا،

"وفتح حلباً بالسیف فی صفر مبشراً بفتوح القدس فی رجب"

ماہ رجب ۵۸۳ھ میں بیت المقدس فتح ہو گیا، بقول علامہ جلال الدین سیوطی ابن برجان نے جو فتح بیت المقدس سے پیشتر انتقال کر چکا تھا "الٓمٓ۔ غلبت الروم" کی بحساب ابجد یہ تفسیر کی تھی کہ ۵۸۳ھ تک بیت المقدس عیسائیوں کے قبضہ میں رہیگا، اس کے بعد سلمانوں کے ہاتھ میں ابد تک رہیگا۔

ملک الناصر سلطان صلاح الدین شہر میں داخل ہوا تو ہر ایک شخص کو یقین تھا کہ اب اس قسم کے پورا کرنے کا وقت آگیا ہے جسکا انتظار صلاح الدین نہایت بیصبری سے کر رہا تھا۔ مگر ملک الناصر نے اسلام کی فضیلت کا ثبوت اس طرح دیا کہ اہل یورپ بھی معترف ہیں۔"

گوڈفرے، اور اس کے ہمسر رفقا نے جو کچھ ظلم و ستم مسلمانوں اور یہودیوں پر مذہبی جوش میں جائز رکھا، اور اس کے برعکس سلطان صلاح الدین نے جو ایک مظلوم اور ستم رسیدہ قوم کا سربرآوردہ رکن تھا اور ظالموں سے خاطر خواہ انتقام لے سکتا تھا، جس طرح عیسائیوں کو معاف کر دیا۔ اس سے کسی مورخ کو انکار نہیں، مگر گبن لکھتا ہے کہ بعض مورخین نے صلاح الدین کی رحمدلی (صداقت اسلام) کا مقابلہ مجاہدین صلیب کے پہلے حملے اور قتل عام (مسیحیت) کے ساتھ کیا ہے، فرق صرف ذاتی ہے، لیکن یہ امر فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ عیسائی خود امن و صلاح کے خواستگار ہوئے تھے اور اس کے برعکس یروشلم کے مسلمانوں نے یورش اور حملے کی انتہائی مصائب کا مقابلہ کیا، مگر انصاف تقاضا کرتا ہے کہ جس دیانت سے ترکی فتحمند نے شرائط عہدنامہ کو وفا کیا۔ اور مغلوب قوم کی حالت پر جس طرح ترس کھایا۔ اسکی تعریف کی جائے۔"

گبن نے ایک تاریک پہلو اختیار کرتے ہوئے "کروسیڈ" کے معانی کی غلط تعبیر کی ہے، جو اس سے پہلے حروب صلیب کے اسباب پر جو کچھ لکھ چکا ہے، اس سے انکار نہیں کہ یہ ایک مذہبی جنگ تھا، یا عیسائیوں کا "مذہبی جنوں" تھا، اگر مسیح کی تعلیم کا اثر عیسائیوں کے دل و دماغ پر صرف "جنون" پیدا کرنے کے قابل ہے تو صلاح الدین کی رحمدلی صداقت اسلام کا بیّن ثبوت ہے، مسلمانوں کا قتل عام اور عیسائیوں کی آزادی پر صرف گوڈفرے اور صلاح الدین ہی قابل نفرین و تحسین نہیں ہیں، کیونکہ یہ جنگ دو تاجداروں میں نہ تھا، اور فی الحقیقت اس جنگ کے محرک دنیاوی خیالات یا ہوس ملک گیری نہ تھے، یہ جنگ دو قوموں میں نہ تھا جن کے اغراض مختلف اور متضاد ہوتے ہیں، اور سچ تو یہ ہے کہ یہ جنگ اہل یورپ اور ایشیا کے درمیان نہ تھا جو اکھاڑہ میں اپنے اپنے ملک کی عزت کے واسطے لڑتے، یہ عظیم الشان جنگ دنیا کی تواریخ میں بےنظیر ہے، یہ جنگ دو مذہبوں کے درمیان تھا۔ یہ جنگ عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان تھا گبن نے لکھا ہے کہ گوڈفرے نے بادشاہ کا لقب اپنے نام کا جزو پسند نہیں کیا تھا، صرف "محافظ دین" پر قناعت کی، ہر ایک واقعہ سے جو ان لڑائیوں میں پیش آئے، واضح ہوتا ہے کہ یہ مذہبی جنگ تھا اور اسلام اور مسیحیت کے درمیان تھا۔ اس کی ابتدا عیسائیوں کی طرف سے ہوئی اور نہایت ہی مذموم اور قبیح روش اختیار کی، اس کا خاتمہ مسلمانوں نے کیا اور احسن طریقہ پر کیا، اس لئے صلاح الدین کی رحمدلی اور مجاہدین صلیب کی سنگدلی کا مقابلہ اور فرق سلسلہ ہائے دول کی ذات تک محدود نہیں ہو سکتا، افسوس ہے کہ گبن نے لکھنے کو تو لکھا ہے کہ عیسائی خود صلح اور امن کے خواستگار ہوئے، اور مسلمانوں نے یورش اور حملہ کے انتہائی مصائب کا مقابلہ کیا۔" اس لئے اوّل الذکر فریق میں یہ ہے

اور مسلمان قتل عام کے لایق تھے، مگر افسوس ہے کہ اس دعویٰ کی دلیل گبن کے پاس نہیں، اسے معلوم نہیں کہ کس طرح شیر خوار بچوں کو ماؤں کی چھاتیوں سے جدا کر کے ظالم نہایت سنگدلی سے پتھروں پر پٹکتے اور کس طرح بوڑھوں اور اُن لوگوں کو جو صرف مسلمان ہونیکے گنہگار تھے بیدریغ قتل کرتے، یہودیوں پر تو یورپ میں ہی ہاتھ صرف کرنے کے عادی تھے، اگر بیت المقدس کے ایک کنیسہ میں صدہا آدمیوں کو جو اس جگہ پناہ گزین تھے زندہ آگ میں جلا دیا تو کوئی نئی بات نہ تھی، کیا یہ لوگ یہ بچے اور بوڑھے آخر دم تک یورپ کے ولااور "نائٹ" کے مقابلہ پر اڑے ہوئے تھے، مسلمانوں نے ہمیشہ بیت المقدس کی حرمت کا پاس کیا ہے، حضرت عمرؓ کی تقلید صلاح الدین پر واجب تھی، وہ اس جگہ خون گرانا نہیں چاہتے تھے، ورنہ عیسائی جنگ کے "انتہائی مصائب" سے بیخبر نہ رہتے، مسلمان ہمیشہ دشمنوں سے نرم شرائط پر صلح کرتے رہے ہیں اور اگر ایک دفعہ امن کا عہد باندھا تو ہمیشہ اس کا پاس کیا، عیسائیوں نے فاطمیہ خلیفہ مصر سے لاکھوں روپیہ وصول کر کے پھر دغا کی، عیسائیوں کے گناہوں کا کفارہ مسیح کے خون سے عیسائیوں کے زعم ناقص میں ہو سکتا ہے، لیکن ناکردہ گناہ مسلمانوں کے خون کے انتقام سے بچنے کے لئے اسلام کی مقدس تعلیم ہی ایک ذریعہ ہوسکتی ہے، سپین میں جہاں مسلمان ایک ہزار سال سے آباد تھے اور جاہل یورپ کو علم و فضل سے مستفیض کر رہے تھے، عیسائیوں نے مسلمانوں سے کیا سلوک کیا، اور کب اور کہاں ان لوگوں نے مسیحیت کی صداقت اور انسانیت کا ثبوت دیا، اسکے برخلاف مسلمانوں نے جو کچھ ان پر احسان کئے ہیں اس سے انکار نہیں ہو سکتا،

کروسیڈ" یورپ کی موجودہ تہذیب و شائستگی کا پیش خیمہ تھے، ایک عرصہ تک مذہبی جنون کے دانت بیت المقدس پر رہے، لیکن حکمائے اسلام نے اسکی فصد اچھی طرح لی، اس کے نتایج پر ہم بحث نہیں کرتے کیونکہ یہ دمشق کا موضوع نہیں، خاندان لوزیہ کے بعد ایوبیہ اور اس کے بعد مملوک کا دور دورہ دمشق میں رہا، اور صلیبی لڑائیوں اور باہمی خانہ جنگی کے صدمات کے بعد دمشق پر ایک اور بلا نازل ہوئی، جسے ہم "الوحش" کے عنوان سے تعبیر کرتے ہیں، دمشق کا تو ہمیشہ سے یہی حال رہا ہے کہ

ہر بلائے کز آسمان آید | گرچہ بر دیگرے قضا باشد
بر زمین نا رسیدہ می پرسد | خانۂ انوری کجا باشد

فی الحقیقت خاندان ایوبیہ اور مملوک کا تعلق "القاہرہ" سے ہے اس لئے ہم دمشق میں ان کا تذکرہ نہیں کرتے۔

"الوحش"

صاحب قران امیر تیمور گورگان کہ جسکے فتوحات اور کارنامے سکندر اعظم سے کم نہیں، بلکہ بعض حیثیتوں سے اس کا قدم یونانی فتحمند سے آگے پڑتا ہے، عربی آجتک "الوحش" کے مہیب نام سے یاد کرتے ہیں۔ فارس پر قبضہ کرنیکے بعد تیمور عراق کے سرسبز اور زرخیز میدانوں میں اُتر پڑا۔ اس وقت برائے نام خلیفہ بغداد المتوکل علی اللہ ابو عبد اللہ تھا جس کا نام مصر و شام میں خطبہ میں پڑھا جاتا، فی الحقیقت جیسا کہ ہم "بغداد" میں مفصل بیان کر چکے ہیں، ان ممالک پر وقتاً فوقتاً مختلف خاندان حکومت کرتے تھے، جن کا لقب سلطان تھا۔ اس وقت ملک الناصر فرج ابو السعادات بن برقوق چرکسی سلطان مصر اور شام میں برائے نام نائب السلطنت اور فی الحقیقت خود مختار سلطان تھا، ۸۰۳ھ ۱۴۰۱ء میں تیمور حلب حمص، حمی اور بعلبک کو پامال کرتا ہوا دمشق کے سامنے نمودار ہوا، اہل شہر کو بخوبی علم تھا کہ "الوحش" کے سر پر گویا وحشت سوار ہے، اسکے قتل و غارت کی داستانیں سُن کر بدحواس ہوئے جاتے تھے۔ اس لئے کچھ تو اسکی آمد سے پیشتر ہی شہر چھوڑ کر بھاگ گئے تھے، اور باقی ایک عالم پریشانی میں اپنے مفرور بھائیوں کی تقلید پر آمادہ تھے کہ ملک الناصر مملوکی سپاہ کے ساتھ وقت پر آپہنچا، قلعہ اور شہر پناہ کی مرمت کے بعد اس نے فوج کا کچھ حصہ شہر کے باہر پھیلا دیا، رسد اور حفاظت کے سب سامان قلعہ میں جمع تھے،

تیمور نے "دارایا" پر خیمہ ایستادہ کئے اور فوج کو شہر پر حملہ کا حکم دیا، اہل شہر اور مملوکی سپاہ ایسا جی توڑ کر لڑی کہ گورگانی لشکر دور تک پسپا ہو گیا، اہل دمشق کے حوصلے بڑھ گئے، اور تیمور کو یقین ہو گیا کہ شہر اس طرح مسخر نہیں ہو سکتا، اس لئے وہ ایک سپاہیانہ چال چلا، اس کا بھتیجا امیرزادہ سلطان حسین ملک الناصر کی خدمت میں حاضر ہوا اور یہ ظاہر کیا کہ تیمور سے بگڑ کر چلا آیا ہے، ملک الناصر نے خیال کیا کہ میدان دشمن سے خالی ہے، اور اب کسی قسم کا اندیشہ باقی نہیں رہا، اس لئے کچھ فوج قلعہ میں چھوڑ کر مصر کی طرف چلا گیا، لیکن تیمور گھات میں بیٹھا ہوا تھا، اور اسی وقت کا منتظر تھا، فوراً دمشق پر لوٹا، اور نہایت سختی سے محاصرہ ڈالدیا۔ اہل شہر کے ہاتھ پاؤں پھول گئے، آخر علما، مشائخ، اور اکابر و اشراف دمشق نے جمع ہو کر مشورہ کیا، اور ایک وفد تیمور کے پاس بھیجا جسمیں قاضی القضاۃ ولی الدین ابن خلدون مشہور مؤرخ بھی تھا، شہر تیمور کے حوالہ کیا گیا، صاحبقران باب الصغیر سے انکار کر دیا، اور مقابلہ پر آمادہ ہو گئی، مصنف روضۃ الصفا

لکھتا ہے کہ "الحق آں قلعہ بود در نہایت استحکام و استواری، چنانچہ از کنگرہ تا آبش سنگہای بزرگ ساختہ و پرداختہ بود و از بلندی عروج سر بفلک البروج کشید و بذخائر فراوان و مردان جنگی مشحون بود و سالہای دراز از حوادث دوران مصئون و مامون، واز سہم ناوک دل دوز و قارورہائے نفط عالم سوز و ضرب سنگ عرادہ و منجنیق و دیگر اسباب ممانعت و مدافعت کہ اہل حصار آمادہ و مہیا داشتند، ہیچ کس را مجال نمیداد کہ پیرامون آن گردد" گورگانی سپاہ نقب زنی میں مشغول ہوئی، اگرچہ تیر اور پتھر اوپر سے باران بلا کی طرح برس رہے تھے اور رعد انداز، ناوک افگن، اور آتشباز سرگرمی سے اپنے کام میں لگے ہوئے تھے۔ آخر تیموری فوج نے لڑتے مرتے کئی ایک مقامات پر نقب لگاکر آگ لگادی، اور اس طرح فصیل میں رخنہ پیدا کرکے قلعہ میں داخل ہوگئے قلعہ پر قبضہ کرنے کے بعد "الوحش" نے بہ تقاضائے طبعی لوٹ مار کا بازار گرم کردیا۔ تیمور اسوقت "قصر ابلق" میں جو قلعہ کے قریب ملک طاہر والئ مصر کی یادگار ہے فروکش تھا۔ مجلس خاص میں امرا و وزراء کو مخاطب کرکے کہا کہ میں سنا کرتا تھا کہ اہل شام نے اہل بیت نبوی کے برخلاف بنو امیہ کا ساتھ مجھے تعجب ہوتا تھا کہ مسلمانوں سے کس طرح توقع ہوسکتی ہے کہ اس طرح معاویہ ویزید کے ہمراہ ابن عم و وصی حضرت رسالت پناہ اور سبط مکرم امیر المومنین حسینؓ کا مقابلہ کریں، لیکن آج یقین ہوگیا کہ اہل شام ایسے ہی سیاہ باطن تھے دیکھو اپنے آرام و آسایش کے لئے کیسی کیسی عمارات رفیع و دلپذیر تعمیر کی ہیں اور امہات مسلمین یعنی حرم خاتم النبیین کے مقبرے اُجڑے پڑے ہیں، یہ تو ان کی ہمت اور مروت کا حال ہے" اسکے بعد حکم دیا کہ ان مزار متبرکہ پر دو قبہ عالی تعمیر کئے جائیں، اور اہل دمشق کو جن کی جان و مال کی حفاظت کا وعدہ کرچکا تھا سنگدل لشکریوں کے ہاتھ میں دیدیا۔ خاوندشاہ مصنف روضۃ الصفا جو تیمور کے کارناموں کو تعریفی کلمات کے ساتھ اور غارت گری کی حکایتوں کو خوش ہوکر بیان کرتا دمشق کی بربادی کا حال مفصلہ ذیل عبارت میں لکھتا ہے:-

"روز چہارشنبہ غرہ شعبان ۸۰۳ھ سپاہ ابہت سمات بہ نیت غارت و تاراج روئے قہر بہ شہر آوردند، دولت تسلط و استیلا بسی و نہب کشادہ، طریق مدارا و مواسا بہ بستند، و دمشق را از پیر و جوان و قوی و ناتوان و شیوخ و اطفال و نساء و رجال باسیری گرفتند، و آنچہ سالہا از بحر و کان اندوختہ بودند از درو جواہر و زر و زیور در یک ساعت بدست بادشاہ والا گہ افتاد" اسکے بعد لکھتا ہے کہ "غارتگران اردوی ہمایون" کا یہ حال تھا کہ فارس کے برتن، روسی غنیمت۔ اور سقرلات عمل نبات اور متفرق اشیاء اسکندریہ مصر جو اس سے

پیشتر ان کے قبضہ میں تھیں اسی جگہ پھینک دیں۔ اور ان کی بجائے صرف سونا اور چاندی اٹھا لیا۔ مصنف عجائب المقدور دمشق کی تباہی کا آخری نظارہ اس طرح کھینچتا ہے کہ دمشق کے قلعہ سے تیمور کو جس قدر دولت ہاتھ آئی وہ تو اس کے خزانہ عامرہ میں داخل ہوئی۔ لیکن مطلق العنان لشکریوں نے جس ظلم و ستم سے اکابر و اشراف اور عوام الناس سے روپیہ وصول کیا اس کا بیان لفظوں میں نہیں ہو سکتا۔ اول الذکر کی ذلت میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ انہیں جبراً نمکین تلخ اور گرم پانی میں خاکستر پلاتے۔ جسم پر داغ دیتے۔ غرض طرح طرح کی اذیتیں پہونچاتے۔ اہل دمشق، مرد و عورت، مسلمان، یہودی، عیسائی، غرض کوئی شخص اس سفاک کی تیغ ستم سے نہیں بچا۔ بچوں اور عورتوں کو بھیڑ بکریوں کے ریوڑ کی طرح ہانک کر شہر کے باہر جمع کیا اور عام لونڈی غلاموں کی طرح لشکریوں میں تقسیم کر دیا۔ مستورات کی پردہ دری جاہل اور خوشامدی علما نے جائز قرار دی۔ ایک تو یہ غارت گری کا بازار گرم تھا اور دوسرے جامع اموی کے محلوں سے آگ کے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ حضرات شیعہ کو اہل سنت سے جو دلی کاوش تھی اس کے اظہار کا اس سے بہتر موقع بھلا کب مل سکتا تھا۔ جا بجا آگ لگا دی۔ مصنف روضۃ الصفا اسے "شعلہ قہر الٰہی" سے تعبیر کرتا ہے۔ دمشق جسے جنت سے تشبیہ دیتے ہیں اس وقت دوزخ کا نمونہ تھا۔ بیکس عورتوں کا نالہ و فغاں، بچوں کا رونا، بے گور و کفن لاشوں کا بازاروں، گلیوں اور گھروں میں انبار ایک قیامت تھی جو اس وقت دمشق میں بپا ہو رہی تھی۔ تیز ہوا کے جھونکے آگ کو پنکھا کر رہے تھے۔ اسکے شعلے جامع اموی کے در و دیوار تک پہونچے۔ اس ہنگامہ محشر میں اسے کون بجھاتا۔ تھوڑے عرصہ میں یہ اللہ کا گھر مجوسیوں کا آتشکدہ بن گیا۔ چوبی سقف مسجد جل کر خاک ہو گئی۔ خاوند شاہ لکھتا ہے کہ اس پریشانی کے عالم میں اہل دمشق کو آگ بجھانے کی کہاں فرصت تھی۔ مگر خبر این احتراق بسمع خجستہ خسرو آفاق رسید۔ اور امیر نے فوج کے ایک حصہ کو حکم دیا کہ جامع اموی کو اس حادثہ سے بچانا چاہیئے۔ مگر شعلۂ غضب الٰہی ایسا بھڑکا ہوا تھا کہ منارہ شرقی اگرچہ تمام پتھر کا تعمیر شدہ تھا جل کر خاک ہو گیا۔ مگر منارہ عروس میں اگرچہ اصل چوبی اور بظاہر گچ تھا۔ آگ نے مطلق اثر نہ کیا۔ وجہ یہ ہے کہ اس منارہ پر حضرت عیسٰی کا نزول ہو گا۔ اس لئے یہ منارہ محفوظ رہا۔ ہمیں اس خوشامدی مؤرخ کے آخری فقرہ پر بالکل اعتبار نہیں اس آتش خانہ خراب اور "الوحش" کے ستم سے تمام دمشق میں آگ لگی ہوئی تھی۔ ان تمام خرابیوں کے بعد تیمور نے دمشق کی بربادی کی تکمیل اس طرح کی کہ علماء و فضلا اور دمشق کے اہل حرفہ اور صنعت کو قید کر کے اپنے ہمراہ لے گیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دمشق سے صنعت و حرفت جو قدیم الایام سے اسکی شہرت کا باعث

تھی اُٹھ گئی؛

اِس بارونق شہر کی آبادی کا اکثر حصہ تہ تیغ بیدریغ ہوا، سمرقند کے بازاروں میں لونڈی اور غلاموں کی طرح آوارہ ہوا، الغوطہ جسے جنت دنیا کہتے ہیں الوحش کے گھوڑوں کے سموں نے پامال کر دیا۔ اور بقول گبن "سات سو سال کے بعد دمشق جل کر خاک ہو گیا جسکی وجہ یہ ہے کہ ایک تاتاری کا مذہبی جوش ایک عربی کے خون کے انتقام کا محرک تھا"

دمشق کا آخری دور سلطان سلیم کے داخلہ دمشق یعنی ۱۵۱۶ء پر ختم ہوتا ہے۔ اسکے بعد آج تک دمشق ترکی حکومت کا ایک صوبہ ہے" ✽

باب دوم

"دمشق"

دمشق منزلنا حیث النعیم بدا ۔۔۔ مکملاً وھو فی الآفاق مختصرا

یعنی دمشق ایک ایسا مقام ہے جسمیں جنت کی نعمتیں مکمل موجود ہیں، مگر جنت اور اس میں یہ فرق ہے کہ وہ ایک دور و دراز راستہ ہے اور سعی عمل وغیرہ کے بغیر اس کا حصول مشکل ہے مگر دمشق میں ہم باسانی پہونچ سکتے ہیں؛

دولت آن است کہ بے خون دل آید بکنار

ورنہ با سعی عمل باغ جناں ایں ہمہ ہیچ

القصب راقصۃ والطیر صاحبۃ ۔۔۔ والزھر مرتفعٌ والماء منحدر

دمشق میں کیسے دلکش منظر ہیں، اسکی نہریں اور باغ کیسے فرحت افزا نظارے پیش نظر کرتے ہیں، درختوں کا ہوا کے جھونکوں سے لچکنا اور جانوروں کا چہچہانا محفل عیش و نشاط کا نقشہ ہے، کلیوں کا شاخوں پر بلند ہونا اور پانی کا سایہ دار درختوں کے نیچے بہنا خلد بریں کے سامان ہیں؛

وقد تجلت من اللذات اوجھھا ۔۔۔ لکنھا بظلال الدوح تستتر

ہر ایک قسم کی لذائذ کے جلوے اس جگہ آشکار ہیں، مگر درختوں کے سایہ میں مستور ہیں یعنی اس جگہ لطف زندگی اگر اُٹھانا چاہو تو درختوں کے سایہ کے نیچے بیٹھو؛

وکل وادٍ بہ موسیٰ یفجرہ ۔۔۔ وکل روضٍ علیٰ حافاتہ الخضر

دمشق کی پتھریلی زمین میں اعجاز موسوی اپنا کام کر رہا ہے کہ پتھروں سے پانی کے چشمے پھوٹ رہے ہیں؛ اور ہر ایک باغ کے کنارہ پر خضر ایستادہ ہیں؛

خیم علق بین الکاس والوتر — فی جنۃ ھی ملاء السمع والبصر

دمشق میں خیمہ ایستادہ کر اس جگہ بادۂ عشرت کا دور چل رہا ہے؛ اور ہر طرف سے نغمۂ دلکش کی صدائیں کانوں میں آتی ہیں؛ دنیا ہمہ تن گوش وچشم بن کر اس جنت کی لذائذ سے محظوظ ہو رہی ہے؛

متع الطرف فی مرای محاسنہ — وروض الفکر بین الروض والنہر

اسکے مقامات کی خوبیاں قابل دید ہیں؛ یہ ایسے منظر ہیں کہ آنکھیں ان سے محظوظ ہوتی ہیں۔ اور غور وفکر اسکے باغ اور نہروں میں کرو، کہ کس طرح بہتی ہیں؛ اوران کے ذریعہ کیا کچھ قدرت خدا کے جلوے نظر آتے ہیں؛ یعنی دل ودماغ اور ظاہری اور باطنی طاقتوں کو اس مقام کے حسن پر نظر اور فکر کرنے کے لئے جمع کرنا چاہیے؛

وانظر الی ذھبیات الاصیل بھا — واسمع الی نغمات الطیر فی الشجر

بوقت غروب آفتاب کی شعاعیں دمشق کے سفید مکانات اور طلائی برجوں اور سنہری کلسوں اور تختۂ گلزار پر جو اس جگہ بکثرت ہیں منعکس ہو کر عالم نور کا سماں پیدا کرتی ہیں اور جو ایک قابل دید منظر ہے؛ اور جانوروں کا نغمہ جو درختوں میں چہچہاتے ہیں سننے کے لایق ہے؛

وقل لمن لام فی اللذاتہ بشرا — وعنی فانک عندی من سوی البشر

وہ شخص انسان ہی نہیں جو کسی آدمی کو دمشق کی لذائذ پر ملامت کرتا ہے؛

دمشق کا عام نظارہ جسکا سیاحوں نے بالخصوص ذکر کیا ہے نہایت دلکش ہے۔ جبل قاسیوں پر کھڑے ہو کر اگر چاروں طرف نگاہ کی جائے تو ایسا دلچسپ منظر نظر آتا ہے کہ مسافر مثال آئینہ حیرت زدہ ہو جاتا ہے؛ پہاڑی سلسلہ دیوار کی طرح سامنے کھنچا ہے؛ اسکے دامن میں میدان پھیلا ہوا ہے؛ جس میں سڑکیں اور اسپر اونٹوں کی قطار اور مسافروں کی آمد ورفت رہتی ہے۔ اس میدان میں نہریں بہتی ہیں جن کے کنارے اور دور دور تک سایہ دار درختوں کے جھنڈ نظر آتے ہیں اور ان کے آغوش میں یہ مشہور شہر اور اسکی سفید عمارتیں اٹھتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں؛ تھکا ماندہ مسافر جو ریگستانوں کو طے کرتا ہوا آرہا ہو جس وقت اس منظر کو دیکھتا ہے تو ایک سراب تصور کرتا ہے؛ روایت مشہور ہے کہ

باغ عدن، یہی دمشق اور اس کا میدان ہے، جسے آبانہ اور فرفر قدیم الایام سے سیراب کرتے ہیں، اگرچہ شہادتیں موجود ہیں جو اس روایت کی تائید کرتی ہیں، مگر ہم اسے ایک روایت سے زیادہ وقعت نہیں دیتے؛ اس میں کچھ شک نہیں کہ دنیا میں ایسے بہت کم مقام ہیں جو دمشق کی شادابی اور سرسبزی کا مقابلہ کرسکیں، اور اگر عربوں نے اسے دنیا کی جنت کہا تو بالکل صحیح ہے؛

کتب مقدس میں اس شہر کو دمشق ارم ہی لکھا ہے لیکن یا تو ان کی خوبیوں کی وجہ سے یا کسی اور باعث سے مختلف ناموں سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ مگر اس کا ابتدائی اور مشہور نام دمشق ہی ہے جیرون جلق؛ اور منجملہ اسکے مشہور لقب یا نام ہیں جو زیادہ تر اشعار میں موزون معلوم ہوتے ہیں؛

"جیرون" کی وجہ تسمیہ میں بہت کچھ اختلاف ہے؛ یاقوت لکھتا ہے کہ روایت ہے کہ جیرون ایک شیطان کا نام ہے جس نے دمشق کا مشہور دروازہ سلیمانؑ کے حکم سے تعمیر کیا؛ اور ایک روایت یہ ہے کہ سب سے پہلے دمشق کی بنا دمشق بن جیرون بن سعد بن عاد بن ارم بن سام بن نوح علیہ السلام نے رکھی اور اس میں ایک دروازہ جیرون کے نام سے منسوب کیا گیا؛ اور شہر کا نام ارم ذات العماد رکھا؛ اور اسی قسم کی اور بھی روایتیں نقل کرتا ہے؛ اور یہ بھی لکھتا ہے کہ دمشق ہی کو جیرون کہتے ہیں۔ مگر غالباً جیرون کا تعلق کم و بیش جامع اموی کے شرقی دروازہ کے ساتھ ہے جسکا نام اب بھی جیرون ہے؛ اور یہ نام یہودیوں یا عیسائیوں کے کنیسہ یا گرجہ کے بعد باقی رہا؛ شعرا نے جیرون سے دمشق یا اس سے اسکا دروازہ ہی مراد لی ہے؛

یا برق هل لك فی احتمال تحیۃٍ
عذبت فصارت مثل مائك سلسلا

شاعر برق کو مخاطب کرکے کہتا ہے کہ دمشق کو میرا اسلام پہنچا دے جو خوبیاں برق و باران میں ہیں وہ دمشق میں بھی ہیں؛ انکی مسلسل روانی؛ چمک دمک؛ اور شیرینی دمشق میں بھی پائی جاتی ہے؛ چونکہ دونوں میں خاص خاص مناسبتیں ہیں اس لئے برق ہی پیغام پہنچانے کے لئے موزون ہے؛

یا کو دمشق بمشق اقلام الحیا
وظهر الریاض مرصعًا و مکللا؛

صبحدم دمشق کا دلکش نظارہ دیکھ کہ باغات میں بر لالہ ژالہ می چکد از ابر مشک فام اور ایسا معلوم ہوتا ہے خط گلزار کی تختوں پر مشق کی گئی ہے؛

واجر ر دعلی رون ذیولك و اختصص

دامن کشاں جیرون میں داخل ہو اور اپنے لئے ایسا امکان

مغنیً تاززہ بالعلی وتسربلا	منتخب کر جو رفعت کے لباس سے آراستہ وپیراستہ ہے؛
حیث الحیا الربعی معلول الجہا	اس جگہ ابر باراں ربیع میں تحلیل ہوتا ہے؛ تاکہ اس سے استفادہ
وابو امل الربعی مغزی اُکلا۔	حاصل کرے؛ اور اس میں وہ قوت نامیہ پیدا ہو جائے جو اسجگہ
	باران ربیع نباتات کی صورت میں ظاہر کرتا ہے؛ یعنی ابر
	خود اس امر کا محتاج ہے کہ باران ربیع دمشق سے استفادہ حاصل کرے؛

"جلق" کی وجہ تسمیہ بھی تاریکی میں ہے؛ حسان بن ثابت فرماتے ہیں :۔

للہ در عصابتہ نادمتھم	غسانیوں کی مدح کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس جماعت کا وصف
یوما بجلق فی الزمان الاول	کیا بیان ہو جنکے ساتھ جلق میں اوایل عمر میں ہمنشیں تھا؛

عرقلہ دمشقی کلبی کہتا ہے؛

الشام شامتہ وجنتہ الدنیا کما	شام تو رخسار دنیا کا خال ہے. مگر جلق چشم مست کی پتلی ہے
انسان مقلتھا الغضیضتہ جلق	یعنی حسن وضرورت دونوں باتیں بدرجہ کمال اسمیں موجود ہیں؛
من آسھا جنتہ لا تنقضی	گل آس نے اسے جنت بنا رکھا ہے جسے زوال کا ڈر نہیں؛
ومن ۲ شقیق جھنم لا یحرق	اور گل لالہ نے دوزخ کی آگ روشن کی ہو مگر جلنے کا خوف نہیں؛

جامع دمشق کو بھی جامع جلق کہا گیا ہے؛ اس سے واضح ہوتا ہے کہ جلق دمشق ہی کا نام ہے

ابن نباتہ کہتا ہے :۔

لدی الحسن مجموعا بجامع جلق	میں حسن کی خوبیوں کو جامع جلق میں جمع دیکھتا ہوں اور اسکے
وفی صدرہ معنی الملاحتہ مشروح	صحن میں ملاحت کے معانی کی شرح پاتا ہوں؛ یعنی جامع
	دمشق میں حسن کی تمام خوبیاں نہ صرف جمع ہیں بلکہ مشرح
	ومفصل بھی ہیں؛

بقول یاقوت جلق؛ الغوطہ یا دمشق کا نام ہے؛ کہتے ہیں کہ اس نام کا ایک قریہ بھی دمشق میں ہے؛
اور ایک اور قریہ نضر نامی ہے جسمیں ایک عورت کا بت نصب تھا؛ پانی اس کے دہن سے جاری
تھا؛ اس کا نام جلق تھا؛ غرض ایسی ایسی روائتیں مشہور ہیں؛

حسان بن نمیر المعروف عرقلہ الدمشقی نے جلق کے وصف اور اسکے نواح کی تعریف میں اس قصیدہ کے

ضمن میں کی ہے جو سلطان صلاح الدین بن یوسف کی مدح میں لکھا تھا؛

عسی من دیار الظاعنین بشیر　　ومن جور ایام الفراق مجیر

"فیحا" بھی ایک لقب ہے؛ چونکہ اسکی آبادی بہت وسیع اور فراخ ہے؛ اس لئے دمشق کو فیحا کہتے ہیں۔ دمشق پرانا شہر ہے اور اس لئے اس جگہ آثار قدیمہ کی کثرت ہونی چاہئے؛ مگر ہر ایک زمانہ میں اسپر اس قدر تغیر واقع ہوتا رہا ہے کہ گذشتہ زمانہ کی تاریخ کا پتہ اسکے آثار سے بمشکل ملتا ہے؛ موجودہ صورت گذشتہ ایام سے بہت مختلف ہے؛ ہر ایک سیاح نے دمشق اور قریوں کے تذکرہ میں اسکی مساجد؛ حمام، بازاروں کا ذکر کیا ہے؛ ان مجمل حالات سے ان بازاروں اور دکانوں کا مفصل پتہ نہیں ملتا؛ قیاس ہو سکتا ہے کہ جو کچھ آجکل دمشق کی صورت ہے قدیم زمانہ میں بھی یہی ہوگی؛ لیکن اگر دمشق کے ایک مکان کو دیکھو تو ظاہر وباطن میں بہت فرق ہے جس کا تذکرہ ہم کر چکے ہیں؛ بنوامیہ کے زمانہ میں اس شہر کا ظاہر و باطن یکساں تھا؛

دمشق کے اکثر بازار مسقف اور بعض غیر مسقف ہیں؛ ان بازاروں کے نام مختلف زمانوں میں بدلتے رہتے ہیں؛ معلوم ہوتا ہے کہ بنوامیہ کے عہد میں جامع دمشق کے قرب میں خلفا اور دیگر اراکین سلطنت کے قصر تھے؛ چنانچہ ابن بطوطہ لکھتا ہے کہ باب الزیادۃ سے دار الخیل کو راستہ جاتا ہے اور بائیں جانب ایک بہت بڑا بازار ہے؛ ابتدا میں اس جگہ حضرت معاویہ اور بنوامیہ کے مکانات تھے اس جگہ کو خضرہ کہتے تھے؛ بنوعباس نے ان عمارتوں کو منہدم کرایا؛ اور اس جگہ ایک بازار بن گیا؛

"ارنے بلا" اور "مرتے" اور دیگر یورپی سیاح یہ سمجھتے ہیں کہ جامع اموی جسکا طول وعرض ۱۶۳ اور ۱۰۰ گز ہے اس پرانے معبد یا کنیسہ یا گرجا کے ایک حصہ پر تعمیر ہوئی ہے جسکا تذکرہ ہم دوسری فصل میں کر چکے اس گرجا کی وسعت چھ سو مربع گز بیان کی جاتی ہے؛ یہ سیاح لکھتے ہیں کہ اس کے آثارات بھی جامع دمشق کے قریب بازاروں میں ملتے ہیں؛ اصل میں اس جگہ جیسا کہ ہم نے لکھا ہے بنوامیہ کے قصر تھے جو بنوعباس نے خاک میں ملا دیئے مگر ان عالیشان عمارتوں کے ستونوں اور دیواروں کے آثار اب بھی پائے جاتے ہیں؛ ناواقف یورپی سیاح غلط فہمی سے انہیں پرانے گرجا یا کنیسہ کے آثار سمجھتے ہیں؛"

یاقوت چند بازاروں اور محلوں کا ذکر کرتا ہے؛ مگر موجودہ بازاروں اور محلوں کی فہرست میں یہ نام نہیں ملتے [۳۱]

حاشیہ نمبر ۳۱۔ باب شرقی میں داخل ہو کر شارع مستقیم کو منہا بنایا جائے تو دروازہ سے آگے چند

جسکی وجہ یہی ہے کہ یہ نام وقتاً فوقتاً بدلتے رہے۔ جامع مسجد کے قریب امیر معاویہ نے ایک عالیشان محل تعمیر کروایا جسکا نام "قصر خضرہ" تھا۔ تعمیر و تکمیل کے بعد ایک دن ابی ذرؓ سے عمارت کی حسن و خوبی کی نسبت استفسار کیا۔ ابی ذرؓ نے جواب دیا کہ "اگر اس عمارت کے مصارف بیت المال سے ہوئے ہیں تو تم نے بددیانتی کی ہے اور اگر اپنی ذاتی دولت اسپر صرف کی ہے تو اسراف کیا ہے"۔ اس جگہ ایک اور "قصر دار الصوفیہ" تھا جو "باب الناطفائیین" کے متصل تھا، یاقوت ابن عساکر کا حوالہ دیتا ہے کہ جامع دمشق سے ملحق تھا، اور اسکی تعمیر عبدالعزیز بن مروان نے کی۔ عمر بن عبدالعزیز اسی مکان میں رہتے تھے، اسکے بعد یہ عمارت فقرا اور صوفیہ کے لئے وقف کی گئی، اس لئے اس کا نام دار الصوفیہ مشہور ہوگیا، یاقوت لکھتا ہے کہ ۴۵۳ھ میں ابو القاسم علی بن محمد السمیساطی السلمی المعروف "الجمیش" کا انتقال ہوا تو اسی دار الصوفیہ میں دفن کیا گیا۔ "القبیبات" مسجد دمشق کا ایک محلہ تھا۔ بقول یاقوت یہ ایک جلیل القدر محلہ تھا، اور اس جگہ امرا اور روسا کے مکان تھے۔

"سوق العمارۃ" اور "سوق المحابریہ" دمشق کے دو بازار ہیں۔ ان کے درمیان سوق الغزل اللعلق تھا

قدم کے فاصلہ پر ایک ارمنی دیر نظر آتا ہے، اس سے آگے ایک شامی اور کچھ فاصلہ پر یونانی کلیسائے کے دیر دکھائی دیتے ہیں، ۱۸۶۰ء میں عیسائیوں اور دروزیوں کے درمیان سخت خونریز لڑائیاں ہوئیں جمیں عیسائیوں کو سخت نقصان جان و مال برداشت کرنا پڑا چنانچہ یہ گرجے بھی جلائے گئے، مگر اب ان کی مرمت کی گئی ہے، کوئی دو سو گز کے فاصلہ پر جانب راست ایک تنگ گلی میں حنانیاہ رسول کا گھر ہے؛ اس کے ساتھ ہی پرانے دیر صلیبا کے آثار پائے جاتے ہیں، پانچسو گز کے فاصلہ پر جانب راست ایک اور گرجا کلیسائے یونانی کا دکھائی دیتا ہے اس کا نام "مریم" ہے اگرچہ اسکی عمارت جدید ہے۔ مگر غالباً یہ وہی جگہ ہے جہاں اس سے پیشتر مریم کا گرجا تھا، اسی طرح شارع مستقیم پر چلتے ہوئے ایک بازار جانب راست دکھائی دیتا ہے، اس جگہ کھڑے ہو کر اگر نگاہ دوڑائی جائے تو بیشمار بازار ایک دوسرے کو قطع کرتے ہوئے اور دوکانوں پر لوگوں کا ہجوم نظر آتا ہے، ان میں سے سوق الصلبیہ، سوق الدقاقین، سوق الحبالین، سوق البعجبہ، سوق الجمق، اور سوق القطن، میں چوبی برتنوں، ریشمی کپڑوں، رسیوں، لحاف، زراعت کے آلات اور دیگر دستکاریاں فروخت کے واسطے قرینے سے لگی ہیں، یہ تمام بازار شارع مستقیم کی جانب راست مشرق سے مغرب کو چلے گئے ہیں، ایک اور بازار سوق الزوعدیہ اسی شارع کے داہنی طرف واقع ہے

اِس جگہ ایک مسجد "المعزل المعلق" اب بھی موجود ہے۔ اور بہت پُرانی مسجد ہے، اِس جگہ ایک مدرسہ بھی تھا جسے امینیہ کہتے تھے؛

جامع دمشق کے مشرقی دروازہ باب جیرون کی جانب شرق چار بازار ایک دوسرے کو قطع کرتے تھے۔ اسے "المربعہ" کہتے تھے۔ اسکے قریب قنطرہ بنی مدلج تھا، اور اسکے متصل ایک محلہ تھا جو "ینبطون" کے نام سے مشہور تھا؛

غالباً موجودہ "سوق الزدریہ" پرانا بازار ہے، یاقوت لکھتا ہے کہ اس جگہ عبدالمنعم بن حسان کی دکان تھی، یہ شخص شاعر، ادیب، اور طبیب تھا، اشعار کے لفظوں کو دائروں، درختوں، اور مختلف صورتوں میں لکھتا، اور اشعار میں عجیب غریب عمل کرتا؛

ہم نے دمشق کا نقشہ جسمیں دیوار اور دروازے، اور مشہور مقامات اور بازار، نہروں اور سڑکوں اور دیگر مقامات کو دکھایا گیا ہے کھینچ دیا ہے اِس لئے ہم اب اس کے مختلف بازاروں کا تذکرہ کرتے ہوئے طول دینا نہیں چاہتے؛

شارع مستقیم جو باب شرقی سے شروع ہو کر باب الجابیہ پر ختم ہوتی ہے بہت پُرانی سڑک ہے جو حضرت عیسیٰ کے زمانہ میں موجود تھی، اِس کے متعلق رسولوں کے اعمال میں لکھا ہے کہ جب پولوس کو آسمان سے ایک نور چمکتا ہوا دکھائی دیا، اور اُنکی آنکھوں کو بے نور کر دیا تو لوگ اُسے اٹھا کر اس محلہ میں لائے جو شارع مستقیم کے ساتھ واقع تھا، اس جگہ "حنانیاہ" رسول آئے اور پولوس کو شفا بخشی، جہاں پولوس فروکش تھے "یہودا" کا مکان تھا، عیسائی زائرین کو یہ جگہ اور حنانیاہ رسول کا مقبرہ

دمشق کے بازاروں کے نام ہی سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس جگہ وہ اشیا فروخت ہوتی ہیں جن کے نام سے یہ بازار منسوب ہیں، شارع مستقیم باب الجابیہ پر ختم ہوتی ہے۔ اسکے قریب ایک بازار سوق باب الجابیہ ہے، سوق السلاح، جسکا دوسرا نام سوق التقن ہے، سوق النقادین، اور اسکے ساتھ سوق الصاغہ، سوق القباقبیہ سوق الخراطین، سوق القوافین، سوق الحریر، سوق النوریہ، سوق الخیاطین، سوق الاروام، سوق العصرونیہ سوق باب البریدۃ، سوق الجدیدہ، سوق الدردام، سوق الننوان، سوق القمیلہ، سوق السروجیہ، سوق الزرابلیہ، سوق الدرویشیہ، سوق السنانیہ، سوق الندار، سوق القبلتویہ، سوق الخیل، سوق الجمال، سوق الحضرویہ، سوق الحاریہ سوق المناخلیہ، سوق البعابعیہ، سوق العمارہ دمشق کے مشہور بازار ہیں؛

اب بھی دکھایا جاتا ہے؛

دمشق کی تقسیم دو طرح پر کی گئی ہے، بلحاظ آبادی تو دمشق کا ایک حصہ دیوار کے اندر اور دوسرا دیوار کے باہر ہے، دیوار یعنی فصیل کے اندر آبادی قدیم الایام سے شہر کی رونق ہے۔ دوسرا حصہ جو شہر سے باہر آباد ہے اسکی ابتدا مسلمانوں کے زمانہ یعنی فتح دمشق کے بعد ہوئی۔ بہ لحاظ حکومت اسے آٹھ قسمتوں میں تقسیم کیا گیا ہے القیمریہ اس میں یہود و نصاریٰ آباد ہیں، الشاغور، میدان الفوقی، میدان التحتی، القنوات، العقیبة، العمارہ، الصالحیہ؛

شہر دمشق میدان میں دامن جبل الشرقی سے ۱½ میل کے فاصلہ پر واقع ہے، میدان سطح سمندر سے دو ہزار دو سو فٹ ۲۲۰۰ بلند ہے اور نباتات سے مستور ہے، اس کے کناروں پر پہاڑی سلسلہ جبل الشیخ سے شمال مشرق کی طرف پھیلا ہوا ہے۔ اسکی اوسط بلندی میدان سے چھ سو فٹ ۶۰۰ ہے، لیکن شہر کے سامنے دائرہ کی صورت میں پہاڑ جبل قاسیون پندرہ سو فٹ ۱۵۰۰ کی بلندی تک اٹھتا ہے، اسکی چوٹی پر کھنڈرات پڑے ہیں، جسے "قبۃ النصر" کہتے ہیں؛ اسکے دامن میں "صالحیہ" واقع ہے، ابن بطوطہ لکھتا ہے، کہ "ربض الصالحیہ" دمشق کے شمال میں واقع ہے؛ یہ ایک بڑے شہر کی طرح آباد ہے، اسکے بازار نہایت خوشنما ہیں، اس میں جامع مسجد شفاخانہ مدرسہ سب کچھ موجود ہے؛ ایک مدرسہ ابن عمر کے نام سے مشہور ہے، سن رسیدہ لوگ جو قرآن شریف پڑھنے کی خواہش رکھتے ہیں، ان کے لیئے یہ مدرسہ وقف ہے؛ صالحیہ میں امام احمد بن حنبل کے مقلدین کی کثیر تعداد ہے یاقوت لکھتا ہے کہ صالحیہ ایک بہت بڑا قریہ ہے، جو محف جبل قاسیوں میں غوطہ دمشق میں واقع ہے؛ اس جگہ بیشمار صالحین کی قبریں ہیں، اور صالحین کی رہائش ہے، غالباً یہی وجہ تسمیہ "صالحیہ" ہے، شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کی قبر اسی جگہ ہے، ایک اور سیاح لکھتا ہے کہ باب الصالحیہ اور اس سڑک سے گذر کر جو صالحیہ کو جاتی ہے جانب چپ دامن جبل اور باغات کے درمیان چلتے چلتے ایسا منظر دکھائی دیتا ہے جو ایک خواب معلوم ہوتا ہے؛ سر شام جبکہ آفتاب غروب ہو رہا ہو، اس مقام کے سامنے خلد بریں کا نقشہ آنکھوں میں پھر جاتا ہے، باغات کا سلسلہ دور تک چلا گیا ہے اور اس جگہ دو نہریں مختلف بلندی اور ایک ہی کنارہ پر پہاڑ کو قطع کرتی ہوئی بہتی ہیں اور دوسرے کنارہ پر اسی طرح تین نہریں ہیں جو شخص ان نہروں کو دیکھتا ہے کہ کس طرح پہاڑ کو کاٹ کر مختلف بلندی سے لائے ہیں اور کس طرح پلوں سے انہیں نہار بادیا ہے عربی صنعت اور فن کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا؛ +

دمشق ایسی جگہ واقع ہے کہ جہاں قدرتاً پانی کی کثرت ہے۔ نہر بردی ہزارہا سال سے اس میں رواں ہے اور اسے سیراب کر رہی ہے پہاڑ سے نکل کر زمین مشرق کی طرف بہتی ہوئی شہر کو دو حصوں میں تقسیم کرتی ہے جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ دمشق دو حصوں میں منقسم ہے۔ پرانی آبادی یعنی شہر جسکے گرد دیوار بیضوی شکل میں محیط ہے، نہر بردی کے جنوبی کنارہ پر واقع ہے۔ اور اس کے اندر جامع اموی، قلعہ اور دیگر خاص خاص عمارتیں ہیں۔ شمالی کنارہ پر قلعہ کے متصل جو شہر کا شمال مغربی کونہ ہے۔ وسیع آبادی صالحیہ کی طرف پھیلی ہوئی ہے، شہر کے مغرب میں دوسری آبادی اسی طرح دور تک چلی گئی ہے اسکے بعد "میدان" دو میل جانب جنوب پھیلا ہوا ہے جو دمشق کے مضافات میں سب سے بڑا ہے۔ میدان میں ایک کشادہ سڑک جاتی ہے جو "بوابتہ اللہ" پر ختم ہوتی ہے۔

دمشق اور دمشق کی دیوار، دروازوں، سڑکوں، نہروں، قریوں کو ہم آیندہ فصلوں میں کسی قدر بالتفصیل بیان کریں گے۔ ہم اس فصل کو چند اشعار پر جو دمشق کے وصف میں نامور شعراء نے لکھے ہیں ختم کرتے ہیں:-

من بعد يوم في دمشق وعيلتي
حلف الزمان بمثلها لا يغلط
تبنا وصبح الليل في غفلاته
ومن الصباح عليه فرع اشمط

دمشق میں میرے دن اور رات کے بعد زمانہ نے قسم کھائی ہے کہ دمشق کی مانند کوئی اور جگہ غلطی سے بھی پیدا نہ کروں گا۔ ہم نے رات دمشق میں ایسی حالت میں بسر کی کہ شب پر پردہ غفلت پڑا تھا۔ پھر وہ وقت ہو گیا جبمیں تاریکی شب اور نور صبح کی آمیزش اس طرح ہوئی ہے جیسے ادھیڑ آدمی کی ڈاڑھی میں سفید و سیاہ بال ہوتے ہیں۔

والطل في تلك الغصون كانه
در يصافحه النسيم فيسقط

شبنم کے قطرے درختوں کی شاخوں پر موتیوں کی طرح بکھرے ہوئے تھے، اور نسیم صبح کے جھونکے انسے مصافحہ کے لئے بڑھتے اور وہ زمین پر آرہے تھے۔

والطير يقرأ والغدير صحيفة
والريح تكتب والغمام ينقط

پرندے پڑھ رہے ہیں، پانی کی مصفا اور ہموار سطح تختہ کاغذ ہے، جس پر ہوا لہریں پیدا کر کے سطریں لکھتی ہے۔ اور بادل نقطے دیتے ہیں۔ +

"ابواب دمشق"

دمشق فی اوصافها جنۃ الخلد راضیہ
دمشق اپنے اوصاف میں باغ خلد ہے جو نہایت پسندیدہ ہے!
اما تری ابوابها قد جعلت ثمانیہ
کیا تو نہیں دیکھتا کہ اسکے دروازے آٹھ کر دیئے گئے ہیں!

دمشق کی مضبوط سنگین دیواروں کا تذکرہ اشیعیاہ نبی کی کتاب میں کیا گیا ہے۔ ممکن ہے کہ موجودہ دیواریں انہی پرانی یادگاریں ہوں؛ رومیوں اور عربیوں کے محاصرہ کے وقت یہ دیواریں موجود تھیں؛ معلوم ہوتا ہے کہ مختلف زمانوں میں ان دیواروں کی مرمت اور تعمیر کی گئی ہے۔ اس لئے قرین قیاس یہی ہے کہ پرانی دیواروں کا کچھ حصہ اور ان کے آثار ہی باقی رہ گئے ہیں؛ ورنہ موجودہ دیواریں رومی یا عربی زمانہ سے پہلے کی نہیں ہوسکتیں؛ بعض بعض جگہ دوہری دیواریں ہیں؛ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پرانی دیوار کے ساتھ ساتھ نئی دیوار تعمیر کی گئی ہے؛ زمانہ حال تک ان دیواروں کا موجود ہونا فی الحقیقت ایک حیرت انگیز امر ہے اور کچھ شک نہیں کہ یہ دیواریں بھی بلحاظ قدامت عجائبات دنیا میں شمار ہونی چاہئیں؛ دمشق کو "حصن الشام" اسی واسطے کہتے تھے کہ اسکی سنگین دیواریں ناقابل تسخیر تھیں؛ اور اس شہر کی فتح کے بعد شام میں کوئی ایسا شہر نہ تھا جو فاتح قوم کا مقابلہ کر سکتا؛ ان دیواروں نے دمشق کو ایک مضبوط قلعہ بنا دیا تھا؛ تمام شام میں ایسا کوئی قلعہ نما شہر نہ تھا؛ رومیوں کو اس دیوار پر بڑا ناز تھا اور ایک حد تک بجا تھا؛ عربیوں نے دو ماہ کامل محاصرہ میں بسر کئے؛ اگرچہ اسکی دیواروں پر برابر حملے کئے۔ مگر کچھ اثر نہ ہوا؛ اس وقت تک عربی منجنیق کا جو اس زمانہ میں قلعہ شکن آلہ تھا استعمال نہ سیکھے تھے؛ اور رومی دیواروں سے برابر اس کے ذریعہ پتھر برسا رہے تھے؛ اس لئے عربیوں کو اس جگہ ایسی مشکل پیش آئی جو کسی اور شہر کے محاصرہ میں نہیں آئی!

یہ دیوار بیضوی شکل میں شہر کے گرد کھچی ہوئی ہے؛ دمشق کے دروازوں کا تذکرہ جو اس دیوار میں نصب ہیں ہم بالاختصار کرتے ہیں؛ اور ضمناً ان مقامات کا ذکر بھی کرینگے جو اس دیوار اور دروازوں کے قریب اور ان سڑکوں کے کنارہ پر واقع ہیں جو ان دروازوں سے نکل کر دور بعض شہروں کی طرف جاتی ہیں۔

۲۔ باب الشرقی؛ یہ دروازہ شہر کے مشرق میں واقع ہے اور اسی لئے اس کا نام باب الشرقی ہے؛ یہ وہی مشہور دروازہ ہے جسکے اندر خالد بن ولید بزور شمشیر داخل ہوئے اس میں تین محرابدار دروازے ہیں۔ ایک مرکز میں اور دو ہر دو جانب ہیں؛ وسطی محراب ۲۰ فٹ بلند اور ۲۰ فٹ ۶ انچ چوڑی ہے؛ باقی دونوں نصف عرض وطول میں ہیں؛ اس وقت وسطی اور اسکی ملحقہ جنوبی محراب میں دیوار کھچی گئی ہے؛ اور صرف شمالی محراب کھلی ہے۔ رومیوں اور عربیوں کے زمانہ میں یہ تینوں محرابدار دروازے کھلے تھے؛ بنوامیہ کے زمانہ میں اس جگہ ایک مینار بنایا گیا تھا جو اس دروازہ کے گرد محیط تھا؛ مگر اب اسکے صرف آثار ہی ملتے ہیں؛ غالباً یہ مینار اس فتح کی یادگار تھا جو سب سے پہلے سلمانوں کو ملک شام میں حاصل ہوئی۔ شارع مستقیم اس دروازہ سے شروع ہو کر مغرب کی طرف باب الجابیہ تک چلی گئی ہے اس کا طول ایک میل ہے؛ یہ وہی سڑک ہے جسکا تذکرہ رسولوں کے اعمال میں کیا گیا ہے؛ اور غالباً خالد بن ولید جس وقت شہر میں بزور شمشیر داخل ہوئے اسی سڑک پر جا رہے تھے کہ ابو عبیدہ باب الجابیہ کی طرف سے آتے ہوئے یوحنا یا مریم کے گرجا کے سامنے ملاقی ہوئے۔ اگرچہ موجودہ زمانہ میں یہ سڑک بخط مستقیم واقع نہیں ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ رومی اور عربی دور دورہ میں یہ ایک کشادہ اور سیدھی سڑک تھی۔ اور مجوف ستونوں کے تین سلسلے جو اس سڑک کو تین حصوں میں تقسیم کرتے تھے۔ ایک دوسرے کے متوازی ایک میل تک چلے گئے تھے ان ستونوں کے آثار اب بھی ملتے ہیں؛ اس سڑک کے شمال میں عیسائیوں اور جنوب میں یہودیوں کے مکانات ہیں؛ اور غالباً عربی تسلط سے پیشتر یہی حالت تھی؛ رسولوں کے اعمال (باب ۹) کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ کے زمانہ میں اس جگہ یہودیوں کی آبادی تھی۔ مگر کچھ عرصہ بعد پولوس رسول کے وقت آنحضرت کے شاگردوں میں سے بعض بزرگوں نے اس جگہ رہائش اختیار کر لی تھی؛ اور یہ لوگ دراصل یہودی تھے؛ موجودہ زمانہ میں بھی یہی حالت ہے کہ دیوار کے ساتھ ساتھ اور شارع مستقیم کے جنوب میں باب الشرقی کے قریب یہودی آباد ہیں اور شمال کی طرف عیسائی رہتے ہیں؛

بنوامیہ کے زمانہ میں باب الشرقی کے باہر ایک "دار الصنعت" تھا۔ اس جگہ دمشق کی مشہور صنعتیں بالخصوص کاشی کا کام؛ اینٹوں اور مٹی کے برتنوں پر کیا جاتا تھا؛ کہتے ہیں کہ "قبۃ الصخرہ" مسجد عمرؓ کے ملمع کا کام اسی جگہ کیا جاتا تھا؛ دمشق کی بعض پرانی عمارتوں پر اس صنعت کی یادگار باقی ہے؛ مگر اب یہ صنعت اور اس کے ساتھ دار الصنعت معدوم ہو چکے ہیں؛ اور موخر الذکر ایک تودہ خاک ہے؛

باب الشرقی سے آگے جانب جنوب تھوڑے فاصلہ پر یہ دیوار ایک زاویہ بناتی ہوئی جنوب مغربی سمت چلی جاتی ہے، اس زاویہ پر ایک مینار تھا اور اسکے دروازے پر پتھر کے دو شیر ہر دو جانب کھڑے تھے۔ اب بھی اس پرانے مینار کے سلامی دار پتھر نظر آتے ہیں، اس زاویہ سے آگے جنوب مغربی جانب دیوار سیدھی چلی گئی ہے۔ اس میں مربع شکل کے مینار تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر ملتے ہیں جہاں تک کہ نظر "باب کیسان" تک پہونچ جاتی ہے، یہ وہی مشہور دروازہ ہے جسے عیسائی "باب پولس" کہتے ہیں، روایت ہے کہ مسیحؑ کے شاگردوں نے پولوس رسول کو چپکے چپکے بوقت شب اس دروازہ سے دو تین گز کے فاصلہ پر دیوار پر سے ایک ٹوکرہ میں نیچے اتار دیا تھا (۲ کارنتھین باب ۱۱ آیت ۳۳) اگرچہ دربان اس دروازہ پر موجود تھے اور انہیں خیال تھا کہ کہیں پولوس بچکر نہ نکل جائے، مگر انکی آنکھوں میں خاک دھول ڈال کر حضرت پولوس نکل گئے۔ اور اسپر یہ جرأت کی۔ کہ دیوار کا وہ حصہ اترنے کے لئے منتخب کیا جسکے قریب ہی دربان موجود تھے۔ اسے ایک معجزہ سمجھنا چاہئے، جس کا اظہار پولوس رسول فخر یہ کہا کرتے تھے، ورنہ اسی دیوار کے ایسے موقع بھی تھے جہاں سے وہ بآسانی اتر سکتے تھے، معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت دیوار کے ساتھ کسی نیک دل عیسائی کا مکان تھا، جسکا دریچہ دیوار پر کھلتا تھا، اسی دریچہ سے آپ کو نیچے اتار دیا گیا، مگر یہودیوں کو کسی طرح اس کا پتہ لگ گیا، حضرت پولوس تو بچ کر نکل گئے مگر "جارج" جسنے آپ کو بچایا تھا، پکڑا گیا، اس دروازہ کے باہر ایک قبر ہے عیسائی کہتے ہیں کہ یہ اسی "جارج" کا مدفن ہے جو قتل کیا گیا تھا، اسی جگہ عیسائیوں کا گورستان ہے جسمیں بے شمار عیسائیوں کی قبریں ہیں،

"باب کیسان" سے آگے دیوار خم کھاتی ہوئی جاتی ہے، اس جگہ پرانی اور موجودہ دونوں دیواریں ایک دوسرے کے متوازی چلی گئی ہیں، پرانی خندق کے آثار جو اس دیوار کے گرد قدیم الایام سے موجود تھی اب بھی پائے جاتے ہیں،

اس دیوار کے بالمقابل شہر سے باہر دور تک آبادی چلی گئی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شہر کے باہر ایک اور شہر آباد ہے، دو میل طول اور ایک میل عرض میں ہے، اس میں شہر کی طرح آبادی کی تقسیم بلحاظ مذہب ہے، اس جگہ کا اکثر حصہ "میدان" نے گھیرا ہوا ہے، بنوامیہ کے زمانہ میں شہر کی آبادی روز بروز ترقی کرتی جاتی تھی، اس لئے شہر میں کچھ عرصہ بعد گنجائش نہ رہی۔ شہر کے باہر قصر اور محلے بن گئے، اور دیوار شہر کو گھروں کی دیواروں میں سے لیا، اس جگہ بھی دیوار نظر نہیں آتی، بعض بعض مقامات پر اس کا کچھ حصہ

دکھائی دیتا ہے، اس آبادی سے گذر کر دیوار شہر پھر اسی طرح چلی جاتی ہے اور کچھ فاصلہ پر "باب الصغیر" نظر آتا ہے"

"باب الصغیر" پر دونوں پرانی دیواریں موجود ہیں، اور اس لیے اس جگہ دو دروازے ایک دوسرے کے اندر واقع ہیں، باب الصغیر کا دوسرا نام "باب الشاغور" ہے، اسکے باہر ایک محلہ تھا جسے "الشاغور" کہتے تھے،

یاقوت لکھتا ہے کہ دمشق میں میری ملاقات شہاب القشیانی سے ہوئی، نحوی اور شاعر تھا، اور اچھے شعر کہتا تھا، اسی محلہ میں رہتا تھا۔ اسکی وفات کا زمانہ قریب تھا، غوطہ دمشق کے وصف میں اس کے چند شعر لکھے گئے ہیں، باب الصغیر کے باہر اور بالمقابل ایک اور قریہ تھا جسے "قلینۃ" کہتے تھے۔ اسی دروازہ سے ایک سڑک اس مشہور قبرستان کو گئی ہے جسے قبرستان باب الصغیر کہتے ہیں، یہ قبرستان باب الجابیۃ تک پھیلا ہوا ہے،

"باب الجابیۃ" شہر کا جنوب مغربی کونہ ہے، یہ وہی مشہور دروازہ ہے جسکے سامنے ابو عبیدہ بن الجراح تھے، اور بزور شمشیر صلح داخل ہوئے تھے، اس دروازہ کو جابیۃ الجولان بھی کہتے تھے۔ حسان بن ثابت کہتے ہیں:—

منعنا رسول اللہ اذ حلّ وسطنا	علی انفِ راض من معدّ وراغم
منعناہ لما حل بین بیوتنا	باسیافنا من کل باغ وظالم
بیت حریدٍ عزّہ وثراؤہ	بجابیۃ الجولان بین الاعاجم
ھل المجد الا السؤدد والعود والندیٰ	وجاہ الملوک واحتمال العظائم

جو آس بن القعطل کہتا ہے:—

اعبد للملیک ما شکرت بلاءنا	فکل فی رخاء الامن ما انت آکل
بجابیۃ الجولان لولا ابن بحدل	ھلکت ولم ینطق لقومک قائل
وکنت اذا اشرفت فی راس رامۃ	تضاولت ان الخائف المتضائل
فلما علوت الشام فی راس باذخ	من العز لا یسطیعہ المتناول
نفحت لنا سجل العداوۃ معرضا	کانک عما یحدث اللہ غافل

فلو طاوعونی یوم بطنان اسلمت | لقیس فروج منکم و مقاتل

"باب الجابیہ" میں باب الشرقی کی طرح تین محرابدار دروازے ہیں، لیکن ابتدا عہد عباسیہ میں شمالی اور وسطی محراب بند کی گئی تھی، اور جنوبی دروازہ کھلا رہا معلوم ہوتا ہے بنو امیہ کے عہد اور زمانہ مابعد میں اسکی مرمت ہوتی رہی ہے۔ اب بھی اسپر ایک کتبہ ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نور الدین نے اسے مرمت کروایا"۔

اس دروازہ کے باہر ایک محلہ تھا جسے "تُوثہ" کہتے تھے؛ یاقوت لکھتا ہے کہ یہ ایک بہت بڑا محلہ تھا۔ اور دوسری صدی ہجری میں اس جگہ محدثین کی ایک جماعت رہتی تھی۔ اسی دروازہ کے باہر ایک اور محلہ تھا جسے "قصر حجاج" کہتے تھے؛ ابتدا میں اس جگہ ایک قصر حجاج بن عبد الملک بن مروان نے تعمیر کروایا تھا؛ رفتہ رفتہ اسکے گرد آبادی بڑھتی گئی۔ اور محلہ کا نام "قصر حجاج" مشہور ہو گیا۔ جابیہ سے ایک سڑک سیدھی مرج صفر کو جاتی تھی جسے شارع جابیہ کہتے تھے؛ اس کے قریب ہی ایک تل ہے جسکا نام تل الجابیہ ہے؛ سنہ ھ میں فاروق اعظمؓ اس جگہ تشریف لائے اور ایک تقریر فرمائی، جو آپ کا مشہور خطبہ ہے؛

باب الجابیہ کے باہر ایک عالیشان قصر تھا؛ جسے قصر عاتکہ اور اسکی متعلقہ اراضی کو "ارض عاتکہ" کہتے تھے؛ عاتکہ یزید بن معاویہ بن ابو سفیان کی بیٹی اور خلیفہ عبد الملک بن مروان کی زوجہ تھی؛ اسی قصر میں عبد الملک نے وفات پائی؛ عاتکہ کے رشتہ دار بارہ خلفا تھے؛ اور سب محرم تھے؛ اسکا باپ یزید اور باپ کے رشتہ دار امیر معاویہ؛ اور معاویہ بن یزید؛ اور خاوند کے رشتہ دار مروان بن الحکم؛ اور یزید بن عبد الملک اور الولید؛ سلیمان؛ ہشام؛ اور الولید بن یزید؛ اور یزید بن الولید بن عبد الملک اور ابراہیم بن الولید تھے؛ عاتکہ اپنے پوتے الولید بن یزید کے قتل تک زندہ رہی؛ عبد اللہ بن قیس المعروف بالرقیات نے عاتکہ کے عشق میں چند شعر لکھے؛

اعاتک یا بنت الخلائف عاتکا	انیلی فتی امسی بحبک ھالکا
تبعدت واتراب لھا فقتلنی	کذلک یقتلن الرجال کذلکا
یقلبن الحاظا لھن فواترا	ویحملن ما فوق النعال سالکا
اذا غفلت عنا العیون التی نری	سلکن بھا حیث انتھن المسالکا

وقلن لنا لونستطیع لزارکم　　طبیبان مناعالمان بدا لکا
فقل من طبیب بالعراق محله　　یداوی سقیماها لکا متها لکا

امیر معاویہ کے عہد میں عبدالرحمن بن حسان بن ثابت نے اسکی ہمشیرہ "رملہ" کے عشق میں چند شعر کہے تو سخت برافروختہ ہوا، باپ نے نصیحت کی کہ ایک شاعر کی بڑ کو خیال میں نہ لانا چاہیے ورنہ لوگ یہی سمجھیں گے کہ جو کچھ عبدالرحمن نے کہا ہے سچ ہے، اس وقت یزید خود سیاہ و سفید کا مالک تھا، عبداللہ بن قیس کے اشعار سن کر چکا ہوتا، عاتکہ پرہیزگار خدا ترس عورت تھی، مصعب بن زبیر کا سر دمشق میں کوفہ سے بغرض تشہیر آیا، لوگوں نے اسکی تشہیر کا قصد کیا، مگر عاتکہ نے روکا اور اسکو لاکر غسل دیا اور دفن کر دیا۔

"باب الجابیہ" سے آگے دیوار خم کھاتی ہوئی شمال کیطرف جاتی ہے اور باب السرایا پر ختم ہوتی ہے، اس دروازہ پر دونوں دیواریں نظر آتی ہیں اور اس میں دو محرابدار دروازہ ہیں، اموی قلعہ سر دروازہ اور دیوار سے ملحق ہے جو شہر کا شمال مغربی زاویہ ہے۔ اسکی قلعہ کی مغربی دیوار شہر کی دیوار ہے، قلعہ کے شمال مشرقی کونہ پر باب الفرج واقع ہے، جو دمشق کا نیک فال دروازہ مشہور ہے عبدالغنی نابلسی کہتا ہے؛

قل ما تشاء عن جلق　　جو دل میں آئے دمشق کی بابت کہو
وانسب لها ولا حرج　　اور جو کچھ اسکی طرف منسوب کرنا چاہو کرو،
فالخیر والیمن بها　　کیونکہ خیر و برکت تو اسی جگہ ہے
وبابها باب الفرج　　اور اسکا دروازہ باب الفرج ہے؛

باب الفرج کے آگے باب الفرادیس ہے، اس جگہ میں جس دیوار میں بڑے بڑے پتھر نصب کیے گئے ہیں ایک محرابدار دروازہ ہے، اور اس سے بیس گز کے فاصلہ پر بالمقابل بیرونی دیوار میں ایک اور دروازہ ہے اور اس کے اندر گیارہ گز کے فاصلہ پر ایک اور مربع شکل کا دروازہ ہے باب الفرادیس کا دوسرا نام "باب العمارۃ" ہے، نہر بردی باب الفرج کی دیواروں کے ساتھ ساتھ اس جگہ تک آتی ہے، اس کے نواح میں باغات کی کثرت تھی، اس دروازہ کے بالمقابل "الفرادیس" ایک قریہ ہے، ابن قیس الرقیات کہتا ہے:-

اقترت منهم الفرادیس وللغو.......طرخات القری وذات الظلال

اسکے سامنے ایک دیر تھا جسے "دیر صلیبا" کہتے تھے، محاصرہ دمشق کے ایام میں اس جگہ خالد بن ولید کا خیمہ ایستادہ تھا، اِس لئے دیر خالد کے نام سے مشہور ہوگیا، ابوالفتح محمد بن علی المعروف بابی اللقا کہتا ہے:-

جنة لقبت بدیر صلیبا ۔ مبدعاء حسنه کما لا وطیبا

جنة المقام یوما فظلنا ۔ فیه شهرا وکان امرا عجیبا

شجر محدق به ومیاه ۔ جاریات الروض بینه زروبا

من بدیع الالوان یضحو به الشا ۔ کل مما یری لدیه طروبا

کم رأینا بدرا به فوق غصن ۔ مائس قد علا بشکل کثیبا

وشربنا به الحیاة مداما ۔ تطلع الشمس فی الکوس غروبا

فکان الظلام فیها نهار ۔ لسناها تستر مننا القلوبا

لست انسی ما مر فیه ولا اف ۔ مل مدحی الا بدیر صلیبا

اس دروازہ سے ایک سڑک جسے "بین السورین" کہتے ہیں "باب السلام" تک چلی گئی ہے۔ چونکہ دمشق کے محاصرہ میں اس جگہ کوئی لڑائی نہیں ہوئی، اس لئے عربی اسے باب السلام کہتے تھے۔ اس دروازہ کے سامنے قریب ہی نہر بردی زور سے بہتی ہوئی درختوں کے جھنڈ اور بندوں اور پشتوں سے گذرتی ہے، دمشق کے شمالی مضافات کا اس دروازہ پر خاتمہ ہو جاتا ہے، اور اس دروازہ سے پرانی دیوار باب توما تک چلی گئی ہے، اس کے ساتھ ساتھ چند گز کے فاصلہ پر نہر باغات کے درمیان بہتی ہے یہ دمشق کی ایک پرفضا سیرگاہ ہے، موسم بہار میں اس جگہ ہر وقت رونق رہتی ہے۔

باب توما دمشق کے شمال میں وہ مشہور دروازہ ہے جہاں ایام محاصرہ میں رومیوں اور عربوں کے درمیان لڑائی نہایت زور شور پر ایک عرصہ تک جاری رہی، اس وقت دمشق میں ایک شخص تھومس نامی رہتا تھا جو قیصر کا داماد یا قیصر کے کسی رشتہ دار کا داماد تھا، یہ نہایت بہادر سپاہی تھا، دمشق کو ایک عرصہ تک بچاتا رہا، عربی اسے "توما" کہتے تھے، اس لئے اس دروازہ کا نام بھی توما مشہور ہوگیا یہ دروازہ ایام محاصرہ میں شکستہ و خستہ ہوگیا تھا، بنو امیہ نے اسے از سر نو تعمیر کرایا، اور اس کے بعد

زنگی نے محمد بن قلاوون کے عہد میں ۷۳۴ھ مرمت کروایا، جیساکہ اس کتبے کی عبارت سے واضح ہوتا ہے جو اس دروازہ کی پیشانی پر اب بھی موجود ہے۔ محاصرہ کے وقت یزید بن ابی سفیان اس دروازہ کے سامنے پڑا تھا۔ عبدالرحمٰن بن ابی سرح اسکے رفقا میں تھا۔ کہتا ہے :-

الا ابلغ ابا سفیان عنا باننا　　　علی خیر حال کان جیش یکونہا

وانا علی باب لتوماء نرہمی　　　وقد حان باب لقوما جیونہا

اس دروازہ سے ایک سڑک قریباً چالیس گز کے فاصلہ پر نہر بردی کو قطع کرتی ہوئی حلب اور تدمر کو جاتی ہے۔ اس جگہ ایک پُل ہے جسے "قنطرۃ سنان" کہتے ہیں۔ سنان بن یحییٰ بن الادرکون نے تعمیر کروایا تھا۔ ادرکون، دمشق کا باشندہ اور قسیس تھا۔ فتح دمشق کے وقت خالد بن ولید کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔

باب توما کا ایک برج "برج الدراجیہ" کے نام سے مشہور ہے۔ عبداللہ بن دراج مولی معاویہ بن ابی سفیان نے تعمیر کروایا تھا۔ عبداللہ امیر معاویہ کا سکریٹری یعنی کاتب رسائل تھا۔

اس دروازہ کے باہر ایک قریہ تھا جسے "الصفوانیہ" کہتے تھے۔ اس جگہ اشراف بنو امیہ کے قصر تھے۔ باب توما سے آگے یہ دیوار کچھ فاصلہ پر شمالی دور ختم کرتی ہے۔ اور جنوب کی طرف جاتی ہوئی باب الشرقی سے ملحق ہو جاتی ہے۔

باب الصغیر اور باب الجابیہ کے درمیان ایک بڑا قبرستان ہے جہاں مشاہیر اسلام مدفون ہیں اور علاوہ ازیں دمشق کے مختلف مقامات پر بھی انکی قبریں زیارت گاہ عوام ہیں۔ دمشق کی دیواروں کے باہر اصحاب رسول اللہ، خلفا بنو امیہ، اولیاء اللہ، علما، فضلا، وحکما۔ محدثین و مورخین، غرض ہر ایک طبقے کے نامور اشخاص سوتے ہیں۔ نہ صرف اہل دمشق ہی بلکہ دور دور ممالک کے باشندے جنہیں دمشق کی شہرت اس جگہ کھینچ لائی، اس جگہ کی خاک میں پڑے ہیں۔ ابن عباسؓ کا قول ہے کہ "ان ارواح المومنین بالجابیۃ من ارض الشام وارواح الکفار ببرھوت من حضرموت"۔ اللہ اکبر! یہ کیسا عبرت کا مقام ہے یہ کیسے لوگ تھے جن کے پُرزور ہاتھوں نے اسلامی سلطنت کی بنیاد رکھی، جن کے مفتوحہ ممالک اب تک مسلمانوں کے قبضہ میں ہیں، جن کے علم و ہنر کے غیر اقوام خوشہ چین ہیں، جن کے زہد و تقویٰ کی مثال کسی اور جگہ نہیں ملتی، یہ مشاہیر اسلام جو اہل قلم اور اہل سیف تھے، اور ہر ایک فن میں یگانہ روزگار تھے۔ دنیا سے

اسی وقت کوچ کر گئے جب مسلمان انتہائے عروج پر پہونچ چکے تھے، لیکن اب مسلمانوں کی موجودہ حالت ناگفتہ بہ ہے، انا للہ وانا الیہ راجعون،

یہ تو گذشتہ اور موجودہ حالت کا اور سلف اور خلف کا مقابلہ ہے، جس پر ہر ایک دردمند دل خون کے آنسو روتا ہے، لیکن فی الحقیقت دمشق کا قبرستان وہ جگہ ہے جہاں کھڑے ہوکر قوم کا مرثیہ پڑھا جانے، مسلمانان درگور کے معنی اسی جگہ واضح ہوتے ہیں، اس قبرستان کی اکثر قبریں زیارتگاہ ہیں اور ہر ایک سیاح نے انکا تذکرہ کیا ہے، ان میں سے مفصلہ ذیل قبور کا ذکر بالاختصار کیا جاتا ہے

قبر حضرت بلال ابن رباح، آپ کی کنیت ابوعبداللہ یا ابوعمرو ہے، بنی جمح کے غلام تھے جس وقت رسول خدا نے اظہار نبوت کیا، تو حضرت بلال نے بھی تصدیق کی، کفار کا زور تھا۔ اور آپ ایک غلام تھے، ابوجہل آپ کو سخت دھوپ میں منہ کے بل لٹاتا اور چکی کا پاٹ آپکے اوپر رکھتا، اور طرح طرح کی اذیتیں پہنچاتا اور کہتا کہ محمد کو خدا کا انکار کرو مگر بلال اس حالت میں بھی احد، احد کہتے، آخر صدیق اکبر رضی نے خرید کر آزاد کر دیا یہ محبوب خدا کے عاشق تھے، اسی بزرگ صحابی نے سب سے پہلے اذان دی، اور یہ خدمت ہمیشہ آپکے سپرد رہی، صدیق اکبر کی خلافت میں بھی موذن رہے، اور آپ کی وفات کے بعد حضرت عمر رض سے اجازت لیکر جہاد کے لئے شام میں آئے، فتح بیت المقدس کے وقت حضرت عمر رض نے آپ کو اذان دینے کے لئے کہا، جس وقت بلال رض نے اللہ اکبر۔ اللہ اکبر کی صدا بلند کی، تمام حاضرین بیتاب ہوگئے اور بے اختیار رونے لگے، رسول اللہ کی صحبت کا نقشہ سب کی آنکھوں میں پھر گیا، جس وقت حضرت عمر دوبارہ شام میں تشریف لائے، حضرت بلال نے بمقام جابیہ جس کا تذکرہ غوطہ دمشق کے قریوں میں ہوچکا ہے اقامت اختیار کی، ایک شب رسول اللہ کو جن کا خیال بلال رض کو ہر وقت لگا رہتا تھا خواب میں دیکھا کہ فرماتے ہیں "بلال کیا وہ وقت نہیں آیا کہ تم ہماری زیارت کے لئے آؤ" بیدار ہوئے تو دل کے اضطراب نے چین سے بیٹھنے نہ دیا، سیدھا مدینہ منورہ کا رستہ لیا، اور روضہ اقدس پر منہ رکھ کر رونے لگے، نماز کا وقت آیا تو اذان دی، ایک عرصہ بعد بلال کی آواز مدینہ میں سنائی دی، تمام شہر میں کہرام مچگیا، اور اصحاب رسول اللہ بیتاب ہو کر گھروں سے نکل آئے۔

سنہ ۲۰ ھمیں آپ کی وفات دمشق میں ہوئی، اور باب الصغیر میں مدفون ہوئے، آپنے کوئی اولاد نہیں چھوڑی۔

قبر حضرت اویس قرنیؒ" اگرچہ رسول اللہ کے صحاب میں اس لئے شمار نہیں ہو سکتے کہ آنحضرتؐ کی صحبت سے مستفیض نہیں ہوئے۔ لیکن رسول خدا کے زمانہ میں تھے، اور آپ کے غائبانہ عاشق تھے، حضرت عمرؓ انکی بہت عزت کیا کرتے تھے۔ آپ کی بزرگی اور آپکے نام سے دنیائے اسلام واقف ہے۔ سنائی کہتا ہے:۔

روزہا باید کہ تا یک مشت پشم از پشت میش	زاہدے را خرقہ گردد یا حمارے را رسن
ہفتہ ہا باید کہ تا یک پنبہ دانہ ز آب و گل	شاہدے را حلہ گردد یا شہیدے را کفن
ماہ ہا باید کہ تا یک نطفہ از پشت پدر	صفدرے خیزد یا مید اں یا عروسے انجمن
سالہا باید کہ تا یک سنگ قابل ز آفتاب	لعل گردد در بدخشاں یا عقیق اندر یمن
قرن ہا باید کہ گردون گرداں یک شبے	عاشقے را وصل بخشد یا غریبے یا وطن
دورہا باید کہ تا یک مرد صاحب دل شود	بایزید اندر خراساں یا اویس اندر قرن

ان کی قبر کے مقام میں اختلاف ہے یاقوت لکھتا ہے کہ باب الجابیہ میں ہے، اور بعض اسکندریہ اور بعض دیار بکر میں بتاتے ہیں، مشہور یہ ہے کہ "رقہ" میں ہے، اور بعض گمان کرتے ہیں کہ حضرت علیؓ کے ہمراہ جنگ صفین میں تھے اور اسی جگہ کام آئے۔

قبر حضرت "فضالہ ابن عبید" انصاری، اوسی، عمری ہیں۔ اور کنیت ابو محمد ہے، غزوہ احد اور اس کے بعد تمام لڑائیوں میں رسول اللہ کے ہمراہ تھے، بیعتہ الرضوان میں بھی شریک تھے، ایام خلافت میں شام کی طرف آئے، فتح مصر میں بھی حصہ لیا۔ مگر اقامت دمشق میں اختیار کی، امیر معاویہ نے جب صفین پر فوج کشی کی تو فضالہ کو دمشق کا قاضی مقرر کرکے کہا کہ اس میں تمھارا کچھ فائدہ نہیں، لیکن تمھارے ذریعہ سے میں دوزخ سے بچنا چاہتا ہوں"۔ اسکے بعد امیر نے انہیں سپہ سالار بناکر رومیوں کے مقابلہ میں بھیجا، بحری لڑائیوں میں کارہائے نمایاں ان سے ظہور میں آئے، ۵۳ھ اور ۶۹ھ کے درمیان دمشق میں وفات پائی، آپ کا جنازہ حضرت معاویہ نے خود اٹھایا اور اپنے بیٹے عبداللہ کو کہا کہ آؤ تم بھی اٹھاؤ، اب ان کے بعد کسی ایسے شخص کا جنازہ تم نہ اٹھاؤ گے"۔ باب الصغیر میں آپ کی قبر ہے"۔

قبر حضرت "ابی بن کعبؓ"۔ انصاری، خزرجی، معاوی ہیں۔ بیعت عقبہ اور جنگ بدر میں شریک تھے، حضرت عمرؓ فرمایا کرتے تھے کہ ابی تمام مسلمانوں کے سردار ہیں، عبادہ بن صامتؓ۔ ابن عباسؓ،

عبداللہ بن حنظلہ ان سے حدیث روایت کرتے ہیں، مشہور روایت ہے کہ قرأت میں ان سے بڑھ کر کوئی ماہر نہ تھا۔ آپ رسول اللہ کے کاتب بھی تھے۔ ۳۲ھ میں بعہد خلافت حضرت عثمان وفات پائی اور بقول یاقوت شہر کی جانب مشرق آپ کا مزار ہے۔ اسی جگہ ایک اور صحابی کی قبر ہے جو حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی طرف منسوب کی جاتی ہے، مگر یاقوت کہتا ہے کہ یہ لوگوں کا زعم ہے کہ یہ قبور ان اصحابؓ کی ہیں، صحیح یہ ہے کہ وہ مدینہ میں مدفون ہوئے۔

قبر حضرت "شرحبیل بن حسنہ" حسنہ آپ کی والدہ کا نام ہے۔ آپ کے والد کا نام عبداللہ تھا فتوحات شام میں بہت حصہ لیا، ۱۸ھ میں طاعون عمواس میں آپ اور ابوعبیدہؓ ایک ہی دن فوت ہوئے۔ باب توما کے باہر آپ کا مرقد ہے۔ بعض روایتوں کے مطابق آپ کا مزار غور میں ہے۔ آپ کی اور حضرت ابوعبیدہ کی قبر باب الصغیر میں ہے۔

قبر حضرت "ضرار بن الازور" اس بہادر سپاہی اور صحابی نے شام میں نہایت عمدہ خدمات کیں اور فتوحات میں بہت کچھ حصہ لیا۔ اس وقت عموماً سپاہی زرہ بکتر لگا کر لڑا کرتے تھے، مگر ضرار کو انکی کچھ ضرورت نہ تھی، انکی شہسواری، بہادری اور شاعری مشہور ہے۔ جس وقت رسول اللہ کے پاس حاضر ہوئے تو کہا یا رسول اللہ میرے پاس ایک ہزار اونٹ ہیں، ان کو چھوڑ کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں، اور میں نے کچھ شعر کہے ہیں، آنحضرتؐ نے پڑھنے کی اجازت دی۔ کہا

خلعت القداح وعزف القیان   میں نے بزم و رزم کے سب سامان چھوڑ دیئے

والخمر اشربہا والثمالا   میں شراب اور دودھ پیا کرتا تھا۔

وکری المجبر فی غمرۃ   میری تمام قوتیں اور کوشش مسلمانوں سے جنگ کرنے

وجہدی علی المسلمین القتالا   میں صرف ہوتی تھی۔

فیا رب لا اغبنن صفقتی   پس اے میرے پروردگار میری تجارت کو خسارہ میں نہ رکھ۔

فقد بعت اہلی ومالی بدالا   میں نے اب اسکی تلافی میں اپنے عزیزوں اور مال کو چھوڑ دیا ہے۔

رسول اللہ نے فرمایا کہ تمہاری تجارت خسارہ میں نہ رہے گی۔ باب الشرقی کے باہر آپ کی قبر ہے اس کے قریب آپ کی ہمشیرہ "خولہ" کا مزار ہے۔

مذکورہ بالا قبور کے علاوہ مقبرہ ابوالدرداء صحابی خزرجی انصاری کا ہے جو فاروق اعظم کے عہد

میں دمشق کے قاضی تھے، اور حضرت عثمانؓ کے عہد میں فوت ہوکر باب الصغیر میں مدفون ہوئے، اس کے قریب قبر ام الدرداء کی ہے، اور اسی جگہ سہل بن حنظلہ، و واثلہ بن الاسقع، اور اوس بن اوس اور کعب الاحبار، اور علی بن عبداللہ بن عباس، اور سلمان بن عبداللہ بن عباس کی قبریں ہیں، ایک گنبد میں آنحضرتؐ کی تین حرم اور رفاطمہ زہراؓ کی کنیز فضہ کی تربت ہے، ایک اور قبر محمد بن عمر بن علی بن ابی طالب کی اسی جگہ ہے۔

ان کے علاوہ[۳۲] بیشمار صحابہ اور تابعین کی قبریں ہیں، مگر ان کا پتہ موجودہ زمانہ میں ملنا مشکل ہے کیونکہ دولت بنی عباس کے آغاز میں ان قبروں پر قلبہ رانی کی گئی اور زراعت کے لئے زمین صفا کی گئی۔

حاشیہ نمبر ۳۲ - اگرچہ یاقوت دیگر مورخین کے حوالہ سے بیشمار بزرگان دین اور مشاہیر اسلام کی قبور کا پتہ باب الصغیر کے قبرستان اور دمشق کے قریوں میں بتاتا ہے، مگر ہمنے عمداً انکا ذکر نہیں کیا۔ اور یہ اس لئے کہ ہم اپنے موضوع سے دور نہ جائیں۔ مدفنان کے تذکرہ کے لئے ایک علیحدہ ضخیم کتاب کی ضرورت ہے، یاقوت اور دیگر مورخین کی تحریروں سے جو ہمارے مطالعہ میں رہی ہیں اور جن کا حوالہ دیا گیا ہے واضح ہوتا ہے کہ دمشق کی آبادی اس کے زمانہ اقتدار میں موجودہ مشہور دارالسلطنتوں سے کسی طرح کم نہ تھی۔ ابن تیمیہ ابن بطوطہ کا ہمعصر تھا اسکے جنازہ کے ہمراہ پچاس ہزار آدمیوں کا ہجوم تھا، اس گئے گذرے زمانہ میں آبادی کا یہ حال تھا، گذشتہ زمانہ میں قیاس ہوسکتا ہے کہ کیا کیفیت ہوگی، اس آبادی کا ایک حصہ ہر ایک زمانہ میں وہ اہل کمال آدمی تھے جو دمشق میں مدفون ہیں اور جن کا تذکرہ ابن عساکر نے اسی جلدوں میں کیا ہے، ابو نصر محمد بن محمد فارابی مشہور ومعروف حکیم و فیلسوف شخص ہے۔

فلسفہ میں اسکی تصانیف ہیں، دمشق میں ۳۳۹ھ میں انتقال کیا۔ یوحنا بن جیلان کا شاگرد تھا جسکا انتقال مقتدر کے زمانہ میں اس سے پیشتر ہو چکا تھا، یاقوت ایک شخص علی بن ابی القاسم محمد ابو الحسن التمیمی المغربی القسطینی کا ذکر کرتا ہے کہ نصر بن ابراہیم المقدسی سے دمشق میں صحیح بخاری کا درس لیا، عراق میں گیا اور پھر دمشق میں مستقل اقامت اختیار کی، رئیس دمشق ابو داؤد المفرج نے اسکی قدر ومنزلت کی، یہ شخص کیمیا میں یگانہ روزگار تھا، چاندی کیمیائی عمل سے بنایا کرتا، اور اسکی دو کتابیں میری نظر سے بھی گذری ہیں جن کے نام کتاب تنزیہ اللہ فی الاصول سماہ، اور کشف فضائح المشبۃ الحشویہ، ہیں، بماہ رمضان ۵۱۹ھ میں دمشق میں انتقال کیا۔

باب الفرادیس میں مشہد حسین بن علیؑ اور شہر کے باہر ایک سبز گنبد کے نیچے قبر محمد بن عبد اللہ بن حسین بن اسمٰعیل بن جعفر صادق ہے؛

"عربی وضع عمارت"

ہر ایک ہستی عدم کا مقابلہ کرتی ہے؛ اور ہر ایک جاندار فطرتاً سب سے مقدم "حفاظت" کی ضرورت محسوس کرتا ہے؛ یوں تو قدرت نے اسے سب کچھ دے رکھا ہے۔ مگر وہ ان قدرتی ذرائع سے مختلف اسباب حفاظت مہیا کرتا ہے؛ یہ اسکی صنعت ہے؛ طبقہ حیوانات بالطبع حفاظت کا تقاضا کرتا ہے۔ درخت کی شاخوں پہاڑ کی غاروں؛ زمین کے سوراخوں میں ہر ایک جاندار نے گھر بنا رکھا ہے۔ حضرت انسان جو خلیفۃ اللہ فی الارض ہے اس اعلٰے طبقہ میں سب سے ممتاز ہے۔ اس نے صدہا سال میں تمدن کے مختلف مرحلے طے کئے؛ پہاڑوں میں رہا؛ جنگلوں میں خانہ بدوش تھا؛ جھونپڑیوں میں رہائش اختیار کی؛ اور آخر تمدن کے انتہا یعنی شہریت پر پہنچا۔ بتدریج حفاظت جان و مال کا فکر کم ہوتا گیا؛ مگر رفتہ رفتہ اسکی نسبت سے "نیچر" اور اس میں بعد بڑھتا گیا؛

: انسان مدنی الطبع ہے؛ اسکی متفقہ طاقت و علم کا اظہار؛ تہذیب و شائستگی اور تمدن کی ترقی صرف شہر میں ہو سکتی ہے؛ "شہریت" اس سے صدہا سال کی کوششوں کے بعد حاصل کی؛ اگرچہ وہ ان فوائد سے محروم ہو گیا جو "نیچر" کے ساتھ بالمشافہ گفتگو کے ذریعہ حاصل ہو سکتے ہیں؛ کیونکہ اس میں شک نہیں کہ شہر میں صنعت اور دیہات اور تمدن کے ابتدائی مراحل میں "قدرت" اپنا کام کرتی ہے؛ لیکن

. ابو البیان بن محفوظ القرشی طائفہ بیانیہ کے بانی اور ان کے ہمعصر شیخ ارسلان جنکا تذکرہ ابن بطوطہ بھی کرتا ہے نامور فاضل اور پرہیزگار بزرگ تھے؛ ابن قیم اور ابن تیمیہ کے نام سے ہر ایک شخص واقف ہے زین الدین ابن رجب؛ فخر الحفاظ کبیر ابو القاسم ابن عساکر؛ بدر الدین المعروف ابن مالک؛ حافظ ذہبی شمس الدین؛ تقی الدین ابن صلاح؛ یوسف بن عبد الرحمٰن المعروف بحافظ مزی؛ شیخ اکبر محی الدین ابن عربی؛ علامہ تاج الدین السبکی؛ قاضی القضاۃ احمد بن محمد ابن خلکان؛ ابراہیم بن احمد موصلی؛ یہ تمام مشاہیر اسلام محدث؛ فقیہہ؛ مفسر؛ مؤرخ؛ نحوی اور صاحب تصانیف گذرے ہیں جن کی قبریں دمشق میں زیارتگاہ ہیں؛ +

اِس نقص کو رفع کرنے کے لیے یہ تو نہیں ہو سکتا کہ انسان ترقی کے چند زینوں سے نیچے اُتر آئے اور اس طرح تنزل کرتا ہوا ابتدائی حالت کی طرف رجوع کرے، یہ نہیں ہو سکتا کہ انسان موجودہ حالت میں جنگلوں اور پہاڑوں میں اس غرض سے رہایش اختیار کرے کہ قدرتی منظروں میں جلوہ قدرت دیکھے جو کچھ اسکی صنعت نے کیا وہ یہ ہے کہ فن عمارت میں قدرت کا خاکہ اُڑایا۔ اور وہ بُعد جو شہریت کے باعث ہمیں اور نیچر میں پیدا ہو گیا تھا کم کر دیا اور کم کر رہا ہے، اِس لیے ایسی صنعت جسمیں جلوۂ قدرت نظر آئے اعلے پایہ کی عمارت ہے، اگر کسی عمارت میں یہ خوبی نہیں تو کچھ بھی نہیں،

فنِ عمارت کے اغراض پر بہت کچھ بحث ہو سکتی ہے، اور اسکی ابتدائی صورت اور ترقی کی تاریخ مفصل بیان ہو سکتی ہے جو ہمارا موضوع نہیں، اس میں کچھ شک نہیں کہ انسانوں میں ہی انسان قابل تقلید ہے اور اقتدا کی صلاحیت رکھتا ہے جسکی ذات میں الٰہی اوصاف نظر آئیں، اور انسانی صنعت کا وہی بہترین نمونہ ہے جس میں جلوہ قدرت دکھائی دے، اِس لئے مختلف اقسام عمارت کی خوبیوں کا موازنہ کرنے کے لئے ہمارے پاس صرف ایک ہی معیار ہے اور وہ "نیچر" ہے،

دنیا میں بے شمار قوموں کا عروج اور نزول ہوا، ان میں سے ہر ایک قوم نے اس فن کو ترقی دی، بعض قوموں کے نام صفحہ ہستی سے حرف غلط کی طرح مٹ گئے۔ اور ان کی عمارتوں کے آثار بھی نہیں ملتے، بعض قوموں کی یادگار دنیا میں اس وقت بھی عمارتیں موجود ہیں، اگرچہ عموماً کھنڈرات کی صورت میں ہیں، لیکن ان قوموں کی تواریخ، انکی ضروریات، انکے خصائل۔ ان کے مذاہب کو زبان حال سے بیان کرتی ہیں،

یہ غلط ہے کہ خاص خاص قومیں اس فن کی موجد مبتدع، اور مخترع ہیں، لیکن یہ صحیح ہے کہ خاص خاص قوموں نے اس فن میں کمال حاصل کیا، اور ترقی میں جس قدر حصہ لیا، وہ ان کی صنعت کا اختراع اور ایجاد ہو سکتا ہے، اور اس لئے انہیں عام عمارات میں خاص امتیاز حاصل ہے، مصری، یونانی، رومی، عربی، عمارتیں قابل تقلید نمونے ہیں، ان لوگوں کے مذاق اور ذہانت نے ان میں ایسی باتیں پیدا کیں جو زمانہ کی ترقی کا تواریخی ثبوت ہیں، یہ عمارتیں انسانی صنعت کے نمونے ہیں۔ ان میں ایسی باتیں پائی جاتی ہیں جو ایک دوسرے سے مغائرت اور تمیز پیدا کرتی ہیں، ان کی وضع ایک دوسرے سے نرالی ہے، لیکن آخر یہ عمارتیں ہیں اور دنیا میں ان سے پہلے بھی عمارتیں

تھیں۔ بہرحال مختلف وضع کی عمارتوں کی تقسیم میں مصری، یونانی، چینی، عربی عمارتوں کے تحت دیگر عمارتیں ہیں، آج دنیا میں جس قدر عمارتیں ہیں وہ انہی عمارتوں کے نمونہ پر تعمیر ہوئی ہیں۔

اہرام مصر" اور دیوار چین اب بھی موجود ہے اور یہ عمارتیں عجائبات دنیا میں شمار ہوتی ہیں، ہزاروں سال سے انقلاب زمانہ کا مقابلہ کرتی چلی آئی ہیں کیسی پختہ، کیسی مضبوط ہیں، ان کا طول، انکا عرض ان کا مصالح، انکی وضع، پر غور کرو، یہ لوگ کیسے ارادہ کے پکے اور مستقل مزاج تھے۔ ان کی ضرورتوں کا تقاضا، انکے دماغی قوا پر کیا اثر کر رہا تھا، زمانہ نے اس فن میں کیا کچھ ترقی کی تھی، اب ان کا مقابلہ موجودہ زمانہ کی عمارتوں سے کرو، اول الذکر کیسی بھدی عمارتیں ہیں، آخر الذکر قلب پر خاص خاص اثر پیدا کرتی ہیں، یہ کیفیتیں ہیں جن کا اظہار الفاظ میں مشکل ہے۔ یہ انسانی دماغ کی اختراع ہے، یہ ذہانت کا عکس ہے، عمارت کا طول و عرض، اسکی مضبوطی، اسکی تکمیل کوئی خوبی نہیں، اس میں انسانی ذہنی طاقتوں کا کچھ کام نہیں۔ ویسے تو پہاڑ زیادہ مضبوط، زیادہ لمبے، زیادہ اونچے، اور تمام قدرتی اشیا نہایت مکمل ہوتی ہیں اسے انسانی صنعت کب پہونچ سکتی ہے، اور اگر مٹی کا ایک تودہ کھڑا کر دیا جائے تو اس میں کونسی خوبی ہے، قدرتی اشیا میں صانع حقیقی کی صنعت کاملہ نظر آتی ہے۔ انسانی صنعت میں "فن" ہونا چاہئے، تصور میں قدرتی منظروں کا نقشہ کھنچا ہو، محسوسات سے جو کچھ اثر قلب پر ہوتا ہے، ذہن میں ذخیرہ ہو، اور معلومات کا خزانہ دماغ میں جمع ہو، اسکے بعد دماغی قوتیں ان میں اپنا تصرف کریں، ان کی ترتیب، تعمیر، تکمیل میں معمار طبیعت اپنے جوہر دکھائے۔ اور پھر خارج میں ان کا ظہور ہو، یہ "فن" ہے، صانع حقیقی کے کاموں پر نظر کرو، اس کا علم، اس کا ارادہ، اسکی قدرت کا اظہار ہو رہا ہے، صرف یہی نہیں اس میں اس کی ذات کا جلوہ نظر آرہا ہے، انسانی صنعت میں اگر انسانی علم، ارادہ، قدرت، کی جھلک نہ ہو، تو کیا ہے، وہ نہایت اعلیٰ پایہ کی عمارت ہے جسمیں معمار خود نظر آتا ہے۔

عمارت میں، در و دیوار، فرش اور سقف، ستون اور مینار یہی کچھ ہوتا ہے۔ انکی دو صورتیں ہیں، ان کی زیبایش یا تو محدب صورت میں ہوگی یا مجوف میں، ان دونوں کا ماخذ سطح مستوی ہے دنیا کی کل عمارتوں میں یہی تین بائی جاتی ہیں، مصری عمارتوں میں صرف دیواریں، اور یونانی عمارتوں میں صرف ستون، اور عربی عمارتوں میں ہر ایک جزو عمارت موجود ہے۔ رومیوں نے یونانیوں کا

خاکہ اڑا دیا۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی خاص غرض مدنظر نہ تھی۔ انکی تمام صنعت محرابوں پر ختم ہوگئی۔ محدب ستون رومی صنعت نے اور بگاڑ دیئے۔ اور مجوف یونانیوں سے نسبتاً زیادہ خوب صورت ہیں۔ لیکن یونانی۔ رومی۔ اور ان کے اوستاد مصریوں کی عمارتوں میں عجائب پرستی پائی جاتی ہے۔ عیسائیت نے رومی اور یونانی صنعت پر خاص اثر کیا۔ اور اس زمانہ کی ہر ایک عمارت سے عیسائیت ٹپکتی ہے۔ خوبصورت اور جذبات سے بھری ہوئی ہے۔ لیکن نہایت نامکمل ہے۔ اور اکثر حالتوں میں جہالت میں مستغرق ہے۔ لیکن بچوں کا مزاج۔ وہی سادگی۔ وہی باتیں پائی جاتی ہیں۔ ابنا ر باسفورس۔ بحیرہ ایڈریاٹک کے کنارے اس فانوس نے روشن کر دیئے۔ لیکن رفتہ رفتہ جب اسمیں بت پرستی کا رواج ہوا تو شمع مزار کی کیفیت ہی رہ گئی۔ جیسا مذہب ہے ویسی اسکی عمارتیں ہیں۔ بالکل اس قبر کے مشابہ ہے۔ جس کا تعوید نقش و نگار سے آراستہ ہے۔ لیکن اسکے اندر "روح" نہیں۔ ایک مردہ خاک کا پتلا پڑا ہے۔ آنکھیں ہیں پر دیکھتا نہیں۔ کان ہیں پر سنتا نہیں۔

رسکن لکھتا ہے کہ "جب رومی حکومت رو بزوال تھی۔ عیسائی صنعت بھی دو حصوں میں منقسم تھی۔ ایک مغربی اور دوسری مشرقی۔ اول الذکر کا مرکز روم تھا۔ اور دوسری قسطنطنیہ میں تھی۔ مشرقی میں آغاز عیسائیت کا ظہور ہوا ہے۔ لیکن مغربی میں یونانی کاریگراں نے اس فن کو قوت متخیلہ کے تصرف سے اعلےٰ پیمانہ پر پہونچایا۔ لیکن یہ تقسیم صرف بلحاظ زمانہ اور عرصہ کی گئی ہے۔ ورنہ فی الحقیقت رومی صنعت رومی شہنشاہت کے ہر ایک حصہ میں ایک ہی وضع کی تھی۔ البتہ اتنا ضرور ہے۔ کہ اٹلی میں لاطینیوں کے ہاتھ میں اور یونان میں یونانیوں کے ذریعہ اسکی اشاعت ہوئی۔ اگر ان دونوں کو "عیسائی رومی" صنعت کے نام سے موسوم کیا جائے تو بالکل صحیح ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ اس میں مصری شائستگی مفقود ہے۔ لیکن عیسائیت نے اسکے اغراض کا پیمانہ بلند کر دیا۔ اور یونانی کاریگروں نے اسے صورت تاباں میں جلوہ دیا۔ لیکن رفتہ رفتہ عیسائیت میں تغیر آتا گیا۔ اور اسکی عمارات کی بھی کایا پلٹ گئی۔ وہ بچپن اور اسکی سادگی کا زمانہ گذر گیا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اسے تو موت ہی آئی شباب کے بدلے۔ یہ غنچہ کھلنے سے پیشتر مرجھا گیا۔ اور اب نہ اسمیں وہ زندہ حسن ہے۔ اور نہ وہ روحانی زندگی ہے۔ ایک پتھر کی مورت ہے۔ لیکن اعجاز عیسوی سے اس مردہ کو دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس عظیم الشان شہنشاہت کے شمال اور جنوب سے دو قومیں اٹھیں جنہوں نے ان کے ممالک ان کے

علم، ان کی صنعت پر قبضہ کرلیا، شمال سے "لمبارڈ" اور جنوب سے "عرب" آئے۔ اول الذکر نے تو عیسائی صنعت کے کمزور لب میں ایک برقی اثر پیدا کیا، اور آخر الذکر نے اسمیں ایک تازہ روح پھونکی، بت پرستی کا استیصال کیا، "لمبارڈ" نے ہر ایک معبد جو تعمیر کیا جسمانی ورزش یعنی شکار اور جنگ کی تمثیلوں سے مزین کیا، لیکن عربیوں نے ہر ایک قسم کی بت پرستی کا خیال مساجد کی تعمیر سے نکال دیا، اور اس کے مناروں پر اللہ اکبر کی صدا بلند کی، رومی کھنڈرات جنپر "لمبارڈ" اور "عربوں" نے اپنی عمارتیں بلند کیں۔ ان دونوں قوموں کی صنعت کے بنیادی پتھر ہیں، دونوں کے اغراض جدا جدا بلکہ متضاد تھے۔ دونوں طوفان کی صورت میں اٹھے، شمال کی جانب سے لمبارڈ سیل یخ کی طرح بہتے ہوئے آئے اور جنوب سے عرب ایک آتشی سمندر کی طرح بڑھا، ان کا اتصال "وینس" میں ہوا، کیمیائی اثر یہ ہوا کہ ایک خاص وضع عمارت پیدا ہوگئی، جسے "گاتھک" کہتے ہیں۔"

مذکورہ بالا اقتباس ہم نے ریسکن کی کتاب "سٹون آف وینس" سے کیا ہے۔ اور اس میں کلام نہیں کہ جس طرح یونانیوں نے مصریوں سے اور مصریوں نے دیگر اقوام سے یہ فن سیکھا، عربوں نے یہ فن یونانیوں سے حاصل کیا، ریسکن نے بالکل بجا کہا کہ ہر ایک قوم نے اپنی عمارتوں میں اپنے مذہبی خیالات کا اظہار کیا ہے، اسکے یہ معنی نہیں کہ ان لوگوں نے اپنی عمارتوں کو بت خانہ بنایا ہوا تھا، اور در و دیوار پر دیوتاؤں اور عجائب المخلوقات کا خاکہ اڑایا ہوا تھا، بلکہ ان عمارتوں کی وضع سے بت پرستی ظاہر ہوتی تھی، اور اگر وہ تصویروں اور بتوں سے معرا بھی ہوں پھر بھی جو کچھ اثر قلب پر ان عمارتوں کے دیکھنے سے ہوتا تھا وہ مادی دنیا کی خواہشات اور خوشی پیدا کرتا تھا، اور خود روح ان میں موجود نہ تھی، اور وہ روحانی جذبات، روحانی خوشی جو قدرتی اشیا کے دیکھنے سے پیدا ہوتی ہے ان عمارتوں میں مفقود تھی، بات اصل میں یہ ہے کہ معمار کی طبیعت اختراع کرتی ہے، اسکے ملی جذبات اپنا اثر ڈالتے ہیں، اور اسکی دماغی قوتیں اپنا تصرف کرتی ہیں، اور پھر ایک نقشہ علمی صورت سے خارج میں عمارت کی شکل میں ظہور کرتا ہے، اگر معمار اپنے آپ کو ایسا ذلیل سمجھتا ہے کہ ہر ایک عجیب چیز کو معبود تصور کرکے اسے سجدہ کرتا ہے، اور ایسا جاہل ہے کہ اپنے ہاتھ سے پتھر تراش کر مورتیں بناتا ہے اور پھر ان کی پرستش کرتا ہے، قیاس ہو سکتا ہے کہ اس شخص کے دل و دماغ پر کیا چیز اثر کر رہی ہے اور اسلئے اسکی حرکتوں سے یہ اثر ظاہر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا، بت پرست قوموں کی صنعتوں میں وہی کچھ ظاہر ہوتا ہے

جو ان کے دماغ میں ہے، یعنی ان میں "نیچر" نہیں ہے۔ انکی عمارتوں میں روحانی زندگی نہیں ہے۔ ان میں صداقت، ایمان، کی بو نہیں، لیکن عربی صنعت میں یہ سب خوبیاں موجود ہیں۔ اسلام سے پیشتر دنیا میں کوئی قوم "توحید" سے جیساکہ اسلام نے تعلیم کی، واقف نہ تھی، اور اس واسطے یہ ممکن نہیں کہ انکی صنعتوں سے وہ امر ظاہر ہو جسکا ان کو علم نہ تھا۔ یہ صرف عربوں کا حصہ تھا، اور اس کا فخر صرف اسی قوم کا حصہ ہے۔

افسوس ہے کہ دمشق میں جہاں عربی پایہ خلافت صرف ایک سو سال تک رہا، ایسی عمارتیں جو صنعت کا نمونہ ہوں بہت کم ہیں، جسکی وجہ یہ ہے کہ ابتدا میں ان لوگوں کو اس طرف خیال نہیں آیا۔ ان کی توجہ زیادہ تر فتوحات کی سلسلہ جنبانی رہی، اور جس وقت وہ متمدن دنیا پر قابض ہو گئے۔ اور دولت و ثروت نے ان کے خزانے معمور کر دیئے، اور اندرونی اور بیرونی خرخشوں سے بیفکر ہو گئے، تو علوم و فنون کی طرف خود بخود بحالت امن طبیعتیں مائل ہوئیں، اس وقت وہ قریباً ایک صدی کا عرصہ طے کر چکے تھے۔ اور یہ زمانہ دمشق کے زوال کا تھا، اس وقت عباسیہ کا عروج ہوا۔ البتہ بنو امیہ نے ہسپانیہ میں اپنے علوم و فنون کو کمال کے درجہ پر پہنچایا۔ اگر عربی تمدن کی تاریخ کا مطالعہ کرنا ہو تو ان عمارتوں کو دیکھو جو بغداد یا ہسپانیہ میں تعمیر ہوئیں، دمشق کے بغیر بنو امیہ کی تاریخ نامکمل رہی جاتی تھی، اس لئے ہم نے بغداد کے بعد انکے کارنامے ہسپانیہ کی فتوحات اور عمارات سے شروع نہیں کئے، اگرچہ ان لوگوں کا کمال جس کے اہل یوروپ بھی معترف ہیں اور خوشہ چین ہیں ہسپانیہ میں ہی ظاہر ہوا۔ الحمرا اور ہسپانیہ کی دیگر عمارات کا تذکرہ تو بشرط زندگی وقت پر ہوگا بالفعل ہم دمشق کی "جامع اموی" کا ذکر کرتے ہیں:۔

"الجامع"

عربوں کی عمارات تعمیر مساجد سے شروع ہوتی ہے، اور سچ تو یہ ہے کہ اسی پر ان کی صنعت کا آغاز ہوا۔ اور اسی پر اسکا خاتمہ ہے، تمام خوبیاں جو عمارت میں ظاہر ہو سکتی ہیں عربوں نے اپنی مسجدوں کی تعمیر میں روشن کر دیں، تمام ذہنی طاقتیں اسی میں صرف کیں، اور قدرتی اشیاء کے اثر کو مساجد کے در و دیوار پر نقش کر دیا، جسکا عکس قلب پر کیفیتیں پیدا کرتا ہے، اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ عربی صنعت مساجد کی تعمیر کے علاوہ کسی اور عمارت سے واقف ہی نہ تھی، یا دیگر اشیاء پر مساجد کی طرح وہ اپنی خوبیوں کا اظہار نہیں

کرسکتی تھی، ایک شخص جو مسجد کے دروازوں کی لکڑی، عاج، اور فرش کے پتھر کو طرح طرح کے نقش و نگار سے مزین کرتا ہے، عام اشیاء پر بھی اسی طرح اپنی صنعت کو کام میں لاسکتا ہے، بات اصل میں یہ ہے کہ اسلام نے بت پرستی کا خاطر خواہ استیصال کیا، عیش و عشرت کے سامان سونے اور چاندی کا استعمال بطور زیورات۔ ریشم اور زربفت کا لباس، اور بت تراشی، جو تمدن کے اسباب میں شمار ہوتے ہیں اسلام کی تعلیم کے مخالف ہیں، اس لئے مسلمانوں نے اس طرف توجہ نہیں کی۔ ان کے دل پر کلمہ توحید نقش تھا، زہد و تقوے، راستی، ایمانداری، انکی طبیعت ہوگئی تھی، اور ان کے افعال پر موثر تھی۔ خانہ خدا کی عمارت میں خیالات خوب۔ اور تقدیس جو اسلام معمار کے دل میں پیدا کرچکا تھا اپنا کام کرتے تھے، اسلام کی تعلیم۔ ان کے پاکیزہ خیالات تقاضا کرتے تھے کہ ان کی صنعت مساجد پر اور فی سبیل اللہ صرف ہو،

سب سے پہلی مسجد مدینہ میں تعمیر ہوئی[۳۳]، یہ مسجد نبوی، رسول خدا کے زمانہ میں بنی، اس وقت تک بلکہ اسکے بعد ایک عرصہ تک مسلمانوں نے میدان صنعت میں قدم نہیں رکھا تھا، اس وقت تو وہ اپنے جان و مال کی حفاظت کی فکر میں تھے، علوم و فنون کا چرچا تو بحالت امن اور بصورت فراغت و فرصت ہوتا ہے، یہ مسجد ابتداء میں مربع شکل میں تھی، اینٹوں کی دیوار نے احاطہ کیا ہوا تھا، اور کچھ حصہ لکڑی کے شہتیر وں سے مسقف تھا۔ جنھیں کھجور کے تنے سہارا دیتے تھے، ان ستونوں پر پلستر کیا ہوا تھا، اس سادہ عمارت میں

حاشیہ نمبر ۳۳ - یاقوت اس مسجد کا نام "مسجد التقویٰ" لکھتا ہے، ابتدا میں اس مسجد کی شکل مربع تھی لیکن رفتہ رفتہ اسکی توسیع کے ساتھ اسکی شکل مستطیل بن گئی، حضرت عمرؓ نے اسے وسیع کیا۔ اور کہا اگر میں نے رسول اللہؐ کو یہ کہتے نہ سنا ہوتا کہ "ینبغی ان نزید فی المسجد" یعنی مناسب ہے کہ ہم اس مسجد کو اور بڑھادیں، تو اسے اصلی حالت پر رہنے دیتا۔ کھجوروں کے تنوں کی بجائے خشتی ستون قائم کئے، اور چھ دروازے بنائے، اور عورتوں کے واسطے علیحدہ جگہ مقرر کردی، حضرت عثمانؓ کے عہد خلافت میں اسے اور بڑھایا گیا، اور بجائے اینٹوں کے پتھر کے ستون اور دیواریں بنائی گئیں، سقف میں ساگوان کی لکڑی لگائی گئی، خلیفہ ولید ابن عبدالملک نے اسے نہایت خوبصورت بنادیا، اس وقت عمر بن عبدالعزیز مدینہ منورہ میں حاکم تھے، یہ کام انہیں کے سپرد ہوا، ازواج نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے حجرے اس مسجد میں شامل کردیئے۔ اس مسجد کے نقش و نگار پر اسی ہزار مثقال سونا چاندی صرف ہوا، روضہ اقدس رسول کریم مسجد کی جانب شرق قبلہ رخ واقعہ ہے، اور آپکے ساتھ آپکے یار غار صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ کے مزار ہیں، صدیق اکبرؓ کا سر رسول اللہؐ کے قدم مبارک کے

صحن ہی ایک ایسی چیز تھی جسکی مقدم ضرورت اس وقت بوقت نماز محسوس ہوتی تھی" اس کے بعد دیگر ضروریات کا کم و بیش خیال رکھا گیا تھا۔ ان میں سے... چھت بارش اور دھوپ سے بچنے کے لئے ضروری تھی، احاطہ کی دیوار دیگر عمارات کے درمیان حدفاصل اور مسجد کو علیحدہ کرتی تھی، "اور اس طرح حضور قلب اور توجہ میں بیرونی شور وغل مخل نہیں ہو سکتا تھا، اس مسجد کی تعمیر میں رسول اللہ اور آپ کے اصحاب نے اپنے ہاتھ سے کام کیا، ابتدا میں رسول اللہ ایک ستون پر تکیہ لگاکر کھڑے ہوکر خطبہ پڑھتے ۸ ہجری میں ایک ممبر بنایا گیا،

یہ عمارت جو صدر اسلام میں پہلی مسجد ہے آئندہ زمانہ میں مساجد کا نمونہ تھی، ضرورتاً یہ مسجد تعمیر ہوئی اور اس لئے اس کے تمام جزو ہر ایک مسجد میں پائے جاتے ہیں۔ "جامع اموی" کی تعمیر دمشق میں خلیفہ ولید کے عہد میں ہوئی، اس عمارت کی ابتدائی صورت ہم نہیں کہہ سکتے کیا تھی، مورخین نے بالاتفاق لکھا ہے کہ یہ آرامیوں کا ایک معبد تھا، چنانچہ بنی اسرائیل کے دور دورہ میں جب شاہ عصاریہ "تلغاث پلاسر" نے دمشق میں ایک دربار منعقد کیا، اور شاہ اسرائیل "یہو یہ۔ اور آرامی بادشاہ اور دیگر چھوٹی چھوٹی سی ریاستوں کے رئیس اس جگہ بغرض اظہار اطاعت جمع ہوئے تو ایک دن "آہاز" شاہ یہودہ سیر کرتا ہوا اس معبد کی طرف آنکلا، اسکے اندر ایک مذبح تھا، اسکی وضع پسند آئی، حکم دیا کہ ہیکل سلیمانی میں اسی نمونہ کا ایک مذبح بنایا جاوے، آرامیوں کے اس معبد کا نام "رامون" تھا۔ جسکے معنی انار ہیں عربی لفظ "رمان" اسی لفظ کی اصل ہے، شامی دیوتاؤں میں سے "رامون" کی پرستش سب سے زیادہ ہوتی تھی اور یہ مندر اسی دیوتا کے نام پر تعمیر کیا گیا تھا، پرانے عہدنامہ میں اس دیوتا کا ذکر کیا گیا ہے،

۲۔ سلاطین باب ۵ میں نعمان سپہ سالار دمشقی کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ جب حضرت "الیشع" نبی نے اسے مرض جذام سے شفا بخشی تو اسے معلوم ہوا کہ بنی اسرائیل کا خدا ہی معبود حقیقی ہے، اس لئے دمشق کے دیوتا "رامون" کی پرستش سے توبہ کی، مگر اتنا کہا کہ جب بادشاہ اس مندر میں جاکر رامون کے آگے جھکے تو مجھے بھی معذور سمجھنا چاہئے، اس واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس بت کی پوجا تمام اہل دمشق کیا کرتے تھے،

پاس ہے، اور فاروق اعظم کا سر صدیق اکبر کے شانوں کے قریب ہے،

اس مقدس مقام کی عمارت، اور اسکی زینت میں ہر ایک نیک بادشاہ نے کچھ نہ کچھ حصہ کار ثواب سمجھ کر لیا ہے لیکن خلیفہ ولید کے رتبہ کو کوئی شخص نہیں پہنچ سکتا، مدینۃ النبی میں یہ عمارت عربی صنعت کا نمونہ ہے" +

مفسرین بائیبل کا خیال ہے کہ یہ لفظ "ہدد رمون" کا مخفف ہے۔ جیسا کہ ذکریا باب ۱۲۔ آیت ۱۱ میں لکھا ہے کہ "اس دن یروشلم میں بڑا ماتم ہوگا، ہدد رمون کے ماتم کی مانند مجدون کی وادی میں" "ہدد رمون" کی شرح اس طرح کی گئی ہے کہ یہ مرکب لفظ ہے، "ہدد" شامیوں کا سورج دیوتا تھا۔ اور رمون یعنی انار سورج کی تمثیل ہے اس لیے "ہدد رمون" موسم گرما کے آخری ایام کے سورج دیوتا ہیں، جو اس وقت اناروں کو اپنی طبعی حرارت سے پختہ کرتے ہیں، اور اسکے بعد مر جاتے ہیں، یعنی موسم سرما کا آغاز ہو جاتا ہے، آپ کے پوجاری "وادی مجدون" میں جمع ہو کر ان دنوں میں ماتم کیا کرتے تھے کہ سورج دیوتا چل بسے، معلوم ہوتا ہے کہ سورج دیوتا کا ماتم نہایت سخت ہوتا ہوگا، کہ حضرت ذکریا نے اسے پیش گوئی کے رنگ میں "یروشلم" کے ماتم کے ساتھ تشبیہ دی، حضرت ذکریا جیسا کہ انکی کتاب سے ظاہر ہوتا ہے۔ "دارا" بادشاہ کے ہمعصر تھے، یعنی پیدائش مسیح سے پانچسو سال پیشتر اس کا ظہور ہوا، اس وقت تک یہ معبد آرامیوں کے قبضہ میں بدستور چلا آتا تھا، اور وہ اس دیوتا کا سالانہ ماتمی تیوہار منایا کرتے تھے۔ پرانا عہد نامہ "ملاکی" نبی کی کتاب پر ختم ہو جاتا ہے، جو ۳۹۷ برس قبل از مسیح لکھی گئی، اس کے بعد نیا عہد نامہ مسیح کی پیدائش سے شروع ہوتا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ اس درمیانی چار سو سال کے عرصہ میں کسی وقت یہودی اس معبد پر قابض ہو گئے، حضرت یحییٰؑ جو حضرت عیسیٰؑ کے ہمعصر تھے۔ اسی معبد میں مدفون ہوئے۔ اور آنحضرت کی تربت اب بھی موجود ہے، اگرچہ دمشق پر کچھ عرصہ یونانیوں کا بھی قبضہ رہا، اور آخر کار رومی سلطنت کی حدود میں آگیا۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس مندر میں ان فتحمند قوموں کے دیوتاؤں نے مداخلت نہیں کی، ۵۹ سنہ قبل مسیحؑ پمپی نے یروشلم کو فتح کیا، اور رومی جمہوری سلطنت کے ساتھ ملحق کر دیا۔ اس وقت رومی گورنمنٹ کی طرف سے "اینتی پیتر" کو یہودیہ کی سلطنت ملی، اس شخص کا بیٹا ہیرودیس اعظم تھا۔ جو یہودیوں کا بادشاہ کہلایا، اس کے تین بیٹے۔ "آرچیلوس" "ہیرودیس انیتپاس" اور "ہیرودفلپ" تھے، ان تینوں میں سلطنت تقسیم ہو گئی، "ہیرودیس انیتپاس" نے۔ "ارتیاس" شاہ عرب کی لڑکی سے شادی کی، مگر آخر کار اسے چھوڑ کر اپنے بھائی "فلپ" کی زوجہ سے تعلق پیدا کر کے نکاح کر لیا، اس وقت حضرت یحییٰؑ زندہ تھے۔ اور لوگوں کو وعظ و نصیحت سے راہ ہدایت دکھاتے تھے، آنحضرتؑ نے ہیرودیس کے اس فعل کو شرعاً ناجائز ظاہر کیا، اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ ہیرودیس نے آپ کو قتل کروا دیا،

مقدس متی (باب ۱۴۔ آیت ۳) اور مقدس مرقس (باب ۶ آیت ۱۷) اور مقدس لوقا (باب ۳ آیت ۱۹)

اور باب ۹ آیت ۹) میں لکھتے ہیں کہ "ہیرودیاس" جو فلپ کی عورت تھی۔ اور بعد ازاں ہیرودیس کے نکاح میں آئی۔ یوحنا بپتسمہ دینے والے سے سخت ناراض تھی۔ کیونکہ اس نے علی الاعلان کہ دیا تھا کہ ہیرودیس کا یہ فعل ناجائز ہے"۔ اور اس تاک میں تھی کہ کوئی موقع ملے تو اس کا بدلہ لوں" چنانچہ ایک روز ہیرودیس نے محفل عیش و نشاط گرم کی ہوئی تھی۔ اور اسکے معزز مہمان جمع تھے"۔ اور "ہیرودیاس" کی لڑکی ناچ رہی تھی۔ "ہیرودیس" اس قدر خوش ہوا کہ کہا۔ "مانگ کیا مانگتی ہے"۔ پھر قسم کھا کر کہا کہ "اگر تو میری نصف سلطنت بھی مانگے تو میں تجھے دوں گا"۔ لڑکی نے والدہ سے مشورہ کیا اور ہیرودیس کو کہا کہ "ایک طشت میں یوحنا بپتسمہ دینے والے کا سر اسی وقت اس جگہ حاضر کیا جائے"۔ ہیرودیس آنحضرت کا معتقد تھا اور آپ کا وعظ خوش ہو کر سُنا کرتا تھا۔ علاوہ ازیں لوگ آنحضرت کو رسول اور نبی سمجھتے تھے اور ہر کہ و مہ آپ کی عزت کرتا تھا۔ اس لئے ہیرودیس کو سخت غم لاحق ہوا۔ لیکن اپنی قسم کا اس قدر پاس تھا کہ حکم دیا کہ فوراً سر طشت میں لگا کر سامنے لایا جائے"۔ اس حکم کی تعمیل کی گئی"۔ اور اس طرح حضرت یحییٰ قتل کئے گئے"۔ اور آپکے شاگردوں نے آپ کی لاش کو دفن کر دیا"۔ کچھ عرصہ بعد یسوع مسیح کی شہرت ہیرودیس کے کان میں پہونچی کہ معجزے دکھاتے ہیں"۔ آسمانی بادشاہت کی طرف دعوت کرتے ہیں"۔ کہا کہ "یہ تو یوحنا بپتسمہ دینے والا ہے جو مردوں سے جی اُٹھا ہے"۔

ہمیں اس حکایت کی صحت پر قوی شبہ ہے۔ اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ نیا عہد نامہ محفوظ کتاب نہیں ہے"۔ اور اس کا اکثر حصہ پایہ اعتبار سے ساقط ہے"۔ ہیرودیس برائے نام یہودیوں کا بادشاہ تھا اور فی الحقیقت رومی گورنر حکومت کرتے تھے"۔ اور یہ مسلمہ امر ہے کہ جہاں رومی حکومت تھی وہاں ان کے قوانین نافذ تھے"۔ عقل باور نہیں کرتی کہ ہیرودیس ایک نامور شخص کو صرف ایک لڑکی کی خاطر اس طرح قتل کرنے کی جرأت کرتا"۔ اور رومی گورنمنٹ کچھ باز پرس نہ کرتی"۔ اور عوام الناس اس طرح خاموش بیٹھے رہتے جن کا حسن اعتقاد بقول مقدس سوانح نگاران حضرت یحییٰ سے اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ آپ کو نبی تسلیم کرتے تھے اور خود ہیرودیس ان کا معتقد تھا"۔ اور یہ عجیب بات ہے کہ یسوع کی شہرت سُن کر ہیرودیس نے کہا کہ یہ یوحنا ہے جو مُردوں سے جی اُٹھا ہے"۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہیرودیس کو خود حضرت یحییٰ کی موت کا یقین نہ تھا"۔ یہ ممکن ہے کہ اس نے ہیرودیاس کو مغالطہ میں رکھا ہو اور اس نے سمجھ لیا ہو کہ ہیرودیس نے حسب وعدہ یحییٰ کو قتل کر دیا ہے یا سرے سے یہ روایت ہی غلط ہو۔ توریت میں صاف صاف الفاظ میں لکھا ہے کہ

جھوٹا نبی قتل کیا جائے گا"۔ کیا یہودی جو حضرت یحییٰؑ کو نبی سمجھتے تھے اور اب بھی سمجھتے ہیں ہیرودیس کے ارادہ سے واقف ہو کر یحییٰؑ کو قتل ہونے دیتے؛ اور خود ہیرودیس ایسے فعل کا مرتکب ہو سکتا تھا؟ ہم اس واقعہ پر زیادہ بحث کرنا نہیں چاہتے؛

ہماری رائے میں ہیرودیس نے اپنی عورت کو مغالطہ میں رکھا اور اس فریب کا انکشاف اس پر کبھی نہیں ہوا۔ اس وقت ہیرودیس رومی سپاہ کے ساتھ عربیوں سے لڑ رہا تھا؛ اور یہ کوئی موقع ایسی بزم نشاط قائم کرنے کا نہ تھا؛ عربیوں کے مقابلہ میں اسنے شکست فاش کھائی؛ اور بالآخر تھوڑے عرصہ بعد رومی گورنمنٹ کی نظروں سے گر گیا؛ اور معہ اہل و عیال فرانس کی طرف جلاوطن کیا گیا؛ اور بحالت خستہ و خراب مر گیا؛ اگر یہ رائے صحیح نہ ہو تو غیر محفوظ کتابوں کی روایتوں کو غیر معتبر سمجھنے میں ہمیں ذرا بھی تامل نہیں؛ "نمز ے بلا" لکھتی ہے کہ" مجھے یقین نہیں کہ اس جگہ یحییٰؑ کا سر مدفون ہے؛ کیونکہ جہاں سر ہے وہاں جسم بھی ساتھ ہوگا"۔

حضرت یحییٰؑ کی قبر اس معبد میں اب بھی موجود ہے اور اس امر کی شاہد ہے کہ آپ قتل نہیں ہوئے؛ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت سے اس معبد کا نام بدل گیا تھا؛ اور حضرت یحییٰؑ کے نام پر مشہور ہو گیا؛ عیسائیت کی اشاعت ہوئی اور قیصر قسطنطنیہ نے یہ دین قبول کیا؛ تو یہ ہیکل جو اب تک یہودیوں کے قبضہ میں تھی۔ عیسائیوں کے ہاتھ میں آگئی؛ اور حضرت یحییٰؑ کے نام اس گرجا کے ساتھ قائم رہا؛ ۳۹۵ء یعنی قسطنطین کے ستر سال بعد "آر۔ کے۔ ڈی۔ اس" نے اس گرجا کی مرمت کی؛ کچھ عرصہ گذرا ہے کہ باب جیرون کے باہر ایک کتبہ ملا جس پر لکھا ہوا تھا کہ مقدس یوحنا کے اس گرجا کو "ارضیادوس" "ابن تھیودوسنی اس" نے مرمت کروایا" اور کیڈیاس کا باپ سخت متعصب عیسائی تھا؛ غالباً اسکے زمانہ میں اس گرجا میں یہودیوں کا قلع و قمع کیا گیا تھا؛ اور اس عمارت کو بھی نقصان پہونچا؛ مگر اس کے بیٹے نے مرمت کروا دیا؛ تین سو برس تک اس گرجا پر عیسائیوں کا قبضہ رہا بالآخر جس وقت مسلمانوں نے دمشق کا محاصرہ کیا۔ اور ایک دروازہ سے ابو عبیدہؓ بروئے صلح اور دوسرے دروازہ سے خالدؓ بن ولید بجبر و قہر اس میں داخل ہوئے تو اسی گرجا کے بالمقابل دونوں کی ملاقات ہوئی؛ جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں؛ ابو عبیدہ اور خالدؓ بن ولید کے درمیان رد و قدح کے بعد یہ فیصلہ ہوا کہ جس قدر حصہ شہر بجبر و قہر فتح ہوا۔ اس پر جنگی اور باقی حصہ پر صلح کے قواعد پر عمل کرنا چاہیے؛ چنانچہ اس گرجا کو بھی انصافاً تقسیم کیا گیا؛ نصف حصہ تو مسجد میں تبدیل ہو گیا، اور نصف

حصہ بدستور عیسائیوں کے قبضہ میں رہا۔

غالباً یہ روایت غلط ہے کہ یوحنا کا گرجا اس طرح نصف نصف تقسیم ہو گیا تھا۔ بات اصل میں یہ ہے کہ اس گرجا کے ساتھ ایک اور چھوٹا سا گرجا تھا جسے حضرت مریم کی طرف منسوب کیا جاتا تھا یہ گرجا خالد بن ولید کے حصہ میں آیا تھا۔ اور اس لئے اس جگہ ایک مسجد تعمیر کی گئی۔ دوسرا گرجا یوحنا صحیح و سالم عیسائیوں کے پاس رہا۔ اسی برس بعد ۸۹ھ میں امیر المومنین خلیفہ ولید بن عبد الملک نے ارادہ کیا کہ اس گرجا کو مسمار کر کے ایک عالیشان مسجد تعمیر کی جائے۔ عیسائیوں کو کہا گیا کہ معاوضہ میں جس قدر روپیہ لینا چاہو لے لو۔ اور گرجا دیدو۔ صاف انکار کیا۔ ولید نے جبراً لے لیا۔ اس عمارت کی قسمت میں یہی کچھ لکھا تھا۔ اہل نینوا۔ بابل کا دور دورہ رہا۔ ایرانیوں کے قبضہ میں رہی۔ یونانیوں کے ہاتھ آئی۔ رومیوں۔ یہودیوں۔ عیسائیوں کا یکے بعد دیگرے قبضہ رہا۔ کنیسہ سے ہیکل۔ ہیکل سے گرجا اور آخر کار مسجد بنی۔ سچ ہے۔

که آئین جہاں گاہے چنیں گاہے چناں باشد

فی الحقیقت اسپر کسی کا دعوے نہ تھا۔ جسکی لاٹھی اسی کی بھینس۔ عیسائیوں نے غلطی کی کہ مفت کا روپیہ ہاتھ آتا تھا۔ وہ بھی کھو بیٹھے۔ یہ سوال کہ خلیفہ ولیدؒ کی نگاہ اس گرجا پر کیوں پڑی۔ وہ کسی اور مقام پر نہایت عالیشان مسجد تعمیر کر سکتا تھا۔ قابل وقعت ہے۔ بات اصل میں یہ ہے کہ جو اس گرجا میں بات تھی وہ کسی اور جگہ پیدا نہیں ہو سکتی تھی۔ اس جگہ حضرت یحییٰ کی تربت تھی۔ اور مسلمان اسے متبرک مقام خیال کرتے تھے۔ ارض شام میں ایسے مقدس مقامات بہت تھے اور مسلمانوں نے ان پر اپنا قبضہ کر لیا۔ ہیکل سلیمانی کا وہ حصہ جسے صخرہ کہتے ہیں۔ اور جو داؤدؑ اور سلیمانؑ کی عبادت گاہ تھی۔ مسجد عمرؓ کے گنبد کے نیچے ہے۔ تمام پیغمبروں کے مزار مسلمانوں کی خانقاہیں بن گئیں۔ لیکن سوائے اس گرجا کے کوئی جگہ زبردستی نہیں لی گئی۔ بہر حال عربوں سے بہت بعید تھا۔ کہ حضرت یحییٰ کی تربت ایسے لوگوں کے قبضہ میں رہنے دیتے جو مسیحؑ کو ابن اللہ کہتے تھے۔ عیسائیوں نے جب دیکھا کہ یہ مقدس مقام ہاتھ سے جاتا ہے تو یہ روایت مشہور کر دی کہ "ہمارے بزرگوں نے لکھا ہے کہ جو شخص اسے مسمار کرے گا مجنون ہو جائیگا۔" خلیفہ ولید نے سنکر کہا کہ "میں پہلا شخص ہوں جو اسے مسمار کرونگا۔ اور میں اللہ کے راستہ میں مجنون ہونا پسند کرتا ہوں" اتنا کہا اور تبر ہاتھ میں لئے ہوئے دار الامارت سے برآمد ہوا۔ زرد قبا بدن پر تھی۔ آستیں چڑھی ہوئی تھی۔

مسلمانوں کو خبر ہوئی تو گرجا کی طرف دوڑے۔ دیکھا کہ خلیفہ بذات خود گرجا کی دیوار کو گرا رہا ہے۔ اس لیے ہر ایک شخص نے خلیفہ کی تقلید کی۔ اور اسے ایک کار ثواب سمجھا۔

کنیسہ یوحنا مسمار کیا گیا۔ کہتے ہیں کہ اس اثنا میں اس عمارت کے قدیم آثار ملے۔ اور مختلف زبانوں میں کتبے لکھے ہوئے پائے گئے۔ یاقوت ان میں سے اہل الاسطواں کا ذکر کرتا ہے۔ جن کی بود و باش بعلبک میں تھی اور اپنے زمانہ میں حکما مشہور تھے۔ اور ان کے ایک کتبہ کا ذکر کرتا ہے کہ خط یونانی میں لکھا ہوا تھا۔

بقول "اذبے بلا۔ برٹن" اس کنیسہ کے جنوبی دروازہ کی طرف یونانی زبان میں ایک کتبہ لکھا ہوا اب بھی موجود ہے۔ "مسز برٹن" تعجب کرتی ہے کہ عربوں کی نگاہ سے یہ کتبہ کس طرح بچ گیا۔ یہ کتبے کچھ ایسے پرانے معلوم نہیں ہوتے۔ اس سے قیاس ہو سکتا ہے کہ کنیسہ یوحنا کے بعض حصے عمداً اصلی حالت پر رکھے گئے۔ غالباً یہ حصے اس وقت کنیسہ میں شامل نہیں تھے۔ دیگر ملحقہ عمارتیں جن میں راہب اور پادری لوگ رہا کرتے تھے۔ اس وقت موجود تھیں۔ اور کچھ عرصہ بعد غیر آباد اور رفتہ رفتہ "الجامع" میں شامل ہو گئیں۔ یہ کتبے جو مسیح کی آمد ثانی اور ابدی بادشاہت کے خوش کن خیالات کا نتیجہ ہیں مسلمانوں کی ان روایتوں کے ماخذ ہیں جو نزول عیسےٰؑ کے متعلق بیان کی جاتی ہیں۔ کہتے ہیں کہ اس قدیم مسجد کے مشرق اور مغربی جانب دو عالیشان محرابیں تھیں اور باب جیرون اور باب البرید تک برابر ستونوں کے دو سلسلے چلے گئے تھے۔ اور مشرقی طرف ایک قصر تھا جسے جیرون کہتے تھے۔ اور ستونوں پر قائم تھا۔ حضرت سلیمانؑ کے حکم سے جنوں نے اسے تعمیر کیا تھا۔ بعض روایتوں کے مطابق عاد ارم نے اسے بنایا تھا۔ کہتے ہیں کہ عاد کے دو بیٹے تھے۔ جیرون اور برید۔ اسجگہ دونوں بیٹوں کے لئے قصر بنوائے۔ قصر تو معدوم ہو گئے۔ نام باقی رہ گیا۔

یہ بت خانہ خراب ہوا تو خانہ خدا کی تعمیر کا کام نہایت سرگرمی سے شروع کیا گیا۔ خلیفہ ولید کی اس وقت بڑی آرزو یہی تھی کہ جتی المقدور یہ کام جلدی ختم ہو۔ ایسا نہ ہو کہ موت سے فرصت نہ ملے اور یہ خواہش دل کی دل ہی میں رہے۔ اکثر اوقات اس جگہ آتا۔ اور بذات خود نگرانی کرتا۔ معماروں، سنگ تراشوں اور دیگر کاریگروں نے اس وقت اس جگہ ایک نیا شہر آباد نظر آتا تھا۔ ان کی تعداد مختلف اوقات میں بارہ ہزار بیان کی جاتی ہے۔ جن میں رومی، یونانی، شامی، مصری، عراقی، عربی، اور ایرانی صناع شامل تھے۔ بعض مورخین نے

اس موقع پر ایسی بے تکی ہانکی ہے کہ عقل باور نہیں کرتی کہ خلیفہ ولیدؒ نے قسطنطین کو لکھا ہو کہ چونکہ مابدولت کا ارادہ کنیسہ کو مسمار کر کے مسجد تعمیر کرنے کا ہے، اس لئے رومی کاریگر اور ماہران فن عمارت کو پایۂ خلافت کی طرف روانہ کیا جائے، چنانچہ قیصر نے بارہ ہزار آدمی بھیجے جو اس جگہ کام کرتے تھے۔

عربی مؤرخین نے "رومی" لفظ کو اس قدر وسعت دی ہے کہ اس میں تمام اصلی رومی، یونانی، شامی، مصری شامل ہیں۔ اور ان اقوام میں کچھ فرق نہیں کیا ہے، وجہ یہ ہے کہ اس وقت ان کا مقابلہ ایک ایسی سلطنت سے تھا جو رومی شہنشاہت کی عظیم الشان شاخ تھی، اور قیصر سے لیکر عوام الناس تک اکثر لوگوں کا مذہب عیسائیت تھا۔ اس لئے اس عیسائی حکومت اور حکمرانوں اور عام عیسائیوں کو وہ "رومی" کے لفظ سے تعبیر کرتے تھے، حالانکہ ان کا اکثر حصہ یونانی تھے، اور خود قیصر یونانی الاصل تھا، اس وقت شام میں بیشمار عیسائی آباد تھے۔ اور آبادی کا اکثر حصہ یہی لوگ تھے، اور خواہ وہ کسی قوم سے ہوں عربی انہیں رومی کہتے تھے، اگر انہوں نے فرق کیا ہے تو صرف عرب متنصرہ میں کیا ہے۔ اور یہ اسلئے کہ یہ لوگ ان کے اپنے قوم کے آدمی تھے، شام میں آباد ہوئے اور عیسائیت کو قبول کیا، لیکن عربی ان کے حسب و نسب سے واقف تھے، یہ عیسائی قومیں جو اس وقت شام میں آباد تھیں الجامع کی تعمیر میں بحیثیت مزدور اور معمار وغیرہ کام کرتی تھیں، ان کے علاوہ دیگر اقوام کے آدمی بھی تھے، جو اسی طرح کام کرتے تھے۔"

"اہرام مصر" کی نسبت بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ بنی اسرائیل نے تعمیر کئے ہیں۔ قبطیوں کے غلام تھے، اور وہ ان سے اپنی عمارتیں بنواتے تھے، لیکن کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ منار اسرائیلیوں کی صنعت کا نمونہ ہیں، آج ہندوستان میں بیشمار عمارتیں انگریزی گورنمنٹ نے تعمیر کروائی ہیں، لیکن یہ ہندوستانی وضع کی عمارتیں نہیں ہیں، حکمران قوم کے افراد جو غیر اقوام پر حکومت کرتے ہیں اپنے مقبوضہ ممالک میں ذلیل محنت مزدوری کا پیشہ اختیار نہیں کرتے، ایسے کاموں کے لئے محکوم قومیں ہر وقت تیار ہیں، اور ان ہدایات پر عمل کرتی ہیں جو حکمرانوں کے دماغ وضع کرتے ہیں، جامع دمشق کی تعمیر میں رومی، یونانی، مصری، ایرانی کاریگروں نے مختلف حیثیت سے عربی حکومت کے ماتحت کام کیا، بعض اشخاص نے غلطی سے یہ سمجھ رکھا ہے، کہ یہ عمارت یونانی وضع کی ہے کیونکہ انہی لوگوں نے تعمیر کی تھی، یہ صریحاً غلط فہمی ہے، یہ اپنی وضع کی پہلی عمارت نہ تھی جو عربیوں نے تعمیر کی، اس سے پیشتر وہ صدہا قصر اور قلعے، اور دیگر عمارتیں بنا چکے تھے، اور اس فن میں اپنے اوستادوں سے گوئے سبقت لے گئے تھے، لیکن اس میں کچھ

شک نہیں کہ یہ ان کی ترقی کی ابتدا ہی تھی، ابھی انہیں بہت کچھ کرنا باقی تھا۔

یاقوت، ابن بطوطہ، ابن جبیر وغیرہ نے جامع دمشق کے حالات مفصل لکھے ہیں۔ اور یہ ایسی عمارت ہے کہ اب بھی دمشق میں موجود ہے، اس لئے اس کا مفصل تذکرہ ہم نہیں کرتے، ان سیاحوں کی تحریروں کا اقتباس کافی ہوگا۔

بقول یاقوت خلیفہ ولید نے اس عمارت پر سات سال کا خراج مملکت صرف کر دیا۔ اسمیں غالباً تمام اخراجات شامل ہیں، معماروں اور مزدوروں کو ان کے حوصلہ سے زیادہ دیا، خلیفہ کے دلی شوق سے ہر ایک شخص واقف تھا، اس لئے ضرورتاً بعض اشیا گراں قیمت پر دستیاب ہوئیں اس عمارت کا مصالح دور دور مقامات سے بہم پہونچایا گیا، خلیفہ نے عاملوں کو تاکیدی احکام نافذ کئے کہ تعمیر مسجد میں امداد دیں اور جو چیز طلب کی جائے۔ فوراً بہم پہونچائیں، ایک دفعہ خلیفہ نے حکم دیا کہ سقف مسجد میں قلعی کا استعمال کیا جائے، تمام ممالک محروسہ سے جس قدر دستیاب ہو سکا اس کام کے واسطے جمع کیا گیا۔ لیکن معلوم ہوا کہ یہ مقدار بھی کافی نہیں، آخر سخت جستجو کے بعد پتہ لگا کہ ایک عورت کے پاس کچھ موجود ہے، اس عورت سے مانگا تو کہا کہ سونے میں تول کر دونگی، خلیفہ کو اس حال سے مطلع کیا گیا تو کہا کہ "اگر ہم وزن سونا بھی لینا قبول نہ کرے تو دگنا دیا جائے"، اسپر عورت نے کہا کہ مجھے تو یہ دیکھنا منظور تھا کہ "کیا خلیفہ نے اس عالیشان مسجد کی بنا اپنی شہرت کے لئے اٹھائی ہے اور ظلم سے اخراجات کو پورا کیا ہے، لیکن اب مجھے معلوم ہوگیا ہے اور میں اس امر کی شہادت دیتی ہوں اور تمہیں بھی گواہ ٹھہراتی ہوں کہ خلیفہ نے یہ کام محض للہ کیا ہے"۔ اسکے بعد زر معاوضہ لینے سے انکار کر دیا، اور جتنا ذخیرہ موجود تھا، نذر کیا۔ خلیفہ نے حکم دیا کہ سقف میں جس قدر آئینے لگائے جائیں انپر لفظ "للہ" لکھا جائے۔

جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں، خلفاء بنو امیہ کو بدنام کرنیکے لئے ان کے ظلم و ستم کی حکایتیں حریف قبایل کی پولیٹیکل اغراض نے وضع کیں۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ خلفاء خدا ترس اور منصف مزاج تھے، خلیفہ ولید کو کہا کرتا تھا کہ "میں نے مسجد نبوی، جامع دمشق، مسجد اقصیٰ کی توسیع و تعمیر و تکمیل کی، اگر اللہ تعالیٰ کو ان میں سے کوئی فعل پسند آگیا۔ تو میری مغفرت کے لئے کافی ہے"، اور لوگ تو اسے داؤد سے تشبیہ دیتے تھے۔

مسجد نبوی جو صدر اسلام میں سب سے پہلی مسجد ہے، ہمیشہ مساجد کی تعمیر میں نمونہ رہی ہے، چنانچہ اس

مسجد میں بھی وہی ضروریات موجود ہیں جو ہر ایک مسجد میں پائی جاتی ہیں؛ محراب کسی مسجد میں اس سے
پیشتر نہ تھی؛ سب سے پہلی محراب جامع دمشق میں تعمیر ہوئی؛ یہ امر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ عربیوں نے
محراوں کے مختلف نقشے پیدا کیئے؛ اس سے پیشتر محراب کی صورت صرف نصف دائرہ کی تھی؛ اور اس
دائرہ میں کسی قسم کا تغیر ممکن ہی نہ تھا؛ اور اس لیئے یونانی اور رومی صنعت کو کبھی وہ آزادی نصیب
نہیں ہوئی جو عربیوں کی دماغی طاقت نے پیدا کی؛ عربی محراب کی بنیاد عموماً خط مستقیم پر ہے جسمیں صنعت
آزادانہ اپنے جوہر دکھا سکتی ہے؛ جامع دمشق کی شکل مستطیل تھی؛ ابن جبیر اور ابن بطوطہ نے اس کا طول تین
سو ذراع اور عرض دو سو ذراع لکھا ہے یعنی ۱۶۳ گز لمبی اور ۱۰۸ گز چوڑی ہے؛ ذیل کا نقشہ اس مسجد کی
بنیادی صورت کو واضح طور پر بیان کرے گا؛ یاقوت لکھتا ہے کہ اس عالیشان مسجد کی یہ عجب خوبی ہے
کہ اگر کوئی شخص سو سال تک اس کے حسن صنعت اور اختلاف پر تامل کرے تو ہر روز وہ ایک نہ ایک
نئی بات دیکھے گا جو پیشتر نہ دیکھی ہو؛ یعنی اس قدر عرصہ دراز تامل کے ساتھ دیکھنے سے بھی ناممکن ہے
کہ انسان اس عمارت کی تمام مختلف خوبیوں کو معلوم کر سکے؛ عجائبات دنیا چار ہیں قنطرہ سنجہ؛ منارہ اسکندریہ
کنیسۃ الرہا؛ اور مسجد دمشق؛ ایک زندہ دل کا قول ہے کہ کچھ تعجب نہیں اگر اہل دمشق میں سے کسی شخص کے
دل پر جنت کا شوق غالب نہ ہو؛ کیونکہ ان کی آنکھوں کے سامنے مسجد دمشق کا حسن ہمیشہ رہتا ہے۔ جو سنگ
رخام کے ستونوں پر قایم ہے جسکے دو طبقے ہیں؛ پائین طبقہ کے ستون بہ نسبت اعلےٰ طبقہ کے ستونوں
کے زیادہ بلند ہیں؛ اور ان دونوں طبقوں کے درمیان یہ صورت ہے کہ کل دنیا کی حسن صنعت اور کارخانہ قدرت
کی خوبیاں جمع ہیں؛ اور زرنگار، مرصع، عمارت میں مختلف رنگوں کی ایسی کیفیت ہے جو دیکھنے والے کے
قلب میں فرحت افزا خیالات کا ہجوم پیدا کرتی ہے؛ جامع اموی جامع المحاسن کامل الغرائب اور عجوبہ روزگار
ہے؛ سنگ رخام کا فرش جسمیں پتھروں کو احسن ترکیب اور نظام سے پیوستہ کیا گیا ہے؛ اور اسپر صنعت
نے چاندی سونے کے پھول اس طرح نثار کیئے ہیں کہ دل باغ باغ ہو جاتا ہے؛ حیوانی صورتوں سے
یہ مقدس مقام منزہ ہے البتہ قدرتی نظارے بیشمار ہیں؛ بیل بوٹوں کی اس قدر کثرت ہے کہ ایک گلشن
کھلا ہوا ہے؛ مگر اس شگفتہ گلشن کی بہار کو کبھی خزاں کا ڈر نہیں؛ اور وہ خرابی جو اشجار و اثمار میں قدرتاً پیدا
ہوتی ہے اس عمارت کی صنعت اسکی مانع ہے۔ پھول مرجھا جاتے ہیں؛ پتے جھڑتے ہیں؛ درخت
گر پڑتے ہیں لیکن یہ "بل باقیۃ علی طول الزمان، مدرکۃ بالعیان، فی کل اٰوان" انقلاب زمانہ، تصرف دہر

کا اسپر کچھ اثر نہیں، درخت پانی سے پرورش پاتا ہے لیکن انہیں اسکی ضرورت نہیں، کیونکہ اس صنعت کی آب کا چشمہ در و دیوار پر لہریں لیتا ہے، اور کبھی خشک نہیں ہوتا، یہ شاعرانہ خیالات نہیں بلکہ محسوسات کا اثر ہے جو قلب میں ایسی کیفیتیں پیدا کرتا ہے کہ الفاظ میں انکا اظہار مشکل ہے، اسکی صنعت دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے، عین وسط میں محراب مسجد کے سامنے "قبۃ النسر" ہوا میں اٹھتا ہوا نظر آتا ہے، دمشق اور اس کے گرد و نواح کا نظارہ جہاں تک نظر کام کر سکتی ہے، "قبۃ النسر" پیش کرتا ہے، بلحاظ بلندی اور بوجہ مشابہت صورت اس قبہ کا نام "نسر" نہایت موزون ہے، تمام شہر میں اس سے زیادہ بلند کوئی عمارت نہیں، بقول ابن بطوطہ یہ ایک سیسہ کا برج ہے جو چھ سنگ مرمر کے ستونوں پر قایم ہے ابن جبیر اسے "قبۃ الرصاص" لکھتا ہے، ان ستونوں کی محرابوں میں ایسی دلاویز خوبصورتی ہے کہ جو بیان نہیں ہو سکتی، مہندسین نے اس مسجد کو اس وضع و اندازے سے بنایا ہے کہ تمام عمارت نسر طائر کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے، یہ قبہ اس کا سر ہے اور دونوں جانب "رواق" اسکے پھیلے ہوئے بازو ہیں جس طرف سے دیکھو یہی نظر آتا ہے کہ "عقاب" ہوا میں اڑ رہا ہے، مسجد کا صحن جسپر صنعت نے حسن و خوبی کو مکمل کر دیا ہے سوگز چوڑا ہے، اسپر سنگ رخام کے چون ستون کھڑے ہیں، جنکے درمیان چودہ پیل پائے سنگ مرمر کے واقع ہیں، انپر عالیشان محرابیں صنعت کی خوبیوں کا اختلاف ظاہر کرتی ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے بیش قیمت مختلف رنگ کے سرخ، سبز، زرد، سفید، سیاہ، پتھروں اور نگینوں سے جس سے یہ ستون اور محرابیں مرصع اور مزین ہیں آسمان کی زینت فرش مسجد پر نازل ہوا چاہتی ہے، المختصر

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ مے نگرم
کرشمہ دامن دل میکشد کہ جا اینجاست

علاوہ بیشمار مختلف حسن صنعت کے جو عربی عمارت نے اختراع کئے قابل ذکر خوبی یہ بھی ہے کہ مختلف پتھروں کے اندر مختلف رنگ کی رگیں اس طرح پیدا کر دی ہیں کہ بالکل قدرتی معلوم ہوتی ہیں جو کسی غیر عربی عمارتوں میں نظر نہیں آتیں،

سٹینلی لین پول، جون رسکن، نے اعتراف کیا ہے کہ یورپ کی بہترین عمارت کا حسن جو گاتھک وضع پر تعمیر ہوئی ہے عربی وضع عمارت کا عکس ہے، فاضل روشن دماغ رسکن لکھتا ہے کہ عمارت کی زیبائش اور زینت دلی اور روحانی فرحت پیدا نہ کرے تو کیا ہے، لمبارڈ تو صرف سکاب کے شائق تھے، اور اس لئے

ان کی عمارتوں پر گھوڑے اور شکاری کتے اور دو گز کے فاصلہ پر آدمی نفیر بجاتے ہوئے نظر آتے ہیں،
اور رذیل وینس کی صنعت تو راگ رنگ کی دلدادہ ہے اس لئے انکی دیواروں پر موسیقی کے ساز اور
مضحکہ انگیز تھیٹر کے سامان دکھائی دیتے ہیں، بہرحال یہ کچھ نہ کچھ زیب و زینت کے اسباب تو ہیں انگریزی
صنعت تو بالکل سادہ ہے، انہیں کوئی چیز پسند ہی نہیں آتی جو ان کے خیالات پر مؤثر ہو، بات اصل
میں یہ ہے کہ ہمیں وہ چیز پسند کرنی چاہیئے جس میں صداقت پائی جائے، اور یہ اشیا کارخانہ قدرت
میں ہی ملیں گی جسکا انتظام صانع حقیقی کے ہاتھ میں ہے، جو کچھ اس نے پیدا کیا ہے وہ ہماری خوشی
اور قناعت کے لئے اس زمین پر خلق کیا ہے، حسن صنعت کی شرافت خالق حقیقی کے کاموں میں انسانی
خوشی کا اظہار ہے، عمارات کی یہی وہ خوبیاں ہیں کہ جسمیں انسان کی ذاتی صنعت کے آثار نمایاں ہوں
اور اپنی صنعت سے بہتر یعنی قدرت کے کاموں میں خوشی کا اظہار ہو" جامع اموی کے متعلق جو کچھ ہم نے
لکھا ہے کیا اس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ عمارت کی دونوں جامع و مانع خوبیاں جو رسکن نے بیان کی
ہیں صرف عربی صنعت نے نقش و نگار میں دکھادی ہیں؛

صنعت کی خوبیاں، اسکے حسن کی نوعیت، اختلاف، اور محل عربی وضع عمارت میں نظر آئے گا
رسکن نے بالکل صحیح کہا ہے کہ "کوئی عمارت "رنگ" کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتی، اور رنگ بھی قدرتی پتھروں
کا ہونا چاہئے، اور یہ اس لئے کہ زیادہ دیرپا اور زیادہ مکمل اور زیادہ خوش نما ہوتا ہے" آنکھوں کا نور، دل
کی ٹھنڈک، خوبصورتی ہے، اور خوبصورتی کا جزو اعظم رنگ ہے، جامع اموی کا رنگ جو قدرتی پتھر دار نے
پیدا کیا ہے وہ سب مسرت انگیز کیفیتیں ظاہر کرتا ہے جو قوس و قزح کے دیکھنے سے دل میں پیدا ہوتی ہیں،

"مرے" لکھتا ہے کہ اس عمارت میں تین زمانوں کی مختلف وضع صاف صاف نظر آتی ہے، شرقی
اور مغربی محرابیں اور دیوار کا وہ حصہ جو جنوب مغربی زاویہ پر واقع ہے، اور جنوبی خوبصورت دروازے یونانی
یا رومی وضع کی عمارتیں ہیں، اور بیرونی دیوار کا کچھ حصہ اور مدور دریچے، اور یونانی کتبے، عیسائی صنعت
کی یادگاریں ہیں اور گنبد، مینار، رواق، سنگین فرش، اور مرمری فوارے اسلامی مذاق اور اسلامی
سلطنت کے شاہد ہیں"، لیکن افسوس ہے کہ اسنے وہ موزونیت جو اس اختلاف کے ساتھ موجود ہے نظر انداز
کردی ہے جسکی وجہ یہ ہے کہ اس کا اس فن میں حصہ نہیں؛

سقف مسجد بلند ستونوں پر واقع ہے جن کا ذکر کیا گیا ہے، قبۃ النسر اسکے مین وسط میں نہایت

وقار سے سر اُٹھاتا ہے، اسکی چوٹی پر "ہلال" بنا ہوا ہے۔

مسجد کا یہ حصہ ۴۳۱ فٹ طول میں اور ۱۲۵ فٹ عرض میں ہے جسے ایک دیوار صحن سے جدا کرتی ہے۔ یہ دیوار ستونوں پر قایم ہے۔ اس حصہ مسجد کو محدب ستون تین حصوں میں تقسیم کرتے ہیں ہر ایک ۱۱۴ فٹ بلند ہے اپر محرابیں بنی ہوئی ہیں۔ وسط میں قبۃ النسر ہے جو چھ ستونوں پر قائم ہے ۱۲۰ فٹ کی بلندی پر یہ عظیم الشان گنبد واقع ہے اور مرکز میں اس کا محیط ۵۰ فٹ ہے۔

اس مسجد کے تین مینار ہیں ایک مشرقی اور دوسرے غربی جانب ہے اور تیسرا شمال رویہ ہے مینارہ مشرقی کے متعلق روایت مشہور ہے کہ حضرت عیسٰی کا نزول آسمان سے اسی جگہ ہوگا۔ اس روایت کے ماخذ جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں وہی مسیحی کتبے ہیں جو کنیسہ یوحنا میں مسیح کی آمد ثانی اور ابدی بادشاہت کی نسبت تذکرہ کرتے ہیں! خاص دمشق میں اور دمشق کے اس مینارہ پر آنحضرت کا نزول یعنی نہیں، عیسائی دنیا ایک عرصہ سے آسمان کی طرف آنکھیں لگائے بیٹھی ہے۔ اور یسوع مسیح کا راہ دیکھتی ہے۔ "از لے بلاَبرٹن" نے صاف صاف الفاظ میں لکھا ہے کہ عیسائی کہتے ہیں کہ مسیح اس مینارہ پر نازل ہونگے" اور اس فاسد عقیدہ کو اس حد تک شائع کیا ہے کہ اس متعدی مرض سے مسلمان بھی بچ نہ سکے۔ لیکن جب سے پہلے مسلمانوں کو دمشق میں اس عقیدہ کا علم ہوا۔ شام کے مشہور شہروں سے دمشق سب سے پہلے فتح ہوا اور اس جگہ راہبوں اور پرانے کتبوں کے ذریعہ عربی واقف ہوئے۔ ان کا عربی ترجمہ عام روایتیں اور بالآخر موضوع حدیثیں بن گئیں۔ ابن بطوطہ، یاقوت، اور کل مؤرخین کا اسپر اتفاق ہے کہ یہ مینار مسلمانوں نے تعمیر نہیں کیا بلکہ ان سے پیشتر رومیوں نے بنایا ہے۔ کچھ تعجب نہیں کہ ابتدا میں اس جگہ رومیوں نے ایک مینار بنایا ہو، اور اسپر اسی مضمون کے کتبے کندہ ہوں جو عیسائیوں کے عقاید کا اظہار کرتے ہیں لیکن یہ غلط ہے کہ وہی مینار آج تک اپنی اصلی حالت پر رہا ہو، خلیفہ ولید نے کنیسہ کی دیواروں، میناروں اور ہر ایک چیز کو گرا کر خاک کے برابر کر دیا تھا، اس کے بعد چار دفعہ اس مینار کو آگ لگی، یہ کسطرح ہو سکتا ہے کہ وہی ابتدائی رومی مینار آج تک قایم ہو، بیان کیا جاتا ہے کہ کنیسہ یوحنا کے چاروں گوشوں پر ایک ایک مینار تھا۔ جسے یونانیوں نے رصدگاہ بنایا ہوا تھا۔ اور ستاروں کی گردش کا حال معلوم کیا کرتے تھے، ممکن ہے کہ ایسا ہو، لیکن اگر یہ کام راہبوں کے ہاتھ میں تھا تو وہ صرف یسوع مسیح کی راہ دیکھتے ہونگے، ہم کہتے ہیں کہ وہ تمام روایتیں جو مسلمانوں نے زمان ماضی کے متعلق بیان کی ہیں

عموماً غلط ہیں اور صرف خوش اعتقاد یہودی اور عیسائی اسکے راوی ہیں۔ ہم نے عمداً ان بے سر و پا روایتوں کو جو جامع دمشق کے ایک ایک پتھر کی نسبت بیان کی جاتی ہیں نظر انداز کر دیا ہے، اگر ان پر بحث کریں تو ہم اپنے موضوع سے بہت دور جا پڑیں گے۔ یہ روائتیں عموماً جامع اموی کی مشہور زیارت گاہوں کے متعلق بیان کی جاتی ہیں۔ اسی مینار شرقی پر ایک پتھر پڑا ہے جسکی نسبت یاقوت لکھتا ہے کہ لوگوں کا زعم ہے کہ اس پتھر کا ٹکڑہ ہے جسپر حضرت موسٰی نے عصا مارا تھا اور جس سے بارہ چشمے جاری ہو گئے تھے۔ اور یہ بھی لکھتا ہے کہ کہتے ہیں کہ وہ منارہ جسپر حضرت عیسٰی نازل ہوں گے "منارۃ الشرقیۃ" مسجد دمشق نہیں بلکہ کنیسہ مریم کا ایک منارہ ہے۔ "منارۃ الغربیۃ" کا موجودہ نام "غزالیہ" ہے۔ غالباً حجۃ الاسلام ابو حامد الغزالی کے نام سے منسوب ہے۔ امام صاحب مدرسہ نظامیہ بغداد میں معلم تھے۔ فلسفہ یونانی کا چرچا اس وقت عام تھا۔ چنانچہ اس کا حملہ اسلام پر بھی ہوا۔ امام صاحب نے سائنس اور مذہب اسلام کو مطابق ثابت کیا۔ ابتدا میں فلسفہ کے بہت دلدادہ تھے۔ آخر تصوف کی طرف طبیعت مائل ہوئی۔ اور سب کچھ چھوڑ کر جامع دمشق کے اسی مینار غربی میں عبادت میں مشغول ہو گئے۔ "زاویہ غربی" اسی مینار کا ایک گوشہ ہے جہاں آپ درس دیا کرتے تھے۔ آپ سے پیشتر کئی ایک بزرگ اسی جگہ حدیث اور فقہ کا درس دیتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ جگہ زاہدوں اور عابدوں کے لئے مخصوص تھی۔ ابن تومرت ملک الغرب کی نسبت کہا جاتا ہے کہ مسلمانوں سے پیشتر اس جگہ موجود تھا اور یہاں ایک "ہیکل النار" تھی۔ اس سے آگ کے شعلے بلند ہوتے تھے۔ اہل حوران اسے سجدہ کیا کرتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس جگہ وہ مذبح سوختنی قربانی تھا جو شاہ یہوداہ "آحاز" کو پسند آیا اور جس کے نمونہ پر ہیکل سلیمانی میں ایک مذبح تعمیر کروایا۔ تیسرا منار شمالی ان دونوں مناروں سے چھوٹا ہے لیکن بقامت کہتر بقیمت بہتر ہے۔ اور دونوں سے زیادہ خوبصورت ہے اس کا نام "العروس" ہے۔ منارہ شرقی کے نیچے وضو کے واسطے جگہ بنی ہے اور قریب ہی ایک پانی کا حوض ہے۔ اسکے قریب قبر سلطان صلاح الدین یوسف ہے جس نے یوروپ کو صلیبی جنگوں میں نیچا دکھایا۔

یوں تو اس مقدس مقام کی ہر ایک چیز زیارت کے قابل ہے لیکن بعض مقامات بالخصوص بزرگوں کی تربت۔ جائے نشست۔ اور دیگر اسباب کے لحاظ سے متبرک ہیں۔ ان میں سے ایک تربت یحیٰی ہے۔ ابن بطوطہ نے اسی غلطی سے حضرت زکریا کی قبر خیال کیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتابت کی غلطی ہے

ورنہ ابن بطوطہ ایسے فاضل سیاح سے ایسی غلطی کی توقع نہیں ہوسکتی، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اسجگہ حضرت یحییٰ کا سر مدفون ہے، ہم بیان کرچکے ہیں یہ بھی ایک غلط روایت ہے، حضرت یحییٰ کی تربت ہمیشہ زیارت گاہ رہی ہے۔ لوگ اس جگہ اعتکاف میں بیٹھتے، شیخ سعدی علیہ الرحمۃ لکھتے ہیں کہ "در جامع دمشق بوتربت یحییٰ معتکف بودم" ابن بطوطہ لکھتا ہے کہ اس تربت پر سیاہ ریشم کا غلاف پڑا ہے جس پر سفید ریشم سے لکھا ہے کہ:-

"یا ذکریا انا نبشرک بغلام اسمہ یحییٰ"

ہودؑ کی قبر کا پتہ مسجد کی دیوار جانب قبلہ میں دیتے ہیں، یہ بالکل غلط ہے۔ یاقوت اور ابن بطوطہ دونوں اسکی تردید کرتے ہیں۔

اس جگہ ایک تربت خلیفہ ولید کی لڑکی کی ہے، اسکے پاس ایک یاقوت سرخ تھا، جسے یہ لڑکی بہت عزیز رکھتی تھی، بقضاء الٰہی سے مرگئی، والدہ نے کہا کہ یہ بیش قیمت جواہر بھی اسکے ساتھ دفن کردیا جائے۔ ولید کے حکم سے تربت پر ایک آبگینہ بنایا گیا جسکے اندر سورۃ "الھاکم التکاثر حتی زرتم المقابر الخ" سنہری حرفوں میں نہایت خوشخط لکھوائی، اور "مقابر" کے قاف میں اس یاقوت سرخ کو لگایا۔

بقول یاقوت "قبتہ النسر" کے نیچے دو عمود ہیں، لوگوں کا خیال ہے کہ بلقیس کے تخت کے پائے ہیں، افسوس ہے کہ یاقوت نے مفصل نہیں لکھا کہ یہ تخت کے پائے اس جگہ کس طرح پہونچ گئے، معلوم ہوتا ہے کہ یاقوت کو خود اس روایت پر یقین نہیں۔

اس مقدس مقام کو اور زیادہ متبرک بنانے کے لئے اہل دمشق نے ایسی باتیں بنائی ہیں جن کا کذب تواریخی واقعات ثابت کرتے ہیں، حضرت عائشہ صدیقہؓ کی قبر کا نشان بھی اس جگہ دیتے ہیں، چنانچہ غربی جانب ایک قبہ ام المؤمنین کے نام سے مشہور ہے، یاقوت اسکی تردید کرتا ہے اور کہتا ہے کہ صحیح یہ ہے کہ آپ کی قبر بقیع میں ہے، یہ قبہ سنگ مرمر کے آٹھ مرصع ستونوں پر قائم ہے اور سقف سیسہ کی ہے، یاقوت کا بیان صحیح ہے کہ اسے "بیت المال الغربیہ" کہتے تھے۔ اس جگہ جامع مسجد کی آمدنی اوقاف جمع رہتی تھی، بقول ابن بطوطہ سالانہ پچیس ہزار دینار سرخ ان اوقاف کی آمدنی ہے، اسکے بالمقابل جانب غرب ایک اور اسی وضع کا قبہ ہے، جسے قبہ زین العابدین کہتے ہیں، غالباً امام صاحب نے جب یزید کے زمانہ میں کربلا سے اسجگہ تشریف لائے نماز پڑھی تھی، اور کچھ عرصہ اسی جگہ مقیم رہے۔

تیسرا قبہ وسط صحن میں سنگ سرخ کا ہشت پہلو شکل کا ہے، اسکی سرخی شوخ مگر نہایت دلاویز ہے،
اس کے ساتھ ایک فوارہ ہے جس کا پانی بہت بلندی تک اچھلتا ہے، اور ایسا معلوم ہوتا ہے
کہ چادر مہتاب آویزاں ہے، چونکہ اسکے گرد ایک لوہے کی جالی لگی ہوئی ہے اس لئے اسے
"قفص الماء" کہتے ہیں۔ لوگ اس کے ساتھ منہ لگا کر پانی کے قطرات پیتے ہیں۔ اور محظوظ ہوتے ہیں"

اس مسجد میں بیش قیمت اور نادر چیز وہ قرآن شریف ہے جسکی ایک جلد حضرت عثمانؓ خلیفہ سوئم نے
شام میں بھیجی تھی، بقول یاقوت یہ قرآن شریف خلیفہ کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، ابن بطوطہ لکھتا ہے کہ
یہ مصحف ایک حجرہ میں مقفل رہتا ہے، ہر جمعہ کو بعد نماز کھولا جاتا ہے، زیارت کے واسطے لوگوں کا ہجوم
ہوتا ہے، جو فرط شوق سے بوسہ دیتے ہیں اور اسی مقام پر مدعی مدعا علیہ سے حلف لیتا ہے،

خلیفہ ولید نے اس مسجد کے چار دروازے بنوائے، مشرقی دروازہ کا نام "باب جیرون" اور جانب
غرب "باب البرید" بقول ابن عساکر عام آمد و رفت کا راستہ جانب جنوب تھا، اس میں دو رویہ ستونوں
پر تین محرابدار دروازے ایک دوسرے کے سامنے تھے، "باب البرید" تمام دروازوں سے زیادہ بارونق ہے
اکثر شعراء نے اسکے وصف میں شعر لکھے ہیں، یاقوت کا ہمعصر شاعر علی بن رضوان الساعاتی کہتا ہے:-

المیت سلیمی والنسیم علیل ... فخیل لی ان الشمال شمول
کان الخزامی صفقت منہ قرقفاً ... فللسکر اعناق المطی تمیل
فلا قف جون ماتلاقی قصیرۃ ... ولیل مشوق بالغرام طویل
شدید الی باب البرید حنینہ ... ولیس الی باب البرید سبیل
دیار نا اماماؤھا مصیفق ... زلال واما ظلھا فظلیل
تحلت وما قولی تحلت تعجبا ... ھل الحب الا لوعتہ ونحول

اس دروازہ کے سامنے ایک بازار سوق البرید کے نام سے مشہور ہے اسکے وسط میں ایک گنبد
بلند ستونوں پر قائم ہے جسکی پیشانی پر لکھا ہے:-

عرج رکابک عن دمشق فانھا ... بلد تذل لھا الاسود وتخضع
اپنے مرکب کو دمشق سے واپس لے جا۔ ... یہ ایسا عظیم الشان شہر ہے کہ اس جگہ عالی قدر
لوگوں کو بھی کوئی نہیں پوچھتا،

مابین جابیها و باب برید ها   قمر یغیب و الف بدر تطلع

جابیہ اور باب برید کے درمیان   اگر ایک قمر غروب ہو تو ہزار بدر طلوع ہوتے ہیں۔

اور قبلہ میں "باب الزیادۃ" اور قبلہ کے مقابل "باب الناطفانیین" ہیں، "باب الزیادۃ" کو باب العمرانی اور باب الساعات اور باب الجامع بھی کہتے ہیں، اس جگہ اس برجی کا ٹکڑہ ہے جسکی نسبت کہا جاتا ہے کہ خالد بن الولید کی ہے، باب الساعات پر ایک غرفہ بنا ہوا ہے جسمیں چوبیس کھڑکیاں لگی ہوئی ہیں اندر کی طرف انکا رنگ سبز اور باہر کی طرف زرد ہے، ایک ایک گھنٹہ کے بعد ایک ایک کھڑکی کا رنگ بدل جاتا ہے یعنی سبز رنگ باہر نظر آتا ہے، اور زرد رنگ اندر کی طرف ہو جاتا ہے اس سے وقت شمار کرتے ہیں، یہ اس زمانہ کی نادر صنعت تھی مگر غالباً بنو امیہ کے زمانہ میں یہ غرفہ تعمیر نہیں ہوا، ابن بنامۃ کہتا ہے :۔

لدی الحسن مجموعاً بجامع جلق   میں حسن کو جامع جلق (دمشق) میں جمع دیکھتا ہوں،

و فی صدرہ معنے للملاحۃ مشروح   اور اسکے صحن میں ملاحت کے معانی کی شرح دیکھتا ہوں،

فان یتعالی بالجوامع معشر   اگر لوگ جوق جوق جامع دمشق کی طرف آئیں۔ توکہدو

فقولوا لہم باب الزیادۃ مفتوح   کہ باب الزیادۃ کھلا ہے،

المختصر یہ مسجد اپنا آپ ہی نظیر ہے۔ واللہ در قائل -

قاسوا حماۃ بجلق فاجبتہم   انہوں نے حماۃ کو جلق (دمشق) پر قیاس کیا۔ میں نے

ہذا قیاس فاسد و حیاتکم   جواب دیا کہ تمہارا قیاس فاسد ہے، تمہاری زندگی کی قسم۔

فعروس جامع جلق ما مثلها   جامع مسجد دمشق ایک عروس ہے جسکا مثل کہیں نہیں،

شتان بین عروسنا و حماتکم   ہماری عروس اور تمہارے حماۃ میں زمین و آسمان کا فرق ہے،

اس مسجد پر بہت کچھ تغیر واقع ہو چکا ہے، لیکن اسکی وضع میں کچھ فرق نہیں، خلیفہ عمر بن عبد العزیز نے ایک دفعہ خیال کیا کہ مسجد میں سونے اور چاندی کی اشیا اس قدر بافراط موجود ہیں جنکا اس جگہ کچھ فائدہ نہیں، بہتر ہو کہ سونے اور چاندی کی زنجیروں کے عوض اسی سے کام لیا جائے۔ اور بیش قیمت اشیا بیت المال میں رکھی جاویں کہ مسلمانوں کے کام آویں، اتفاق سے قیصر روم کا سفیر دمشق میں وارد ہوا، مسجد اموی کا شہرہ بہت کچھ سن چکا تھا، درخواست کی کہ دیکھنے کی اجازت ملے۔ جو منظور

کی گئی، دس آدمیوں کے ہمراہ باب البرید میں داخل ہوا، خلیفہ کی طرف سے چند آدمی ساتھ تھے جو یونانی زبان جانتے تھے، مدعا یہ تھا کہ جو کچھ سفیر اپنے رفقا سے کہے اسکی اطلاع خلیفہ کو دی جائے، سفیر دم صحن میں آیا اور جب سر اٹھا کر اپنے سامنے وہ دلکش نظارہ دیکھا جسے بالاختصار ہم بیان کر چکے ہیں تو بت کی طرح بن گیا، عرصہ تک اسپر حیرت طاری رہی، بعد ازاں اس کا رنگ فق ہو گیا، اور اپنے رفقا کو مخاطب کر کے کہا کہ میں نے خیال کیا تھا کہ دمشق میں اہل عرب کی عمارت کی بنا ایک قلیل عرصہ کے لئے قائم کی ہے لیکن اب جو کچھ میں اس وقت دیکھ رہا ہوں، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ دنیا کے ساتھ اس مسجد کا قیام بھی ہمیشہ رہے گا، خلیفہ کو سفیر کی حالت اور گفتگو کی اطلاع دی گئی تو کہا کہ "بیشک یہ مسجد کفار کے غیظ کا باعث ہے" اسکے بعد اپنا ارادہ ترک کر دیا، اور چاندی اور سونے کی قندیلیں بنوا کر مسجد میں آویزاں کرا دیں، آخری جملہ سے ہمیں اتفاق نہیں یہ خلیفہ ولید ہی کا کام تھا اور اس نے ایسی قندیلیں مسجد میں بیشمار موقع و محل پر لگوا دی تھیں جو رات کے وقت اس عمارت کو بقعۂ نور بنا دیتی تھیں، اور نقش و نگار سقف پر شب ماہتاب کا لطف پیدا کرتی تھیں،

یاقوت لکھتا ہے کہ ۴۶۱ھ تک اس مسجد کے حسن میں کچھ تغیر واقع نہ ہوا تھا، لیکن اس وقت مسجد کے قریب ایک گھر کو آگ لگ گئی، اسکے شعلے مسجد کی دیواروں تک پہونچے، اس کا اثر یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ تمام مسجد آتشکدہ بن گئی، اہل دمشق نے بہت کوشش کی مگر بے سود، وہ ابتدائی حسن شباب جاتا رہا،

گیا حسن خوبان دلخواہ کا

ہمیشہ رہے نام اللہ کا،

جامع اموی اب بھی موجود ہے اور بےنظیر عمارت ہے، لیکن آہ! خلیفہ ولید ثانی کوئی نہیں ہوا، جو اسے از سرِ نو اسی رنگ میں جلوہ دیتا جیسا کہ یہ کسی وقت تھی،

خلافت اموی کے دور دورہ میں دمشق میں بیسیوں مسجدیں تھیں اور انکی خوبصورتی بھی قابل رشک تھی، ان میں سے "الجامع المعلق" "جامع المصلی" اور "جامع البدرقیہ" مشہور مسجدیں تھیں، اور غالباً جامع اموی سے پہلے انکی تعمیر ہوئی، "جامع المصلی" میدان میں واقع ہے، کہتے ہیں کہ یہ دمشق میں سب سے پہلے تعمیر ہوئی، معلوم ہوتا ہے محاصرہ کے وقت ابو عبیدہؓ بن الجراح اور دیگر مسلمان اسجگہ نماز پڑھا کرتے تھے، اور فتح دمشق کے بعد اسی جگہ ایک مسجد تعمیر کی، اور غالباً اسی مسجد میں نماز جمعہ اور

عید اہل دمشق ادا کرتے تھے، "جامع البدرقیہ" مسجد اموی کے قریب واقع ہے، کہتے ہیں کہ اس جگہ رومی گورنر کا ایک محل تھا جہاں بیٹھ کر وہ عدالت کیا کرتا تھا، ممکن ہے کہ یہ بھی کوئی گرجا یا کنیسہ ہو، عربوں نے اسے معمولی تغیر و تبدل کے بعد مسجد بنا لیا، پُرانی عمارت کے ستون اس وقت بھی دیواروں میں نظر آتے رہیں، یاقوت مسجد خاتون اور اسکے متعلق ایک قریہ "صنعا" کا ذکر کرتا ہے کہ اس وقت اس کے کہیں کہیں آثار ملتے ہیں، جنپر لوگوں کے باغات اور اراضیات واقع ہیں، یہ مسجد اور قریہ بیرون باب دمشق تھا، اور ایک جماعت محدثین کے نام بھی لکھتا ہے جو اس قریہ میں رہایش رکھتی تھی،

"دمشق کی نہریں"

دمشق کی رونق اور سرسبزی کا باعث دمشق کی نہریں ہیں، پانی کی یہ کثرت ہے کہ کوئی جگہ اس سے خالی نہیں، کوئی مسجد، کوئی خانقاہ، کوئی مدرسہ، کوئی مکان، دمشق میں ایسا نہیں جہاں ان نہروں نے اپنا پانی نہ دیا ہو، ہر ایک مکان کے صحن میں حوض ہیں جو ہر وقت پانی سے لبریز رہتے ہیں، فوارے چھوٹتے ہیں، اور با مذاق اہل دمشق ان کے گرد تکیہ لگائے بیٹھتے ہیں، ویسے تو پانی ہر ایک چیز کی جان ہے، لیکن اہل دمشق کی زندگی اور زندگی کا لطف یہی نہریں ہیں ابن جبیر نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ یہ شہر زبان حال سے کہہ رہا ہے، کہ آؤ اسی جگہ قیام کرو، اس سے بہتر کوئی آرام گاہ نہیں، چشموں اور نہروں کی کثرت سے سرزمین دمشق اسی آسودہ اور سیراب کہ اسے "تشنگی" کی حقیقت معلوم کرنے کا اشتیاق ہو تو کچھ تعجب نہیں، سیر حاصل زمین کا تو کیا ذکر ہے، سنگلاخ زمین بھی بوجہ شادابی کہہ رہی ہے کہ اعجاز موسوی مجھ میں ہے، ذرا ٹھوکر دو اور دیکھو کہ کس طرح پانی پھوٹ پھوٹ کر نکلتا ہے،

وکل وادٍ بہ موسیٰ یفجرہ	ہر ایک وادی میں اعجاز موسوی اپنا کام کر رہا ہے کہ پتھریلی زمین
وکل روضٍ صافاتہ الخضر	سے چشمے پھوٹ پھوٹ کر نکلتے ہیں، اور ہر ایک باغ کے کنارہ
	پر خضر موجود ہے، جو آب حیات سے باغات کو سیراب کرتے ہیں کہ
	ہر وقت سرسبز نظر آتے ہیں،
یتسلسل فیہا ماءھا وھو مطلق	اگرچہ (نہروں میں) پانی جکڑا ہوا ہے مگر اسکے ساتھ مطلق العنان بھی ہے
وصح نسیم الروض وھو علیل	باغات کی ہوا کا اگرچہ مزاج صحیح ہے مگر علیل بھی ہے،

یعنی اگرچہ بظاہر پانی نہروں کے کناروں میں محدود معلوم ہوتا ہے مگر چونکہ ہر وقت جاری ہے
اس لئے اس روانی کے باعث مطلق العنان ہے اور نسیم گلشن کے زم زم جھونکے بقول اوستاد
ذوق :-

واہ واہ کیا معتدل ہے باغ عالم کی ہوا
مثل نبض صاحب صحت ہے ہر موج صبا

چونکہ تیز رفتار نہیں اور اس طرح چلتے ہیں جس طرح بیمار قدم اٹھاتا ہے۔ اسلئے اگر انہیں علیل کہا جائے
تو بھی بجا ہے، متضاد امور دمشق کی آب ہوا میں پائے جلتے ہیں مگر با ایں ہمہ دونوں خوبیاں ہی ہیں۔
پرانے عہد نامہ کا ایک قصہ مشہور ہے، کہ شاہ دمشق کا سپہ سالار نعمان ایک بہادر اور مدبر آدمی
تھا۔ اس شخص کے وسیلہ سے "ارام" کو آزادی نصیب ہوئی تھی۔ اسرائیلوں سے اکثر لڑائیاں ہوئیں
ایک دفعہ ایک اسرائیلی لڑکی کو اسیر کرکے لایا، جو اسکی زوجہ کی خدمت کیا کرتی تھی، نعمان مرض جذام میں
مبتلا تھا، یہ موذی مرض وبال جان تھا۔ حکما روقت کے علاج معالجہ سے کچھ فائدہ نہ ہوا، آخر نعمان
مایوس ہوگیا، اس اسرائیلی لڑکی نے ایک دن نعمان کی زوجہ سے حضرت الیسع کے معجزات کا ذکر
کیا اور کہا کہ "اگر میرا مالک اس نبی کے پاس جاتا جو "سمرون" میں ہے تو وہ اسے شفا بخشتا"۔
نعمان نے ایک خط شاہ دمشق کیطرف سے شاہ اسرائیل کو اس مضمون کا بھجوایا کہ "میں اپنے خادم نعمان کو
تیرے پاس بھیجتا ہوں، تاکہ تو اس کا جزام رفع کر دے"۔ نعمان اس خط کے ساتھ دس قنطار چاندی،
اور چھ ہزار مثقال سونا لیکر شاہ اسرائیل کی خدمت میں آیا۔ شاہ اسرائیل نے کہا کہ "میں خدا ہوں
کہ زندہ کروں اور ماروں، شاہ دمشق مجھ سے لڑائی کا بہانہ ڈھونڈھتا ہے"۔ حضرت الیسع کو اس
حال سے مطلع کیا گیا، تو نعمان کو بلایا۔ اور کہا کہ "جا۔ اور یردن میں سات بار غوطہ مار کہ تیرا بدن اپنی
اصلی حالت پر آئے گا، اور تو پاک صاف ہوگا"۔ نعمان یہ سُنکر ملول ہوا اور یہ کہتا ہوا چلا کہ "دیکھو ابانہ
اور فرفر دمشقی نہریں اسرائیل کے تمام پانیوں سے کہیں بہتر نہیں ہیں؟ کیا میں ان میں نہا دھو نہیں سکتا،
کہ شفا حاصل کرسکوں؟" (۲ سلاطین باب ۵)

اگرچہ نعمان کو یردن میں غوطہ لگانے ہی سے شفا حاصل ہوئی۔ لیکن اسمیں یردن کی کوئی خوبی
نہیں تھی، حضرت الیسع نبی کا معجزہ تھا۔ مگر نعمان کا یہ خیال کہ دمشقی نہریں "ابانہ" اور "فرفر" اسرائیل کے

تمام دریاؤں اور نہروں سے کہیں بہتر ہیں بالکل صحیح تھا؛ یہ دونوں نہریں قدیم الایام سے سرزمین دمشق کو سیراب کرتی ہیں ان کا موجودہ نام "بردی" اور "اعوج" ہے؛ اس وقت نہر ابانہ دمشق کے شمال مغرب سے آتے ہوئے شہر میں داخل ہوتی تھی، اور شہر کے گذر کر مشرق کی طرف رخ کرتی؛ بعد ازاں بیضوی شکل میں پھر مغرب کی طرف لوٹتی؛ اور اس طرح تمام دمشق کی زمینوں کو سیراب کرتی تھی، معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت دمشق کی حدود اس نہر تک پھیلی ہوئی تھیں؛

دمشق کی زمینوں کو سات نہریں سیراب کرتی ہیں، انہیں سے "بردی" سب سے بڑی ہے، اور فی الحقیقت باقی چھ نہریں اسکی شاخیں ہیں، ان کے نام یہ ہیں، نہر یزید، نہر وبرانی، نہر ثورا، نہر قنوات، نہر بانیاس، اور نہر عقربا۔ ان نہروں کو ایک شاعر نے اس طرح منظوم کیا ہے؛

شوقی یزید ودمع الصب ما بردا — میرا شوق بڑھا ہوا ہے اور آنسو عاشق کی طرح گرم ہیں، لیکن
وبان یاس من المحبوب حین بدا — جس وقت محبوب سامنے آتا ہے یاس مفقود ہو جاتا ہے

یعنی ہجر میں میری یہ کیفیت ہے کہ فرط شوق سے بیقرار ہوں اور وہ مایوسی جو ہر ایک عاشق کو لاحق ہوتی ہے مجھ خوں گشتہ آنسو لاتی ہے لیکن یاس اور ناامیدی جب محبوب سامنے آتا ہے خوشی سے متبدل ہو جاتی ہے؛

ومدمعی قنوات والعذول حکی — میرے بڑے بڑے قطرات اشک انگور کے دانوں کی طرح جاری
ثورا ابلوم العقم فی عشق حلا — ہیں، اور ناصح کی حماقت تو دیکھو کہ نوجوان کو اس گانے والی
علی مغنیۃ ما الحبک جاوبہا — عورت کے عشق پر ملامت کرتا ہے جو اسے پیغام وصل دیتی اور
دبخلہا مات فی خلخالہا لکدا — جسکے خلخال پاکی آواز پر رقیب نے جان دیدی؛

انہی نہروں کے ناموں کو عماد ابو عبد اللہ محمد بن محمد الاصفہانی نے اسی صنعت کے ساتھ مگر بہتر مضمون اور پیرایہ میں باندھا ہے :-

الی ناس بانیاس لی صبوۃ
لہا الوجد داع وذکری مشیر

يزيد اشتياقي وينمو كما
يزيد يزيد وثورا يشور
ومن بردى برد قلبي المشوق
فها انا من حره مستجير

بردی کا تلفظ "بردیا" بھی ہے۔ راعی نمیری کہتا ہے۔

ومن كانسين وادى القطن اسوقه   واعتم من بردّيا بين افلاج۔

مگر وہ نام جو زبان زد خلایق رہا "بردی" ہی ہے۔ جریر کہتا ہے۔

لا ورد للقوم ان لم يعرفوا بردى   اذا تجوب عن اعناقها السدف

نہر بردی کا منبع قریہ "قنوا" میں دمشق میں پانچ فرسخ کے فاصلہ پر ہے۔ "قنوا"۔ علاقہ "زبدانی" میں واقع ہے جو "بعلبک"۔ اور دمشق کے مابین ہے۔ اس مقام پر "بعلبک" کے چشموں کا پانی اس سے آملتا ہے۔ زبدانی جبل الشرقی میں ایک نہایت پُرفضا جگہ ہے۔ ایک وسیع میدان اس پہاڑی سلسلے میں پھیلا ہوا ہے۔ قصبہ زبدانی اسکے بالائی حصہ پر واقع ہے۔ اسی وادی میں قریہ "قنوا" کے قریب نہر بردی کا چشمہ ہے۔ پہاڑ کے پہلوؤں سے پانی زور سے بہتا ہوا نکلتا اور قدرتی چشموں کے پانی سے جو مختلف مقامات سے پھوٹتے ہیں۔ نہر بردی کی ابتدائی صورت دامن کوہ سے پیدا ہوتی ہے بڑے بڑے درختوں کے جھنڈ اور سبزہ زار نے اس مقام کو نہایت پُرفضا بنا رکھا ہے۔ زبدانی سے گذر کر "وادی شغ" اور "وادی الذہب" میں اترتی ہے۔ ان وادیوں کو طے کرکے پھر واپس لوٹتی ہے۔ اور ایک چکر لگا کر پھر آگے بڑھتی ہے۔ دمشق سے ۲ دو فرسخ کے فاصلہ پر ایک قریہ "فیجہ" پر آتی ہے۔ اس جگہ اس میں دیگر چشموں کا پانی اسکا حجم زیادہ کر دیتے ہیں۔ بردی اسجگہ سے رواں دواں آگے بڑھتی ہے۔ اور قریہ "بسیمہ" کے سامنے ظاہر ہوتی ہے۔ اس مقام پر ایک چشمہ نہایت صاف شفاف اور خوش ذائقہ پانی کا ہے۔ اسے "عین الخضرا" کہتے ہیں۔ اس چشمے سے ایک ندی ایک پُر فرامز غرار میں بہتی ہوئی نہر بردی سے آملتی ہے۔ بردی بسیمہ کا پانی لیکر ایک اور قریہ پر پہونچتی ہے اسے "حمرایا" کہتے ہیں۔ اسجگہ چند چھوٹی چھوٹی شاخیں بردی سے نکلتی ہیں۔ پانی کا اکثر حصہ تو بردی بہا لیجاتی ہے۔ باقی پانی "نہر یزید" کے حصہ میں آتا ہے۔ بعض مورخین نے غلطی سے اس نہر کو

یزیدؓ بن ابی سفیانؓ کے نام سے منسوب کیا ہے؛ ہماری رائے میں یاقوت نے صحیح لکھا ہے۔ کہ یزید بن معاویہ اسے جبل قاسیون سے لایا، "بردی" آگے چل کر "دمر" پر آتی ہے، اس جگہ اس سے دو اور شاخیں پھوٹتی ہیں جسے "دبرانی" اور "تورا" کہتے ہیں، کچھ دور آگے چل کر پھر تین شاخوں میں منقسم ہو جاتی ہے، بڑی نہر کا نام تو وہی "بردی" برقرار رہتا ہے، اور ایک کو قنوات اور دوسری کو "باناس" کہتے ہیں؛ "بردی" اسی رفتار سے شہر کے سامنے آتی ہے اور قلعہ کی دیواروں کے نیچے اس سے ایک اور شاخ نکل کر اسکے ساتھ شہر میں داخل ہوتی ہے؛ اسے "عقربا" کہتے ہیں، پھر باب توما سے نکل کر "بحیرۃ المرج" کا راستہ لیتی ہے؛

نہر قنوات اور باناس کا پانی نالیوں کے ذریعہ شہر میں آتا ہے، اور بازاروں، عبادت گاہوں، حماموں اور گھروں سے گذر کر جو باب الصغیر اور باب شرقی کی طرف واقع ہیں۔ زائد پانی باب توما سے باہر نہر بردی میں گرتا ہے؛

نہر باناس کے وصف میں حسن بن عبداللہ بن ابی حصینۃ کہتا ہے۔

یا صاحبی نشقی منازل جلق	غیث یردی محلات طساسھا
فروافی جامعھا فباب بریدھا	فمشارب القنوات من باناسھا

نہر دبرانی جو دمر کے قریب "بردی" سے جدا ہوتی ہے "دارایا" کی جانب رخ کرتی ہے، اور ندی نالیوں کے ذریعہ میدان کو سیراب کرتی ہے؛

نہر یزید جبل قاسیون سے نکل کر اور بردی کا کچھ زائد پانی لے کر "صالحیہ" کے باغات کو سیراب کرتی ہے اور اس جگہ قرنیہ کی زمینوں اور گھروں کو بھی پانی دیتی ہے؛

نہر تورا شمالی باغات دمشق کو پانی دیتی ہے؛ اور بعد ازاں دو شاخوں میں شہر کی طرف آتی ہے اور بعض قریوں اور باغوں کو سیراب کرتی ہوئی آگے نکل جاتی ہے؛

یہ تمام نہریں ایک دوسرے سے جدا ہو کر اور پھر باہم مل کر دمشق کی زمینوں کو سیراب کرتی ہیں اور بالآخر "بحیرۃ المرج" میں بردی کے ہمراہ مل کر گرتی ہیں؛ "بحیرۃ المرج" غوطہ کے مشرق میں دمشق سے پانچ فرسخ یعنی قریباً بیس میل ہے؛

نہر "بردی" جو تمام دمشق کے باغات کی شادابی اراضیات کی سرسبزی۔ اور غوطہ کی منظر شگفتگی

اور شہر میں پانی کی کثرت کا باعث ہر شعرا کے کلام میں بھی وہی حسن، وہی لطف، وہی روانی، وہی شیرینی پیدا کرتی ہے جو قدرت نے اسکی طبع میں ودیعت رکھا۔ ذی القرنین ابی المطاع بن حمدان کہتا ہے:-

سقی اللہ ارض الغوطتین و اھلھا

فلی بجنوب الغوطتین شجون

وما ذقت طعم الماء الا استخفنی

الی بردی والنیربین حنین

وقد کان شکی فی الفراق یروعنی

فکیف یکون الیوم وھو یقین

فو اللہ ما فارقتکم قالیا لکم

ولکن ما یقضی فسوف یکون

ایک اور "نہر البریص" کی نسبت بھی کہا جاتا ہے کہ دمشق کی نہروں میں سے ہے۔ یاقوت اسکی تردید کرتا ہے کہ اس نام کی کوئی نہر دمشق میں نہیں۔ حسانؓ بن ثابت مداح رسول اللہ کہتے ہیں:-

للہ در عصابۃ نادمتھم یوما بجلق فی الزمان الاول

وہ جماعت کیا ہی اچھی تھی جسکے ساتھ مل کر میں نے شراب پی تھی یہ ابتدائی زمانہ کا تذکرہ ہے کہ دمشق میں واقعہ ہوا۔

اولاد جفنۃ حول قبر ابیھم قبر ابن ماریۃ الکریم المفضل

وہ لوگ جفنہ کی اولاد ہیں جو کہ اپنے باپ کی قبر کے ارد گرد تھے، اور وہ قبر ابن ماریہ کی تھی جو نہایت ہی کریم و فضل والا تھا۔

یسقون من ورد البریص علیھم بردی یصفق بالرحیق السلسل

اور جو لوگ ان کے پاس آتے وہ ان کو نہر بردی کا پانی پلاتے جو خالص شراب کو شرمندہ کرتا ہے۔

یاقوت لکھتا ہے کہ حسان بن ثابت کا مطلب نہر بردی سے پانی پینے کا ہے۔ اور در حقیقت "البریص" غوطہ دمشق کا نام ہے جیسا کہ اس مصرعہ میں کہا گیا ہے۔

"ولا سرطان انھار البریص"

بقول یاقوت امرئ القیس کے ایک شعر میں "البریض" ضاد معجمہ کے ساتھ ہے۔ مسعودی مروج الذہب میں لکھتا ہے کہ "البریض" دمشق میں ایک ہیکل تھا جسکے آثار وسط شہر میں اب بھی پائے جاتے ہیں۔

شعرائے ملوک غسان کی مدح میں اسکا بھی ذکر کیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ "البریص" یا "البریض" ایک قدیم مشہور معبد تھا اور نہر بردی شہر میں داخل ہونے وقت اسکی دیواروں کے نیچے بہتی تھی۔ اسلئے بردی کو البریص کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ بقول بلاذری خالدؓ اور ابو عبیدہؓ دمشق میں بزور شمشیر اور بذریعہ صلح داخل ہو کر مقسلاط پر ملے تھے جسکو بریص کہتے ہیں ممکن ہے کہ بریص غسانی بادشاہوں کا قصر ہو جیسا کہ حسانؓ کے اشعار سے واضح ہوتا ہے۔

دمشق کی نہروں کا اصلی منبع "جبل لبنان" اور "دو مانہ بحیرۃ الرج" میں ہے۔ "لبنان" لفظ "لبن" سے مشتق ہے جو عبرانی ہے۔ اسکے معنی "سفید" یا "سفیدی مائل" ہیں۔ اگرچہ لبنان کی چوٹیاں ہمیشہ برف سے مستور رہتی ہیں مگر لبنان کے معنوں کا اطلاق اسکی برفانی چوٹیوں پر نہیں بلکہ اسکی مٹی کی رنگت پر ہوتا ہے۔ عالمان علم الارض نے اسے چار طبقوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے طبقہ میں مٹی کی رنگت سفید۔ اور دوسرے میں سفیدی مائل اور تیسرے میں زرد اور چوتھے میں سیاہی مائل ہے۔ جبل لبنان دو پہاڑی بلند اور وسیع سلسلے ہیں جو شام سے جنوب کی طرف ایکدوسرے کے متوازی چلے گئے ہیں۔ جنکی بلندی اور بتدریج ساحل شام کے ساتھ ساتھ کم ہوتی جاتی ہے۔ مغربی سلسلے کو "جبل لبنان" اور شرقی کو "جبل الشرقی" اور اہل یورپ اسے "ایشنٹی لبنان" کہتے ہیں۔ "وادی العزیز" ان دونوں کو جدا کرتی ہے اسے "البقاع" بھی کہتے ہیں۔ اسے دو دریا سیراب کرتے ہیں۔ ان پہاڑوں میں چار نہریں بہتی ہیں جن کے نام "قدسیہ" "جوز" "ابراہیم" اور "نہر کلب" ہیں۔ ان نہروں اور دیگر دریاؤں اور نہروں کا سرچشمہ جو شام اور ارض فلسطین اور "الاردن" کو سیراب کرتی ہیں یہی پہاڑ ہیں۔

"جبل الشرقی" نے دمشق کو شمال اور مغرب کی طرف سے گھیر رکھا ہے "جبل قاسیون" جو نہر یزید کا منبع ہے اور "جبل الشیخ" اسکی مشہور چوٹیاں ہیں۔ "جبل قاسیون" دمشق کا وہ مقدس پہاڑ ہے جسکی غاروں میں انبیاؑ کے آثار ملتے ہیں۔ اور عابدوں، زاہدوں اور صالحین کا مقام ہے۔ یہ جبل معظم مقدس زیارت گاہ ہے۔ اولیاء اللہ کے مقبرے اسجگہ ہیں۔ ایک مغارہ جسے "مغارۃ الدم" کہتے ہیں واقع ہے اسکی نسبت مشہور روایت ہے کہ قابیل ابن آدم نے اپنے بھائی ہابیل کو اسی جگہ قتل کیا تھا۔ چنانچہ مقتول کا خون اب بھی اس پتھر پر موجود ہے۔ پیدایش باب ۴ میں دونوں بھائیوں کا قصہ مفصل لکھا ہے۔ اور اس روایت کا ماخذ بھی یہی ہے۔

یاقوت لکھتا ہے کہ لوگوں کا یہ زعم کہ پتھر پر ہابیل کا خون ہے باطل ہے۔ کچھ شک نہیں کہ خون کے

مشابہ ضرور ہے لیکن فی الحقیقت یہ پتھر کا قدرتی رنگ ہے۔ ایک اور مغارہ جسے "مغارۃ الجوع" کہتے ہیں، اسی پہاڑ میں ہے۔ اسکی نسبت یہ روایت ہے کہ اس جگہ چالیس نبیوں نے پناہ لی تھی اور بھوک کے مر گئے۔ پہاڑ کی چوٹی پر ایک اور غار ہے جسے مغارہ آدم علیہ السلام کہتے ہیں۔ اسجگہ ایک مکان بھی بنا ہوا ہے۔ مغارۃ الجوع اسکے قریب نیچے واقع ہے۔

جبل قاسیوں میں بیشمار غار ہیں جن میں ایک نہ ایک پیغمبر یا نبی کے آثار بیان کئے جاتے ہیں۔ چنانچہ اس غار کا پتہ بھی اسی جگہ ملتا ہے جس میں حضرت ابراہیم خلیل اللہ کچھ عرصہ رہے۔ اور چاند، ستاروں اور سورج کی یکے بعد دیگرے پرستش کی۔ اور آخر جب انہیں غروب ہوتا ہوا دیکھا تو سمجھ لیا کہ یہ چیزیں قابل پرستش نہیں ہو سکتیں۔ ابن بطوطہ لکھتا ہے کہ یہ غار تنگ مستطیل شکل کا ہے اسکے قریب ایک مسجد بنی ہوئی ہے۔ جبل قاسیوں کی نسبت ایک اور روایت یہ بھی ہے کہ اسجگہ حضرت عیسیٰ اور آنحضرت کی والدہ کا گذر ہوا تھا۔ یہ ایک چھوٹا سا غار ہے اور اسکے اندر ایک حجرہ بنا ہوا ہے۔ ابن جبیر، یاقوت، اور ابن بطوطہ اور دیگر مؤرخین تصدیق کرتے ہیں کہ اہل دمشق کا یہ خیال ہے کہ اس جگہ حضرت عیسیٰ اور ان کی والدہ نے قرار پکڑا۔ ابن جبیر تو اسے فخر دمشق سمجھتا ہے۔ یاقوت لکھتا ہے کہ اسجگہ کا نام "ربوۃ" ہے۔ جسکے معنی زمین کا قطعہ مرتفع ہے اور "ربی" کی جمع بھی ہے۔ غالباً اس مقام کی بلندی اسکی وجہ تسمیہ ہے۔ یہ مقام جبل قاسیوں کے صحن میں واقع ہے۔ اور دمشق سے ایک فرسنخ کے فاصلہ پر ہے۔ دنیا میں کوئی جگہ بلحاظ نزہت اس سے بہتر نہیں اس جگہ نہر ثورا بردی سے جدا ہوتی ہے۔ اور اس جگہ ایک مسجد عالی بھی ہے۔ نہر یزید اسکے اوپر بہتی ہے۔ یہ وہ مقام ہے جسکی نسبت ابن جبیر لکھتا ہے کہ حضرت عیسیٰ اور انکی والدہ نے ایک ایسی بلند جگہ پر قرار پکڑا۔ جہاں عمدہ آب شیریں کا چشمہ ہے درختان سایہ دار اسکے چاروں طرف جھوم رہے ہیں اور درمیان میں نہریں رواں ہیں۔ ابن جبیر آیہ "و آویناھما الی ربوۃ ذات قرار و معین" کی تفسیر کر رہا ہے۔ یاقوت بھی یہی کچھ لکھتا ہے۔

ابن بطوطہ اگرچہ دمشق کی نہروں کے سرچشموں کے بیان میں غلطی کرتا ہے لیکن اس میں کچھ شک نہیں کہ جو کچھ اس نے عام حالات لکھے ہیں وہ صحیح ہیں وہ جبل قاسیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ دمشق کی نہروں کا منبع ایک ہی جگہ ہے جہاں سے پانی سات نہروں کی شکل میں نکل کر بہتا ہے۔ اور ہر ایک نہر کا رخ علیحدہ علیحدہ ہے۔ نہر ثورا نے پہاڑ کو توڑ کر اپنا راستہ بنایا ہے اور اس جگہ اس نہر کے زور سے ایک بڑا غار بن گیا ہے

اس غار سے پانی پہاڑ کے اندر ہی اندر جا کر پھر ظاہر ہوتا ہے، بعض دلیر پیراک اس غار میں غوطہ لگا کر غائب ہو جاتے ہیں اور پھر پہاڑ کے نیچے سے آ کر سر نکالتے ہیں، یہ نہایت خطرناک کھیل ہے،

جبل الشرقی کا برفانی پانی قدرتی چشمے پیدا کرتا ہے جو ندی نالوں کی صورت میں ان کے پہلوؤں پر بہتے ہیں، سیاحوں نے اس پہاڑی سلسلے کے دلچسپ نظارہ کا بالخصوص ذکر کیا ہے، آفتاب کی شعاعیں اسکی برفانی سطح پر منعکس ہوتی ہیں، اور اسکی چوٹیوں کو متجلی کرتی ہیں، دمشق کے قریب کھڑے ہو کر اگر دیکھا جائے تو اسکی چوٹی دس ہزار فٹ کی بلندی پر آسمان کا جگر پھاڑتی ہوئی بادلوں کی دھند میں غائب ہو جاتی ہے،

ان چشموں اور نہروں کی بدولت پانی کی یہ کثرت ہے کہ ان مقامات میں ہوا بھی تر و تازہ ہے، اور یہ بالکل صحیح ہے کہ آجتک کسی شخص نے اس جگہ تشنگی کو محسوس نہیں کیا، اور اس لئے اسکی حقیقت بھی ان پر منکشف نہیں ہوئی، نہر بردی، اور اسکی شاخوں کے کنارے کنارے چلو تو حاشیہ پر سبزہ زار اور دور دور تک دلکشا مرغزاریں پھیلی ہیں جنمیں خودرو بیل بوٹے اور مختلف اقسام کے پھول کھلے ہیں شہر کے قریب باغات کا سلسلہ اس "عروس البلاد" کو آغوش میں لئے ہوئے ہے، ابن جبیر کے قلب پر محسوسات کا اثر جو کچھ ہوا وہ اس نظارہ کا صحیح صحیح نقشہ ہے اگرچہ اس میں کسی قدر شاعرانہ تصرف ہے، مگر فی الحقیقت ایک ایسے فاضل ادیب شاعر کا دل و دماغ ہی اس قابل ہے کہ وہ اس نظارہ کو دیکھے اور جس صورت میں اس کا جلوہ اسکی آنکھوں کے سامنے ہوتا ہے اس کا نقشہ موزون الفاظ میں کھینچ دے، جسے دیدہ بصیرت ہی عطا نہیں ہوا، وہ کیا دیکھے گا۔

هرکه امروز نه بیند اثر قدرت او ۔
غالب آنست که فرداش نه بیند دیدار

دمشق کی خوبصورتی کا شہرہ شش جہت عالم میں پھیلا ہوا ہے، لیکن اس حسن کی مشاطہ یہی نہریں ہیں ابن جبیر اس شہر اور ان باغات کی نسبت جو اسکے گرد دور دور تک چلے گئے ہیں لکھتا ہے کہ یہ جبین عروس پھولوں کے زیور سے لدی ہوئی، باغات اور سبزہ زار کی یہ کثرت ہے کہ گویا ایک معشوق سبز پوش ایک ایسے عالیشان اور بلند پایہ گاہ خوشنما مکان میں جلوہ گر ہے جو انتہا درجہ کا آراستہ اور ہر ایک قسم کے ساماں سے مزین ہے، حسن صنعت میں جلوہ قدرت نظر آتا ہے، اس سے بہتر دنیا میں کونسا مقام ہو سکتا ہے، آب شیریں کے چشمے، اور نہروں کی روانی، سایہ دار درختوں کی کثرت بالکل خلد بریں کا نقشہ ہے

وہ مقام جسے جنت سے تشبیہ دیتے ہیں

"الغوطہ"

اور اسکی

مروج الذہب

ہیں، انہی نہروں نے اس سرزمین کو وہ عزت دی ہے کہ کل مؤرخین کا اس پر اتفاق ہے کہ دنیا میں چار مقام جنہیں جنان الدنیا کہتے ہیں، غوطہ دمشق، صغد سمرقند، شعب بوان، اور جزیرۃ الابلہ ہیں، یاقوت کہتا ہے کہ میں نے چاروں مقام دیکھے ہیں ان میں سے فضیلت غوطہ دمشق کو ہے:

غوطہ کے چاروں طرف پہاڑ واقع ہیں، اور یہ ایسی زمین ہے جو اٹھارہ میل تک وسعت میں ہے اور بوجہ نشیب اور وسعت اسے غوطہ کہتے ہیں، ان پہاڑوں کی بلندی کے مقابلہ میں سرزمین غوطہ نسبتاً پست نظر آتی ہے، نہریں ان پہاڑوں کے قدرتی چشموں سے نکل کر اس میں پیچ و خم کھاتی ہوئی بہتی ہیں اور اسکے بیشمار قریوں، اور اراضیات کو سیراب کرتی ہیں، درختوں کی یہ کثرت ہے کہ ان کے سایہ کے نیچے زمین نے کبھی آفتاب کی صورت نہیں دیکھی، حسن اور نزہت میں غوطہ دمشق سے بڑھ کر کوئی مقام نہیں، یہ نہریں غوطہ کے شمالی پہاڑوں سے جیسا کہ مذکور ہو چکا ہے آتی ہیں، شعرا نے اسکے وصف میں نہایت عمدہ شعر کہے ہیں، ابن قیس الرقیات کہتا ہے:-

اجلك الله والخليفة ما له · قوطه دار ابها بنوالحكم

الما لغو الجار ان يضام فنا · جار وعافيهم بمهتضم

اسی شاعر کے یہ شعر بھی ہیں:-

اقفرت منهم الفراديس فالغو · طة ذات القرى ذوات الظلال

فضير فالما طرون فحورا · ن قفار بسابس الاطلال

اٹھارہ میل کی وسعت میں بیشمار چھوٹے بڑے گاؤں آباد ہیں، اور ان میں بنو امیہ نے قصر بنائے تھے، ان کی فہرست اگرچہ بہت طویل ہے لیکن ہم بالاختصار یاقوت کا تتبع کر کے ذیل میں لکھتے ہیں:

"أبل السوق"، غوطہ دمشق میں ایک بہت بڑا قریہ ہے، یاقوت اس قریہ کے بعض نامور علما و فضلا میں سے ابو طاہر الحسین بن محمد بن الحسین بن عامر بن احمد جو ابن خراشہ کی نسبت لکھتا ہے کہ نہایت

خزرجی تھے؛ اور جامع دمشق کے امام تھے؛

شیخ ابوطاہر کا انتقال ۵۲۸ھ میں ہوا، نہایت ثقہ، متقی، مومن بزرگ تھے؛ ۲۷۸ھ میں جامع دمشق کے امام احمد بن الضحاک بن مازن ابوعبداللہ الاسدی القردی تھے؛

جسرین، جرباناً، تلبین، غوطہ کے قریئے ایک دوسرے کے قریب واقع تھے، جسرین میں ایک قاضی کی عدالت تھی جو اہل غوطہ کے مقدمات فیصل کیا کرتا تھا؛ یاقوت ان میں سے قاضی عمار بن الجزر کی نسبت لکھتا ہے کہ شیخ صالح اور جلیل القدر آدمی تھا، ۳۲۹ھ میں وفات پائی، دیر قانون اور "سطرا" اور "ناطرون" اور "مسیطور" بھی غوطہ کے نزہت گاہ تھے؛

حی الدیار علی علیاء جیرون ... مھوی الھوی ومغانی الخرد العین

مرا دلھوی اذ کنو مصرفتہ ... اغنۃ العین فی فسیح المیادین

بالنیربین فمقری فالسریر فجمہ ... رایا فجو حواشی جسر جسرین

فالقصر فالمرج فالمیدان فالشرف ... اعلی فسطرا فجرقان فقلبین

فالماطرون فداریا فجارتھا ... فابل فمغانی دیر قانون

تلک المنازل لا وادی الاراک ولا ... رمل المصلی ولا اثلات یبرین

"ازبد" دمشق سے تیرہ میل کے فاصلہ پر ایک قریہ ہے، ۱۰۵ھ میں خلیفہ یزید بن عبدالملک بن مروان جو عمر بن عبدالعزیز کے بعد تخت نشین ہوا، بیت المقدس کے ارادہ سے دمشق سے نکلا لیکن جب اس مقام پر پہنچا تو بیمار ہوگیا؛ اور چند روز میں اسی جگہ وفات پائی، لاش اٹھا کر دمشق میں لائے اور مقبرہ باب الصغیر میں دفن کر دیا؛ "بیت لھیا" اور "برزۃ" غوطہ دمشق کی قریوں میں یہ مقام بھی مردم خیز تھے یاقوت بعض مشہور آدمیوں کی جنکی پیدایش اور رہایش اس جگہ تھی فہرست لکھتا ہے؛ ابن منیر کہتا ہے،

سقاھا وروی من النیربین ... الی الفیضتین وحموریہ

الی بیت لھیا الی برزۃ ... ولاح مکفکفت الاوعیہ

بعض لوگوں نے خیال کیا ہے یہی مقام ہے جہاں حضرت ابراہیم خلیل اللہ پیدا ہوئے۔ مگر یہ روایت غلط ہے۔ عراق میں آپ کی پیدایش واقع ہوئی؛ "حموریہ" بھی اسی جگہ ایک قریہ تھا"

"بلاط" ایک اور قریہ غوطہ میں ہے، ابوسعید سلمۃ بن علی اسی قریہ میں پیدا ہوئے۔ ابن عساکر نے

بھی ان کا تذکرہ لکھا ہے، آخر مصر میں اقامت اختیار کی، اور اسی جگہ سنہ ۱۹۰ھ میں وفات پائی، اِس قریہ کا نام "بیت البلاط" بھی ہے، "تلفیاتا" اور "توما"، "بیت الآبار" اور "بیت قوفا" غوطہ دمشق کے مشہور قریئے ہیں، "بیت قوفا" میں معاویہ ابن ادس کی رہائش تھی جو "الواعظ" کے لقب سے مشہور تھے، اور جامع دمشق میں خطیب تھے، قریہ توما اس سڑک پر واقع تھا جو باب توما سے نکلتی تھی اور اس کے قریب باناس اور بردی کا اتصال ہوتا تھا، جریر کہتا ہے:۔

لاورد للقوم ان لم یعرفوا بردی — اذا تجوب عن اعناقها السدف

صبحن توما والناقوس یقرعه — قس النصاری خراجیجاً بنا تجف

قریۂ "الجامع" میں بنوامیہ کے مکانات تھے، ولید بن تمام بن الولید بن عبدالملک بن مروان بن الحکم کا ایک قصر اس جگہ تھا، اور متعلقہ اراضی جاگیر میں ملی ہوئی تھی۔

"دیر بشر" اور "قریہ حجرا" اور "حسجیرا" ایک دوسرے کے قریب تھے، مؤخر الذکر میں مدرک بن زیاد صحابی رسول کریم کی قبر ہے، اول الذکر میں بشر بن مروان بن الحکم بن ابی العاصی بن امیہ کا مکان تھا۔

قریہ "الحدیثة" اور "حرّان"، "حروان"، اور "حرستا" مشہور قریئے ہیں، حرستا دمشق کے قریب باغات کے درمیان اوس سڑک کے کنارہ پر واقع ہے جو دمشق سے حمص کو جاتی ہے، اسکے متعلق یاقوت قاضی عبدالصمد بن محمد بن ابی الفضل الانصاری کا ذکر کرتا ہے کہ نوّے سال سے زیادہ عمر تھی، اور نہایت ثقہ اور محتاط آدمی تھے، دمشق کے قاضی القضات تھے، سنہ ۵۲۰ھ میں وفات پائی، اسی نام کا ایک اور قریہ غوطہ میں جانب شرق واقع تھا؛

"داریا" ایک مشہور بڑا قریہ ہے، نہر "برانی" بمقام "دمر" بردی سے جدا ہو کر اس طرف آتی ہے اور اسکی زمینوں کو سیراب کرتی ہے، اس جگہ قبر ابی سلیمان دارانی ہے، شہر واسطے سے اس جگہ آکر رہائش اختیار کی، زہد و تقوےٰ کی زندہ مثال تھے، انکی قبر ایک زیارت گاہ ہے جسے "مزار" کہتے ہیں، سنہ ۲۳۵ھ میں انتقال ہوا، بیٹا سلیمان عابد اور زاہد تھا، دو سال بعد یعنی سنہ ۲۳۷ھ میں اس کا بھی انتقال ہوگیا، سلیمان بن حبیب ابوبکر اور ابو ثابت اور ابو ایوب دمشق کے قاضی عمر بن عبدالعزیز اور یزید اور ہشام کے زمانہ میں ہوئے، اور اسی مقام داریا کے باشندے تھے، "دُرمتہ" اور "دقانیتہ" اور "دکتہ" اور "دمّر" غوطہ دمشق کے قریئے ہیں، "دکہ" تو دمشق کے قریب واقع ہے،

اور "مقر" شمال کی طرف اس سڑک کے کنارہ پر ہے جو بعلبک کی طرف جاتی ہے۔ اس مقام پر نہر بردی تین شاخوں میں منقسم ہوئی ہے۔ "دبرانی" اور "ثورا" ان شاخوں کے نام ہیں جنکا ذکر ہو چکا ہے

"دیر بونا" غوطہ دمشق کی نزہت گاہ ہے۔ خلیفہ ولید بن یزید بن عبد الملک کی نسبت مبالغہ آمیز اور اکثر غلط روائتیں مشہور ہیں کہ فاسق اور فاجر تھا۔ لیکن مے نوشی کا لپکا ضرور پڑا ہوا تھا۔ ایک دن "دیر بونا" میں سیر کرتا ہوا آ نکلا۔ کہتے ہیں کہ یہ دیر نصاریٰ کی سب سے قدیم عمارت ہے اور حضرت مسیح کے وقت اسکی تعمیر ہوئی۔ یہ صریحاً غلط ہے۔ "ابن آدم کو تو سر کہنے کے لئے جگہ نہیں ملتی تھی"۔ آپکے حواری اور شاگرد اس قابل ہی نہ تھے کہ ایسے دیر تعمیر کرتے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس جگہ ابتدا میں یہودیوں کا ایک کنیسہ تھا جسپر آخر نصاریٰ قابض ہو گئے۔ اگر یہ صحیح نہ ہو تو یہ دیر دوسری یا تیسری صدی عیسوی میں عیسائیوں نے تعمیر کروایا ہوگا۔ خلیفہ ولید بن یزید کو یہ مقام ایسا پسند آیا کہ اسجگہ ایک دن قیام کیا اور یہ وقت جس عیش و عشرت میں بسر کیا اس کا تذکرہ وہ خود ذیل کے اشعار میں کرتا ہے:۔

حبذا لیلتی بدیر بونا — حیث نسقی شرابنا ونغنی
کیف ما دارت الزجاجة درنا — یحسب الجاهلون انا جننا
ومررنا بنسوة عطرات — وغناء وقهوة فنزلنا
وجعلنا خلیفة الله فطرو — س مجونا والمستشار یحنا
فاخذنا قربانهم ثم کفر — نا الصلبان دیرهم فکفرنا
واشتهرنا للناس حیث یقولو — ن اذا اخبروا بما قد فعلنا

اسی "دیر بونا" کے وصف میں ابو صالح عبد الملک بن سعید دمشقی کہتا ہے:۔

تملیت طیب العیش فی دیر بونا — بندمان صدق کملوا الظرف والحسنی
خطبت الی قس به بنت کرمه — معتقة قد صیروا احذرها دنا

غوطہ دمشق میں "دیر زکی" بھی ایک تفریح کا مقام تھا۔ یاقوت لکھتا ہے کہ اس جگہ عبد اللہ بن طاہر اور اس کا بھائی آئے۔ اور کچھ عرصہ اس جگہ لطف زندگی اٹھایا۔ بعد ازاں دونوں مصر کی طرف چلے گئے عبد اللہ کے بھائی کا اسجگہ انتقال ہو گیا۔ عبد اللہ واپس آیا۔ اور جب اس جگہ پہنچا تو گذشتہ صحبت کی یاد نے رلا دیا۔ اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کرتا ہے:۔

ایا سروتی بستان ذکی سلمتا — وغال ابن امی نائب الحد ثان
ویا سروتی بستان ذکی سلمتا — ومن لکما ان تسلما بضمان

"دیر فطرس" اور "دیر بولس" غوطہ دمشق میں اپنے حسن اور کثرت باغات اور اشجار کی وجہ سے مشہور تھے۔
جریر کہتا ہے:-

لما ذکرت بالدیرین ارقنی — صوت الدجاج وضرب بالنواقیس
فقلت للرکب اذ جد الرحیل بنا — یا بعد یبرین من باب الفرادیس

جریر اپنے بیٹے کے مرثیہ میں کہتا ہے:-

اودی سوادة یبدی مقلتی لحم — باز یصرصر فوق المرقب العالی
الا تکن لک بالدیرین باکیة — فرب باکیة بالرمل معوال
قالوا نصیبک من اجر فقلت لہم — کیف العزاء وقد فارقت اشبالی

قریہ "زملکا" اور "سام" اور "سقبا" اور "شواش" غوطہ دمشق کے قریے ہیں۔ دمشق کی نزہت کا ذکر کرتے ہوئے شہاب فتیان بن علی دمشقی "شواش" اور مرج اور "نہر" اور قصر المنیف وغیرہ کی خوبیاں بیان کرتا ہے

یا حبذا جنة باب البرید بھا — والحسن قد حثیت منہ حواشیہ
فالمرج فالنہر فالقصر المنیف علی الـ — قصور والشرف الاعلی فثانیہ
فالجسر جسر ابن شواس فنیربھا — تخلو معانیہ لا تخلو مغانیہ
کان فی راس علیین ربوتھا — یجری بھا کوثر سیحان مجریہ
تلک المرابع لا رضوی وکاظمة — ولا العقیق تواریہ بوادیہ

"شواش" جسر ابن شواش کے نام سے منسوب ہے، مفصل حالات کا پتہ نہیں لگا۔
"ضمیر" دمشق کی آخر حدود میں واقع ہے۔ عبید اللہ بن قیس الرقیات کہتا ہے:-

اقفرت منہم الفرادیس فالغو — طة ذات القری وذات الظلال
فضمیر فالماطرون فحورا — ن قفار بسابس الاطلال

متنبی کہتا ہے:-

لئن ترکنا ضمیرا عن میامننا — لیحدثن لمن ودعتہم ندم

فرزدق، عمر بن عبید اللہ بن معمر التیمی کے مرثیہ میں جسنے "ضمیر" میں وفات پائی کہتا ہے:-

یا معشر الناس لا تبکوا علی احد ۔۔۔ بعد الذی بضمیر وافق القدرا

ما مات مثل ابی حفص لملحمۃ ۔۔۔ ولا لطالب معروف اذا افتقرا

ضمن امام صدق قد منیت لھا ۔۔۔ ایام فارس فالایام من ھجرا

"عین ترما" اور "العنولۃ" اور "نذایا" اور "قطنا" اور "الکسوۃ" غوطہ دمشق کے قریہ ہیں جسکے ضمن میں محدثین، علما، اور اہل کمال کا ذکر کیا جاتا ہے، موخر الذکر اوس رستہ پر واقع ہے جو دمشق سے مصر کو جاتا ہے اور پہلی منزل اس مقام پر ختم ہوتی ہے۔

"المنزۃ" دمشق سے نصف فرسخ کے فاصلہ پر باغات میں واقع ہے، یہ ایک بہت بڑا مشہور قریہ ہے۔ اس میں رسول اللہ کے صحابی وحیۃ الکلبی کی قبر ہے۔ وحیۃ الکلبی رسول اللہ کے ہمراہ احد اور تمام مابعد کی لڑائیوں میں شامل رہے ۶ھ میں رسول کریم نے آپ کو قیصر کی طرف نامہ مبارک دیکر روانہ کیا تھا۔ اس قبر کو "منزۃ الکلب" کہتے ہیں۔

ابن بطوطہ لکھتا ہے کہ یہ قریہ جبل قاسیوں کے قرب میں واقع ہے اور اسکو منزہ کلب اس واسطے کہتے ہیں کہ قبیلہ کلب ابن دبرہ بن تغلب بن حلوان بن عمران ابن لطاف ابن قضاعہ کی طرف منسوب ہے۔ اس قریہ میں ایک جامع مسجد بھی ہے۔

ابن قیس الرقیات کہتا ہے:-

حبذا الیلتی بمزۃ کلب ۔۔۔ غال عنی بھا الکوانین غول

بت اسقی بھا وعندی مصاد ۔۔۔ انہ لی وللکرام خلیل

معدیا احل اللہ لنا ۔۔۔ س شرابا وما تحل الشمول

عندنا المشرفات من بقر الانس ۔۔۔ س ھواھن لابن قیس دلیل

"بیت لذا النبی" اور "حلفبلنا" دو قریے غوطہ دمشق میں ہیں ان کے قرب میں رسول اللہ کے ایک اور صحابی ابی مرثد وثار بن الحصین کی قبر بیان کی جاتی ہے۔

قریہ "منیحہ" میں سعد بن عبادۃ الانصاری کی قبر کا نشان بتایا جاتا ہے، لیکن بقول یاقوت سعد کی قبر مدینہ میں ہے۔

بقول ابن بطوطہ یہ قریہ دمشق سے چار میل کے فاصلہ پر واقع ہے، اور اس جگہ ایک چھوٹی سی خوبصورت مسجد بنی ہوئی ہے، جسکے احاطہ میں حضرت سعد بن عبادہ کی قبر ہے سرہانے ایک پتھر ہے جسپر یہ عبارت کندہ ہے:-

ھذا قبر سعد بن عبادہ راس الخزرج صاحب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تسلیماً۔

مگر یاقوت کا بیان صحیح معلوم ہوتا ہے۔

"نیرب" دمشق سے نصف فرسخ کے فاصلہ پر نہایت فرحت افزا مقام ہے، باغات کے درمیان واقع ہے۔ کہتے ہیں کہ اس جگہ مصلی خضر علیہ السلام ہے۔

ابن بطوطہ تائید کرتا ہے اور کہتا ہے کہ جبل قاسیون کے قریب ایک غار ہے اور اسے ایک مسجد نے احاطہ کیا ہوا ہے، اس میں ایک سنگ مرمر کا حوض جسمیں پانی پہاڑ کے قدرتی چشموں سے آکر خودبخود جمع ہوتا ہے۔ میں نے ایسا خوبصورت اور نادر وضع کا حوض تمام دنیا میں کہیں نہیں دیکھا، اس حوض کے قریب وضو کے واسطے جگہ بنی ہوئی ہے جس سے خودبخود پانی جاری رہتا ہے۔

"راویہ" ایک اور قریہ ہے، اس جگہ ام کلثوم اور مدرک بن زیاد الفزاری صحابی رسول اللہ کی قبر ہے ابن عساکر کہتا ہے کہ مدرک بن زیاد پہلا مسلمان ہے جو دمشق میں دفن ہوا، ابو عبیدہؓ کے ہمراہ آیا تھا اور اس جگہ وفات پائی، اور راویہ میں مدفون ہوا۔ ام کلثوم حضرت علیؓ کی بیٹی کا نام ہے، جو فاطمہ زہرا کے بطن سے تھی، اصلی نام ان کا زینب ہے، ابن بطوطہ کہتا ہے کہ اس قبر پر ایک خوبصورت مسجد بھی ہے اور اسکے مصارف کے واسطے اوقاف بھی ہیں، اہل دمشق اسکو قبر الست ام کلثوم کہتے ہیں، اور اس کے قریب ایک اور قبر ہے سکینہ بنت حسین بن علیؓ کی ہے، راویہ دمشق سے ایک کوس کے فاصلہ پر واقع ہے۔

غوطہ دمشق جسے جنت سے تشبیہ دیتے ہیں ایسا مقام تھا جسے خلفاء بنو امیہ اور اس خاندان کے اشراف رہائش کے لئے بالخصوص اختیار کرتے، اس جگہ انہوں نے عالیشان قصر، اور مساجد تعمیر کیں، اور آخری دنوں میں تو عیش و عشرت کا ہر اک سامان اس جگہ مہیا تھا ان مقامات میں سے قریہ "بلدا" اور "تمرانیہ"۔ اور "المحمدیات"۔ جو محمد بن الولید بن عبد الملک بن مروان کی طرف منسوب ہے۔ اور "القو بیضتہ" جسمیں ابان بن عبد العزیز بن ابان بن مروان بن الحکم بن ابی العاص اموی کے تین بیٹے مروان، ولید

اور امیہ سکونت رکھتے تھے۔ اور "طرمیس" جو ہشام بن یزید بن خالد بن یزید بن معاویہ بن ابی سفیان ابن حرب کی جائے رہائش تھا؛ اور "قرحتا" جو یحیی بن عبداللہ بن خالد بن یزید بن معاویہ بن ابی سفیان کا مسکن تھا؛ اور "دیرابان" اور "حرلان" مشہور قریے ہیں؛

"بیدعا" ایک اور قریہ تھا جہیں یزید بن عنبد بن محمد بن عبداللہ بن یزید بن معاویہ بن ابی سفیان کی رہائش تھی؛ "بیت سابا" میں ہشام بن یزید بن محمد بن عبداللہ کی سکونت تھی؛

غوطۂ دمشق کے قریوں کے تذکرہ کے بعد اسکی دلکش اور فرحت افزا مرغزاروں کا بیان اس دنیا کی جنت کے حالات کی تکمیل کرتا ہے؛ بالاختصار جو کچھ ہم نے ان قریوں کی نسبت لکھا ہے اس سے اتنا اندازہ تو ہو سکتا ہے؛ دمشق کی آبادی کا ایک حصہ اس جگہ اٹھارہ میلوں میں پھیلا ہوا ہے۔ بنوامیہ کے زمانہ میں شہر کے علاوہ دمشق کے باہر آبادی کا بڑا حصہ تھا؛ لیکن غوطۂ دمشق بلحاظ آبادی نفوس قابل ذکر نہیں؛ یہ وہ بے نظیر مقام ہے جو قدرتاً انسانی آبادی کا محرک ہے؛ اور کچھ تعجب نہیں کہ جیسا پرانے عہدنامہ میں مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو ایک باغ میں رکھا تھا جس کا عدن نام تھا وہ یہی باغ ہو یہی جنت ہو؛ جسکے حسن و خوبی کا تذکرہ ہر ایک سیاح اور نامور شعراء نے کیا ہے؛

ان تکن جنۃ الخلود بارض
فدمشق ولا تکون سواھا

اگر جلد بریں زمین پر ہے تو وہ دمشق ہے؛ اسکے سوا کوئی اور جگہ نہیں ہو سکتی؛

او تکن فی السماء فھی علیھا
قد ابدت ھواءھا وھواھا

اور اگر بہشت آسمان پر ہے تو وہ دمشق کے اوپر ہی واقع ہے کیونکہ اسکی ہوائیں اور خواہشات اسی امر کی مؤید ہیں؛ کہ یا تو دمشق بذاتہ جنت ہے اور اگر یہ نہیں تو اسکے اوپر جنت واقع ہے۔ اسکی ہوا نسیم خلد کے مشابہ ہے اور جس طرح لوگوں کے دلوں پر جنت کا اشتیاق غالب ہے اسی طرح دمشق کے دیکھنے اور اس میں رہنے کی خواہش ہے؛ یا یہ کہ دمشق خلد بریں کا عکس ہے اور دونوں کا کرہ ہوا ایک ہی ہے۔ یا نسیم خلد ہی دمشق میں چلتی ہے؛

بلد طیب ورب غفور
فاغتنمھا عشیۃ وضحاھا

بوجہ مشابہت بہشت دمشق پاکیزہ شہر ہے اور اسمیں جنت کی تمام نعمتیں موجود ہیں۔ وقت فرصت غنیمت ہے؛ ای جان بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

غوطہ دمشق کی مرغزاروں کا تذکرہ نقل عیش بہتر از عیش ہے؛ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ خود بخود طبیعت ایسے الفاظ میں اظہار خیالات کرنا چاہتی ہے جو اشعار میں ہی موزوں ہوتے ہیں؛ اس خیال سے کہ مبادا ہم اپنے موضوع سے بہت دور جا پڑیں دمشق کے چند مشہور مرغزاروں کا ذکر بالاختصار کرتے ہیں کہ۔

غوطہ دمشق میں جہاں بے شمار قریئے ہیں دلکشا مرغزاریں بھی پھیلی ہوئی ہیں؛ اور اہل دمشق بقول ابن بطوطہ ہفتہ میں ایک دن کچھ کاروبار نہیں کرتے؛ بلکہ انہیں مرغزاروں میں جمع ہوتے ہیں! باغات کی روشوں، پھولوں کے تختوں، اور نہروں کے کنارہ پر، سایہ دار درختوں کے نیچے، پانی کے چشموں کے گرد اُٹھتے، بیٹھتے، چلتے، پھرتے ہیں، عموماً موسم بہار کے شروع میں اس جگہ ہر وقت میلا لگا رہتا ہے؛ ہر ایک ہفتہ کے دن "مرج" میں لوگوں کا ہجوم ہوتا ہے۔ ان ایام اور غوطہ کے سیر و تماشا کی کیفیت ایک شاعر اس طرح بیان کرتا ہے،

اما دمشق فجنتہ	دمشق جنت ہے۔ اور ایسے مقام کو چھوڑ کر انسان اور کس جگہ کی
ینسی بھا الوطن الغریب	خواہش کر سکتا ہے؛ اس لئے مسافر اس جگہ آ کر اپنے وطن مالوف کو بھول جاتا ہے؛
للہ ایام السبوت	ایام سبت اور ان دنوں میں غوطہ کے منظر عجیب ہیں
بھا ومنظرھا العجیب	
انظر بعینك ھل تریٰ	آنکھ کھول کر دیکھ کہ سوائے محب اور حبیب کے اور کچھ نظر نہ آئیگا
الا محبًّا او حبیب	تو ان لوگوں میں جو اس جگہ داد عیش دے رہے ہیں؛ عناد اور حسد کی بو بھی نہ دیکھے گا؛ یہ ہنگامہ عیش و طرب ایسی مقامات میں ہوتا ہے؛ جہاں ہرے بھرے درختوں کی شاخیں پھولوں سے لدی ہوئی ہیں جو نسیم کے ہلکے ہلکے جھونکوں سے لچکتی ہیں؛ گویا ایک عالم سرور میں ان طیور کی خوش الحانی پر رقص کرتی ہیں جو ان پر نغمہ سرا ہیں؛
وغدت ازاھر روضہ	اس جشن گاہ کے باغات کی کلیاں فرحت و انبساط سے کھلتی
تختال فی فرح وطیب	ہیں؛ ہوا کے جھونکے سبزہ زار میں تموج پیدا کرتے ہیں؛

صاف شفاف پانی کی نہریں جاری ہیں، سایہ دار درخت اور گل وگلزار۔ اور یہ تمام منظر جنت کا نقشہ ہے۔ اگر فردوس بر روئے زمین است ٭ ہمین است وہمیں است وہمین است۔

"مرج عذراء" غوطہ دمشق میں اسی نام کے قریہ "عذراء" کے ساتھ ہے۔ اسکے قریب ہی ایک اور قریہ "ثنیات العقاب" ہے، جب مسلمانوں نے فتح "بصریٰ" کے بعد دمشق کا رخ کیا۔ تو اسجگہ اتر آئے۔ اور "رایت العقاب" کو کھولا۔ یہ علم رسول اللہ کا تھا۔ اور آپ کی وفات کے بعد مسلمانوں نے جہاں کہیں فوجکشی کی اسے بھی ہمراہ لے گئے۔ سپہ سالار کے خیمہ کا نشان یہی پھریرا تھا۔

"مرج عذراء" میں "عذرا" کے دائیں جانب ایک اور قریہ ہے جسے "تل الجبل" کہتے ہیں یہاں ایک منارہ ہے۔ اس جگہ حجر بن عدی الکندی کی قبر ہے۔ حجرؓ رسول اللہؐ کے صحابی تھے۔ امیر معاویہؓ کے دور خلافت میں کوفہ میں ان کی رہائش تھی۔ اور بنو امیہ کے برخلاف آل ابی طالب کی حکومت کے خواہاں تھے۔ اور ایک شورہ پشت جماعت کے سرغنہ تھے۔ اس وقت مغیرہ بن شعبہؓ عامل کوفہ تھے۔ اگرچہ "حجرؓ" ہمیشہ گستاخانہ پیش آتا۔ مگر مغیرہ حق صحبت رسول اللہؐ مد نظر رکھکر طرح دیتا مگر اتنا کہتا کہ اگر حجر کی یہی حالت رہی تو اسکا انجام اچھا نہ ہوگا۔ میں اب دنیا میں چندروزہ مہمان ہوں۔ میرا جانشین اس سے یہ رعایت نہ کریگا آخر جب زیاد عامل عراق مقرر ہوا تو حجر حسب معمول بوقت خطبہ زیاد پر کنکر پھینکے۔ زیاد نے گرفتار کر لیا اور ان کے ساتھ اور بھی باغی پکڑے گئے۔ اسی منارہ پر حجر بمعہ رفقا قتل کیے گئے۔

حجر بمعہ اپنے بھائی ہانی رسولؐ اللہ پر ایمان لائے۔ رسولؐ اللہ کے زمانہ میں انسے کچھ ایسی خدمات اسلام ظہور میں نہیں آئیں۔ جنگ قادسیہ میں شریک تھے۔ حضرت علیؓ کے ہواخواہوں میں سے تھے۔ جنگ جمل میں شامل تھے۔ اور جنگ صفین میں قبیلہ کندہ کے سپہ سالار تھے خوارج کے مقابلہ میں جنگ نہروان میں لشکر کا میسرہ ان کے ماتحت تھا۔ جب بنو امیہ کی حکومت بالاستقلال قائم ہو گئی تو "حجر" اپنی عادت سے باز نہ آئے۔ اور زیاد کی بیعت فسخ کر دی۔ زیاد نے ان کو گرفتار کر کے دمشق کی طرف روانہ کیا۔ ابن اثیر لکھتا ہے کہ جب یہ جماعت مرج عذرا میں پہنچی تو اس جگہ "حجر" نے تکبیر کہی۔ اور کہا "میں پہلا مسلمان ہوں جو اس جگہ تکبیر کہتا ہوں"۔ اسکے بعد قریہ عذرا میں آئے۔ اور اس جگہ بحکم امیر معاویہ قتل کیے گئے۔ جب ام المومنین عایشہ صدیقہؓ کو حجر کی گرفتاری کی خبر ہوئی تو عبدالرحمٰن بن حارث کو امیر کے پاس یہ پیغام دیکر روانہ کیا۔ کہ حجر سے کسی قسم کی بدسلوکی نہ کیجائے۔ لیکن عبدالرحمٰن دمشق میں حجر کے

قتل کے بعد پھوپنچے! امیر معاویہ سے کہا کہ ابوسفیان تو حجر اور ان کے اصحاب کے ساتھ بہت بردباری سے پیش آتے تھے! اس وقت آپ کا حلم کہاں کیا گیا تھا؛ تم نے ان کو قید کیوں نہ کیا؛ جہاں وہ اپنی موت سے مر جاتے؛ معاویہ نے کہا اس وقت میری قوم میں آپ جیسے نیک مشورہ دینے والے موجود نہ تھے؛ ورنہ میں ایسا ہی کرتا؛ عبدالرحمٰن نے کہا کہ "واللہ اہل عرب اب تمہیں نہ حلیم کہیں گے اور نہ صاحب عقل کہ؛ تم نے مسلمانوں کا خون کیا؛ اور وہ بھی بحالت قید؛ معاویہ نے کہا مجھے تو ابن سمیہ نے حجر کے قتل پر برانگیختہ کیا؛ اس نے لکھا کہ یہ لوگ انتظام سلطنت میں ایسا رخنہ ڈالنا چاہتے ہیں کہ اگر یہ کامیاب ہو گئے تو یہ خرابی کسی طرح دور نہیں ہو سکتی؛ اسمیں کچھ شک نہیں کہ حجر کے قتل کا افسوس تمام دنیائے اسلام کو ہوا؛ مگر ہزارہا بندگان خدا کی جانیں بچ گئیں؛ اور انتظام خاطر خواہ ہو گیا؛ یہ واقعہ ۵۱ھ کا ہے؛

جب آخری تاجدار بنوامیہ مروان کو عباسیہ کے مقابلہ میں شکست ہوئی تو محمد بن علی ایک لشکر جرار کے ساتھ مروان کا تعاقب کرتا ہوا دمشق پر بڑھا؛ اور راسی مرج عذرا میں اپنا کیمپ قائم کیا؛ اسی مرج کے جانب شرق مرج راہط واقع ہے؛ ۶۵ھ میں یزید بن معاویہ مر گیا؛ اور خلافت کا بوجھ اس کا بیٹا معاویہ نہ اٹھا سکا؛ عبداللہ بن زبیر نے مکہ میں محصور ہو کر ایک عرصہ تک میدان کارزار گرم رکھا؛ اس وقت دنیا اسلام میں بیعت کے متعلق اختلاف تھا؛ سب سے پہلے شام میں نعمان بن بشیر انصاری نے جو اس وقت حمص میں تھا؛ بنوامیہ کی بیعت فسخ کی؛ اس کے بعد زخر بن الحرث کلبی نے قنسرین میں نعمان کی تقلید کی؛ ضحاک بن قیس "اردن" میں تھا؛ ان جنگی افسروں نے بالاتفاق عبداللہ بن زبیر کی اطاعت قبول کی؛ اور ضحاک بن قیس دمشق کی طرف ایک لشکر جرار کے ساتھ آیا؛ مرج راہط میں ان کا مقابلہ مروان سے ہو گیا؛ اگرچہ مروان کا ارادہ تھا کہ عبداللہ بن زبیر کے حلقہ اطاعت میں آئے؛ مگر عبیداللہ بن زیاد نے اسے سمجھایا کہ عبداللہ نے حکم دیا ہے کہ جہاں کہیں بنوامیہ کو پاؤ قتل کر دو؛ اس وقت جب دونوں فوجوں کا مقابلہ مرج راہط میں ہوا؛ تو عبیداللہ نے مروان کو کہا کہ حریف کے ساتھ بیشمار جمعیت ہے اس لئے "الحرب خدعۃ" پر عمل کرنا چاہئے؛ مروان نے قبیر کو ضحاک کے پاس مصالحت کے لئے بھیجا؛ ضحاک کو امید تھی کہ مروان عبداللہ بن زبیر کی بیعت قبول کرے گا؛ اس لئے مصالحت پر رضامند ہو گیا؛ مگر عبیداللہ بن زیاد نے عین غفلت میں اُنپر حملہ کیا؛ ضحاک مارا گیا؛ اور مروان غالب آیا؛

زفر بن الحارث الکلابی جسکے اس جگہ تین بیٹے کام آئے۔ کہتا ہے:-

لعمری لقد ابقت وقیعۃ راھط — لمروان صدعا بیننا متنائیا
اریننی سلاحی لا اباک اننی — اری الحرب لا تزداد الا تمادیا
اسعد ابن عمرو وابن معن تتابعا — ومقتل ھمام امنی الامانیا
وتذھب کلب لم تنلھا رماحنا — وتترک قتلی راھط ھی ماھیا
فلم تر منی نبوۃ قبل ھذا — فراری وترکی صاحبی ورائیا
عشیۃ اجری بالقرینین لا اری — من الناس الا من علی ولا لیا
ایذھب یوم واحد ان اساتہ — بصالح ایامی وحسن بلائیا
فلا صلح حتی تنحط الخیل بالقنا — وتثار من نسوان کلب نسائیا
فقد ینبت المرعی علی دمن الثری — وتبقی حزازات النفوس کما ھیا

مرج عذرا اور مرج راہط دونوں تاریخی مقامات ہیں۔

مرج "راہط" بکا ایک مشہور قریہ "سکا" ہے؛ حسان بن ثابت کہتے ہیں:-

لمن الدار اقفرت بمعان — بین شاطی الیرموک فالصان
فالقریات من بلاس فداریا ..... فسکاء فالقصور الدانی
فقفا جاسم فاودیۃ الصفر ..... مغنی قبایل وھجان
ذاک مغنی لآل جفنۃ فی الدھر ..... وحقا تعاقب الازمان
ثکلت امھم وقد ثکلتھم — یوم حلوا بحارث الجولان

"بحیرۃ المرج" مرج راہط میں واقع ہے جسمیں دمشق کی تمام نہریں گرتی ہیں۔

دمشق کی مرغزاروں میں سے ایک مرج "صفر" بھی ہے جسکا تذکرہ مورخین اور شعرا نے اکثر کیا ہے:

شھدت قبایل مالک وتغیبت — عنی عمیرۃ یوم مرج الصفر

خالد بن سعید بن العاصی جو اسی مرج الصفر میں قتل ہوا کہتا ہے:-

ھل فارس کرہ النزال یعیرنی — رمحا اذا نزلوا بمرج الصفر

اس جگہ ایک قصر تھا جسے "قصر ام حکیم" کہتے تھے؛ ام حکیم، یوسف بن یحیی بن الحکم بن العاصی بن امیہ کی لڑکی تھی؛ اسکی والدہ کا نام زینب بنت عبد الرحمن ابن الحارث بن ہشام تھا؛ عبد العزیز بن الولید بن عبد الملک

سے شادی کی۔ اس نے طلاق دیدی تو ہشام بن عبدالملک کے نکاح میں آئی۔ دمشق کا ایک بازار "سوق ام حکیم" اسی کی طرف منسوب ہے۔ اس کا دوسرا نام "سوق القلانسین" ہے۔ شراب کی بہت شائق تھی۔ شعر بھی کہا کرتی تھی۔ اسکے اشعار میں سے ذیل کے دو شعر ہیں:-

الا فاسقیانی من شرابکما الورد ۔۔۔ وان کنت قد انفدت فاستر ہنا بردی

سوارمی ودملوجی وما ملکت یدی ۔۔۔ مباح لکم نہب فلا تقطعا وردی

اگرچہ انجیل میں مذکور ہے کہ ایک دفعہ مسیح بھوک کی شدت کے باعث ایک انجیر کے درخت کے پاس گئے دیکھا تو اسمیں کوئی پھل نہیں ہے۔ بد دعا دی کہ ہمیشہ بے ثمر ہی رہے۔ چنانچہ آج تک اسمیں کبھی پھل نہیں لگا۔ مگر مسلمانوں کی روایتیں اسکے برخلاف ہیں۔ چنانچہ روایت ہے کہ ایک دفعہ حضرت عیسیٰ جبل البضیع سے جو جبل الشرقی کی ایک چوٹی ہے اتر کر غوطہ میں آئے۔ اسکا دلچسپ منظر دیکھکر دل باغ باغ ہوگیا۔ آپنے غوطہ کو مخاطب کرکے فرمایا "ان یعجز الغنی ان یجمع بھا کنزاً فلن یعجز المسکین ان یشبع فیھا خبزاً"۔ چنانچہ اس دعا کا یہ اثر ہے کہ آجتک کوئی شخص غوطہ میں بھوک سے نہیں مرا۔ یہ تو ایک روایت ہے جسپر تنقیدی بحث بہت کچھ ہو سکتی ہے۔ لیکن اسمیں کچھ شک نہیں کہ غوطہ دمشق کی زمین نے کبھی تشنگی کو محسوس نہیں کیا۔ اور اسکی زمین نہایت سیر حاصل ہے۔ چنانچہ اہل دمشق سال میں کئی فصلیں کاشت کر لیتے ہیں۔ اور ہر ایک قسم کی پیداوار کے لئے یہ ارضی موزون ہے۔ مگر جس طرح دیگر شہروں پر ارضی اور سماوی بلائیں نازل ہوتی ہیں۔ دمشق ان میں مستثنیٰ نہیں ہے۔ بقول شیخ سعدی رح ؎

چناں قحط سالے شد اندر دمشق
کہ یاراں فراموش کردند عشق

موسم خریف میں غوطہ کی آب و ہوا صحت کے لئے سخت مضر ہے۔ ان دنوں پانی کی کثرت سے تعفن موسمی بخار پیدا کرتا ہے۔

"الغوطہ" فی الحقیقت "میدان" کا ایک حصہ ہے۔ میدان کی وضع کی نسبت مختلف رائیں ہیں مگر اکثر سیاحوں کا اسپر اتفاق ہے کہ میدان مثلث نما ہے۔ اسکے شمال مغرب میں جبل الشرقی (انٹی لبنان) اور جنوب میں نہر اعوج (فرفر) اور شرق میں بحیرۃ المرج واقع ہیں۔ میدان کے دو حصے ہیں۔ ایک کو فوقی اور دوسرے کو تحتی کہتے ہیں۔ میدان کو "الغوطہ" اور "المرج" میں بھی تقسیم کیا گیا ہے۔ الغوطہ شہر کے گرد اور المرج جانب

مشرق واقع ہے۔ میدان میں جنوب کی طرف وہ حصہ بھی شامل ہے جسے "وادی العجم" کہتے ہیں اور جسے نہر اعوج اور اس کی شاخیں سیراب کرتی ہیں۔ نہر بردی اور اعوج وہی پرانی نہریں ہیں جن کا نام توریت میں "ابانہ" اور "فرفر" لکھا ہے۔ اور جو قدیم الایام سے دمشق کی زمینوں کو سیراب کرتی ہیں۔ ان میں سے بردی، شہر دمشق کو دو حصوں میں تقسیم کرتی ہوئی مغرب سے مشرق کو بہتی ہے۔ نہر اعوج کا منبع جبل الشیخ میں "عین وردیہ" ہے یہ نہر دمشق کے جنوب میں مغرب سے مشرق کو بہتی ہے، دونوں نہریں الغوطہ۔ المرج، اور المیدان، کو سیراب کرتی ہوئی۔ "بحیرۃ المرج" میں گرتی ہیں جو شہر سے جانب شرق بیس میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ بحیرۃ المرج درحقیقت جھیلوں کا سلسلہ ہے۔ شمالی جھیل کو بحیرۃ الشرقیہ، اور اس کے جنوبی حصہ کو "بحیرۃ القبلیہ" کہتے ہیں اس میں نہر بردی گرتی ہے۔

بنوامیہ کے زمانہ میں بحیرۃ المرج کے قریب بھی اشراف بنوامیہ کے قصر تھے۔ جن کے آثار اب بھی ملتے ہیں، مگر موجودہ زمانہ یہ پُرفضا مقام لمبے لمبے گھاس اور جھاڑیوں میں مونھ چھپاتا ہے۔"

دین و دانش
یورپ کی علمی دنیا کے نے مختلف اوقات میں اسلام کے متعلق گوناگون خیالات ظاہر کیے ہیں۔ اور اٹھارھویں اور انیسویں صدی عیسوی میں اس مذہب کے احکام و تعلیمات کی تحقیقات میں بکثرت کتابیں یورپین زبانوں میں تالیف ہوئی ہیں جن میں موافق و مخالف سب ہی قسم کی باتیں مذکور ہیں۔ اس کتاب (دین و دانش) میں یہ التزام کیا گیا ہے۔ کہ اب تک اسلام کی نسبت یوروپ و امریکہ میں جتنی باتیں کہی گئی ہیں ان سب کا خلاصہ دے کر تمام اسلامی عقاید و احکام کا محققانہ ثبوت خود علمائے یوروپ کے مسلمات اور سائنس کے اصول موضوعہ سے دیا گیا ہے جدید علم کلام کی یہ ایک ایسی عظیم الشان سایکلوپیڈیا ہے۔ کہ تمام علمی زبانیں اس سرمایہ سے خالی ہیں۔ اور اردو کی یہ خصوصیت ہے کہ اس کے حال میں ایک ایسی تالیف نصیب ہوئی جس کو اس صدی کا بہترین سائنٹیفک انکشاف کہنا چاہیے ضخامت ۴۰۵ صفحہ قیمت ۳ روپے
المشتہر
منیجر اخبار وکیل امرتسر
(پنجاب)

ادلۃ الکرام
فی اثبات
عقائدالاسلام

(اردو) علم کلام میں یہ پہلی کتاب ہے جس میں لائق مصنف نے قدیم کتب عقائد اسلامیہ کے طرز پر ایک پر زور فلسفیانہ تالیف جس کی مدت سے ضرورت محسوس ہو رہی تھی شائع کی۔ اس میں اسلام کے ہر عقیدے کی توضیح فلسفہ جدید یعنے سائنس اور موجودہ تھیالوجی کے اصول سے کی گئی ہے اسلام کے تمام بنیادی اعتقادات کے ثبوت میں ایسے بین اور واضح اور سائنٹیفک اصول پر دلائل دیئے ہیں کہ اُن کو ہر ایک شخص سمجھ لے اور مان جائے اس کتاب کا طرز استدلال نہایت دل نشین ہے اور دقیق سے دقیق مسائل بھی اس خوش اسلوبی سے بیان کیے ہیں جن کے سمجھنے اور تسلیم کرنے میں کچھ تکلیف اُٹھانی نہیں پڑتی۔ اس کتاب کے پُرزور دلائل کے ماننے میں یورپ کے مادہ پرستوں کو بھی کچھ عذر و انکار نہیں ہو سکتا۔ غرضیکہ اس کی خوبیاں دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ ضبط تحریر میں نہیں آسکتیں۔ عمدہ ولایتی کاغذ پر نہایت صاف اور خوش خط طبع ہوئی ہے **قیمت ایک روپیہ (عہ)**

آثار اکبری

یہ کتاب دارالحکومت فتح پور سیکری اور اس کے مضافات کی قدیم اور مہتم بالشان اکبر شاہی عمارتوں کی ایک نہایت مفصل تاریخ ہے جس کے دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ ہندوستان میں مسلمانوں نے کس شان و شکوہ کی عمارتیں تعمیر کی تھیں اُنکا خاص فن تعمیر کس قدر عجیب و غریب اور حیرت ناک تھا۔ جر ثقیل کے علم میں وہ کس قدر ماہر تھے۔ رفاہ عام کی مخصوص تعمیرات میں اُن کی کیسی کیسی شاندار یادگاریں تھیں اور انہوں نے واٹر ورکس اور خود آٹا پیسنے والی مشین کیسی اہم ایجاد کی تھیں۔ عمارتوں کے ساتھ بانیان عمارت کے حالات بھی لکھے ہیں۔ ناظرین اس کے مطالعہ سے اس بیسویں صدی میں اکبر و جہانگیر کے عہد کا تمدن بچشم خود دیکھ سکتے ہیں۔ قدیم عظمت کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔ عبرت خیز کتاب ہے۔ **قیمت دو روپے۔ (عگ)**

(۱۰۱)

المشتہر
منیجر اخبار وکیل امرتسر